جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی وادبی رسالہ
جلد ۱۳
بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۰ع
نمبر ۱
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927.

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

نمبر ۱	بابتہ ماہ جنوری ۱۹۳۰ء	جلد ۱۴

فہرست مضامین

برنارڈ شا

جارج برنارڈ شا آئرستان کے دارالسلطنت ڈبلن میں ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوا۔ اسکا خاندان آئری نسل سے تھا۔ مگر مذہباً پروٹسٹنٹ کلیسا کے پیورٹین[1] فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ صوبہ السٹر کے پروٹسٹنٹ باشندے ابتدا سے آئرستان میں انگریزی حکومت کے حامی اور مددگار رہے۔ برنارڈ شا کا باپ جارج کار شا آئرستان کی سول سروس کا رکن رہ چکا تھا اور پنشن لینے کے بعد تجارت کرتا تھا۔ ہندوستانی عہدیداران سول سروس کی طرح آئرستان کے سول سروس والے بھی عزیزوں میں بیگانہ ہوکر رہتے تھے۔ انہیں اپنے آبائی تمدن سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ ہر بات میں اپنے حکمرانوں کی تقلید کرتے تھے اور اتحاد مذہب کے سبب سے انکا رشتہ تعلق ان غیر ملکیوں سے اور بھی مضبوط ہوگیا تھا۔ مگر پھر بھی نسل کے اثر سے ان کی طبیعت میں آئری خصوصیات موجود تھیں۔ برنارڈ شا کی سیرت کے سمجھنے کے لئے ان دونوں عناصر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ آئرستان والوں کی وسعت تخیل ظرافت و صاحب خیال تنقید، واقعہ بینی، سادگی، عفت اس کے خمیر میں تھی، پیورٹین مذہب کی عقلیت پسندی، سادگی، سختی، خشکی، جنگجوئی ماحول اور تربیت کے اثر سے پیدا ہوئی۔ شا کی ابتدائی عمر کا تصور کیجئے تو یہ نظر آتا ہے کہ ایک حسین طبیعت، پاک دل، گہری نظر رکھنے والا بچہ ایک مصنوعی ماحول میں تعلیم پا رہا ہے جو وطنیت کے جذبات سے خالی قومی روایات سے بیگانہ ماضی کے اثرات سے آزاد ہے۔ اُس کے سامنے زندگی کا ایک بلند اور مجرد تصور ہے۔ لیکن اُس

---

(۱) Puritan۔ عیسائیوں کے اس فرقے کو کہتے ہیں جو خدا کی عقلی پرستش کا قائل ہو۔ مذہب میں جذبات کا عنصر داخل نہیں کرنا چاہتا۔ اور اخلاقی اصول میں بیحد سخت ہو۔

کی واقعی حالت سے اس کی نیرنگیوں سے، اسکی پیچیدگیوں سے واقف ہونے کا اُسے موقع نہیں ملتا۔ اس کی نظر میں انسانیت کا ایک اعلیٰ اور یک رنگ تخیل ہے۔ مگر جیتے جاگتے انسانوں کی کشمکش آرزو، انکے سعی و عمل کے نشیب و فراز، انکے جذبات و احساسات کے مد و جزر کو دیکھنے اور سمجھنے سے وہ معذور رہے۔ وہ آنکھ کھول کر دیکھتا ہے تو اپنے ہم مذہبوں کے حلقے کو دیکھتا ہے۔ جو قومی زندگی کے بحر ذخار کے کنارے ایک چٹان کی طرح کھڑا ہے جسے خبر تک نہیں کہ کونسی ہوائیں موجوں کو حرکت دیتی ہیں۔ کونسے طوفان سمندر میں تلاطم برپا کرتے ہیں۔

ایسی بے تعلقی اور ناآشنائی کے دامن میں پرورش پاکر انسان یا تو مردم بیزار راہب یا عالم بنتا ہے یا شدید انقلاب پسند۔ شا کی سرشت میں بنی نوع انسان کی محبت تھی اور اس کی تربیت پیوریٹن مذہب پر ہوئی تھی۔ اس لئے وہ رہبانیت سے محفوظ رہا۔ اور انقلاب پسندی کی طرف جھک گیا۔ علمی ذوق اسے ابتداء سے تھا اور آخیر تک رہا۔ لیکن اخلاقی جوش اور عملی ولولے نے اُسے پیشہ ور سائنس داں نہ بننے دیا۔ منطقی تحلیل اور غور و فکر کی قوت کو اس نے علمی تحقیق میں صرف کرنے کے بجائے عملی زندگی کی تنقید اور اصلاح کے لئے وقف کر دیا۔

تنقید کا شوق اور اصلاح کا جوش برنارڈ شا کے دل میں اسی زمانے میں پیدا ہو گیا تھا جب وہ اسکول میں تعلیم پاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انگلستان اور اسکاٹستان میں پیوریٹن مذہب پر زوال آچکا تھا۔ اور آئرستان میں بھی اُسکا انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ لوگ اس کے آہنی اصولوں کے زبان سے قائل تھے۔ مگر عمل محض برائے نام باقی رہ گیا تھا۔ باطنی خلوص اور عقیدت کے گھٹنے سے ظاہری تعصب اور تشدد بڑھ گیا تھا۔ پادریوں میں نفسانیت اور تنگ نظری کا زور تھا۔ اور وہ اپنا وقت آپس کے مناظروں میں ضائع کرتے تھے۔ نوعمر شا اپنے گھر پر یہ دیکھتا تھا کہ اسکا باپ پیوریٹن عقیدے کے مطابق شراب نوشی کا مخالف ہے مگر چھپ کر شراب پیتا ہے۔ باہر اسے یہ نظر آتا تھا کہ دینیات کے فروعی مسائل پر دور دراز کاوشیں ہوا کرتی ہیں۔ لیکن زندگی کے اہم مسائل پر کوئی غور نہیں کرتا۔ شا کے گہرے مذہبی احساس اور سچے اخلاقی جوش کو اس کھوٹی مذہبیت سے اس قدر

وحشت ہوئی کہ وہ سرے سے مذہب ہی کا مخالف ہوگیا۔ نوعمری کی خامکاری اکثر لوگوں کو ایسے
شبہات میں مبتلا کر دیتی ہے۔ مگر وہ عموماً انہیں چھپاتے ہیں۔ شا کے ولولے اور اسکی ہمت کا
اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس نے مذہب کی مخالفت اور الحاد کی تائید میں ایک مضمون لکھا اور اسے
اخبار میں چھپوا بھی دیا۔ خدا نے خاندان کی مخالفت کا اثر تھا یا اور کوئی وجہ تھی کہ شا ایک ہی مضمون لکھکر خاموش
ہوگیا۔ مگر اس کے دل میں لا مذہبی ایک مدت تک کے لئے راسخ ہوگئی۔ برسوں کے بعد ذاتی
روحانی واردات کی صیقل نے اس کے آئینۂ قلب سے اس زنگ کو دور کیا۔

اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد برنارڈ شا کو کسی تجارتی کارخانے میں معقول آمدنی
کی جگہ مل گئی۔ اور باوجودیکہ یہاں اُس کے علمی اور ادبی ذوق کے پورا ملانے کا کوئی سامان نہ تھا۔
وہ انتہائی ضبطِ نفس سے کام لیکر چار سال تک اپنے فرائض ایمانداری اور محنت سے انجام دیتا رہا
لیکن اسے خدا نے ایسا دل دیا تھا جو اپنے بنی نوع کی مصیبتوں پر کڑھتا تھا۔ اسے یہ گوارا نہ ہوا کہ
زندگی کے طوفان خیز سمندر میں ایک چٹان پر بیٹھا ہوا ڈوبنے والوں کے ہاتھ پیر مارنے کا تماشا
دیکھا کرتا۔ اس نے یک بیک اپنے کاروبار کو چھوڑ دیا۔ اور حیات کی زندگی سے منہ موڑ کر ڈبلن سے
لندن چلا آیا۔ اور انقلابی تحریکوں میں شریک ہوکر ہر قسم کی سختیاں جھیلنے لگا۔

یہاں وہ ابتدا میں نراجیوں اور دہریوں کے ساتھ ریاست اور کلیسا سے جنگ کرتا رہا
مگر آخر میں اشتراکیوں کا ہم خیال اور شریک کار ہوگیا۔ شا کے ہاتھ میں تنقید اور طنز کی جو بے پناہ
تلوار تھی۔ اُس سے صرف اس کے مخالفین ہی نہیں بلکہ اس کے موافقین بھی پناہ مانگتے تھے۔ اُس
کی دیانتداری اور انصاف پسندی کا یہ حال تھا کہ جس جماعت میں وہ شریک ہوتا تھا۔ اس
کی کمزوریوں کو ظاہر کرنا اپنا سب سے پہلا فرض سمجھتا تھا۔ وہ سیاسی اور سماجی انقلاب چاہتا تھا۔ لیکن
انقلاب پسندوں کی جذبات پرستی اور بے اصولی پر سختی سے نکتہ چینی کرتا تھا۔ وہ آزادی نسواں کا
حامی تھا۔ لیکن اس بات پر شدت سے اعتراض کرتا تھا کہ عورتیں ایک طرف تو دل و دماغ میں
مردوں کی برابری کا دعوےٰ کریں اور دوسری طرف صنفِ نازک بن کر خاص رعایتوں
کی طالب ہوں۔ وہ مروجہ مذہب کا مخالف تھا۔ اور اس پر حملے کرتا تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ

ان لوگوں کی خبر لیتا تھا جنہوں نے سائنس کو مذہب کی حیثیت دے رکھی تھی۔ غرض کچھ تو اس کی بیگانہ وار تربیت کا اثر تھا، اور کچھ اس کی نا آشنا طبیعت کا فیض کہ وہ کسی اصول کسی تحریک کو آنکھ بند کرکے والہانہ جوش عقیدت کے ساتھ قبول نہیں کرتا تھا۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ اپنے خیالات میں راسخ اور اپنی دھن کا پکا نہ تھا۔ اخلاق و معاشرت کی اصلاح کی ہر کوشش میں وہ پوری سرگرمی سے حصہ لیتا تھا۔ لیکن دو باتوں کے سبب سے اس کے رفیق اس کے شاکی رہتے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ انکے کاموں کا بہت سختی سے احتساب کرتا تھا دوسرے یہ کہ وہ ہر اصلاحی اور انقلابی تحریک کو محض عقل اور انصاف پر مبنی رکھنا چاہتا تھا۔ اور جذبات کے ہیجان کو جو انسانی احساس کا جزو اعظم ہے کمزوری کی دلیل سمجھ کر دبا دیتا تھا۔ خود اسکا دل ہمدردی اور محبت سے معمور تھا لیکن وہ انہیں منطقیانہ خشکی اور ناقدانہ طنز کے پردے میں چھپاتا تھا۔ اس کا درد آشنا دل انسان تو انسان حیوانوں تک سے الفت رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ ابتدا سے گوشت خواری کا مخالف تھا اور سوائے سبزی ترکاری کے کچھ نہیں کھاتا تھا۔ لیکں اسکا سبب وہ ظاہر کرتا تھا۔ کہ گوشت کھانا اقتصاد فطرت کے خلاف ہے۔

برنارڈشا کی جد وجہد کا مرکز فیبین سوسائٹی تھی جسے انگلستان کے چند قابل بلند نظر دو راندیش ارباب فکر نے اشتراکیت کی تبلیغ اور ملک و قوم کی تدریجی اصلاح کی غرض سے قائم کیا تھا۔ اس کے ارکان وہ لوگ تھے جن میں سے بعض آج لیبر حکومت میں وزارت کے منصب پر فائز ہیں۔ شا اس حد تک ان لوگوں کا ہم خیال ہے کہ وہ ریاست کو حکومت و سیاست، اقتصاد و تجارت میں مختار کل بنانا چاہتا ہے، لیکن مذہب و اخلاق علم و فن آرٹ و شاعری غرض سارے روحانی اور ذہنی امور میں وہ انفرادی آزادی کا قائل ہے۔ طرز حکومت کے معاملے میں بھی اُسے اشتراکیوں کے تمام اصولوں سے اختلاف ہے وہ جمہوریت کا حامی نہیں ہے۔ بلکہ اُس کا یہ عقیدہ ہے کہ ملک کا نظم و نسق چند دیانت دار اور روشن خیال افراد کے ہاتھ میں ہونا چاہئے جو اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھ کر حکومت کریں لیکن ان اختلافات کے باوجود وہ عقائد کے اعتبار سے

سب سے زیادہ قریب انہیں اشتراکیوں کو پاتا تھا اس لئے وہ انکی جماعت کا ایک سرگرم رکن بن گیا۔ وہ ان لوگوں کے لئے پمفلٹ لکھا کرتا تھا اور انکے مباحثوں میں شریک ہو کر ان کے اچھے اصولوں کی تائید اور ان کی کمزوریوں پر سختی سے تنقید کیا کرتا تھا۔

یہ شا کے لئے سخت دشواریوں کا زمانہ تھا۔ پورے چھ برس اس نے ایسی عسرت میں گذارے کہ اُسے پیٹ بھرنے کو سوکھی روٹی اور تن ڈھکنے کو موٹا کپڑا بھی مشکل سے میسر آتا تھا۔ وہ آرٹ کی تنقید خصوصاً موسیقی کی تنقید پر مضامین لکھا کرتا تھا۔ لیکن اس کی صاف گوئی اور تلخ بیانی کے سبب سے اخبارات اور رسالے بہت کم اس کی تحریروں کو قابل اشاعت سمجھتے تھے۔ کبھی کبھی اسے کوئی اشتہار یا کسی تصویر کی تشریح لکھنے کو مل جاتی تھی اور اُس کے قلیل معاوضے سے جیسے تیسے اسکا کام چلتا تھا۔ اس زمانے میں اس نے ناول بھی لکھے مگر اُن میں سے کوئی مقبول نہ ہوا۔

سب سے پہلے ولیم آرچر نے اس کی قدر پہچانی اور اُسے سیٹرڈے ریویو کے لئے آرٹ کی تنقید لکھنے کا کام سپرد کیا۔ اب شا کو فکر معاش کی طرف سے کسی قدر اطمینان نصیب ہوا۔ اور اپنے جوہر قابل کے اظہار کا موقع ملا۔ اس موقع سے اس نے سب سے پہلے یہ فائدہ اٹھایا کہ اپنا بت شکنی کا کام آرٹ اور ادب کے میدان میں بھی شروع کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ انگلستان والے بہت سے بتوں کی پرستش کرتے ہیں جیسے سامراج، امارت پسندی قدامت پرستی لیکن ان کا سب سے بڑا بت شیکسپیر ہے۔ وہ شکسپیر کی شاعری کا بہت قائل تھا۔ لیکن شیکسپیر کے فلسفۂ زندگی کا جو تخیل اس کے ذہن میں تھا اسکا وہ سختی سے مخالف تھا۔ شا کے جمالیاتی نظریہ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ آرٹ کو کوئی مستقل مقصد زندگی (قدر) تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ تمدنی اور اخلاقی اغراض کا آلۂ کار سمجھتا ہے۔ چنانچہ اس نے شیکسپیر کی شاعری پر زیادہ تر اس پہلو سے نظر ڈالی کہ وہ کائنات کی کیا تفسیر کرتا ہے اور زندگی کا کونسا نصب العین پیش کرتا ہے۔ اور اسے یہ نظر آیا کہ یہ شاعر جسے انگلستان والے پوجتے ہیں زندگی کو ایک چندروزہ تماشا، اس کے مقاصد کو کھلونا، اس کے فرائض کو کھیل جانتا ہے اور آزادی، زندی، لاابالی پن کی تعلیم دیتا ہے۔ بھلا برنارڈ شا جس کے نزدیک زندگی ایک

ازلی اور ابدی قوت کا مظہر، عالمگیر ارتقا کا سلسلہ، خشک اور سخت گیر اخلاق کا ضابطہ ہے۔ ان خیالات کو کیونکر پسند کرتا۔ اس نے اپنے زورِ قلم سے ادبی دنیا میں ہلچل مچا دی اور شیکسپیر کے سنگین بت کو گرا نہیں سکا۔ تو اس کی بنیادوں کو ہلا ضرور دیا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ برنارڈ شا نے شیکسپیر کی شاعری کا منشا صحیح نہیں سمجھا۔ شیکسپیر نشاۃ ثانیہ[1] کے زمانے کا شاعر اپنے دور کے ذہنی شراب سے سرشار تھا۔ اس کے عہد میں مغربی تمدن کلیسا کی جابرانہ حکومت سے نیا نیا آزاد ہوا تھا اور صدیوں تک تنگ خیالی اور تنگ نظری کی کال کوٹھری میں بند رہنے کے بعد نئی زندگی کی صاف روشنی اور تازہ ہوا کا لطف اٹھا رہا تھا۔ وہ اپنے ہم عصروں کے ساتھ زندگی کی وسعت اور گوناگونی کے نظارے میں ایسا مگن تھا کہ اُسے اس کے مقصد اور منشا پر غور کرنے اور اس کی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور قبول کرنے کی فرصت نہ تھی وہ نہ تو نقاد تھا۔ اور نہ مصلح بلکہ محض مصور اور مغنی یعنی خالص شاعر۔ وہ انسان کے جذبات و احساسات، اُس کی امیدوں اور آرزؤں اس کے ارادوں اور کوششوں کا خود مشاہدہ کرتا تھا اور دوسروں کو کراتا تھا۔ زندگی کے راحت و الم، مد و جزر، نشیب و فراز پر خود ہنستا اور روتا تھا اور دوسروں کو ہنساتا اور رُلاتا تھا۔ اُس کے نزدیک زندگی واقعی ایک تماشا ہے مگر عبرت آموز تماشا۔ اس کے مقاصد واقعی کھلونے ہیں مگر دیوتاؤں کے کھلونے اس کے فرائض واقعی کھیل ہیں مگر قسمت کے کھیل۔ اس کی شاعری کو سمجھنے کے لئے نشاۃ ثانیہ کی روح کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس سے برنارڈ شا اپنی خلقت اور تربیت کی بدولت بیگانہ ہے جس چیز کو وہ رندی اور لاابالی پن سمجھتا ہے وہ اصل میں جوشِ نمو تھا اور ولولۂ حیات جو آئینۂ فطرت میں اپنی سی صورت دیکھتا تھا اور مشاہدے کے کیف میں ڈوبا ہوا سبکروی سے زندگی کی راہیں طے کر رہا تھا۔

شیوۂ رنداں بے پروا خرام از من مپرس   ایں قدر دانم کہ دشوار است آساں زیستن

مگر اسمیں شک نہیں کہ یہ طرزِ خیال اور یہ شیوۂ زندگی زیادہ دن قائم رہنے والا نہ تھا۔ مغربی تمدن

---

(1) Renaissance

کے حاملوں کو بہت جلد یہ محسوس ہوا کہ بھونرے کی طرح کلی کلی کا رس لینا انسانیت کی تکمیل کے لئے کافی نہیں۔ انہیں ایک گہرے اور مستحکم عقیدے کی ضرورت ہوئی اور مذہبی اصلاح کی تحریک نے اس ضرورت کو پورا کیا۔ اس کے بعد ان پر عقلیت، روحانیت، عینیت کے دور گذرے جن میں اُن کے دماغ میں ترتیب انکے جذبات میں گہرائی اُن کے تخیل میں وسعت پیدا ہوئی۔ آخر میں ثبوتیت کا دور آیا جس میں انکے تجربے اور مشاہدے کی قوتوں نے بیحد ترقی کی۔ انہوں نے صنعت وحرفت و سائنس سے مدد لے کر زندگی میں ایسی سہولتیں پیدا کیں اور عیش وآرام کے ایسے اسباب مہیا کئے۔ جو اس سے پہلے کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے لیکن اسی کے ساتھ صنعتی انقلاب نے بڑی بڑی پیچیدگیاں بھی پیدا کر دیں۔ زندگی کا مادی پہلو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اور روحانی پہلو کی طرف سے لوگ غافل ہو گئے۔ کسب معاش کی کشمکش اس قدر ہو گئی کہ سکون و اطمینان کافور ہو گئے۔ اور مذہب کی کھیتی جو قلب مطمئن کی زمین پر سرسبز ہوتی ہے۔ مرجھا کر رہ گئی۔ زندگی کے ربط واتحاد کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ تمدن اپنے مختلف شعبوں میں بکھر کر رہ گیا۔ ایک شعبہ دوسرے شعبے سے بے تعلق ہو گیا۔ بے تعلقی سے اختلاف اور اختلاف سے مخاصمت تک نوبت پہنچی۔ اقتصاد سیاست سے دست و گریبان ہو گیا۔ آرٹ اور اخلاق میں لڑائی چھڑ گئی۔ علم نے مادی فلاح کا دامن تھام کر اور مقاصد زندگی سے قطع تعلق کر لیا۔ امیروں اور غریبوں سرمایہ داروں اور مزدوروں نے ایک دوسرے کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ غرض یہ اندیشہ پیدا ہو گیا۔ کہ کہیں یہ انتشار اجتماعی زندگی کے شیرازے کو توڑ کر مغربی تمدن کا خاتمہ نہ کر دے۔

اب اگر ہم اس زمانے کا مقابلہ شیکسپیر کے زمانے سے کریں تو صبح و شام، بہار و خزاں شباب و پیری کا فرق نظر آتا ہے کہاں نشاۃ ثانیہ کے آغاز کا جوش اور ولولہ اور کہاں انیسویں صدی کے آخر کی افسردگی اور بیدلی۔ کہاں وہ امید سے معمور عقیدۂ زندگی کہاں یہ یاس سے لبریز بے عقیدتی۔ کہاں وہ فطرت انسانی کی گود میں پلنے اور بڑھنے والی ہم رنگ اور ہم آہنگ

تہذیب کہاں یہ عقل اور سائنس کی زنجیروں میں جکڑا ہوا بے مرکز اور بے ربط تمدن۔ ظاہر ہے کہ شیکسپیر کا فلسفہ حیات (اگر محض سرور زندگی کو حیات کہا جا سکے) جس نے باد بہار کے آغوش میں پرورش پائی تھی خزاں کے دور کے لئے مناسب نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ قلب انسانی کے ان اسرار کا ترجمان ہے جو ہر قدم اور ہر دور کے لئے یکساں ہیں۔ لیکن جدید زندگی کے اکثر مسائل ایسے ہیں جن میں وہ رہنمائی نہیں کر سکتا۔ یہی حقیقت تھی۔ جسے برنارڈ شا نے انگریز قوم پر جو اپنی قدامت پرستی کی بدولت اب تک شیکسپیر کا کلمہ پڑھتی تھی، واضح کرنا چاہا۔ شیکسپیر کے شاعرانہ کمال کا وہ معترف ہو لیکن یہ کمال اُس کی نظر میں زیادہ وقعت نہیں رکھتا وہ افلاطون کی طرح شاعر سے معلم اخلاق کا کام لینا چاہتا ہے اور جو شاعر اس کام کا نہ ہو وہ اُسے کسی کام کا نہیں سمجھتا۔

شا محض نقاد نہیں بلکہ مصلح بھی ہے۔ اس نے شیکسپیر کے نصب العین کی جو اس کے نزدیک ناقص اور غلط ہے۔ تردید کرنے پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ اس کے مقابلے میں ابسن کا نصب العین پیش کیا جسے وہ عہد جدید کا ادبی پیغمبر سمجھتا ہے۔ ابسن کے پیغام کے صحیح نتائج سے اپنی قوم کو آشنا کرنا۔ برنارڈ شا کا سب سے بڑا تنقیدی کارنامہ ہے۔ اس زمانے میں انگلستان میں یہ غلط خیال پھیلا ہوا تھا۔ ابسن آسکر وائلڈ کی طرح محض جمالیات پرست شاعر ہے جو آرٹ کو اخلاق سے برتر سمجھتا ہے۔ شا نے لوگوں کو یہ سمجھایا کہ ابسن کی تصانیف اخلاقی روح اور اخلاقی جوش سے لبریز ہیں۔ البتہ اس کا نظریہ اخلاق عام روش سے علیحدہ ہے۔ یہ ناروے کا ڈراما نگار جس نے تمدن و معاشرت کی تنقید کو اپنا موضوع قرار دیا تھا۔ شا کے نزدیک انسانی زندگی کا سچا مفسر اور حقیقی معنی میں آرٹسٹ اور شاعر ہے اس سے وہ اس درجہ عقیدت رکھتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کا مقلد اور اپنی تصانیف کو اس کے فلسفۂ حیات کی تفسیر کہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس معاملے میں بہت حسن ظن سے کام لیتا ہے۔ ابسن میں اور اُس میں سوائے اس کے اور کوئی چیز مشترک نہیں کہ دونوں مروجہ رسوم و اخلاق

کے نقاد ہیں۔ اور انفرادی آزادی کے حامی۔ جب تک وہ محض تخریبی تنقید کرتا رہا۔ اس کے خیالات ابسن سے مشابہ رہے۔ لیکن جس دن اس نے ایک مستقل نصب العین زندگی کی تعمیر شروع کی۔ اُسی دن سے وہ ابسن کی راہ سے دور ہٹنے لگا۔ خیالات کے علاوہ طرز ادا اور اسلوب بیان کے اعتبار سے بھی ابسن اور شا میں بہت بڑا فرق ہے۔

ان تنقیدی مضامین کی بدولت جو اہل انگلستان کے عزیز ترین عقائد کی بنیاد کو ہلا رہے تھے، لوگ برنارڈ شا کے نام کے دشمن ہو گئے اور اس پر ہر طرف سے نفریں کی بوچھار ہونے لگی۔ یہی سبب ہے کہ جب اس نے خود تصنیف کے میدان میں قدم رکھا تو اس کی کتابیں عرصے تک رواج نہ پا سکیں۔ ابتدا میں چند ناول لکھے۔ لیکن اُسے بہت جلد محسوس ہو گیا کہ ادب کی اس صنف سے اس کی طبیعت کو مناسبت نہیں ہے۔ اس لئے اس نے ڈراما کو اختیار کیا۔ انگلستان کے ادیب اور نقاد تو اس سے جلے بیٹھے ہی تھے۔ اس کے پہلے ناٹکوں کے شائع ہوتے ہی ہر طرف سے اعتراضات کی باڑھ چلنے لگی۔ شا نے نہایت ہمت اور استقلال سے اس مخالفت کا مقابلہ کیا۔ اور رفتہ رفتہ لوگوں کے تعصبات پر فتح پا کر بہتوں کو اپنا ہم خیال اور قریب قریب سب کو اپنا قدر دان بنا لیا۔ ہم آئندہ صفحات میں اس کے ڈراما اور اس کے فلسفیانہ خیالات کی نشو و نما کسی قدر تفصیل سے دکھائیں گے۔

افلاس ہند

اور

جدید معاشیاتی تحقیقات

مسئلہ افلاس ہند کی اہمیت   ہندوستان کے معاشی مسائل میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ مشکل مسئلہ ہماری قدیمی غربت کا ہے۔ اس مسئلہ کی تحلیل میں نہ صرف ہندو مسلمان پارسی عیسائی کوشاں رہے بلکہ ایک حد تک عہدیداران سلطنت نے بھی حصہ لیا ہے۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں جس کی تحلیل صرف "نظری احباب علم" کو مطلوب ہو بلکہ اس کی صحیح تحلیل پر ہماری قومی عمرانی سیاسی اور تمدنی ترقی کا دار و مدار ہونیکے باعث (کیونکہ معاشی ترقی کے بغیر سیاسی یا سماجی ترقی ناممکن ہے) عملی اعتبار سے رہبران قوم و ملت بھی اس جانب متوجہ نظر آتے ہیں۔ اس مسئلہ کی عملی اہمیت اس درجہ ہے کہ اس کی خاطر خواہ حل ہونے یا نہ ہونے پر ہندوستان کی ایک تہائی آبادی کی زندگی کا دار و مدار ہے، کیونکہ ہندوستان میں افلاس کی ہمہ گیری کا یہ حال ہے کہ کم و بیش دس کروڑ انسان معاشی اعتبار سے مفلس ہیں، نہ انکے پاس رہنے کو مکان ہے، نہ پہننے اوڑھنے کو کپڑا، اور نہ کھانے کے لئے کافی صحت بخش غذا۔

ہندوستان دنیا کا غریب ترین ملک ہے پست معیار زندگی، بیماریوں کی کثرت، وباؤں کا وجود اور قحطوں کی شدت حقیقۃً افلاس کے نتائج اور یہاں کی عام غربت کا بین ثبوت ہیں۔ اگر ہندوستان اس درجہ مفلس و نادار نہ ہوتا، تو یہاں نہ وباؤں کا وجود ہوتا، اور نہ بیماریوں کی کثرت ہوتی۔ معیار زندگی بھی اس درجہ پست نہ ہوتا اور قحطوں کا واقع ہونا ایک امر محال ہو جاتا۔

ہندوستان کی اس انتہائی غربت کے اسباب پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے

اسباب ایک دو نہیں بلکہ متعدد ہیں اور ہندوستانی معاشی زندگی کے ہر شعبہ میں کوئی نہ کوئی خرابی ہو۔ اگر ہم تشبیہ کو موزوں خیال کریں تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہندوستان کے معاشی جسم میں صرف ایک ہی شکایت ہو (مثلاً گردوں کی شدید بیماری) جس کا علاج ناممکن ہے اور بقیہ اعضاء بدن اپنی ذات سے تو تندرست ہیں مگر گردوں کی شکایت کی وجہ سے قدرتی طور پر جسمانی صحت کو برقرار رکھنے سے معذور۔ ہندوستان کی حالت اُس مریض کی سی ہے جو سدا کا روگی، اور ہمہ قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو۔ جس کے بدن پر جا بجا بیماریوں کے آثار نمایاں ہوں اور جسمانی غلاظت کے باعث جلدی بیماریوں میں مبتلا ہو۔ طبی معائنہ سے پتہ چلتا ہے کہ اندرون جسم میں بھی خرابیاں موجود ہیں۔ فاقہ کرتے کرتے مریض میں سکت باقی نہیں رہی، خراب غذائیں کھانے سے عام صحت تباہ ہو گئی۔ جسم اچھی طرح نشو و نما نہ پا سکا۔ الغرض کئی خرابیاں ہیں۔ قابل اطمینان امر یہ ہے کہ ظاہر حالت چاہے کتنی ہی یاس انگیز کیوں نہ ہو مریض لاعلاج نہیں ہو بشرطیکہ وہ خود معالجہ کے لئے آمادہ ہو جائے اور اُسے کوئی عمدہ طبیب مل جائے۔ دیکھ بھال خاطر خواہ طور پر ہو، اور غذا صحت بخش ملے تو ابھی مریض ایک طاقتور انسان بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کا حال بھی ایسا ہی ہے جس کی معاشی زندگی گوناگوں اسباب کے باعث تباہ ہوتی جا رہی ہے۔ مرض اگرچہ کہنہ ہے، ظاہر حالت خراب ہے لیکن علاج ممکن ہو، اور صحت یاب ہونے کی پوری توقع۔

مسئلہ افلاس ہند کی نوعیت معاشی نقطۂ نظر سے ہندوستان سے دو بڑی شکایتیں ہیں اول تو یہ کہ ہندوستان باوجود استطاعت کے موجودہ ضروریات کے لئے جس قدر معاشی دولت درکار ہے وہ پیدا ہی نہیں کرتا یعنی پیدائش کی کمی (underproduction) ہندوستان کی غربت کا ایک سبب ہو، دوسری شکایت یہ ہے کہ ہندوستان کی معاشی دولت مقابلۃً ادنےٰ قسم کی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے اندرونِ ملک اس کی قدر نہیں بڑھنے پاتی اور بین الاقوامی بازاروں میں ہندوستانی پیداوار ادنےٰ ہونے کے باعث دوسرے ممالک کی پیداوار کا مقابلہ نہیں کر سکتی یا نیز اسکی قدر کم ہوتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو کہ تبادلہ میں کمتر معاشی دولت ہندوستان کے

حصہ میں آتی ہے، بالفاظ دیگر ہندوستان کو اپنی محنت کا معاوضہ کم ملتا ہے۔ مثال کے طور پر
کپاس اور گیہوں کے بازار پر غور کیجئے۔ مصر اور ممالک متحدہ امریکہ کی کپاس کے سامنے ہندوستان
کی کپاس ادنےٰ قسم کی تصور کیجاتی ہے کیونکہ مقابلہ مصری یا امریکی روئی کے ہندوستانی روئی سے
مضبوط دھاگا تیار نہیں کیا جاسکتا۔ حالانکہ ہندوستان میں قدرتی حالات روئی کی کاشت کے
لئے بہت موزوں ہیں۔ برار کی آب و ہوا اور وہاں کی کالی زمین روئی کی کاشت کے لئے اس
درجہ موزوں ہیں کہ ماہرین زراعت اس کو زریں تصور کرتے ہیں۔ روئی سے بدتر حال گیہوں کا
ہے۔ پنجاب جیسا صوبہ رکھتے ہوئے ہندوستان میں اسی سال سے کناڈا سے گیہوں بھی درآمد
ہونا شروع ہوا ہے۔ بادی النظر میں یہ بات سخت تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف تو ہندوستان
گیہوں کی درآمد کرتا نظر آئے اور دوسری طرف خود بہت سا گیہوں دوسرے ممالک کو بھیجنے میں پیش
پیش ہو۔ یہی حال خام روئی۔ دھاگے۔ کپڑے کوئیلے وغیرہ کا ہے یعنی ہندوستان خام روئی۔
دھاگا۔ کپڑا۔ کوئیلہ منگاتا بھی ہے اور بھیجتا بھی ہے۔ اس معمے کی تحلیل کیا ہے؟ تحقیق سے پتہ چلا کہ
ہندوستان میں گیہوں، کوئیلہ وغیرہ جو باہر سے منگائے جاتے ہیں اعلےٰ قسم کے اور دیسی گیہوں
کوئیلہ وغیرہ متوسط یا ادنےٰ قسم کے ہوتے ہیں یا کم از کم بہترین نہیں ہوتے۔ چونکہ ہر ملک کو
ایک ہی چیز کے مختلف اقسام کی ضرورت پڑتی ہے ایک ہی چیز کے مختلف اقسام کی درآمد و برآمد
ہونے لگی ہے۔ چنانچہ ڈاک گاڑیوں کے لئے عمدہ قسم کا کوئیلہ، قیمتی اور پائیدار کپڑوں کے لئے
عمدہ قسم کی روئی۔ عمدہ روٹیوں کے لئے اعلیٰ قسم کا گیہوں، یہ اور اسی قسم کی چیزیں باہر سے منگائی
جاتی ہیں، اور ہندوستان سے متوسط اور ادنےٰ قسم کا مال دوسرے ممالک کے متوسط اور ادنےٰ
طبقہ کے لوگوں کے لئے بھیجا جاتا ہے، زرعی پیداوار کے لئے اگر چند دن اور یہی لیل و نہار رہے
تو ہندوستان صرف متوسط اور ادنےٰ درجہ کی زراعتی پیداوار کے لئے تمام دنیا میں مشہور بلکہ بدنام
ہوجائے گا۔ اور پھر اسکی پیداوار کی قدر بین الاقوامی بازاروں میں اور بھی گھٹ جائیگی۔
پیداوار کی عمدگی کا تو یہ حال تھا اب مقدار پیداوار کا حال جیسا کچھ ابتر ہے اسکا اندازہ

حسب ذیل نقشوں اور تشریحوں سے بخوبی ہو سکتا ہے :-

ہندوستان کی زراعتی اجناس میں سب سے زیادہ اہمیت چاول کو حاصل ہے جس کی کاشت کے لئے بعض حصص ہند کی آب وہوا اور زرخیز سرزمین خاص طور پر موزوں ہے۔ باوجود اس کے جو کچھ مقدار ہم حاصل کرتے ہیں وہ نسبتۃً نہایت قلیل ہے جو اس نقشہ سے عیاں ہے[1]۔

نام ملک	سال	رقبہ کاشت ہیکٹر	مقدار پیداوار (ڈوبل کینٹلز) بحیثیت مجموعی	مقدار پیداوار (ڈوبل کینٹلز) فی ہیکٹر
ہسپانیہ	۱۹۲۴	۴۶،۹۶۳	۲۹،۵۵،۵۳۳	۶۲٫۹
اطالیہ	۱۹۲۴	۱،۳۷،۵۰۰	۵۹،۰۹،۰۰۰	۴۳٫۰۰
ہندوستان	۱۹۲۴	۳،۲۶،۰۷،۰۹۱	۴۸،۵۰،۶۰،۰۰۰	۱۴٫۹

یعنی فی ہیکٹر ہسپانیہ میں ۶۲، اطالیہ میں ۴۳ ڈوبل کینٹلز[2] پیدا ہوتے ہیں تو ہندوستان میں صرف ۱۴۔

اسی طرح گیہوں کی مقدار پیداوار بمقابلہ غیر ممالک کے ہندوستان میں بہت قلیل ہے چنانچہ سرکاری اعداد وشمار سے پتہ چلا کہ فی ہیکٹر بلجیم میں ۲۶، برطانیہ عظمیٰ میں ۲۲ اور ہندوستان میں صرف ۸ ڈوبل کینٹلز پیدا ہوتا ہے۔

ہندوستان کی زرعی پیداوار کی قلت کا ایک مزید ثبوت کپاس کی پیداوار سے حاصل ہوتا ہے :-

---

(۱) ماخوذ از "بین الاقوامی سالنامہ زرعی اعداد وشمار برائے ۱۹۲۶-۲۷ء مطبوعہ روم صفحہ ۱۲۰ جو سرکاری بین الاقوامی زرعی ادارہ کے دفتر سے شائع کیا جاتا ہے۔

(۲) ڈوبل کینٹلز بین الاقوامی پیمانۂ مقدار

نام ملک	سال	رقبہ کاشت	حاصل پیداوار	
			بحیثیت مجموعی	بحساب فی ہیکڑ
مصر	۱۹۲۴-۲۵	۷،۵۱،۰۳۷	۳۱،۸۹،۸۸۸۸	۴ر۲
اطالیہ	۱۹۲۴-۲۵	۲ر۵۰۰	۹ر۸۰۰	۳ر۸
ہندوستان	۱۹۲۴-۲۵	۱،۰۷،۰۸،۲۰۰	۱،۰۹،۹۹،۲۰۰	صرف ۱

ان نقشوں سے ظاہر ہے کہ ہندوستانی کسانوں کو جس قدر مقدار پیداوار حاصل ہوتی ہے اُس سے دوگنی تگنی بلکہ چارگنی مقدار غیر اقوام کے کسانوں کو حاصل ہوتی ہے جب کمی پیدائش (over production) کا یہ حال ہے تو قوم کس طرح مادی مرفہ الحالی حاصل کر سکتی ہے!

بہرطور یہ ثابت ہوا کہ ہندوستان اول تو دولت بہت کم پیدا کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ ہندوستانی پیداوار عمدہ یا بہتر قسم کی نہیں ہوتی۔ مسئلہ افلاس ہند اس وقت تک حل نہیں ہوسکتا جبتک کہ یہ دونوں خرابیاں دور نہ کیجائیں۔ مگر ان خرابیوں کو دور کرنا آسان نہیں ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ہماری معاشی و عمرانی اور سیاسی پالیسی میں اہم تغیرات واقع ہوں یعنی یہ کہ ہماری تمدنی زندگی از سر نو ترتیب دیجائے۔ اس کے لئے ہمیں سب سے زیادہ جس عامل پیدائش کی ضرورت ہے وہ تنظیم ہے۔ بغیر اعلےٰ تنظیم کے ہماری حالت درست ہونا تو ایک طرف اندیشہ ہے کہ حالت بد سے بدتر نہ ہوجائے۔

چونکہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور اُس کی دوتہائی آبادی زراعت پیشہ ہے اس لئے یہاں کی معاشی ترقی اور مادی مرفہ الحالی کا دارومدار زیادہ تر زرعی ترقی پر ہے یعنی بغیر زراعتی ترقی کے صنعتی۔ معاشی۔ سیاسی۔ سماجی ترقی ناممکن ہے۔ اور زراعت میں کمی پیدائش اور ناقص پیداوار کی شکایت اس وقت تک دور نہیں ہوسکتی، جبتک کہ عملی زراعتی تعلیم نہ دیجائے۔ مصنوعی کھاد کا استعمال نہ ہو اور انجمنہائے امداد باہمی کے ذریعہ عمدہ تخم کم سودی قرضہ کا انتظام نہ کیا جائے۔ اپلوں کو جلانے کی عادت ترک نہ کیجائے۔ جس کے لئے سستی

لکڑی کا فراہم کرنا بھی ضروری ہے جو اس وقت تک ناممکن ہے جبتک کہ نئے جنگلات کا انتظام نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ (Afforestation) کا کام سوائے حکومت کے اور کوئی نہیں کرسکتا۔ اسی طرح قوانین وراثت، طریق تقسیم زمین، قوانین سود دربا، انتظام آبپاشی طریق بندوبست اور طریق ٹیکس میں اہم تبدیلیوں کی شدید ضرورت ہے۔

موجودہ صورت میں انکا ہندوستانی معاشی حالات پر کیا اثر پڑتا ہے اور یہ کس درجہ ہندوستانی غربت کا باعث ہیں اسکا تصور اس طرح سے بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ رومیش چندر دت جیسے محقق معاشیات ہند، سرکاری طریق بندوبست کو ہندوستان کی اہم ترین و بدترین وجہ افلاس خیال کرتے تھے، کیونکہ اس طریق کے بموجب زمین کی ملکیت نصف سرکاری اور نصف کسان کی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے دونوں میں سے کوئی بھی زمین کی حقیقی پرواہ نہیں کرتا اور یہ نفس انسان کی فطری خاصیت ہے کہ وہ دوسروں کے لئے محنت ومشقت کرنا پسند نہیں کرتا۔ چونکہ یہاں لوگوں کو زمین پر مطلق حق مالکانہ حاصل نہیں ہے اس لئے وہ پوری محنت و جانفشانی سے کام نہیں کرتے، اور نہ اپنا سرمایہ اس پر خرچ کرتے ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر دت موجودہ طریق بندوبست کو بدترین وجہ افلاس سمجھتے تھے[۱]۔

غرضیکہ جس وقت معاشی جدوجہد کے ساتھ ساتھ تعلیمی، سماجی اور سیاسی کوششیں کیجائیں گی تب ہی ہندوستان میں زرعی پیداوار زیادہ اور بہتر دستیاب ہوگی۔

تنظیم کے خصوصیات میں پیش بینی، مردم شناسی، معاملہ فہمی، موقع شناسی اپنی اور دوسروں کی احتیاجات کی کم وبیش صحیح اندازہ کرنیکی قابلیت سب ہی داخل ہیں۔ ملک میں یا تنظیم اعلیٰ ہوگی تو لامحالہ حکومت وقت کو پیداوار کی اغراض کے لئے محنت کروانے کا خیال ہوگا۔ وہ

---

(۱) وضاحت و مکمل بحث کے لئے دیکھئے "معاشی تاریخ" (بالخصوص ابواب متعلقہ طریق بندوبست) از رومیش چندر دت مطبوعہ کیگان پاؤل (لندن)

ڈرانے دھمکانے کے لئے زائد فوج (superfluous army) نہیں رکھے گی، بلکہ انہیں قوتوں کو نئے جنگلوں کے قائم کرنے، آبپاشی کا انتظام کرنے، زراعتی علمی درسگاہوں کے افتتاح کرنے نمائشی کھیت وغیرہ قائم کرنے میں صرف کرے گی۔

ہندوستان میں افلاس کے جسقدر وجوہ ہیں مثلاً ذات پات کا طریق، مشترکہ خاندانی زندگی مروجہ پردہ، بچپن کی شادی، قریبی رشتہ داروں کی شادی، رسومات میں بے دریغ فضول خرچی، اصول حفظان صحت سے عدم واقفیت، علمی وعلمی وفنی، زراعتی اور تجارتی ناواقفیت، عام جہالت، صنعت وحرفت کی تباہی، پیشیوں کی کمی، اضافی کثرت آبادی، رفتار اضافہ آبادی اور رفتار پیدائش دولت میں نامناسبت، قدیم طریق کاشت، زمین کی تقسیم، فرسودہ طریق تجارت، قدامت پرستی، پست ہمتی، تنگ خیالی، جھوٹی قناعت، بیجا سخاوت، غیر معاشی ذہنیت، آبپاشی کا ناکافی اور ناقص انتظام، غیر پیداآور قرضہ کی بہتات مہاجنوں کی رباخوری، عام گرانی، افواج پر بیکار خرچ، سرکاری بے توجہی وعدم سرپرستی، سب کے سب درحقیقت ہندوستانی معاشی، سماجی اور سیاسی بدنظمی وبدانتظامی کا نتیجہ ہیں۔

اگر ہندوستان میں زرخیز زمینیں اور کارآمد دھاتیں نہ ہوتیں۔ اگر ہندوستانیوں میں اکتساب علم وہنر کی قدرتی قابلیت نہ ہوتی تو ہم کہہ سکتے تھے کہ یہ غربت قدرتی اسباب کا لازمی نتیجہ ہے مگر یہ حقیقت نہیں ہے ہندوستانیوں میں علم وہنر بھی ہے اور اکتساب علم وہنر کی قدرتی صلاحیت بھی اور انہیں قدرت کی فیاضی کی بدولت اس قدر چیزیں بھی دستیاب ہیں، کہ جابجا دولت پیدا کر سکتے ہیں۔ ہمیں جس چیز کی معاشی دولت کو حاصل کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ درحقیقت تنظیم ہے۔

انسان میں اگر تھوڑی سی ہمت ہو، مستقل مزاجی ہو، مستعدی ہو، جفاکشی ہو، اور دوراندیشی ہو تو وہ تمام ضروری چیزیں اکٹھا کر سکتا ہے۔ جو معاشی ترقی کے لئے لازمی ہیں۔ معاشین ابتک اس غلط فہمی میں تھے کہ عاملین پیدائش صرف تین ہیں یعنی قدرت (زمین) محنت اور

سرمایہ (اصل) مگر جدید ترین معاشی تحقیقات نے بالکل بجا طور پر چوتھے عامل پیدائش کا انکشاف کیا جسے تنظیم کہتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں بعض معاشئین شکایت کرتے ہیں کہ ہندوستان میں سرمایہ نہیں ہے جبکہ ملک میں کروڑھا روپیہ اب بھی بیکار پڑا ہو تو ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ملک میں "سرمایہ" نہیں سرمایہ نہ ہونے کے کیا معنی؟ اگر ملک میں ایسی دولت موجود ہو جو مزید دولت پیدا کرنے کے لئے استعمال کیجا سکے تو یہ بے معنی ہے کہ ملک میں "اصل" نہیں دولت کو اصل اور اصل کو دولت بنانا انسان کا کام اور تنظیمی قابلیت کا معمولی کرشمہ ہے اگر ہندوستان میں دولت ہی نہ ہوتی جو بطور سرمایہ کے مستعمل ہو سکے تو یہ کہنا بجا ہوتا کہ ہندوستان میں سرمایہ کی قلت ہے۔ موجودہ زمانہ میں دولت تو ہے مگر دولت کو اصل بنانے والے موجود نہیں۔ اگر منتظمین ملجائیں تو آسانی سے حسب ضرورت سرمایہ دستیاب ہو سکتا ہے وہ اس طرح کہ دو چار منتظمین مل کر چار پانچ ہونہار ہستیوں کو اپنے کاروبار کے متعلق اطمینان دلائیں اور انہیں آمادہ کر کے انکے اور اپنے نام سے کمپنی جاری کریں۔ جب پبلک کو ترغیب دلائی جائے گی اور لوگوں کو یقین دلایا جائے گا تو وہ آپ ہی کمپنی کے حصے خریدا کریں گے۔ جب ایک کمپنی ایمانداری اور دیانت داری سے کام کرے گی تو لوگ دوسری کمپنی کے قیام پر اس کی بھی امداد کریں گے۔ جس قدر ہوشیاری اور ایمانداری سے کام کیا جائے گا اسی عشرت سے ہندوستانی دولت بطور سرمایہ کے کاروبار کے لئے فراہم ہوتی رہے گی۔ اگر اب بھی لوگ اپنے اندوختہ کو بطور سرمایہ کے استعمال کرنے سے ہچکچاتے ہیں اور دفینوں اور سونے چاندی کے زیورات کو اصل پر ترجیح دیتے ہیں تو یہ انکی نادانی نہیں بلکہ عین مصلحت ہے۔ ہندوستان کے گذشتہ ساٹھ ستر سالہ کاروباری تجربات نے اسکا کافی ثبوت پیش کر دیا ہے کہ بے دریغ ہر کمپنی کے حصے خریدتے رہنا عین نادانی ہے۔ کیونکہ کمپنی کے بہانے سے پبلک کو لوٹ کر کھا نیوالے بالخصوص ہندوستان میں اب بھی بہت ہیں۔

ہندوستانی سرمایہ کی قلت ایک بدیہی ثبوت ہے کہ ملک میں اعلیٰ درجے کے معاشی

منتظمین کافی تعداد میں موجود نہیں۔ اگر منتظمین ہوتے تو ضرور کمپنیوں کے ذریعہ ملک کی صحیح ضروریات کے پورا کرنے میں مدد دیتے۔

تنظیم جب اعلیٰ ہوتی ہے تو کاروبار بیشتر صورتوں میں اعلےٰ ہوتا ہے۔ کیونکہ اعلیٰ تنظیم کو بہترین کام کرنیوالے بھی ملجاتے ہیں، اور یہ اتفاق نہیں بلکہ حالات کا قدرتی نتیجہ ہے۔ ذرا غور کر کے دیکھئے کہ ایک اعلیٰ منتظم بحیثیت مردم شناس ہونے کے کس طرح عزیز و اقارب، دوست احباب، محلہ والوں، ملاقاتیوں میں سے چن چن کر بہترین لوگوں کا انتخاب کرتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ ہر شخص سے اس کی قابلیت کے موافق کام لیتا ہے، نپولین کا قول ہے "بعض اشخاص ہیں جو ناگر چلاتے ہیں جنہیں سیاسی عہدوں پر ہونا چاہئے تھا۔ اور بعض وزراءہیں جو ہل جوتتے اور پانی دینے ہی کے لئے موزوں ہیں۔"(۱)

جہاں تنظیم اعلےٰ ہوتی ہے وہاں ہر شخص سے اُس کی قابلیت و استطاعت کے موافق بہترین کام لیا جاتا ہے، اور اس طرح اجتماعی حیثیت سے کام بخوبی انجام پاتا ہے۔

جہاں عمدہ تنظیم ہوتی ہے وہاں فضولخرچی نہیں ہوتی بلکہ کفایت، لاپرواہی نہیں ہوتی بلکہ احتیاط، بے قاعدگی نہیں ہوتی بلکہ ضابطہ۔

ہندوستان میں ایسے ہی اعلیٰ قسم کے منتظمین کی کمی ہے جس کی وجہ سے عوام الناس ابتک اپنے اندوختوں کو معاشی ضروریات کے لئے پیش کرنے میں پس وپیش کرتے ہیں، اور یہ اُنکی لاعلمی اور بیوقوفی نہیں بلکہ تلخ تجربوں کا نتیجہ ہے۔ ہندوستانی معاشی زندگی کے کسی شعبہ پر نظر دوڑائیے۔ آپ ہمیشہ یہی پائیں گے کہ بدنظمی اور بدانتظامی کی وجہ سے قدرتی دولت بیکار ضائع جارہی ہے۔

جن لوگوں کو ممالک محروسۂ سرکار نظام کے معاشی جغرافیہ سے واقفیت ہے، وہ

---

(۱) ماخوذ از "اقوال نپولین" مطبع فائیلر لائپزگ: صفحہ ۵۷

جانتے ہیں کہ ضلع محبوب نگر میں لکھو کھا خود رو شریفہ کے درخت موجود ہیں، جن کا پھل نہایت شیریں ہوتا ہے اگر منتظمین ہوتے تو وہ تحقیقات کرواکر خود اطمینان حاصل کر سکتے تھے۔ کہ ان پھلوں سے شکر کیوں نہ نکالی جائے، اور وہ کس طرح نکالی جاسکتی ہے چند ماہرین کو بلاکر شکرسازی کا کارخانہ قائم کرکے۔ ملکی صنعت کو فائدہ پہنچانا، عمدہ قسم کی شکر تیار کروانا، ماہرین کے لئے پیشہ، مزدوری کے لئے محنت کے مواقع، حصہ داروں کے لئے منافع اور اپنے لئے وسیلہ آمدنی مہیا کرنا، یعنی ذاتی منفعت کے ساتھ ملک وملت کی خدمت کرنے کا بہترین موقع حاصل ہے، کیا حیدرآباد میں اس قدر دولت نہیں جو بطور سرمایہ کے مستعمل ہوسکے؟ کیا یہاں ماہرین وفردور موجود نہیں؟ ضرورت ہے تو صرف منتظمین کی جو ان سب کو یکجا فراہم کرسکتے ہیں۔ اگر بالفرض تصور کرلیا جائے کہ فی الحال شکرسازی کے ماہرین دستیاب نہیں ہو سکتے تو کیا لوگوں کو آسانی شکرسازی کی تعلیم نہیں دلوائی جاسکتی؟ یا یہ کہ باہر سے دو تین ماہرین زیادہ تنخواہ پر نہیں بلائے جاسکتے؟ اب رہا سیاسی دقتوں مجبوریوں کا سوال تو یہ بھی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ برخلاف برطانیہ ہند کے دیسی ریاستیں اپنے یہاں صنعت وحرفت کو زیادہ فروغ دے سکتی ہیں برطانوی ہند میں لوگ براہ راست انگریزوں کے دست نگر ہیں اور بغیر سرکاری اجازت و ہمدردی و سرپرستی کے قومی صنعت کو فروغ نہیں دے سکتے، برعکس اس کے دیسی ریاستیں (کم ازکم بڑی بڑی دیسی ریاستیں) اندرونی معاملات سلطنت میں آزاد ہیں اور جس طرح ہماری ریاست قومی ادبیات و اسلامی اداروں کی فیاضی سے امداد کرتی ہے اسی طرح وہ قومی صنعت وحرفت کو بھی مدد پہنچا سکتی ہے (اور شاذ و نادر مدد پہنچانے میں دریغ نہیں کرتی)

اسی طرح ممالک محروسہ سرکار عالی میں سرکاری بنک کی سخت ضرورت ہے ریاست کے مالی کاروبار قریب قریب سب غیر بنکوں کے توسط سے کئے جاتے ہیں اور غیر لوگ لکھوکھا روپیہ کا منافع صرف ریاست کے اندرونی کاروبار سے حاصل کرتے ہیں۔ اور ہم ہیں کہ اپنی دولت کو دفن کئے ہوئے ہیں یا یہ کہ لکھوکھا روپیہ کا زیور بناکر اپنے بیوی بچوں کے گلے اور ہاتھوں میں ڈالے ہوئے

ہیں۔ یہ معاشی غلامی کے طوق وسلاسل ہمارے غیر تربیت یافتہ دل و دماغ کو حسن و خوبصورتی بڑھانے والی، بیوی بچوں کو خوش کرنے والی اور لبھانے والی چیزیں نظر آتی ہیں سرکاری بنک اور پھر رفتہ رفتہ اس کی شاخیں قائم ہونے سے ملک کے ہونہار طالبعلموں کو پیدا آور کام کرنے کا موقع ملے گا۔ سرکاری وظائف سے تعلیم یافتہ ماہرین بنک اور جامعہ عثمانیہ کے طلبہ معاشیات و مالیات بیسیوں اسی بنک اور اس کی شاخوں میں کھپائے جا سکتے ہیں اور پھر یہ نوکریاں ایسی ہوں گی جن سے سرکاری خزانہ پر مطلق بار نہیں پڑے گا کیونکہ چند سال کے وقفہ کے بعد سے رفتہ رفتہ تمام اصل مع سود کے واپس ملجائے گا۔ اور پھر بعد کو مستقل آمدنی وصول ہوتی رہے گی جس سے سرکاری آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ لوگوں کو بیکار مضر اخلاق پر خطر بھدے زیورات اور دفینوں کے بجائے مستقل آمدنی حاصل ہوگی ہندوستانی علمی فورڈ کمپنیوں کے طلبہ ہی سرکار کا نفع بخش کام کریں گے۔ بیسیوں تعلیم یافتہ لوگوں کو نوکریاں ملیں گی اور باوجود ان تمام باتوں کے سرکار کو فائدہ حاصل ہوگا۔ اور اس طرح یہ یک کرشمہ دو کار نہیں بلکہ دس کام انجام پائینگے۔

یہ کام امکان سے خارج نہیں مگر اس کی اولین و اہم ترین شرط اعلیٰ تنظیم ہے کیونکہ تنظیم اعلیٰ نہ ہوگی بنک کے ڈائرکٹر واقف کار دیانتدار معاملہ فہم نہ ہونگے تو یہی ذریعہ جو ملکی مرفہ الحالی میں اضافہ کر سکتا ہے۔ قومی تباہی و بربادی کا ذریعہ بن جائے گا۔

بہرطور جدید ترین معاشیاتی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی غربت کا باعث ہندوستان کے سیاسی حالات ہی نہیں بلکہ خود ہندوستان کی ذہنیت عدم فعلیت اور لاپروائی ہے پس ہر وقت انگریزی حکومت کو اپنی تباہی کا باعث قرار دینا اور ہر ناکامی کا حکومت وقت کو ذمہ دار ٹھیرانا سراسر غلطی ہے ہم جب ہندوستان کے غربت کے مسئلہ پر اس نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں تو ہمیں یقین ہوجاتا ہے کہ ہندوستان کی نصف غربت کے جوابدہ خود ہم ہیں اور ہم اپنی ذاتی کوشش سے اعلیٰ تنظیم کے ذریعہ اس غربت کو دور کر سکتے ہیں۔

بنگال سے لیکر سندھ و شمالی مغربی سرحد تک اور لنکا سے لیکر کوہ ہمالیہ تک آپ

جہاں جائیں گے اور ٹھیٹ ہندوستانی کارخانوں اور دوکانوں کا انتظام دیکھیں گے تو آپ کو مشکل سے ایک فیصدی کارخانوں اور دوکانوں میں اعلیٰ تنظیم نظر آئے گی۔ زیادہ تر آپ کو ایسے مالکان کارخانہ جات اور دوکانات ملیں گے جو پیٹ بھر روٹی کمانے کی خاطر اور بڑے بھلے طریق پر گذر کرنے کے لئے اوچاٹ دل سے بے ضابطہ اور بے قاعدہ طور پر کاروبار چلاتے ہیں ان کے دلوں میں معاشی ترقی کی امنگ نہیں اور اگر معاشی ترقی مطلوب بھی ہو تو اس کے لئے باقاعدہ اور باضابطہ طور پر کوشش کرنا نہیں جانتے اور اگر کوشش کرتے بھی ہیں تو دو چار مرتبہ کے بعد اپنی پست ہمتی کے بدولت مایوس ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہ جاتے ہیں ہم میں جفاکشی، مستقل مزاجی، اور صبر و استقلال نہیں اور ہمارے ہی اس قصور کی بدولت ہندوستان میں اس قدر غربت پائی جاتی ہے۔

ہندوستان کے مسئلہ افلاس کے حل کرنے کی جو کچھ تدبیر ہو اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہماری اہم ترین اور اولین ضرورت اعلیٰ تنظیم ہے اور اعلیٰ تنظیم کی شدید کمی افلاس ہند کی بدترین وجہ ہے۔

اسراف اور مسئلہ افلاس | جدید معاشیاتی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ فضول خرچی دو قسم کی ہوتی ہے جن کو ہم مطلق اسراف اور اضافی اسراف کہہ سکتے ہیں اور جن کی نوعیت یہ ہے کہ اول الذکر کو آخر الذکر حقیقی معنوں میں اسراف ہی مطلق اور اضافی اسراف کے معنی ایک مثال سے بخوبی ذہن نشین ہو سکتے ہیں فرض کیجئے کہ ایک نواب زادہ ہے جس کی ماہانہ آمدنی دو ہزار روپیہ ہے اور جس کی کل جائداد ایک لاکھ کے قریب ہے اگر یہ شخص محض شان و شوکت کے اظہار کی خاطر اپنے آبائی مکان کو چھوڑ کر کسی عالیشان کوٹھی میں کرایہ پر رہے دو دو موٹریں دس پندرہ خدمتگار رکھے سیر و تفریح اور آسائشی چیزوں کی خرید و فروخت میں بے دریغ لٹائے تو کوئی نہیں کہے گا کہ اس طرح گھر پھونک کر تماشہ دیکھنا اور اپنی حیثیت و آمدنی سے کہیں زیادہ خرچ کرنا اعلیٰ معیار زندگی کا تقاضہ اور دانشمندی کی دلیل ہے یہ سراسر فضول خرچی ہے انسان کو چاہئے

کہ اپنے سرمایہ کو محض پیدا آوار اغراض کے لئے استعمال میں لائے اور صرف آمدنی کو صرف کیا کرے ، اگرچہ یہ علم مرفہ الحالی کا مسلم الثبوت نظریہ ہے مگر اسکا انطباق افراد تک محدود ہے۔ اقوام پر لازمی نہیں اس قسم کی فضول خرچی کو اصطلاحی زبان میں اضافی اسراف کہتے ہیں کیونکہ اس طرح سے ایک کو نقصان ہے تو اُسی نسبت سے دوسرے کو فائدہ بھی ہوتا ہے۔ یعنی مثال بالا میں کوٹھی والے کو کرایہ کار دالے کی بگری اسیر و تفریح سے ہوٹل والوں ریلوں وغیرہ کو فائدہ اسائشی سامان بنانے اور بیچنے والوں کو منافع حاصل ہوتا ہے ، گویا ایک کے نقصان کی تلافی دوسروں کے نفع سے ہوجاتی ہے اور قومی معاشیاتی نقطۂ نظر سے مجموعی دولت کم نہیں ہوتی اس حقیقت کو معاشیات کے سب سے پہلے محقق آدم اسمتھ نے ہی کچھ کچھ پہچانا تھا وہ اپنی مشہور و معروف کتاب رماہیت و اسباب دولت اقوام) میں کہتا ہے کہ ، کہ دنیا کی بڑی بڑی قومیں انفرادی اسراف و عیش پرستی سے مفلس نہیں ہوتیں ،، مگر اسراف کی دوسری قسم وہ ہو ،جس سے ایک کو تو نقصان پہنچتا ہے ، مگر دوسرے کو یا تو فائدہ ہی نہیں ہوتا یا اُسی نسبت سے فائدہ نہیں ہوتا قدرتی اور قومی دولت بلا وجہ بیکار رجاتی ہے مثلاً محبوب نگر کے شریفے ہمالیہ کے آبشار (جن سے اگر جدید طریق سائنس کے مطابق قوت برقی پیدا کی جائے تو دولت کے دریا بہہ نکلیں لاکھوں بلکہ کروڑھا روپیہ کی آمدنی ہو[1]) وسطی ہند میں ۔ اور ہمالیہ کی وادیوں میں توسیع کاشت کی اب بھی بہت گنجائش باقی ہے جنوبی ہند اور دکن مین اگر آبپاشی کا انتظام کر دیا جائے تو لکھوکھا ایکڑ زرخیز زمین جو اب بیکار پڑی ہوئی ہے زیر کاشت آتی ہے اسی طرح شہروں کے قرب وجوار میں بہت سی زمینیں بیکار پڑی رہتی ہیں حالانکہ وہاں ترکاری کی کاشت اور میووں کے باغ لگانے سے ملکی معاشی دولت میں معتدبہ اضافہ ہوسکتا ہو۔

محض معاشی زندگی میں ابتری ہونے کے باعث ان قدرتی ذرائع دولت کی پرواہ نہیں

---

(۱) ماخوذ از معیشت الہند مصنفہ پروفیسر الیاس برنی مطبوعہ جامع عثمانیہ پریس حیدر آباد دکن صفحہ ۱۹ و ۲۰

کی جاتی اور قوم کی دولت بیکار رائگاں جاتی ہے۔ پھل سڑ سڑ کے گلجاتے ہیں۔ آبشاروں کا پانی بہہ جاتا ہے، زرخیز زمینیں بیکار پڑی رہتی ہیں شہروں کے قرب وجوار میں تجارتی پیمانہ پر ترکاری ومیوہ جات اور پھولوں وغیرہ کی باغبانی نہیں کیجاتی۔

مطلق اسراف زراعت ہی تک محدود نہیں بالخصوص متوسط گھرانوں، اعلیٰ طبقوں اور امیر خاندانوں کا یہ حال ہے کہ بے توجہی اور لاپرواہی، بدسلیقگی وپھوہڑپن کی وجہ سے بہت سی قیمتی ونادر چیزیں برباد جایا کرتی ہیں۔ عمدہ تصاویر اور نادر کتب بسا اوقات کیڑوں کی غذا بنجاتی ہیں مگر غیر ضروری بوسیدہ اور از کار رفتہ سامان جوں کا توں پڑا رہتا ہے اور شاذو نادر ہی گھرانے ایسے ہوں گے جہاں سلیقہ مندی سے کام کاج ہوتا ہے، لاکھوں میں دوچار ہی گھرانے ایسے پائے جاتے ہیں جہاں وجدان کا نہیں بلکہ عقل کا تسلط ہو اور جن کا معیار زندگی اصلی معنوں میں اعلیٰ ہو یعنی جو کسی قدر چین وآرام سے زندگی بسر کرتے ہوں۔

غرض کہ مطلق اسراف بھی افلاس ہند کی ایک اہم وجہ ہے جو سچ پوچھئے تو ہماری بدنظمی اور بدانتظامی کا نتیجہ ہے کیونکہ جن لوگوں میں تنظیمی قابلیت ہوتی ہے وہ مطلق اسراف تو کجا اضافی اسراف کو بھی واقع نہیں ہونے دیتے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ افلاس ہند کا سبب الاسباب یہاں کی غربت کی وجہ وجوہ ہندوستان کی فلاکت ونا داری مفلسی ومحتاجی کا حقیقی ماخذ وہ بدنظمی وبدسلیقگی ہے جو ہمارے خاندانی، عمرانی، کاروباری، تجارتی اور سیاسی معاملات غرضکہ ہمارے زندگی کے ہر شعبہ میں پائی جاتی ہے۔

(باقی)

تعلیم، اس کی ماہیت اور اس کا اثر

ناظرین جامعہ کے لئے مشہور فرانسیسی حکیم امیل ڈرکیم کے ان لکچروں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو "تعلیم اور اجتماعیات" کے نام سے رسالہ کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ امید ہے کہ ہم یہ سلسلہ برابر قسط وار جاری رکھ سکیں گے۔

(یوسف)

تعلیم کا لفظ بعض دفعہ بہت ہی پھیلے ہوئے مفہوم میں ان مجموعی اثروں کو بتلانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو فطرت یا دوسرے انسان ہمارے ذہن یا ہمارے ارادے پر ڈالتے ہیں۔ بقول اسٹورٹ مل تعلیم کا مطلب "وہ سب کچھ ہے جو ہم خود کرتے ہیں اور وہ سب کچھ جو دوسرے ہمیں اپنی فطرت کی تکمیل سے نزدیک کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ اپنے بہت وسیع معنوں میں تعلیم سے مراد وہ بلا واسطہ اثرات بھی ہیں جو انسانی سیرت اور قابلیتوں پر ان چیزوں سے پڑتے ہیں جن کا مقصد بالکل مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً قانون سے، حکومت کی شکلوں سے، حرفتی مصنوعات سے اور ان قدرتی واقعات سے جو انسانی ارادے سے آزاد ہیں، جیسے آب و ہوا، زمین اور جائے وقوع۔" اس تعریف میں وہ واقعات شامل ہیں جن میں کوئی باہمی تعلق نہیں اور جنہیں کوئی آدمی بھی بغیر اپنے آپ کو الجھن میں ڈالے ہوئے ایک لفظ کے تحت میں نہیں اکھٹا کر سکتا۔ چیزوں کا اثر انسان پر اپنے طریق عمل اور نتائج کے اعتبار سے، اس سے بالکل جداگانہ ہوتا ہے جو خود انسان ڈالتے ہیں۔ ہمعصروں کا اثر اپنے ہم عصروں پر اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو بڑی عمر والے نا بالغوں پر ڈالتے ہیں۔ یہاں ہمیں بس اسی آخر الذکر اثر سے دلچسپی ہے اس لئے اسی کے لئے ہمیں چاہئے کہ لفظ تعلیم کو مخصوص کر دیں لیکن یہ مخصوص عمل کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اس سوال کے بہت سارے جواب دئے

گئے ہیں - ان جوابوں کی دو قسمیں کہجا سکتی ہیں -

بقول کانٹ "تعلیم کا مقصد ہر فرد کی اس تکمیل کی پوری ترقی ہے جس کا کہ وہ اہل ہو" لیکن "تکمیل" کا کیا مطلب سمجھا جائے ؟ یہ اکثر کہا گیا ہے کہ اسکا مطلب انسان کی ساری قابلیتوں کی ہم آہنگ ترقی ہے - اس کا مطلب یہ ہو کہ ان ساری طاقتوں کو، جو ہم میں ودیعت ہیں، سب سے اونچے نقطہ پر لیجائے جہاں تک کہ آپ کی پہنچ ہو سکے - جہاں تک ممکن ہو انہیں وقوع میں لائے - یہ نہ ہو کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے ٹکرائیں - کیا یہ ایسا مطمح نہیں جس سے بڑھکر اور دوسرا نہیں ہو سکتا ؟ -

لیکن اگر واقعی یہ ہم آہنگ ترقی، ایک حد تک ضروری اور پسندیدہ ہو تو ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ پوری طرح سے وقوع پذیر نہیں ہوتی - اس لئے کہ اس میں اور ایک اور دوسرے انسانی چلن کے طریقے میں جو اس سے کم حکمی نہیں، تضاد آن پڑتا ہے - یہ چلن وہ ہے جو ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو ایک محدود اور مخصوص کام کے لئے وقف کریں - ہم سب ایک ہی طرح کی زندگی کا عہد نہیں کر سکتے اور نہ ہمیں چاہئے - ہمیں اپنی اہلیتوں کے مطابق الگ الگ کارگذاریاں کرنا ہیں - ہمیں ان کارگذاریوں میں ہم آہنگی پیدا کرنی چاہئے جن کی ہمیں ضرورت ہو ہم سب سوچنے کے لئے نہیں بنے - احساس والوں اور عمل والوں دونوں کی ضرورت ہے - ایسوں کی بھی ضرورت ہو جن کا کام سوچنا ہے - خیال بغیر حرکت سے بے تعلقی کے بغیر خود پر پیچ در پیچ دئے اور بغیر خارجی عمل سے اس چیز کو جدا کئے ہوئے جس کے لئے وہ اپنے کو پورا پورا وقف کر دیتا ہے، ترقی نہیں کر سکتا - یہاں یہ پہلی تفریق پیدا ہوئی جو لازمی طور پر توازن کو بگاڑ دیتی ہے - اور عمل اپنی جانب، خیال کی طرح بہت سی مختلف اور مخصوص شکلیں اختیار کر سکتا ہے -

بلاشبہ، ایک طرح کی مشترک بنیاد اس تخصیص کے باوجود باقی رہتی ہے اور بطور نتیجہ عضوی اور نفسی کارگذاریوں کا توازن قائم رہتا ہے - اگر ایسا نہ ہو تو انفرادی صحت اور سماجی تعلق کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے - پھر بھی اس سے یہ مراد نہیں کہ مکمل توازن، انسانی چلن اور تعلیم کے انتہائی مقصد

کے طور پر نہ پیش کئے جائیں۔

تعلیم کی استفادی تعریف اور بھی زیادہ ناقابل اطمینان ہے جس کے مطابق تعلیم کا مقصد "فرد کو اپنی اور اپنے ہم جنسوں کی خوش حالی کا آلہ بنانا ہے[1]"۔ کیونکہ خوشحالی تو دراصل موضوعی شے ہے جسے ہر آدمی اپنے طریقہ پر گن گیان کرتا ہے۔ اس قسم کے ضابطہ سے تعلیم کا مقصد غیر متعین رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خود تعلیم غیر متعین چیز رہتی ہے کیونکہ وہ انفرادی فیصلہ پر چھوڑ دی جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسپنسر نے خوشحالی کی معروضی تعریف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے نزدیک خوشحالی کی شرطیں وہی ہیں جو زندگی کی مکمل خوشحالی مکمل زندگی ہے۔ لیکن زندگی کیا ہے؟ اگر اس سے مراد طبعی زندگی ہے تو آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ کن چیزوں کے بغیر وہ ناممکن ہو جاتی ہے۔ طبعی زندگی عضویات اور اس کے ماحول میں ایک طرح کا توازن ہے۔ اور چونکہ یہ دونوں متعلقہ الفاظ "عضویات" اور اس کے "ماحول" ایسے مقدمات ہیں جن کی تعریف کی جا سکتی ہے تو ضرور ہے کہ ان دونوں کے تعلق کی تعریف بھی ممکن ہو۔ لیکن اس طرح محض قریبی حیاتی ضرورتوں کا اظہار ہو سکتا ہے۔ آدمی کے لئے اور خصوصاً اسی زمانہ کے آدمی کے لئے، ایسی زندگی زندگی نہیں۔ ہم زندگی سے اپنے عضووں کی ٹھیک کارگزاری کے علاوہ اور کچھ بھی مراد لیتے ہیں۔ ایک شائستہ روح یہ پسند کرے گی کہ وہ زندہ نہ رہے بمقابلہ اس کے کہ اپنے ذہن کی خوشیوں کو چھوڑ دے۔ صرف واحد مادی نقطۂ نظر سے وہ سب کچھ جو تحت ضرورت سے پرے ہے، تعین سے بچ نکلتا ہے۔ زندگی کا معیار (Standard of life) بقول انگریزوں کے وہ کم سے کم جس سے نیچے اترنے کو کوئی رضامند نہیں ہوتا، ماحولوں اور وقتوں کے لحاظ سے بے حد جداگانہ ہوتا ہے۔ کل جو ہیں کافی معلوم ہوتا ہے آج، جیسا کہ ہم ابھی محسوس کرتے

---

(1) جیمس مل

ہیں، انسانی وقار سے نیچے نظر آتا ہے۔ اور ہر بات سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ہماری ضرورتیں بڑھتی ہی چلی جائیں گی۔

یہاں اب ہم اس نزدیکی سے لگ بھگ ہیں جو ان سب تعریفوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ سب تعریفیں اس مفروضہ سے شروع ہوتی ہیں کہ ایک تعلیمی عین ہے، مکمل، جو بلا لحاظ سب انسانوں کے لئے ایک ہی قدر رکھتا ہے۔ یہ عالمگیر اور یکتا تعلیم ہے جس کی اہلِ اصول زبردستی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن اولاً اگر ہم تاریخ کو دیکھیں تو ہمیں کچھ نہیں ملتا جو اس قسم کے نظریوں کی تصدیق کرے۔ تعلیم، عہد اور ملک کے لحاظ سے بیحد مختلف رہی ہے۔ یونانی اور لاطینی شہروں میں تعلیم فرد کو اس بات کے لئے تیار کرتی تھی کہ وہ خود کو اندھا دھند سماج کے ماتحت کردے اور سماج کی ایک چیز بن جائے۔ آج تعلیم فرد کو زبردستی آزاد شخصیت بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ ایتھنز میں یہ کوشش تھی کہ ذہنوں کو نازک، واقف کار، نفیس، وزن و تناسب کا گرویدہ، حسن سے لطف اندوز ہونے والا اور خالص تخیل کی خوشیوں کا مزہ لینے والا، بنایا جائے۔ روما میں یہ چاہتے تھے کہ سب سے پہلے بچے عملی انسان بنیں، شکوہ لشکری سے مجذوب، اور اور فنونِ لطیفہ کے متعلق سب باتوں سے بے توجہ۔ ازمنہ وسطیٰ میں تعلیم سب سے پہلے مسیحی تعلیم تھی۔ نشاۃ ثانیہ کے وقت تعلیم کی سیرت زیادہ دنیاوی اور زیادہ ادبی ہوئی۔ آج سائنس وہ جگہ لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو کچھ عرصہ پہلے آرٹ کی تھی۔ لوگ کہیں گے کہ یہ واقعہ عین نہیں ہو سکتا اگر تعلیم ادلتی بدلتی رہی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمیوں نے ہمیشہ اس امر میں شبہ کیا ہے کہ وہ کیسی ہونی چاہئے؟ لیکن اگر روما کی تعلیم انفرادیت سے ویسی ہی ملوث ہوتی جیسی کہ ہمارے عہد کی ہے۔ تو روما کا شہر نہ قائم رہتا۔ لاطینی تہذیب نہ بن پاتی اور نہ ہماری موجودہ تہذیب ہوتی۔ جس کا ایک حصہ اسی سے نکلا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ کے مسیحی سماج نہ زندہ رہ سکتے اگر انہوں نے آزاد تحقیق کو وہی جگہ دی ہوتی جو ہم آج دیتے ہیں۔ پس ایسی ضروریات کا تسلیم کرنا لازمی ہے جو ناگزیر ہیں اور جنکی تجرید ناممکن ہے۔ ایسی تعلیم کے خیال کرنے سے کیا فائدہ جو اس سماج کیلئے جو اسپر عمل پیرا ہو ہلاکت کا حکم رکھتی ہو۔

یہ اس قدر مختلف فیہ مفروضہ خود ایک عام غلطی پر مبنی ہے۔ اگر کوئی اس بات سے شروع کرتا ہے کہ تعلیمی سطح کیا ہونا چاہیے، زمانہ اور مقام کے سب حالات کی تجرید کے بعد، تو وہ اس بات کو بے کہے مانتا ہے کہ نظام تعلیمی میں بجائے خود کوئی اصلیت نہیں۔ اس نظام میں ان مجموعی دستوروں اور اداروں کو نظر انداز کیا جاتا ہے جو مرور زمانہ سے آہستہ آہستہ بنے ہیں اور جو دوسرے سماجی اداروں سے زیادہ مستحکم ہی نہیں ہوتے بلکہ انکا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں ارادے سے اس طرح تبدیلی نہیں ہوسکتی جس طرح خود سماج کے ڈھانچے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعیت پذیر تصورات کا نظام ہے۔ اس وجہ سے ایک ہی منطق سے ان پر بحث ہوسکتی ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہر عہد کے لوگ اس نظام کو جان بوجھکر بناتے ہیں تاکہ ایک متعین مقصد کو حاصل کیا جائے۔ اور یہ نظام ہر جگہ ایک سا نہیں رہا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس کی ماہیت کے، یا اس مقصد کے جس کے پیچھے اسے جانا چاہیے، یا اس طریقہ کے جس سے وہ مقصد حاصل ہوا، سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ اس نقطۂ نظر سے گذشتہ زمانہ کے تعلیمی نظام کلی یا جزئی حیثیت سے غلطیاں معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے ہمیں ان سے قطع نظر کرنی چاہیے اور ہمیں اپنا استحکام اپنے پیشروؤں کے مشاہدہ اور منطق کی غلطیوں پر نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن ہم اس مسئلہ کے حلوں میں اپنے آپ کو نہ ڈالدیں۔ یعنی وہ سب الگ چھوڑ کر جو "ہوا ہے" خود سے یہ سوال کریں کہ کیا "ہونا چاہیے"۔ تاریخ کی تعلیم ہمیں ان غلطیوں کی تکرار سے بچا سکتی ہے جو کی گئی ہیں۔

لیکن واقعی ہر سماج کا، اپنی ترقی کے ایک متعین وقت میں، ایک نظام تعلیم ہوتا ہے جو ایک ناقابل مدافعت قوت کے ساتھ افراد پر چھا جاتا ہے۔ یہ یقین کرنا بیکار ہے کہ ہم اپنے بچوں کی ویسی تربیت کر سکتے ہیں جیسے کہ ہم چاہتے ہیں۔ ایسی بہت سی رسمیں ہیں جن سے ہمیں مطابقت کرنا پڑتی ہے۔ اگر ہم سنجیدگی سے انکی مخالفت کریں تو وہ ہمارے بچوں سے اپنا بدلہ لیں گے۔ جب یہ بچے بالغ ہوں گے تو انہیں اپنے ہمعصروں کے ساتھ جن سے وہ ہم آہنگ ہیں۔

زندگی بسر کرنا دشوار ہوگا۔ یہ بات اہمیت نہیں رکھتی کہ آیا ان کی تربیت دقیانوسی خیال کے مطابق ہوئی یا ان خیالوں کے مطابق جو قبل از وقت ہیں۔ دونوں حالتوں میں یہ بچے اپنے وقت کے نہیں اور بطور نتیجہ، انکی زندگی کے حالات حسب معمول نہیں اس لئے وقت کے ہر لمحہ میں تعلیم کا ایک درست کن نمونہ ہوتا ہے جس سے بغیر اپنے آپ کو سخت مخالفت سے مجروح کئے ہوئے، ہم دور نہیں جا سکتے۔ اس میں تکرین پوشیدہ ہوتی ہیں۔

ان رواجوں اور خیالوں کو جن سے یہ متعین معیار بنتا ہے، ہم تنہا انفرادی حیثیت سے نہیں بناتے۔ یہ آپس کی شرکت کی زندگی سے پیدا ہوتے ہیں اور اس شرکت کی زندگی کی ضرورتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ بڑی حد تک تو یہ ہم سے پہلے والی نسل کا کام ہوتا ہے۔ آج کی تعلیم کے جتنے مجموعی اصول ہیں، انکے بنانے میں انسانیت کے سارے ماضی نے کچھ نہ کچھ ضرور عطا کیا ہے۔ ان میں نہ صرف ہماری تاریخ نے بلکہ ان لوگوں کی تاریخ نے جو ہم سے پہلے ہوئے ہیں اپنے نشان چھوڑے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ اعلیٰ عضویات اپنے اندر علم الحیات کا پورا ارتقار نیہاں رکھتی ہے جس کی کہ وہ انتہا ہے۔ جب ہم اس طریقہ کا تاریخی مطالعہ کرتے ہیں جس سے تعلیمی نظام بنتے اور ترقی کرتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ ان نظاموں کا انحصار مذہب پر، سیاسی نظام پر، علوم کی ترقی پر اور حرفت کی حالت پر ہوتا ہے۔ اگر انہیں اُن کے تاریخی اسباب سے علیحدہ کر دیا جائے تو وہ چیستان بن جاتے ہیں۔ پھر بھلا تنہا فرد کس طرح اپنے ذاتی سوچ کی کوشش سے اس چیز کو بنانے کا دعوےٰ کر سکتا ہے جس کی تعمیر انفرادی فکر کا کام نہیں؟ - اس کے سامنے ایک کوری میز نہیں جس پر وہ جو چاہے بنا کر کھڑا کر دے۔ اس کے سامنے واقعی حقایق ہیں جنہیں نہ وہ پیدا کر سکتا ہے، نہ مٹا سکتا ہے اور نہ ارادے سے بدل سکتا ہے۔ ان واقعات پر اسکا عمل اسی قدر ہوگا جتنا کہ وہ انہیں سمجھے گا اور ان کی ماہیت کو اور ان حالات کو جن پر انکا انحصار ہے، جانے گا۔ وہ انہیں اس وقت تک نہیں جان سکتا جب تک کہ وہ انکے (ان واقعات کے)

مدرسہ میں داخل ہو کر اسی طرح مشاہدہ نہ کرے جس طرح کہ طبیعی بے جان مادہ کا اور علم الحیات کا ماہر زندہ جسموں کا مشاہدہ کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اور کیا طریقہ کار ہو سکتا ہے؟۔ اگر صرف منطقی طریقہ سے یہ بات متعین کرنا ہے کہ تعلیم کیا ہونی چاہئے تو شروع اس سوال سے کرنا چاہئے کہ تعلیم کی کیا اغراض ہیں؟۔ بھلا وہ کیا ہے جو ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیتا ہے کہ تعلیم کی اغراض یہ ہیں ۔ نہ کہ یہ؟۔ ہم قیاساً یہ نہیں جانتے کہ سانس یا دوران خون کی زندہ انسان میں کیا کارگذاری ہے؟ کس حق کی بنا پر ہمیں تعلیمی کارگذاری کے متعلق زیادہ بہتر معلومات مل سکتی ہے؟ کوئی جواب دے گا کہ بظاہر تعلیم کا مقصد بچوں کی تربیت ہے۔ لیکن یہ کہنا بس مسئلہ کو بہ شکل دوسری طرح بیان کرنا ہے۔ یہ اسکا حل نہیں ہوا۔ یہ بتلانا پڑے گا کہ یہ تربیت کیا ہے؟۔ اسکا کیا رجحان ہے؟ اور وہ کن انسانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے؟۔ ان سوالوں کا جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ شروع ہی سے اس امر کا مشاہدہ نہ کیا جائے کہ یہ تربیت (ماضی میں) کیا تھی اور کن ضرورتوں کو اس نے پورا کیا؟ اس طرح تعلیم کا ابتدائی خیال قائم کیا جا سکتا ہے اور اس کے متعین کرنے کے لئے تاریخی مشاہدہ ناگزیر ہے۔

تعلیم کی تعریف

تعلیم کی تعریف کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان تعلیمی نظاموں پر جو رائج ہیں یا رائج رہ چکے ہیں، غور کیا جائے۔ ان میں ملاپ پیدا کیا جائے اور ان خصوصیتوں کو جو ان میں مشترک ہیں الگ الگ نکالا جائے۔ ان خصوصیتوں کے آپس میں ملانے سے تعلیم کی تعریف ہو جائے گی جس کی ہمیں تلاش ہے۔

بر سر راہ ہم نے تعلیم کے دو عناصر مقرر کرلئے ہیں۔ اس کے لئے بالغوں اور نوجوانوں کی نسلوں کا وجود، اور اس عمل کا وجود جو اول الذکر آخر الذکر پر برتتے ہیں، ضروری

ہے۔ اب ہمیں اس عمل کی ماہیت کی تعریف کرنا باقی ہے۔

یوں سمجھئے کہ ایسا کوئی سماج نہیں جہاں تعلیمی نظام کے دو رُخ ہوں۔ بیک وقت یہ نظام ایک ہوتا ہے اور متفرق۔ یہ متفرق ہوتا ہے اس معنی کرکے کہ سماج میں جتنے مختلف ماحول ہوتے ہیں اتنی ہی مختلف قسم کی تعلیمیں ہوتی ہیں۔ اگر سماج میں مختلف ذاتیں ہیں تو ایک ذات کی تعلیم دوسری ذات کی تعلیم سے جدا ہوگی۔ رومانی شرفا کی تعلیم وہ نہ تھی جو غربا کی۔ برہمن کی تعلیم وہ نہیں جو شدر کی۔ اس طرح ازمنۂ وسطےٰ میں ایک نوابی خواص کی شائستگی میں جسے سارے فنون حرب سکھائے جاتے تھے، اور ایک کسان کی تعلیم میں، جسے موسموں کے زبانی حساب لگانے کی ابتدائی باتیں، چند گیت اور زبان کے قواعد گاؤں کے مدرسہ میں بتائے جاتے تھے۔ بڑا فرق تھا۔ آج بھی کیا ہم نہیں دیکھتے کہ سماجی طبقوں اور مقام بود و باش کے لحاظ سے تعلیم میں فرق ہوتا ہے۔ شہر کی تعلیم وہ نہیں ہوتی جو گاؤں کی۔ متوسط طبقے کی تعلیم وہ نہیں ہوتی جو مزدور کی۔ آپ کہیں گے کہ ایسا نظام اخلاقاً روا نہیں۔ یہ صرف پرانی یادگار رہے اور عنقریب مٹنے والی ہے۔ اس مقالہ کی حمایت آسان ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے بچوں کی تعلیم اس اتفاق پر نہ مبنی ہونی چاہئے جو انہیں یہاں یا وہاں، ان ماں باپ کے ہاں نہ کہ اُن ماں باپ کے ہاں، پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی کہ ہمارے عہد کے اخلاقی ضمیر کو وہ اطمینان مل جائے جس کا اسے انتظار رہے تو بھی تعلیم میں یکسانیت نہیں پیدا ہو سکے گی۔ اس حالت میں بھی جب کہ بچہ کی زندگی کے چلن کو اندھا توارث پہلے سے متعین نہ کر سکے گا تو بھی پیشوں کے اخلاقی اختلاف کے باعث تعلیمی اختلاف لازمی طور پر پیدا ہو جائے گا۔ ہر پیشہ واقعی اپنے ساتھ ایک مخصوص ماحول کی تعمیر کرتا ہے جس کے لئے خاص قسم کی قابلیتوں اور مخصوص معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ماحول میں ایک خاص طرح کے خیالات، ایک خاص طرح کے رواج اور ایک خاص طرح سے چیزوں کو دیکھنے کا طریقہ رائج ہوتا ہے اور چونکہ بچہ کو اس کارگذاری کے لئے، جسے وہ (بڑا ہو کر) پورا کرے گا۔ تیار کرنا ہوتا ہے اس لئے عمر کے ایک خاص وقت میں

سب بچوں کی تعلیم ایک سی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ تمام مہذب ملکوں میں تعلیمی اختلاف واختصاص کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یہ اختصاص ہر روز قبل از وقت شروع ہو رہا ہے۔ اسی طرح جو غیر مناسبت پیدا ہوتی ہے اس کی بنیاد، اس اختلاف کی طرح جس کی ہم نے ابھی تصدیق کی ہے، غیر منصفانہ عدم مساوات پر نہیں۔ لیکن اس سے وہ کچھ کم بھی نہیں۔ بالکل یکساں اور مساواتی تعلیم ڈھونڈنے کے لئے تاریخ سے پہلے کے سماجوں تک ہیں جانا چاہئے جن میں کسی قسم کی تفریق کا وجود نہ تھا۔ اور پھر اس قسم کے سماج محض انسانی تاریخ کے ایک منطقی لمحہ کو ظاہر کرتا ہے۔

ان مخصوص تعلیموں کی اہمیت کچھ سہی لیکن ان سب کو تعلیم نہیں کہہ سکتے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ خود اپنے آپ کافی نہیں تھیں۔ ہر کہیں جہاں ہم انہیں دیکھتے ہیں وہ ایک خاص نقطہ پر پہنچکر ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہیں اور پھر اس نقطہ سے گذر کے وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ وہ سب ایک مشترک بنیاد پر ٹھہری ہوئی ہیں۔ ایسی کوئی قوم نہیں۔ جس میں ایک خاص قسم کے بعض تصورات، جذبات اور رسمیں نہ ہوں جنہیں تعلیم کے ذریعے تمام بچوں میں بلا کسی تفریق کے نہ جذب کیا جاتا ہو۔ ان بچوں کا تعلق سماج کے کسی طبقہ سے سہی۔ وہاں بھی جہاں سماج ایک دوسرے سے الگ ذاتوں میں منقسم ہے۔ سب کا ایک مشترک مذہب ہوتا ہے اور بطور نتیجہ، مذہبی شائستگی کے اصول، جو اب بنیادی حیثیت رکھتی ہے، تمام آبادی کے پھیلاؤ میں ایک ہی ہوتے ہیں۔ اگر ہر ذات اور ہر خاندان کے اپنے مخصوص دیوتا ہوتے ہیں تو ساتھ ہی عمومی دیوتا بھی ہوتے ہیں جنہیں سب تسلیم کرتے ہیں اور جن کی پوجا سب بچوں کو سکھائی جاتی ہے اور چونکہ یہ دیوتا بعض جذبات کا جسم اور تشخص ہوتا ہے اور زندگی کے ایک مخصوص اسلوب تصور کا اظہار کرتا ہے اس لئے ہر کوئی ان فرقوں میں داخل ہونے کے ساتھ ہی وہ ساری دماغی عادتیں حاصل کر لیتا ہے جو خالص مذہبی زندگی کے کرہ سے پرے ہوتی ہیں۔

بعینہٖ ازمنہ وسطیٰ میں غلام زرعی کسان، طبقۂ متوسط کا آدمی اور شرفا، سب کے سب

کو سیمی تعلیم دیجاتی تھی۔اگران ساجوں میں یہ حالت ہو جہاں ذہنی اور اخلاقی تباین اس بڑی حد تک ہو تو ترقی یافتہ لوگوں میں ایسا ہونا اور بھی زیادہ قرین عقل ہے جن میں طبقے، باوجود ایک دوسرے سے الگ ہونے کے، ایک کم گہری خندق سے جدا ہیں۔ وہاں جہاں ہر تعلیم کے مشترک عناصر کا اظہار مذہبی علامتوں سے نہیں ہوتا وہاں انکا وجود نہیں باقی رہ سکتا۔ ہماری تاریخ کے دوران میں انسانی فطرت، ہماری مختلف قابلیتوں کی جداگانہ اہمیت حق اور فرض، سماج، فرد، ترقی، علم، فن وغیرہ کی بابتہ جو ہماری قومی زندگی کی بنیادیں ہیں۔ بہت سارے مجموعی تصوّرات قائم کئے جاچکے ہیں۔ ہماری ساری تعلیم، امیر کی اور غریب کی، انکی جو آزاد پیشے برتتے ہیں اور ان کی جو حرفتی کارگذاری کی تیاری کرتے ہیں، کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان سب تصوروں کو بچوں کے شعوروں میں متعین کردے۔

ان واقعات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر سماج انسان کا ایک خاص سطح بناتا ہے کہ وہ دماغی جسمانی اور اخلاقی حیثیت سے کیا ہو؟ - یہ سطح، ایک خاص حد تک، سارے شہریوں کا ایک سا ہوتا ہے۔ ایک خاص نقطہ پر پہنچکر اس میں، مخصوص ماحولوں کے مطابق جو ہر سماج میں ہوتے ہیں، فرق آنا شروع ہوتا ہے۔ یہ سطح ہی ہے جو بیک وقت ایک اور مختلف ہو، اور یہی تعلیم کا مقصد ہے۔ تعلیم کی کارگذاری یہ ہے کہ بچہ میں اولاً، خاص جسمانی اور دماغی کیفیتوں کو ابھارے جنہیں وہ سماج جس سے اس بچہ کا تعلق ہے اپنے ہر فرد میں لازمی سمجھتا ہے۔ دوئم، ان خاص جسمانی اور دماغی کیفیتوں کا پیدا کرنا جو مخصوص سماجی طبقہ (ذات، طبقہ، خاندان، پیشہ) اپنے ہر فرد میں ضروری خیال کرتا ہے۔ اس طرح، سماج اپنی مجموعی حیثیت میں اور ہر مخصوص سماجی ماحول اس سطح کو بناتے ہیں اور تعلیم اسے واقعیت دیتی ہے۔ سماج اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کے افراد میں کافی یکسانیت نہ ہو۔ تعلیم، پہلے ہی سے بچہ کی روح میں وہ جوہری مشابہتیں مقرر کرکے جو سماجی زندگی کے لئے لابدی ہوتی ہیں، یکسانیت کو ابدیت دیتی ہے اور انہیں زبردستی پیدا کرتی ہے۔ لیکن دوسرے پہلوؤں کو دیکھئے تو معلوم ہو کہ بغیر ایک خاص

اختلاف کے سماج میں تعاون ناممکن ہو جائے تعلیم اس ضروری فرق کے قیام کی اس طرح ضمانت کرتی ہے کہ خود میں اختلاف اور اختصاص پیدا کرلیتی ہے۔ اگر سماج ترقی کے اس نقطہ پر آگیا ہے کہ ذات اور طبقہ کی پرانی تقسیم نہیں باقی رہ سکتی تو وہ اپنی بنیاد میں ایک اور تعلیم کا اضافہ کرلیتا ہے۔ اگر محنت زیادہ منقسم ہو گئی ہے تو وہ (سماج) بچوں میں مشترک تصورات اور جذبات کی پہلی بنیاد پر پیشوں کی قابلیتوں کے مالامال اختلاف کو ابھارے گا۔ اگر وہ سماج دوسرے سماجوں کے ساتھ بر سر پیکار رہے تو وہ زبردستی سے ایک قومی نمونہ پر دماغوں کی ساخت ڈھالتا ہے۔ اگر بین الاقوامی سمجھوتا صلح جو شکل اختیار کرتا ہے تو وہ ایسا ڈھانچا تلاش کرتا ہے جو زیادہ عمومی اور زیادہ انسانی ہو۔ سماج کے لئے تعلیم محض ایک ذریعہ ہی جس سے وہ بچوں کے دلوں میں اپنے وجود کی جوہری شرطوں کی تیاری کرتا ہے۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ خود فرد کا ان سب پابندیوں کو تسلیم کرنے میں کونسا مفاد مضمر ہے۔

ہم اب اس ضابطہ پر پہنچے کہ تعلیم وہ عمل ہے جو بالغ نسلیں ان نسلوں پر برتتی ہیں جو ابھی سماجی زندگی کے لئے پختہ نہیں ہوئیں۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ بچہ میں گنی گنائی خاص جسمانی، ذہنی اور اخلاقی کیفیتیں ابھارے اور انہیں ترقی دے جس کا سیاسی سماج اپنی مجموعی حیثیت میں، اور وہ مخصوص ماحول جس سے اسی فرد کا خاص طور پر تعلق ہے۔ دعوے دار ہے۔

مذکورہ تعریف کے نتائج
تعلیم کی سماجی خصوصیت

تعلیم کی جو تعریف اوپر کی گئی ہے اس سے لازمی طور پر یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ تعلیم نابالغ نسل کو باقاعدہ سماجی رنگ دینے کا نام ہے۔ ہم میں سے ہر ایک میں دو ہستیاں ہیں جو سوائے تجرید کے اور کسی طرح جدا نہیں کی جا سکتیں ایک تو وہ ہستی ہے جو ان تمام دماغی کیفیتوں سے بنی ہے جس کا تعلق سوائے ہمارے اور ہماری شخصی زندگی کے واقعات کے، کسی اور سے نہیں۔ اسے انفرادی ہستی کہہ سکتے ہیں۔ دوسری ہستی تصوروں، جذبوں اور عادتوں کا ایک نظام ہے جو ہم میں، ہماری شخصیت کی نہیں بلکہ

ان گروہوں کی ترجمانی کرتا ہے جن میں ہم شریک ہیں۔ اس مد میں مذہبی عقیدے، اخلاقی عقیدے اور رسمیں، قومی یا پیشے کی روایتیں اور ہر قسم کی اجتماعی رائیں شامل ہیں۔ ان سب کے مجموعے سے سماجی ہستی بنتی ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اس ہستی کی ہم میں سے ہر ایک میں تعمیر کرے۔

اس سے تعلیم کے حصہ کی اہمیت اور اس کے عمل کی زرخیزی ظاہر ہوتی ہے فی الواقع نہ صرف یہ کہ یہ سماجی ہستی بنی بنائی، ابتدائی انسان کی ساخت میں نہیں رکھی گئی بلکہ یہ کہ وہ کسی از خود ترقی کا نتیجہ بھی نہیں۔ فطرتاً انسان کی طبیعت ایک سیاسی حکم کی ماتحتی، اخلاقی قاعدوں کی تعظیم اور خلوص و ایثار کی طرف مائل نہ تھی۔ ہماری خلقی فطرت میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو ہمیں دیوتاؤں کی غلامی کی طرف، جو سماج کے مذہبی علامات تھے، راغب کرتی۔ انکی طرف ایک مسلک منسوب کراتی اور انکے احترام کے لیے خود کو محروم کراتی۔ یہ خود سماج ہے جس نے وہاں تک جہاں تک اس کی تشکیل اور استحکام ہو سکا، اپنی چھاتی سے یہ بڑی اخلاقی قوتیں نکالی ہیں جن کے سامنے فرد نے اپنے چھوٹے پن کو محسوس کر لیا۔ اب اگر ان لہروں اور غیر یقینی رجحانوں کی تجرید کیجائے جو وراثت میں ملتے ہیں، تو بچہ زندگی میں داخل ہوتے وقت سوائے اپنی انفرادی فطرت کے اور کچھ نہیں رکھتا۔ غرضکہ ہر نئی نسل سماج کے لئے ایک کوری میز ہوتی ہے جس پر اسے نئے سرے سے تعمیر کرنی ہوتی ہے۔ سماج کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ تیز راستہ سے ایک خود غرض اور غیر سماجی ہستی میں جو پیدا ہوتی ہے، پیدا ہونے کے ساتھ ہی ایک اور دوسری ہستی اضافہ کرے جو سماجی اور اخلاقی زندگی بسر کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ یہ ہے تعلیم کا کام اور اسی کام میں اس کی ساری بڑائی نظر آتی ہے۔ تعلیم کی حد یہاں نہیں رکتی کہ بس انفرادی اعضا کی ترقی کرائے، جس کے رُخ خود فطرت نے مقرر کر دئے ہیں، اور ان کی چھپی ہوئی قوتوں کو ظاہر کرائے جنہیں ابھارنے کی ضرورت ہی ہوتی ہے بلکہ تعلیم انسان میں ایک اور نئی ہستی پیدا کرتی ہے۔

یہ تخلیقی خیر، ازبس، انسانی تعلیم کا ایک استحاق ہے۔ وہ تعلیم جو جانوروں کو ملتی ہے، اگر یہ لفظ اسی مائل بہ ترقی تربیت کے لئے استعمال کیا جا سکے جو اُنکے والدین کی طرف سے اُن پر عائد ہوتی ہے۔ اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہ تربیت بعض جبلتوں کو جو جانوروں میں سوئی ہوئی ہوتی ہیں، ترقی دے سکتی ہے لیکن ان سے نئی زندگی کی ابتدا نہیں ہوتی۔ فطری کارگذاری کے کھیل میں اس سے آسانی ہوتی ہے لیکن وہ پیدا کچھ نہیں کرسکتی۔ اپنی ماں کے سکھانے سے ننھا اُڑنا یا گھونسلا بنانا بہت جلد سیکھ لیتا ہے۔ اسکے علاوہ وہ کچھ نہیں سیکھتا جسے وہ خود اپنے ذاتی تجربہ سے نہ معلوم کرلیتا۔ اسی وجہ سے یا تو جانور سماجی حالت سے علیحدہ زندگی بسر کرتے ہیں یا بالکل سیدھا سادھا سماج بنا لیتے ہیں۔ اس سماج کی کارگذاری آلات جبلتی کی بدولت پوری ہوتی ہے جو ان میں سے ہر فرد اپنے اندر رکھتا ہے اور جو پیدائش کے وقت ہی سے بنے بنائے ہوتے ہیں۔ یہ تعلیم کسی قسم کا، فطرت میں جوہری اضافہ نہیں کرتی کیونکہ فطرت گروہی زندگی اور انفرادی زندگی دونوں کے لئے خود کافی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے انسان کی وہ ساری قابلیتیں جو سماجی زندگی کے لئے ضروری ہیں بہت پیچیدہ ہیں۔ وہ کسی حالت میں بھی خود بخود ہمارے جسموں میں جنم نہیں لے سکتیں اور عضواتی رجحان کی مادی صورت نہیں اختیار کرسکتیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ وراثت کے توسل سے، ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل نہیں ہوسکتیں بلکہ تعلیم کے ذریعے سے منتقل ہوتی ہیں۔

دُنیا کیا سے کیا ہو جائیگی؟

شخصیت اور ماحول کے باہمی اثر اور تاثر کا مسئلہ عرصہ سے مباحث تاریخی میں بڑی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ اور اگرچہ مورخین کا بہت بڑا گروہ اب بھی تاریخ کی رفتار کو با اثر شخصیتوں کی پراسرار کارفرمائی سے تعبیر کرتا ہے اور جس طرح مصری نقاش اپنی تاریخ کے واقعات کو نقش و نگار میں محفوظ کرتے وقت کسی بادشاہ، یا بطل عظیم کی بڑی سی تصویر کے پیش پا چھوٹے چھوٹے سپاہیوں کے لشکروں اور مزدوروں کے گروہوں کی تصویریں بنا دیتے تھے اب بھی بڑی شخصیتوں کے ذکر مفصل کے ساتھ بقیہ نوع انسانی کا بھی مجمل ذکر آجاتا ہے۔ تاہم اب کچھ عرصہ سے مورخین کا ایک گروہ اس خیال کی طرف آرہا ہے کہ اگر تاریخ ایک مرتب علم کا نام ہے تو اسکا کام صرف واقعات کا گنوا دینا اور بیان کر دینا نہیں ہو سکتا بلکہ اسکا فرض ہے انکی تحلیل اور انکی تنقید۔ اور اس تحلیل و تنقید میں اشخاص کی اہمیت گھٹتی اور جماعتوں کی بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ لوگ تاریخ کو انسانی جماعتوں کے ترقی و تنزل کی داستان اور اس ترقی و تنزل کے قوانین کی تلاش سے تعبیر کرتے ہیں جس میں شخصیتیں محض ضمنی حیثیت رکھتی ہیں۔ تاریخ جو پہلے بے ربط واقعات کا ایک مجموعہ تھی اب سلسل عمل ارتقاء کی تفسیر بنجاتی ہے۔ اور مورخ اگر اس ارتقاء کے اصول صحیح طور پر معلوم کرلے تو یہی نہیں کہ گذشتہ واقعات کے فہم میں مدد دے سکتا ہے بلکہ آئندہ کے متعلق پیش گوئی بھی کر سکتا ہے۔

دور جدید کے مشہور انشا پرداز ایچ۔ جی۔ ویلز نے تاریخ کے اس جدید تصور کو بہت رائج کیا ہے اور اسکا خیال ہے کہ "مستقبل کے واقعات کے عام رجحان کے متعلق پیشگوئی کرنا۔ یہی نہیں کہ مورخ کے لئے جائز ہے بلکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو گویا علم تاریخ کے عبث و

لایعنی ہونے کا اقرار کرتا ہے "۔ چنانچہ خود ایچ ۔ جی ۔ ویلز نے بھی دنیا کی آنیوالی تاریخ کے متعلق کچھ خیالات ظاہر کئے ہیں جن کا اقتباس ذیل میں ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

" دنیا کی موجودہ حالت دو متضاد قوتوں کی نہایت پیچیدہ کشمکش سے عبارت ہے۔ ایک طرف تو بہت قوی جماعتی اور سیاسی روایات ہیں، دوسری طرف نئے علم کی اُمنڈتی ہوئی موجیں اور جدید اختراعات کا عدیم المثال طوفان ۔ یہ نیا علم اور نئی اختراعات ان جماعتی اور سیاسی روایات سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا جو اس وقت ذہن انسانی پر طاری ہیں ۔ ان روایتوں کا رُخ ماضی کی طرف ہے اور اسکو بڑھا چڑھا کر اور خوب سراہ کر یہ اپنی سند لیتی ہیں ۔ اُدھر جو نئی قوتیں ان پر حملہ آور ہیں وہ انسانی جماعت کو ایک عالمی نظام میں ترتیب دینے کے درپے ہیں ۔ یہ نئی قوتیں اپنے اس مقصد کے حصول پر سختی سے مصر ہیں اور جبتک یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا ڈر ہے کہ یہ نئی قوتیں نہایت بے رحمی سے انسانی فلاح وبہبود کو برباد و تباہ کرتی رہیں گی .... نئی ایجادات نے ہمارے حلقۂ اثر کو وسیع کر دیا ہے اور جماعت انسانی میں حصول مسرت کے ذریعوں اور طریقوں کو بہت ترقی دیدی ہے لیکن ساتھ ہی تباہی و بربادی کی قوتوں کو بھی اس قدر بے پناہ کر دیا ہے کہ ہم سے پہلے کی نسلیں اسکا تخیل بھی نہ کر سکتی تھیں ۔ یہ اچھی بری دونوں قسم کی قوتیں انسانی عقل اور انسانی ارادہ کو اس بات کا پیام دیتی ہیں کہ وہ دنیا کے جماعتی معاملات میں ایک وسیع ترتعمیر نو کی طرف متوجہ ہو ۔ اگر اس نے ایسا کیا تو انعام میں قوت، فلاح، مرفہ الحالی، آزادی اور سعی مشکور کے وہ دروازے ہماری نوع کے لئے کھل جائیں گے جو آج سے پہلے کسی کے خواب میں بھی نہ آسکتے تھے ۔ لیکن ان امکانات کا وجود اس پر دلالت نہیں کرتا کہ ان مواقع سے فائدہ بھی اٹھایا جائے گا۔ ...... ممکن ہے کہ اسکی خوبیوں سے متمتع ہونے سے قبل انسان پہلے اس کی سب برائیوں سے دوچار ہو بلکہ ممکن ہے کہ ارادہ اور عقل کی کمی اسے کبھی بھلائیوں تک پہنچنے ہی نہ دے!

انسان کی اس حرماں نصیبی کی مثالیں ہماری پچھلی تاریخ میں موجود ہیں تعلقات انسانی کو وسعت دینے والی نئی ایجادات پندرہویں صدی عیسوی میں شروع ہوئیں لیکن انکا نتیجہ تعاون نہیں ہوا بلکہ انھوں نے انسانیت کو اور بھی منقسم کر دیا۔ کچھ اتار چڑھاؤ کے بعد سیاست عالم کا اصول کارفرما " قومیت "، کا تصور ہو گیا۔ اور ذہن انسانی پر اس نے وہ تسلط حاصل کر لیا جس کا اندازہ بھی مشکل ہے۔ جنگ عظیم اسی اصول کا نتیجہ تھی، اور اسی کو اس نے اور قوی کر دیا۔ جرمن، اسٹریا اور ترکی سلطنتیں ختم ہو گئیں اور انکی جگہ بہت سی چھوٹی چھوٹی قوموں نے لے لی۔ اور یہ سب تفریق و تقسیم ایسے وقت ہوئی جب نئے ایجادات، نئے اختراعات نئے طریقے، نئی دریافتیں اس بات کی مقتضی ہیں کہ قومی حدود سے نکل کر دنیا کے سیاسی اور معاشی نظام کو عالمی طریق پر ترتیب دیا جائے۔ دنیا کی تاریخ پھر عرصہ تک ان متضاد قوتوں کی کشمکش سے پر رہے گی۔ دیکھیں قومیت کا غلبہ رہتا ہے یا ان خاصۂ فنکی اختراعات کا ؟

قومیت کا جذبہ فطرت انسانی کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں رکھتا ہے . . . . آدمی ہمیشہ کسی نہ کسی کی طرف ہوتا ہے، کسی فرقہ یا ٹولی سے تعلق رکھنا چاہتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے کتا یا بھیڑیا۔ بغیر اس تعلق کے وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ پھر وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ جس جماعت یا ٹولی سے اسکا تعلق ہو وہ اس کی سمجھ میں بھی آ سکے۔ اس کے لئے حقیقی ہو محض خیالی نہ ہو بلا تعلیم کے وہ " انسانیت "، کو اپنا فرقہ نہیں سمجھ سکتا۔ وہ ایسی جھونپڑی میں کیسے جا کر پناہ لے لے جس میں آپ بتاتے ہیں کہ ساری دنیا سما سکتی ہے !

فرقہ بندی کے اس فطری جذبہ کے خلاف مختلف مذاہب نے، سیاسی نظاموں نے، زمانہ موجودہ میں اشتراکیت نے صدا بلند کی ہے اور اس کے زور کو دبانا چاہا ہے لیکن یہ سب کے سب اس فطری جذبہ کے سامنے مصنوعی چیزیں ہیں۔ اگر آدمی کبھی بھی ایک نیا نظام زندگی بنائے گا تو اسے ان فطری چیزوں کو ان مصنوعی چیزوں سے دبانا پڑے گا۔

زمانہ موجودہ میں ان مصنوعی تصورات کا اثر تھوڑے سے مفکرین تک محدود ہے۔

جمعیت اقوام سے جو عام دلچسپی شروع ہوئی تھی وہ اس کی فریب ربا حقیقت کے سامنے ہوا ہوگئی جس سائنس نے اپنی جدید ایجادوں سے زمان و مکان کی قید کو تقریباً مٹا سا دیا ہے اسی نے عیسائیت اور اسلام کے ان جامع تصورات کو بھی کھوکھلا کر دیا ہے اور ان میں اس نئے موقع سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت نہیں چھوڑی .... ہماری خواہشات اور آرزوئیں اور ہمارے وسوسے کچھ بھی ہوں ہمیں اس نتیجہ پر مجبوراً آنا پڑتا ہے کہ ابھی بہت نسلوں تک متقابل و جنگ آزما قومی ریاستوں کا دور جاری رہے گا۔

ان قومی مخاصمتوں کو رفع کرنے کے لئے جو جمعیت اقوام بنائی گئی ہے اسکی مثال ایک اندھی گلی کی سی ہے جس سے پھر کہیں کو راستہ نہیں جاتا۔ اس راستے پر چل کر انسان کی تعمیری قوتیں بیکار جا رہی ہیں۔ اس کے موافقین کی امید ہے کہ یہ دفتروں کا مجموعہ، دفاتر خارجہ کے کارندوں کا جھمگٹ، یہ گھٹیا دوسرے درجے کے سیاست دانوں کا دار المباحثہ، شاید زیادہ طاقتور اور بالکل نئی قسم کی چیز بن جائے۔ میں اس امید میں انکا شریک نہیں ہوں۔ میرے نزدیک اس کی بنیاد کی خشت اول ہی کج ہے۔ اس کے نیک نیت بانیوں میں غالباً صحیح تاریخی حس ہی نہ تھا۔ انہوں نے قوموں کو معاملات انسانی کی سب سے بڑی مصیبت تسلیم کرنے کے بجائے انہیں ایک مقدس چیز سمجھا۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کی قوت جو حقیقی امن اور اتحاد عالم کے کام میں صرف ہوتی آج اس اندھی گلی میں بیکار جا رہی ہے۔ اور جمعیت اقوام در اصل اس اچھے کام میں حائل ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ انسانی میں انقلابات کا دور ختم نہیں ہو چکا ہے۔ اور ممکن ہے کہ مشرق سے اور ان مفلس و مفلوک فرزندوں کے تنگ و تاریک جھونپڑیوں سے جن کی محنت و مشقت پر ہمارا آرام و آسائش اور ہمارا سارا امن و چین منحصر ہے تھوڑے ہی عرصہ میں کوئی نیا انقلابی تصور رونما ہو جو ایسا ہی قوی ہو جیسا کہ اپنے شروع ایام میں اسلام اور جس کی وسعت تمام دنیا کو اپنے حلقہ میں لے لے۔ ایسے انقلابی طوفان کی یقینی پیش گوئی تو کوئی نہیں

کر سکتا لیکن مستقبل کے ہر خاکہ میں اس امکان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس انقلابی طوفان سے دنیا کو حیات تازہ ملے لیکن اس میں مجھے یہ بات ضرور دکھائی دیتی ہے کہ بہت سے قرض، بہت سے دعوے، بہت سے ادارے بہت سے حقوق ملکیت جنہیں قلمزد کرنے کی ہمت موجودہ دنیا میں نہیں ہے وہ اس کے طفیل میں صاف ہو جائیں گے اور اس طرح ایک نئے نظام دنیا دی کی بے روک و بے خطر راہ کھل جائے گی اگرچہ یہ راہ بہت بے رونق و ویران ہوگی!

ایک طرف اگر عالمگیر انقلاب کی توقع کیجا سکتی ہے تو اس کے قرائن بھی موجود ہیں کہ مستقبل قریب میں دنیا کا تمدن رو بہ انحطاط ہو جائے گا۔ یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ قومیت اور سامراج کے تخیلات میں اگر ترقی ہو کر ایک عالمی نظام نہ بنا تو کم سے کم یہ ادارے خود تو اسی حالت میں برقرار رہ سکیں گے۔ خیالات اور ادارے زندہ اور نامی چیزیں ہیں، جن میں ہر لحظہ تغیر ہونا ضروری ہے اور اگر یہ تغیر ترقی کی شکل میں ظاہر نہیں ہوتا تو تنزل کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ ہمارے موجودہ تمدن میں بہت سی چیزیں ہیں جو انحطاط اور تنزل کی خبر دے رہی ہیں۔ متمدن دنیا میں تقریباً ہر جگہ خصوصاً اٹلی، جنوبی جرمنی، ریاستہائے متحدہ امریکہ، میں قانون کا احترام کم ہو رہا ہے۔ نیابتی اداروں اور پچھلی نسلوں کے سیاسی تصورات کی وقعت گھٹ رہی ہے۔ موجودہ دنیا میں یہ تصورات اب بے موقع اور بے محل ہو گئے ہیں۔ اور نئے حالات کے مطابق وسیع تر تصورات اور زیادہ ہمہ گیر ادارے نہ مرتب ہوئے تو انسانیت پھر پہلے کی طرح چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو جائے گی . . . گمان ہے کہ آنے والی صدیوں میں تاریخ عالم جماعتوں کے صعودی سلسلہ کے بجائے نزولی سلسلہ کی داستان ہو جس کے آخر میں بس راہزنی ہے اور قزاقی!

دنیا کے جن حصوں میں یہ انحطاط جہاں بالکل عیاں نہیں وہاں بھی بے ادبی اور بے ترتیبی کے آثار نمایاں ہیں۔ ہماری مادی ترقیوں کا ایک عجیب نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مشورہ اور غور و خوض کی مجلسوں

کے مقابلہ میں اخبارات کا اثر بہت بڑھ گیا ہے ..... اخبارات جو کبھی پارلیمنٹ کی سیاسی جماعتوں کے خادم ہوتے تھے اب ان پارلیمنٹوں کو اپنی چیخ پکار سے بالکل دبا سکتے ہیں ..... میکانکی ایجادوں نے یہ بھی ممکن کر دیا ہے کہ اخباروں کی ملکیت چند ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مالکان اخبار کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو نہ کسی سیاسی روایات کا پابند ہے نہ کسی خاص ذمہ داری کا احساس رکھتا ہے اور جماعتی کارروائیوں میں خواہ مخواہ دخل دیتا ہے اور تقریباً بلا استثنیٰ سختی اور عدم رواداری کی راہ کا حامی ہوتا ہے۔ آج کل خصوصاً برطانیہ میں مالک اخبار مدبر سیاسی کا شخصی رقیب اور معلم کا بلند آہنگ دشمن بن گیا ہے۔ اخباروں کے عنوانات جلی فکر و خیال کے راہزن ہیں۔

اب ذرا موجودہ دنیا کی خاص خاص دول پر نظر ڈالئے۔ آج مغربی ڈراما میں مرکزی حصہ فرانس کا ہے۔ ہر ایک کی زبان پر یہی ہے فرانس کا کیا مطلب ہے، فرانس کا کیا قصد ہے، فرانس کیا کرے گا؟ فرانس کو آج وہی مرکزیت حاصل ہے جو دس برس پہلے جرمنی کو حاصل تھی، اور بالکل اسی وجہ سے، یعنی اس لئے اسکی قومی کارروائیاں اور سب دول کے مقابلہ میں نہایت مرتب و منظم ہیں فرانس کے ارادے اب سب پر ظاہر ہیں۔ وہ ہر اصول جرمنی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اس غرض کے لئے جہاں مناسب ہوتا ہے عہدنامہ ورسائی کی قرار دادوں پر اصرار کرتا ہے جہاں ضرورت ہوتی ہے ان سے بالکل قطع نظر کر لیتا ہے۔ جرمنی کے چاروں طرف اس نے اپنے مددگار بنا رکھے ہیں، جن کی بڑی بڑی فوجوں کو فرانسیسی افسر تعلیم دے رہے ہیں اور جن کا خرچ اس روپیہ سے ادا ہو رہا جو کوئی دوسری قوم اپنے انگریز اور امریکن قرض خواہوں کا قرض اتارنے میں صرف کرتی!

فرانس جرمنی کو تباہ کرنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے؟ تاریخ میں شاذ ہی مثالیں ہوں گی کہ ایک زبان بولنے والی جماعت کو منتشر کر کے مٹا دیا گیا ہو۔ ارمنی، بلغاری

چک، آئرلینڈ اور ویلز کے لوگ طویل محکومیت بلکہ قتل عام کے باوجود بھی اپنی مخصوص روایات کو قایم رکھ سکے۔ بیشک فرانس نے آج جرمنی کو دبا لیا ہے لیکن اسے ہر لحظہ وہر دم اسے دبائے رکھنا پڑے گا اور اس میں جو مدد بھی اپنے پولش، چک، اور دوسرے حلیفوں سے مل سکتی ہے لینی ہوگی۔ ایک آرام دوست اور دولت پسند قوم کے لئے یہ کوئی خوشش آیند توقع نہیں ہے۔

فرانس کی سیاسی نظر جتنی تیز ہے اتنی ہی محدود بھی ہے . . . . فرانس سمجھتا ہے کہ کم سی کم ۲۵ برس تک روس بین الاقوامی معاملات پر کوئی خاص اثر نہیں ڈال سکتا۔ شاید یہ غلطی ہے۔ . . . . فرانس کی کچھ خصوصیت ہی ہو کہ روس کے متعلق غلطی کرتا ہے، والٹیر نے غلطی کی، نپولین نے غلطی کی، ۱۸۷۰ء سے ۱۹۱۴ء تک فرانس کے سرمایہ داروں نے روس میں روپیہ لگا لگا کر کی۔ کیا عجب ہے کہ مشرقی یورپ میں فرانس نے جو سیاسی جال پھیلایا ہے اس میں خود پھنس جائے اور جو فوجیں اس نے وہاں بنائی ہیں وہ اسی پر آپڑیں اور جو سامان جنگ اس نے فراہم کیا ہے وہ خود اسی پر صرف کیا جائے۔

فرانس کے پڑوس میں جو لاطینی ممالک ہیں وہ بھی اس کے مستقبل پر بڑا اثر ڈالیں گے۔ شمالی افریقہ میں فرانس کے پیر پھیلانے کو نہ اسپین اطمینان سے دیکھ سکتا ہے نہ اٹلی۔ . . . .

فرانس مغرب میں اپنے ارادوں کے پورا کرنے کے لئے افریقیوں سے کام لینا چاہتا ہے موسیو پونکارے فرماتے ہیں کہ فرانس ۴ کروڑ آدمیوں کا ملک نہیں اس کی آبادی دس کروڑ ہے اس میں ۶ کروڑ عرب، بربر اور حبشی ہیں۔ اور ان میں سے اکثر مذہب اسلام کے پیرو ہیں شمالی افریقہ کی اس رنگین آبادی کو فرانس فوجی قواعد کے گر سکھا رہا ہے۔ فوجی رلیں بن رہی ہیں تاکہ یہ مسلح افریقی لاکھوں کی تعداد میں یورپ میں پہنچائے جا سکیں۔ لیکن فرانس نہیں سمجھتا کہ مخالف برطانیہ اور مخالف اٹلی اس سیاہ کمک کے یورپ پہنچنے میں بہت کچھ حائل ہو سکتے ہیں۔ اس معاملہ میں بھی فرانسیسی اپنے کو ایسے خطروں میں ڈال رہے ہیں جنکا انہیں خود اندازہ نہیں

اٹلی کی آبادی بڑھ رہی ہے اور وہ بھی رومن سلطنت کے قدیم حصوں کو اپنی اولاد سے آباد
کرنا چاہتا ہے۔ شمال میں اسکی مرفہ الحالی مرکزی یورپ سے وابستہ ہے جسے فرانس تباہ
کرنے کے درپے ہے ...... ہم سمجھتے ہیں کہ جب فرانس کو اپنی کالی کمک کے یورپ
لانے کی سخت ضرورت پڑے گی اس وقت اٹلی اس کی سرحدوں پر ، سمندر کے نیچے
اور ہوا میں ہر جگہ اس پر کاری ضرب لگائے گا۔ یا پھر خود فرانس کا باجگذار بنکر رہے گا۔
اس یورپ کے مقابلہ میں جس میں فرانس غالب ہے برطانیہ کھڑا ہے۔ جنگ کے
طریقوں میں بے حساب تغیر ہوگیا ہے۔ اور دنیا کے متزلزل سیاسی نظاموں میں کسی کا توازن
اس قدر نازک نہیں جتنا کہ سلطنت برطانوی کا۔ یہ بحری جہازوں خصوصاً دخانی جہازوں کی بنائی
ہوئی سلطنت ہے ، اسکی قوت پہلے ہمیشہ بحری قوت رہی ہے جو اب جنگ میں فیصلہ کن چیز
نہیں رہی۔ ہوائی جہازوں نے لندن کو فرانس کی زد میں پہنچا دیا ہے .... فرانس اور برطانیہ
میں جنگ ہوئی تو دونوں کے دارالسلطنتوں کو ہوائی حملوں سے بے شمار نقصانات برداشت
کرنے ہونگے اور اس میں غالبًا پلہ پیرس ہی کا بھاری رہے گا مگر انگلستان کی معاشی زندگی،
اس کے صنعتی اور کان کنی کے مرکز اتنی زد میں نہیں جتنا کہ شمالی فرانس کے صنعتی علاقے۔
سمندر میں غالبًا فرانسیسی تحت البحر کشتیوں کا حملہ جرمن حملہ سے کہیں سخت ہوگا۔ اس وقت
برٹش چینیل کو محفوظ رکھنا مشکل ہوگا اور ممکن ہے فرانس انگلستان کو بھوکوں مارلے۔ لیکن
شاید استقلال کے مقابلہ میں برطانوی آبادی پھر بھی فرانس کو ہرالے گی۔ اور جیسا کہ
ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اٹلی اور اسپین فرانس کے خلاف ہونگے۔ اور غالبًا امریکہ بھی فرانس
کی کالی فوج کے مقابلہ میں برطانیہ کی مدد کو دوڑ پڑے گا۔
فرانس اور برطانیہ کی جنگ یورپ میں فرانس کے تفوق اور سازشوں کا خاتمہ کردیگی۔
لیکن ساتھ ہی لندن کو بھی انگریزی بدلنے والی دنیا میں اب کی سی حیثیت حاصل نہ رہے گی۔
بلکہ کچھ ہو۔ انگلستان اور فرانس میں جنگ ہو یا نہ ہو یہ تو یقینی معلوم ہوتا ہے کہ اگلے ۵۰ سال

میں سلطنت برطانوی کے نظام پر بڑے بڑے بوجھ پڑیں گے۔ اور ممکن ہے یہ ان کی تاب نہ لا سکے۔

سلطنت برطانیہ کو دو اہم مسئلے اب بھی ستا رہے ہیں جنہیں ٹالنے کی کوشش ہوتی ہے پر وہ ٹلتے نہیں۔ ایک تو بے کاری اور ضرورت سے زیادہ آبادی کا مسئلہ ہے۔ فرانس نے برطانیہ کی یورپی تجارت کو جو مستقل نقصان پہنچایا یہ اسکا نتیجہ ہے۔ برطانیہ کی روزی تجارت خارجہ سے تھی اور وہ اپنی کثیر آبادی کو اور کسی طرح نہیں پال سکتا۔ یہ مسئلہ غالباً برطانیہ کے جسم سیاسی میں ایک مستقل سرطان بن کر رہے گا اور برطانیہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس باب میں کیا کرے۔

برطانیہ کے سامنے دوسرا مسئلہ ہندوستانی آبادی کی ترقی ہے۔ یہ آبادی اب پرانے رعب کے طریقوں سے روکے نہیں رکتی۔ وہ ادھر اُدھر نظر کر سکتی ہے۔ سوال کرتی ہے، اخبار پڑھتی ہے، مقابلہ کرتی ہے اور پریشانیاں پیدا کرتی ہے، ہندوستانی تہذیب کی تجدید، ایک نئے ہندوستان کی تعمیر، برطانیہ اور ہندوستان کے بہترین دماغوں کا عظیم الشان اور دلفریب کام ہے۔ لیکن انگریزی حکمراں طبقہ کی قدامت پسندی، تعلیم میں طبقہ وارانہ رقابت، اور اکسفورڈ اور کیمبرج کی تنگ نظر اور مصنوعی روایات سے انگلستان میں جماعتی اور سیاسی تعلیم کو ایسا روک رکھا ہے کہ خود اپنے ملک کے مسائل کو حل کرنیکے لئے تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی ہے چہ جائیکہ یہ ہندوستان کے پیچیدہ اور صبر آزما مسائل کا حل کر سکیں۔ مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی جو ہندوستان میں روز افزوں بغاوتی حملوں کو روکنے کی ضامن ہو سکے۔ ممکن ہے یہ بغاوتیں خود ہندوستان کے لئے بھی تباہ کن ثابت ہوں۔ لیکن ہمارا کام اس وقت یہ بتانا نہیں کہ جو کچھ ہوگا وہ اچھا ہوگا یا برا بلکہ یہ بتلانا ہے کہ آیا ایسا ہونا قرین قیاس ہے یا نہیں۔ چنانچہ اسکا وقوع قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ فرانس اس سے چھپکر یا علانیہ طور سے فائدہ نہ اٹھائے گا۔

ان مایوس کن ملاحظات کے بعد نئی دنیا میں ذرا بہتر توقعات نظر آتی ہیں۔ امریکہ کی نئی آبادیوں کے سامنے بھی بیشک سخت جماعتی اور معاشی کشمکش ہے لیکن یہاں ہمیں عظیم الشان فوجیں تقریباً ختم دولت، زوال آمادہ تعلیم، اور بیکاروں کے امنڈتے ہوئے ٹڈی دل نہیں دکھائی دیتے۔ یہاں ملک کے وسیع علاقے دکھائی دیتے ہیں جہاں وسائل دولت کو ترقی دی جا سکتی ہے، عرصہ تک کے لئے بافراط کھانا ملنے کی امید ہے، زندگی کے خاصے محفوظ رہنے کی توقع ہے، اور نشو و نما اور سعی تعمیری کا حوصلہ ہے۔ فنی اور علمی محرکات روز بروز قوی ہو رہے ہیں خصوصاً ریاستہائے متحدہ میں۔ ممکن ہے کہ پچاس سال کے اندر اندر امریکہ علوم و فنون اور ادب میں دنیا کی سب سے اول قوم ہو جائے۔ اس کے پچاس سال کے اندر اندر شاید شمالی اور جنوبی امریکہ بالترتیب دنیا میں انگریزی اور ہسپانی بولنے والی آبادی والوں کے مرکز بنجائیں۔ اور اگر یان۔ امریکی خوابوں کی تعبیر ہوگئی تو یہ آپس میں مستقل امن کا انتظام بھی ممکن ہے کرلیں۔ غالباً ہمارے سامنے تمدن انسانی کے رو بہ مغرب سفر کی ایک نئی منزل طے ہونے والی ہے۔ جیسے پہلے ایشیا مصر اور یونان سے چل کر عہد عیسوی کے آغاز میں تمدن اٹلی اور گال میں پہنچا اور نشاۃ الثانیہ میں وہاں سے پھر شمال اور مغرب کی طرف چل کر یورپ کے ممالک میں آیا۔

امریکہ سے چل کر بحرالکاہل کو پار کیجئے تو جاپان آتا ہے۔ نہایت ذہین اور آباد ملک جس پر ایک سخت حادثہ قدرتی کا اثر ہے اور عنقریب ہی جس کو جماعتی دشواریوں سے دوچار ہونے کا اندیشہ ہے۔ لیکن جنگ عظیم ان سب ایشیائی قوموں کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی ہے اس لئے کہ اس نے ایشیا پر یورپ کے تسلط کا خاتمہ کر دیا ہے اب غالباً مغربی ریشہ دوانیوں سے محفوظ جاپان اور چین اپنے مسائل کا حل سوچ سکیں گے ریاستہائے امریکہ نے ہمیشہ یہ رویہ رکھا ہے کہ جاپان کے معاملات سیاسی میں مداخلت نہ کیجائے لیکن ساتھ ساتھ نہایت قوی تعلیمی اور صنعتی پروپیگنڈا سے کام لیا ہے۔ ظن غالب

ہے کہ اگر جاپان چین میں یورپ کی نقل کرنا چاہے تو اسے امریکہ کا اثر روک سکے گا چین کی تاریخ میں پچھلی صدی بدبختیوں اور بے حرمتیوں کی صدی رہی ہے، کیا عجب ہے کہ اگلی صدی موقع ترقی کی صدی ہو۔ . . .

اگر یورپ کا تفوق باقی رہتا تو غالباً ہم اپنے مخصوص طریقوں کا تکلیف دہ لباس سارے ایشیا کو پہنا دیتے۔ لیکن ہمارا تفوق ختم ہو چکا۔ ہماری نیابتی حکومت، ہماری شخصی سرمایہ داری ہمارے تعلیمی طریقوں کا بھرم بھی ساتھ ہی اُٹھ جائے گا اور ریل، تار، ٹیلیفون کے ساتھ مطابقت کرنے کے لئے ایشیائی قومیں غالباً اپنے مخصوص طریقہ پر جماعتی تبدیلیوں کی کوشش کرینگی . . . . . چین، جاپان اور ہندوستان میں وسیع پیمانہ پر جماعتی اور معاشی تجربے ہوں گے جن کا مقصد ایک نئی اور وسیع تر جماعت بندی کی مخصوص شکلیں پیدا کرنا ہوگا۔ ہندوستان کی آبادی چونکہ بہت سی زبان بولنے والوں میں منقسم ہے اور اس میں تعلیم کی مساوات بھی نہیں اس لئے یہ شاید جلد ایسا اتحاد نہ پیدا کر سکے جیسے کہ چین۔ دنیا کا ایک بڑا حصہ جس میں ایشیا کے شمالی حصے شامل ہیں یعنی روس اسی قسم کا تجربہ اس وقت کر رہا ہے اور اگرچہ ہم اشتراکیت کی پہلی بھونڈی اور سخت کوشش کی ناکامی کا ذکر بہت سنتے رہتے ہیں تاہم یہ سمجھنا نہایت درجہ حماقت ہوگی کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ روس پھر ۱۹۱۴ء کے معاشی سیاسی اور جماعتی طریقے اختیار کرے۔ تجربہ کرنے والی حکومت ابھی موجود ہے، تجربہ کا جذبہ موجود ہے، تجربہ کی شدید ضرورت موجود ہے . . . . اور ہر فرانس کی ضد جرمن قوم کے بڑے حصہ کو وہی بات باور کرا رہی ہے جو ۱۹۱۷ء میں روس کو باور کرائی گئی تھی یعنی یہ کہ انکے لئے ہمارا موجودہ جماعتی اور معاشی نظام سراپا برا ہے اور بہتر ہے کہ جب ختم ہی ہوتا ہے تو تجربہ کرنے میں جان دیجائے۔ بجائے اس کے کہ کچھ کئے بن جان جائے بیشک اشتراک کی پہلی کوشش ناکام ہو چکی۔ لیکن دریائے رہائن اور سواحل بحر الکاہل کے درمیان ایک نئی اشتراکی کوشش کا امکان ہی نہیں ظن غالب باقی ہے جس نے پچھلی

کوششوں سے بہت سے سبق سیکھ لئے ہوں گے، جس نے شدید تعلیمی کوشش کی ضرورت جان لی ہوگی اور تعمیر میں غور و فکر، رایوں میں سمجھوتہ، اور اختلاف کرنے والوں سے رواداری کے لزوم کو خوب پہچان لیا ہوگا۔ اور اگر روس جیسے تیسے مر پڑ کر ایک تعلیمی جمہوریہ بن گیا جو اور سب حکومتوں سے زیادہ اشتراکی ہوگی تو اس کے محض چل جانے سے اور اس کی کامیابی سے جرمنی پر بہت اثر پڑے گا اور جاپان اور چین بھی اس مثال سے غیر متاثر نہ رہیں گے۔

غزل

(از حضرت جگر)

بربادیٔ ما پرس از آں سینہ فگارے ‏ ‏ ‏ ‏ در عین بہارے کہ جدا شد ز بہارے

دیدم بہ در دیر عجب شعبدہ کارے ‏ ‏ ‏ ‏ میخانہ بدوشے و گلستاں بکنارے

چیزے منگر بر تنِ لاغر ز بہارے ‏ ‏ ‏ ‏ افسانۂ ما پرس ز نوکِ سرِ خارے

اشکم سرِ مژگاں نست کہ شبنم بہ سرِ شاخ ‏ ‏ ‏ ‏ شبنم سرِ شاخ ست کہ منصور بدارے

بلبل ہمہ تن خوں شد و گل شد ہمہ تن چاک ‏ ‏ ‏ ‏ اے وائے بہارے اگر اینست بہارے

صد بار گزشتیم ز ہر مرحلۂ عشق ‏ ‏ ‏ ‏ حیرت بہماں طرز و ادا آئینہ دارے

اغیار بدل خندہ زناں دل بتو مشغول ‏ ‏ ‏ ‏ خلقے پسِ دیوانہ و دیوانہ بکارے

اے خسروِ خوباں نظرے کن ز سرِ مہر
افتادہ بکویت جگرِ سینہ فگارے

خطاب بہ مسلم

(از حضرت اصغر)

کہاں اے مسلم سرگشتہ تو محو تماشا ہے
جب اس آئینۂ ہستی میں تیرا ہی سراپا ہے

ہجوم کفر بھی جنبش ہے تیری زلف برہم کی
فضائے حسن ایماں۔ انعکاس روئے زیبا ہے

جہان آب و گل میں ہے شرار زندگی تجھ سے
تری ذات گرامی ارتقا کا اک ہیولا ہے

تجھی سے اس جہاں میں ہے بنا آئین و حکمت کی
کہ سب مے کی بدولت اصطلاح جام و مینا ہے

ضوابط دین کامل کے وضع ہیں تیری ہی آنکھوں میں
تجھی سے خلق کی تکمیل کا بھی کام لینا ہے

تجھی کو دیکھتا ہوں روح اقوام و مذاہب میں
یہ راز زندگی سن لے کہ ہر قطرہ میں دریا ہے

فرشتوں نے وہاں پر حرز جاں اسکو بنایا ہے
فراز عرش پر تیرا ہی کچھ نقش کف پا ہے

جو ہو للّٰہیت تو دین بنجاتی ہے یہ دنیا
اگر اغراض ہوں تو دین بھی بدتر ز دنیا ہے

فرائض کا رہے احساس عالم کے مظاہر میں
یہی عارف کا مقصد ہے یہی شارع کا ایما ہے

نوا سنج غزل کو کیا غرض ہے درس حکمت کی
یہاں تو ہر نفس سرشار گلبانگ معلیٰ ہے

کنیڈا سے سبق

کنیڈا کی حکومت خود اختیاری کی جدوجہد کی تاریخ ہندوستان کے لئے بہت کچھ سبق آموز ہے۔ جس طرح یہاں مذہب کے، قوموں کے، اور زبان کے اختلافات ہیں اسی طرح کنیڈا میں بھی یہی اختلافات موجود تھے اور ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں کنیڈا کو حکومت خود اختیاری حاصل کرنے میں کسی طرح کی روک نہ ثابت ہوسکیں۔ باہمی عداوتوں اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے ایک وقت یہ خیال بہت کچھ یقین کی حد تک پہنچ گیا تھا کہ کنیڈا ضرور دو حصوں میں منقسم ہو جائیگا اور کوئی ایسا آئین سیاسی نہیں بنایا جاسکیگا جس سے کہ جنوبی اور شمالی حصے جہاں دو مختلف قومیں آباد تھیں متحد ہوکر ایک ہی نظام سیاسی کے ماتحت کام کرسکیں۔ مگر واقعات نے بتا دیا کہ جب اہل کنیڈا کو حکومت خود اختیاری کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ اس پر مجبور ہوئے کہ اپنے باہمی مذہبی اور قومی اختلافات کو رواداری کے ساتھ طے کریں اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کریں۔ چنانچہ وہ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے وہ اس مرتبہ سے ظاہر ہے جو کنیڈا کو آج نہ صرف برٹش ایمپائر بلکہ دنیا کی سیاسیات میں حاصل ہے۔ چنانچہ حال ہی میں جمعیۃ الاقوام کی مستقل انتظامی کمیٹی میں کنیڈا کے نمائندے کو مثل دیگر بڑی بڑی سلطنتوں کے نمائندوں کے جگہ دی گئی ہے۔

کینڈا میں پہلے جو یورپین قوم جاکر آباد ہوئی وہ فرانسیسی تھی۔ سترھویں صدی عیسوی کے شروع میں فرانس کے تباہ شدہ امرا وافسران اور دیگر اشخاص کو گورنمنٹ فرانس نے کنیڈا میں زمین دیکر ترک وطن پر آمادہ کیا۔ چنانچہ ان لوگوں نے جو اپنی مفلوک الحالی اور اپنے وطن میں ٹیکس کی زیادتی کی وجہ سے تنگ آئے ہوئے تھے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور جنوبی کنیڈا میں جاکر سکونت اختیار کرنا شروع کی۔ ابتدا میں وہاں کے اصلی جنگجو باشندوں کے خوف سے یہ لوگ زیادہ تر

ساحل سمندر کے قریب رہے لیکن رفتہ رفتہ اندرون ملک میں پھیلتے گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ فرانس سے کچھ پادری بھی گئے جنہوں نے حسب معمول دسواں حصہ آمدنی کا ان نوآباد لوگوں سے وصول کرنا شروع کیا اور کچھ گرجا وغیرہ قائم کیے۔ جو لوگ فرانس سے آئے تھے اُن کا مذہب رومن کیتھولک تھا اور یہاں آکر انہوں نے فرانسیسی قانون رائج رکھا اور زمین کی تقسیم بھی فیوڈل (منصب داری) طریقہ پر کی۔

فرانسیسیوں کے جنوبی کنیڈا میں آباد ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد انگریز شمالی کنیڈا میں جو غیر آباد تھا آکر بسنا شروع ہوئے اور کچھ جنوبی کنیڈا میں بھی آکر آباد ہوئے۔ ان کی تعداد بہت تیزی سے بڑھنا شروع ہوئی۔ ان میں سے اکثر پیوریٹن (Puritan) فرقہ سے تعلق رکھتے تھے جو رومن کیتھولک سے سخت تعصب رکھتا تھا۔ باقی پروٹسٹینٹ تھے۔ یہ انگریز اس قانون کے جو انگلستان میں رائج تھا پابند ہوئے اور انہوں نے اپنا نظام سیاسی انگلستان کے نمونہ پر قائم کیا۔ اس طرح پر جنوبی اور شمالی کنیڈا میں دو مختلف قومیں آکر آباد ہونا شروع ہوئیں جو مذہب میں نہ صرف جدا تھیں بلکہ جن میں سخت تعصب کی وجہ سے آپس میں بے حد دشمنی تھی۔ ان کی زبان، تاریخی روایات، قانون اور تمدن ایک دوسرے سے بالکل جدا تھے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں فرانس اور انگلستان میں باہمی رقابت تھی اور جنگ چھڑی ہوئی تھی اس وجہ سے کنیڈا کے دونوں حصوں میں جہاں یہ قومیں آباد تھیں لڑائی رہی۔ ایک عرصہ کی لڑائی کے بعد فرانس نے ۱۷۶۳ء میں پیرس کے صلحنامہ کے مطابق جنوبی کنیڈا کو انگلستان کے حوالہ کر دیا۔ باشندگانِ جنوبی کنیڈا کو مذہبی آزادی "جہانتک کہ قانون انگریزی اجازت دے" دی گئی لیکن اس بات کی تشریح نہیں کیگئی کہ کونسا قانون رائج کیا جائے گا آیا فرانسیسی قانون جو اس وقت تک رائج تھا مروج رہے گا یا فاتح قوم کا قانون یعنی قانون انگریزی رائج کیا جائیگا۔ چنانچہ ۱۷۶۳ء سے ۱۷۷۴ء تک جس وقت پہلا آئین سیاسی کنیڈا کے لئے پاس ہوا گورنران صوبجات اعلانِ شاہی کے مطابق حکومت کرتے رہے جنہیں عدالتیں اور نظام عدالت کو انگلستان کے طرز پر ترتیب دینے کی ہدایت کیگئی تھی۔ مگر یہ زمانہ حکومت زیادہ تر مطلق العنانی کا تھا اور اس سے

فرانسیسیوں میں بہت بے چینی پھیلی۔ بالآخر ۱۷۷۴ء میں انگریزی پارلیمنٹ نے پہلا آئین سیاسی پاس کیا جس میں فرانسیسیوں کی دلجوئی کرنے کی کوشش کی اور ان کو Test Act یعنی رومن کیتھولک مذہب سے بیزاری اور بے تعلقی کے اظہار سے مستثنیٰ کیا گیا اور فرانسیسی سول قانون مروج کیا گیا۔ اس سے انگریزوں میں بے چینی پھیل گئی کیونکہ انگریزی قانون کو بدل دیا گیا تھا۔ یہ زمانہ وہی تھا جب امریکہ اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ ۱۷۸۳ء میں جب امریکہ کو آزادی ملی تو جو لوگ امریکہ کے خلاف لڑ رہے تھے ان کو وہاں رہنا مشکل ہو گیا۔ اور ان کی ایک بڑی تعداد جس میں گورنر اور دیگر افسران حکومت شامل تھے کنیڈا میں آکر آباد ہونا شروع ہوئے۔ ان لوگوں نے جن کو "متحدہ حکومت کے وفادار" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا ان ہی حقوق کا مطالبہ شروع کیا جو ان کو بحیثیت انگریز ہونے کے حاصل تھے۔ جیسے جیسے ان لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی ویسے ان کا ایجیٹیشن بڑھتا گیا۔ بالآخر ۱۷۹۱ء میں ایک اور آئین سیاسی پاس کیا گیا جس میں گورنر یا لفٹنٹ گورنر کو آئندہ لیجسلیٹو کونسل اور اسمبلی کی رائے کے مطابق قانون بنانے کی ہدایت کی گئی۔ لیکن گورنر کو ایسے قانون کی منظوری یا نامنظوری یا تا اطلاع ہوم گورنمنٹ محفوظ رکھنے کا پورا اختیار دیا گیا۔ کنیڈا کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا اور ہر ایک کی کونسل اور اسمبلی جدا قائم کی گئی۔ شمالی کنیڈا کے لئے کم از کم سات اور جنوبی کنیڈا کی کم از کم پندرہ کی تعداد کونسل کے لئے مقرر کی گئی اور اسمبلی کے ممبران کی تعداد کم از کم سولہ شمالی کنیڈا کے لئے اور پچاس جنوبی کنیڈا کے لئے مقرر ہوئی۔ کونسل کے ممبران کا تقرر گورنر کی نامزدگی پر رکھا گیا اور اسمبلی کے ممبران کا تقرر بذریعہ انتخاب کے رکھا گیا۔

اس ایکٹ کا مقابلہ بہت کچھ ہندوستان کے ان اصلاحات سے ہو سکتا ہے جن کا نفاذ منٹو مارلے اسکیم کے مطابق ہوا۔ جس طرح یہاں اسی طرح کنیڈا میں نیابتی حکومت بغیر ذمہ دار حکومت کے قائم کی گئی۔

اس خطرہ کا احساس کہ آئندہ چلکر فرانسیسی جو جنوبی کنیڈا میں اکثریت میں تھے اپنی تعداد

سے فائدہ اُٹھا کر گورنمنٹ کو مشکلات میں ڈالیں گے گورنر کر نگر کو ہوا اور اُس نے ۱۸۳۸ء میں لارڈ گیلنگ ریگ پر جو وزیر نوآبادیات تھے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا "لیڈران کنیڈا اس بات کا یقین رکھتے ہیں یا یقین رکھنا چاہتے ہیں کہ یہاں بھی ایک وزارت ہے اور انگلستان کے دستور العمل کی نظیر پر وہ وزارت اسمبلی کو جواب دہ ہے۔ یہ میرے لئے ضروری نہیں کہ میں یور لارڈ شپ کو ان نتائج سے آگاہ کروں جو ان خیالات سے پیدا ہوں گے۔"

اس قسم کی نیابتی مگر غیر ذمہ دارانہ حکومت کا نتیجہ ہمیشہ بے چینی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے چنانچہ کنیڈا میں اس بے چینی نے ایک کشمکش کی صورت درمیان گورنمنٹ اور فرانسیسیوں کے اختیار کی۔ کئی ایک گورنران کو اسمبلی کو متعدد بار برخاست کر دینا پڑا لیکن ہر ایک انتخاب کا نتیجہ ایک ہی ہوا یعنی اسمبلی میں مخالفین گورنمنٹ کی تعداد غالب رہی۔ ایک طرف بموجب ایکٹ کے اسمبلی کا قیام ضروری دوسری طرف اسمبلی کے ممبران کی مخالفانہ روش سے گورنمنٹ کا چلانا سخت مشکل کر دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ انگریز جو جنوبی کنیڈا میں آباد ہوئے تھے وہ گو تعداد میں کم تھے لیکن باثر اور خوشحال تھے۔ ان کو ہمدردی اپنے اہل وطن سے تھی اور اسمبلی اور گورنمنٹ کی کشمکش میں قدرتی طور پر وہ گورنمنٹ کے ساتھ تھے۔ اس وجہ سے فرانسیسی اور ان انگریزوں میں بھی مخالفت اور دشمنی شروع ہو گئی۔

اس کشمکش کے دوران میں بعض گورنران نے رواداری اور دلجوئی کی پالیسی بھی اختیار کی اور فرانسیسیوں کی مخالفت کو مختلف طریقہ سے مٹانا چاہا۔ اس پالیسی کا اثر فوری ضرور ہوا اور مخالفت کچھ مدت کے لئے ٹل گئی لیکن جیسے ہی ایسے گورنر کا دور حکومت ختم ہوا ویسے ہی مخالفت پھر شروع ہو گئی۔

اس کا اندازہ کہ جوش اور مخالفت میں ایک پارٹی جا و بیجا مطالبہ کرنے لگتی تھی اور اس کی کوشش کرتی تھی کہ اپنی بات کو منوائے مندرجہ ذیل واقعہ سے ہو گا۔

۱۸۲۵ء میں اسمبلی نے یہ مطالبہ کیا کہ اس کے ہر ایک ممبر کو یہ حق رہے کہ وہ جس مصرف کے لئے چاہے روپیہ کا مطالبہ کرے اور صوبہ کے تمام آمدنی و خرچ پر اسمبلی کا پورا اختیار ہو گا۔ ظاہر ہے

کہ قانونی طور پر اسمبلی کا پہلا مطالبہ سراسر بیجا تھا کیونکہ کسی نیابتی جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ روپیہ کے صرف کرنے کا طریقہ ہر ایک ممبر کی رائے پر منحصر ہو۔ ہر ممبر پر چونکہ انتظامی ذمہ داری نہیں ہوتی اس لئے وہ اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس کا مطالبہ کہاں تک جائز ہوگا کیونکہ ہر ایک یہی خیال کریگا کہ اس کی تجویز بہت ضروری ہے اور اسی پر روپیہ صرف ہونا چاہیئے اسی لئے تمام ذمہ دار نیابتی جماعتوں میں روپیہ کی آمد و صرف کا اختیار انتظامی جماعت یا گورنمنٹ کو بشرط منظوری کُل جماعت کے دیا جاتا ہے۔ جزوی ترمیم البتہ ہوسکتی ہے لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ بجٹ ہر ایک ممبر کی مرضی سے بنایا جائے۔ اگر اس اصول سے دیکھا جائے تو کنیڈا کی اسمبلی کا پہلا مطالبہ بالکل بیجا تھا اور گورنمنٹ اس کو کسی صورت میں منظور نہیں کرسکتی تھی۔ برخلاف اس کے اس کا دوسرا مطالبہ بالکل بجا تھا لیکن چونکہ گورنمنٹ اور اسمبلی میں کشمکش تھی اس لئے کوئی فریق بھی دوسرے کی بات کو چاہے وہ کتنی معقول کیوں نہ ہو سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ گورنر ڈلہوزی نے اسمبلی کو برخاست کیا۔

اس وقت چونکہ جوش بہت بڑھا ہوا تھا اس لئے اس انتخاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنر کے موافقین چھ ماہ سے زیادہ منتخب نہ ہوسکے۔ اس الیکشن کے بعد فرانسیسی لیڈر پاپینیو کو اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا لیکن گورنر نے اس کو نامنظور کیا۔ جب اسمبلی نے اسی کے صدر بنائے جانے کے متعلق ایڈریس پیش کیا تو اسمبلی کو پھر برخاست کردیا۔ اس پر گورنر کے خلاف ایک زبردست ایجی ٹیشن اخبارات میں اور پلیٹ فارم پر برپا ہوا اور ایک درخواست گورنر کے خلاف جس پر بہت سے باشندگان کے دستخط کرائے گئے انگلستان بھیجنے کے لئے تیار کی گئی۔ اس کے برخلاف انگریز باشندوں کی طرف سے اسمبلی کی زیادتیوں کی شکایت کی درخواست مرتب کیگئی۔ چنانچہ انگریزی گورنمنٹ نے ایک کمیٹی تحقیقات کے لئے مقرر کردی۔ گورنر ڈلہوزی نے چاہا کہ انگلستان کے دارالامراء میں جاکر اپنی صفائی پیش کرے لیکن ان کو ہندوستان کا کمانڈر انچیف بناکر بھیج دیا گیا۔ ڈلہوزی کے بعد جو گورنران آئے ان میں سے اکثر نے فرانسیسیوں کی دلجوئی کی کوشش کی۔

فرانسیسی لیڈر پاپینیو کو صدر منظور کیا گیا اور کچھ اور مراعات بھی دی گئیں لیکن اسمبلی کی کوشش برابر یہی رہی کہ اس کی مالیات پر پورا اختیار دیا جائے۔ اور اس کی یہ جدوجہد برابر جاری رہی۔ کبھی اسمیں زیادتی ہو جاتی تھی اور کبھی کمی جو زیادہ تر گورنر کے طرزعمل پر منحصر تھا۔

الغرض یہ کشمکش حاکم و محکوم کے درمیان ایک عرصہ تک رہی اور اس میں اکثر فرانسیسی لیڈر جلاوطن اور قید ہوئے۔ مگر بالآخر ان کی مستقل مزاجی رنگ لائی اور وہ اپنا مقصد پانے میں کامیاب ہوئے۔

کنیڈا کی حکومت خود اختیاری کی جدوجہد کی تاریخ سے ہندوستان بہت کچھ سبق حاصل کرسکتا ہے۔ کنیڈا کا دستورالعمل جس سے وہاں حکومت خود اختیاری قائم ہوئی انگریزی پارلیمنٹ کا تجویز کردہ نہیں ہے بلکہ اُس کا خاکہ خود کنیڈا کے تمام صوبوں نے ملکر طے کیا تھا اور اپنی اسکیم کو لیکر نمایندگان کنیڈا لندن گئے تھے اور انگریزی پارلیمنٹ نے جزدی ترمیموں کے ساتھ اسکو منظور کیا۔ اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو حکومت خود اختیاری اگر وہ قوم خود تیار نہ ہو تو نہیں دے سکتی۔ حکومت خود اختیاری حاصل کرنے کے لئے اپنے میں قابلیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

آج ہندوستانیوں کے سامنے اہل کنیڈا کی مثال موجود ہے۔ جس طرح یہاں قومیت زبان اور مذاہب کے اختلافات ہیں اسی طرح کنیڈا میں بھی یہ سب چیزیں موجود تھیں اور ہیں۔ لیکن یہ اختلافات کنیڈا کو حکومت خود اختیاری حاصل کرنے سے زیادہ عرصہ تک روک نہ سکے۔ کاش ہم لوگ بھی اس سے سبق حاصل کریں اور بجائے ایک دوسرے کو برا کہنے کے اپنے اختلافات کو باہم رواداری سے مٹانیکی کوشش اور متحد ہو کر اپنے ملک کی بہتری اور بہبودی کی سعی کریں۔

ریل کی سڑک اور قبرستان

بیارنسن، ناروے کی تاریخ ادبیات میں وہ پہلا صاحب قلم ہے جس نے امرا کے طبقہ کو اپنے زور بازو سے ترقی کرنے کی تلقین کی۔ اس کا سال ولادت ۱۸۳۲ء ہے۔ ۱۸۶۰ء میں اُس کی شہرہ آفاق تصنیف ”آرنے“ منظر عام پر آئی۔ یہ افسانہ دنیائے ادب میں ایک ”نشان راہ“ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قصہ کا موضوع نشاط حیات ہے۔ وہ اپنے وطن کی جمہوری پارٹی کا قائد اعظم تھا۔ اور وہی نارؔوے اور سوئیڈن کی علیحدگی کی سیاسی تحریک کا علمبردار بنا۔ نقاد فن برانڈے کہتا ہے کہ ”اپنے اہل ملک کے مجمع کے اندر محض اُس کے نام کا تذکرہ گویا علم قومی کو بلند کر دینے کے ہم معنی ہے!“

اُس کی ادبی زندگی دو جدا جدا دوروں میں منقسم ہے: پہلے دور کی تحریریں مذہبیت اور عشق پر ہیں، انہی کے ذیل میں اُس نے نارؔوے کا ترانہ ملّی بھی لکھا۔ دوسرے دور کا آغاز اُس وقت سے ہوتا ہے جبکہ اُس کے متخیلہ میں زیادہ واقعیت اور نقادی پیدا ہو گئی تھی اور طرز عمل میں زعیمانہ اقدام اور مبازرطلبی آ گئی تھی۔ زبردست تخیل، عشق صداقت، مفرط مگر مخلصانہ جوش سے اُس کی قلمی نگارشیں مایہ دار ہیں۔ بجارنسن کو ”ادبیات نارؔوے میں قومی ڈرامے کا خالق“ کہا گیا ہے۔ اُس کے دیگر ادبی خطابات والقاب یہ ہیں:۔

”ابسن ثانی“

”نارؔوے کا وکٹر ہیوگو“

(۱)

تلّا آکرے کلیسائی حلقے کے ایک قدیم خاندان کا فرد تھا جو رفاہ عام کے کاموں میں

اپنی قابلیت اور انہماک کے لئے مشہور تھا۔ اُس کے باپ نے بہت جد و جہد کرکے اور مشکلات و شدائد کی بہت سی منزلیں طے کر کے پادری کا عہدہ حاصل کرلیا تھا۔ یہ شخص ابھی حال میں مرچکا تھا اور چونکہ بیوہ ایک دہقانی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اس لئے بچوں کی پرورش اسی قسم کی آب و ہوا میں ہوئی تھی، چنانچہ نڈ کو بھی اُس تعلیم سے زیادہ کوئی تعلیم میسر نہ آئی جو عام طور پر سرکاری مدرسوں کا مبلغ علم ہوتا ہے۔ لیکن نڈ کے باپ کے نانگی کتبخانہ نے اس بچے کے اندر اُس عہد طفلی ہی میں علم کا ذوق پیدا کر دیا تھا۔ اس اشتیاق علمی کو مزید تحریک ہنرک درجیلینڈ کی طرف سے ہوئی، جو نڈ کا دوست تھا اور اکثر اُس کے ہاں اُس کی آمد و رفت تھی۔ یہ شخص اس نوجوان کو زراعتی تخم کے علاوہ کتابیں بھی بھیجتا اور عام طور پر انکے معاملات میں اپنے مشورہ سے قابل قدر امداد بہم پہنچاتا۔ چنانچہ درجیلینڈ ہی کی اثر آفرینی سے نڈ نے ابتدا ہی میں ایک کلب قائم کر دیا۔ جس کے اغراض و مقاصد آغاز افتتاح کے بعد ایک عرصہ تک بہت ہی ہمہ گیر اور گوناگوں قسم کے رہے، چنانچہ بطور مثال کے یہ واقعہ بیان کیا جا سکتا ہے کہ "خطابت و مناظرہ کی مشق سے لیکر دستور حکومت کا مطالعہ تک اُس کے حلقۂ کار میں داخل تھا! لیکن جو بعد کے دور میں ایک علمی قسم کی "مجلس فلاحین" کی شکل میں تبدیل ہو گیا جو گرد و پیش کے تمام زرعی علاقہ کے لئے ایک استفادہ گاہ تھی۔ درجیلینڈ ہی کے تعمیل ارشاد میں اُس نے ایک کتبخانہ کی بھی گرجا کے اندر بنیاد ڈالدی، اور اپنے باپ کا ذخیرۂ کتب اس نو بنیاد دار المطالعہ کو اس کے "والدین عطیہ" کے طور پر نذر کر دیا! اسی دائرہ علمی کی ایک دوسری تجویز کو لبیک کہتے ہوئے اُس نے اپنی مملوکہ اراضی پر ایک "سنڈے اسکول" (اتوار کا مدرسہ) بھی قائم کر دیا تاکہ جو لوگ نوشت و خواند، حساب کتاب، اور تاریخ وغیرہ مضامین پڑھنا چاہیں اُنکی ضروریات کو یہ درسگاہ پورا کرے۔ ان پے در پے خدمات کی وجہ سے لوگوں کی توجہ نڈ کی ذات کی طرف منعطف ہوئی چنانچہ اس رسوخ ہر دلعزیزی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ گرجا کی جماعت نگراں کار کا ممبر منتخب ہو گیا اور پھر بہت جلد اُس کی صدارت کے منصب پر فائز ہو گیا! ان اختیارات و حقوق کے ساتھ وہ

مدارس و مکاتب کے معاملے میں بہت عمیق دلچسپی لینے لگا۔ نڈ کی نگرانی و رہنمائی میں ان تعلیم گاہوں نے بہت نمایاں ترقی کی اور وہ بہت فروغ و اوج پا گئیں!

نڈآکرے ایک پست قامت چست و چابکدست، اپنی حرکات و سکنات میں بہت تیز و شتاب کار شخص تھا۔ اُس کی آنکھیں بیچینی کا آئینہ تھیں اور کاروبار میں غیر معمولی انہماک و عدیم الفرصتی کی وجہ سے اس کے بال ہمیشہ پریشان اور ناآشنائے شانہ رہا کرتے تھے۔ اُس کے ہونٹ بڑے بڑے تھے۔ جو دائمی حرکت وارتعاش میں رہتے تھے خوبصورت اور مضبوط دانتوں کی قطاریں پیچھے سے نظر آتی تھیں، اور جس وقت نڈ کے منہ سے صاف اور واضح لب ولہجہ میں الفاظ نکلتے تھے تو براق اور جلادار دانت ایک برق وشں انداز میں اس طرح چمک چمک جاتے تھے جس طرح جلتی ہوئی لکڑی میں سے شرارے چٹک چٹک کر اُڑتے ہیں!

اس کے حلقہ تربیت میں جو شخص صف اول میں تھا اور جو اس کی تعلیم و فیضان سے سب سے زیادہ مستفید ہوا تھا وہ اسکا ہمسایہ لارس ہگسٹیڈ تھا۔ لارس کی عمر نڈ سے کچھ ہی کم ہوگی لیکن اس کی رفتار آخرالذکر کی طرح! وہ برق کی طرح نہ تھی۔ نڈ کے مطالعہ میں جو جو چیزیں آتی تھیں یا جو جو خیالات اُس کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے تھے ان پر وہ لارس کے سامنے گفتگو کرنے میں ایک خاص ذوق محسوس کرتا تھا کیونکہ یہ شخص جو ایک خاموش و متین اور صاحب فکر آدمی تھا نڈ کے خطبات کو ہمہ تن گوش ہو کے سنا کرتا تھا۔ اس استفادہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ لارس ایک صائب الرائے شخص بن گیا! دونوں کے تعلقات اس قدر بڑھے کہ جبتک نڈ لارس سے پہلے استمزاج نہ کرلیتا تھا، کسی اہم کام کا اقدام نہ کرتا تھا۔ باہمی صلاح و مشورے کے بعد نڈ کی ابتدائی تجویز میں اکثر بہت کچھ ترمیم و تنسیخ اور قطع و برید ہوجایا کرتی تھی! اب نڈ نے اپنے اس محرم راز اور یار غار کو کلیسا کی جمعیۃ نگران کار میں بھی داخل کرلیا، اور رفتہ رفتہ ایک عرصہ کے بعد لارس ہر اُس کام میں شریک و سہیم ہوگیا۔ جس میں نڈ کا کوئی حصہ ہوا ہو ہمیشہ

ساتھ ساتھ جمعیتہ کے جلسوں میں شرکت کے لئے جایا کرتے تھے۔ جلسوں کی ہنگامہ آرائیوں لارس کبھی تقریر نہ کرتا تھا، لیکن گھر سے جلسہ گاہ تک کے راستہ میں دونوں طرف نڈ اُس کے آرا، وخیالات معاملہ زیر بحث کے متعلق معلوم کیا کرتا تھا۔ دونوں ہمزاد دوست "ایک جان دو قالب" سمجھے جاتے تھے!

. . . .

موسم خزاں میں ایکدن جمعیتہ کلیسا کا جلسہ طلب کیا گیا جس کا موضوع فکر وبحث دیگر مسائل کے علاوہ ایک تجویز تھی جو ناظر کی طرف سے موصول ہوئی تھی اور جس کا منشا یہ تھا کہ گرجا کے اناج کے ذخیرہ کو فروخت کر ڈالا جائے اور اُس سے جو رقم حاصل ہو اُس سے ایک چھوٹا سا سیونگ بنک (خزینہ پس انداز) قائم کیا جائے۔ نڈ آکرے جو میر مجلس تھا بلاشبہ اس تجویز کو قبول کرلیتا بشرطیکہ اس کو صاحب تجویز کی اصابت رائے اور خلوص نیت پر اعتماد ہوتا، لیکن وہ اس معاملہ میں بہت غیر مطمئن تھا، کچھ تو اسی وجہ سے کہ تجویز کی تحریک ناظر کی طرف سے ہوئی تھی جس کو در جیلینڈ اچھا آدمی نہ سمجھتا تھا اور جو لامحالا نڈ کا بھی کبھی منظور نظر نہ ہوسکتا تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ غلہ کا یہ ذخیرہ خانہ نڈ کے دادا کا قائم کیا ہوا تھا اور اُسی نے اُس کو گرجا کے نام وقف کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ نڈ کچھ اس خیال کی طرف مائل ہو رہا تھا کہ ناظر کی اس تجویز میں ایک شرارت مضمر ہے اور اُس کا مقصود نڈ کی توہین کرنا ہے!

یہی وجہ تھی کہ نڈ نے اپنے خدشات کا ذکر کسی سے کرنا مناسب نہ سمجھا، خود لارس سے بھی اس نے ان خیالات کو صیغۂ راز میں رکھا! اور جیسا کہ معلوم ہے لارس کی یہ عادت نہ تھی کہ وہ کسی ایسے مسئلہ پر لب کشائی کرے جس کی سلسلہ جنبانی پہلے کسی اور نے نہ کر دی ہو!

خیر جلسہ منعقد ہوا اور صدر مجلس نڈ آکرے نے تجویز مذکور کو کسی ذاتی رائے زنی یا اضافہ کے پڑھا، لیکن حسب معمول اُس کی آنکھیں لارس کو ڈھونڈھ رہی تھیں، جو وہیں کہیں بیٹھا یا کھڑا ہوا ہوتا تھا۔ لارس کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ وہ ایک تنکا اپنے دانتوں میں پکڑے

رہتا تھا، جب کبھی وہ گفتگو کرتا ہوتا تھا تو اُس کا منہ کبھی اس تنکے سے خالی نہ ہوتا تھا! اس تنکے کے دو مصرف تھے: یا تو وہ معمولی "دندان کن" کا کام دیتا تھا یا یونہی لارس کے منہ کے کسی گوشہ میں پڑا رہتا تھا اور جس وقت وہ تیزی سے گرم تقریر ہوتا تھا تو یہ تنکا اُسی کی تناسب تیزی سے گردش کرتا تھا اور جس موضوع گفتگو میں وہ کسی جوش وجذبہ کو محسوس نہ کرتا تھا تو اس میں تنکے کی حرکت بھی آہستہ ہو جاتی تھی! ہنڈ نے آج جلسے میں جو لارس پر نظر ڈالی تو وہ یہ دیکھکر سخت حیرت زدہ رہ گیا کہ تنکے کا آلۂ مقیاس الحرارت بڑی تیز گردشیں کر رہا ہے! اور یہ دماغی تلاطم کی علامت تھی!

"تمہارا کیا خیال ہے؟ ہمیں اس تجویز کو منظور کر لینا چاہئے؟" ہنڈ نے آخر پوچھا۔

لارس نے بڑی بے فکری اور بے اعتنائی سے جواب دیا: "بیشک"۔

سارا جلسہ جو اس راز سے آشنا تھا کہ ہنڈ کے اس معاملہ میں کیا خیالات ہیں۔ لارس کی اس رائے پر مبہوت وحیران رہ گیا! لیکن لارس نے اس کے سوا کچھ اور نہ کہا اور نہ اُس سے پھر اس پر کوئی مزید توجیہہ طلب کی گئی۔ ہنڈ نے دفعتاً ایک دوسری بحث چھیڑ دی گویا کہ کچھ ہوا ہی نہیں! اور پھر اُس نے اُس وقت تک اس معاملہ کو زیر بحث لانے کے لئے دوبارہ پیش نہ کیا جبتک جلسہ کا وقت بالکل ختم ہونے کے قریب نہ آگیا، اور پھر بظاہر بلا کسی تعلق خاطر کے ایک تجاہل عارفانہ کے ساتھ حاضرین جلسہ کو مخاطب کرکے پوچھا کہ کیا یہ قرین مصلحت نہ ہوگا کہ اس تجویز کو ناظر کے پاس واپس بھیجا جائے تاکہ وہ اُس پر مزید غور اور نظر ثانی کر لیں اس لئے کہ یہ تجویز عام طور لوگوں کے لئے پسندیدہ نہیں ہے کیونکہ وہ محلے کے گودام کو اپنی ایک قیمتی متاع سمجھتے ہیں کسی شخص نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس پر ہنڈ نے سوال کیا کہ آیا میں اس ریزولیوشن کو داخل دفتر کر دوں؟ بہتر ہے کہ اُس کی نسبت مجلس یہی فتوے صادر کردے کہ یہ کوئی دانشمندانہ تجویز نہیں ہے۔

"مگر ایک اختلافی رائے کو بھی درج کر لیجئے" لارس نے کہا۔

"نہیں دورایوں کو" ایک دوسرا شخص فوراً بولا۔

"نہیں تین کو" ایک تیسری آواز آئی!

اور قبل اس کے کہ صدر جلسہ اس ناگہانی انقلاب کو محسوس کر سکے مجلس کی اکثریت نے تجویز کے حق میں رائے دیدی!

نڈ بالکل سراسیمہ ہو گیا! اُس کے حواس ایسے باختہ ہوئے کہ وہ مخالفت وغیرہ کرنا سب بھول گیا! اُس نے جلسہ کی روداد کو قلمبند کر لیا اور آہستہ آواز میں اس فیصلہ کا اعلان کیا:

"تجویز ملتوی کیجاتی ہے"

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اُسپر خشمناکی کے آثار طاری ہو گئے۔ وہ کھڑا ہو گیا اور مجلس کی "کتاب روداد" میز پر پٹکدی! وہ مجلس نمائندگان کے ایک دوسرے جلسہ میں اس سوال کو ایک مرتبہ پھر اٹھانا چاہتا تھا۔ باہر صحن میں جاکر اس نے گھوڑے کو گاڑی میں جوڑا اور لارس اس کے پہلو میں اپنی معلومہ نشست پر آکر بیٹھ گیا! گھر جاتے ہوئے مختلف مسائل پر اُن کی گفتگو ہوتی رہی لیکن اس بحث کو جو ہر لحظہ دونوں کے پیش نظر تھا ذرا بھی مس نہ کیا گیا!

دوسرے دن نڈ کی بیوی، لارس کی بیوی کی تلاش میں نکلی تاکہ معلوم کرے کہ آیا ان دونوں کے درمیان کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے اس لئے کہ اُس نے محسوس کیا تھا کہ گھر آکر آج نڈ نے کچھ عجیب حرکتیں کیں! تھوڑا راستہ طے کرنے پر اس کو لارس کی بیوی مل گئی جو خود بھی اُسی کے پاس آرہی تھی اور اُس کی ملاقات کا مقصود بھی اسی معمے کا حل کرانا تھا، اس لئے کہ اُس نے بھی اپنے شوہر پر اُس روز خلاف معمول بعض کیفیات و واردات دیکھی تھیں!

لارس کی بیوی ایک خاموش، شرمیلی عورت تھی۔ وہ کسی قدر ڈرنے والا مزاج بھی رکھتی تھی اور اس خوف کا احساس وہ سخت الفاظ کو سنکر اس قدر نہ کرتی تھی جس قدر کہ لوگوں کی خاموشی اُس کے لئے مرعوب کن ہوتی تھی! لارس کے اصول ناراضگی کا اُس کے ساتھ یہی رنگ تھا! بخلاف اس کے نڈ کی بیوی اُس کے ساتھ نسبتہً زیادہ مانوس تھی، وہ آزادی سے ہنس

کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھی، اور اپنے شوہر کے ساتھ اس کی بات چیت کا موضوع اکثر یہ مجلس نابینین ہی ہوتی تھی کیونکہ ابھی چند روز سے نڈ اُس کی کارروائیوں میں زیادہ منہمک نظر آتا تھا اور اُس کی مصروفیتوں کا بیشتر حصہ انہیں سرگرمیوں کی نذر ہوتا تھا! نڈ کی بیوی اپنے شوہر کی ان عدیم الفرصتیوں میں اپنی محبت کے لئے ایک گونہ بے اعتنائی مشاہدہ کر رہی تھی اور یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ وہ بچوں کی فکر سے بھی غافل نظر آتا ہے۔ چنانچہ وہ اس انجمن کے ساتھ ایسی ہی رقابت رکھتی تھی جیسی کہ کسی عورت کو کسی عورت کے خلاف ہوا کرتی ہے! وہ راتوں کو اس ''موئی'' انجمن کا خیال کر کر کے رویا کرتی اور انہیں اپنے شوہر سے اُسکا ذکر کر کے جھگڑا کیا کرتی! اسی وجہ سے آج کہ پہلی مرتبہ نڈ اپنی اس محبوب مجلس سے کبیدہ خاطر لوٹا تھا، اُس نے خود اُس سے اس کی بابت کوئی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن بہت جلد وہ اس واقعہ سے نڈ سے بھی زیادہ خلجان و خلش محسوس کرنے لگی اور جبتک وہ اس تمام ماجرے کو معلوم نہ کر لے وہ چین سے بیٹھنے والی عورت نہ تھی! چنانچہ جب لارس کی بیوی نے بھی اپنی لاعلمی ظاہر کی اور مطلوبہ معلومات اُس سے حاصل نہ ہوئیں تو وہ گرجا کو دوڑی ہوئی گئی تاکہ وہاں کچھ اس کا پتہ لگائے۔ خیر یہاں آ کر اُس کو یہ حقیقت معلوم ہو گئی۔ قصہ کی نوعیت سے خبردار ہو کر وہ فوراً اپنے خاوند کی رائے کی ہمنوا ہو گئی اور اُس نے اپنے دل میں کہا کہ لارس اگر شرارت نہیں کر رہا ہے تو کم از کم اُسکا طرز عمل ناقابل فہم تو ضرور ہے! لیکن جب اُس نے نڈ کے سامنے اُسکی وکالت کی تو اُس پر یہ حقیقت بے نقاب ہوئی کہ دونوں کے دلوں میں اب بھی کوئی میل نہیں ہے اور نڈ اب بھی اُسی گرمجوشی کے ساتھ لارس سے وابستۂ محبت ہے!!

آخر کار مجلس نابینین کا اجلاس ہوا۔ اُسی دن صبح کو لارس ہاگسٹیڈ گاڑی میں سوار ہو کر آکرے کے ہاں پہنچ گیا، نڈ بھی باہر آگیا اور لارس کے بازو میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دونوں کے درمیان روزمرہ کی معمولی صاحب سلامت ہوئی۔ لیکن اور دنوں کے مقابلہ میں وہ آپس میں کم ہمکلام ہوئے، اور مسئلہ معلومہ کے متعلق تو ایک حرف بھی زبان پر نہ آیا مجلس کے سارے ارکان

آج حاضر تھے۔ بعض دوسرے لوگ تماشائی کی حیثیت سے بھی آئے تھے! لیکن نڈ نے غیر خوشگواری سے اس بات کو دیکھا کیونکہ یہ اس بات کی علامت تھی کہ شہر میں عام طور سے اس معاملہ کے متعلق اشتیاق و دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے! اور اُس کی کافی تشہیر ہو چکی ہے!

لارس حسب معمول اپنے "تنکے" سے مسلح تھا! وہ آتشدان کے قریب کھڑا ہوا تھا اس لئے کہ اب سردی زیادہ پڑنے لگی تھی۔ صدر نے تجویز کو پڑھا، مگر ایک دبی ہوئی آواز اور محتاط لہجہ میں! اور ساتھ ہی ساتھ اس ریمارک کا بھی اضافہ کیا کہ "یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس تجویز کے مصنف ناظر صاحب ہیں جن کی طرف سے کچھ زیادہ اصابت رائے کی توقع نہیں کیجا سکتی۔ حاضرین کو خوب معلوم ہے کہ یہ عمارت بطور "عطیہ" کے گرجا کو ملی تھی اور گرجا کی روایات میں اس قسم کے عطایا کا بیع و انتقال کی کوئی سابقہ نظیر نہیں، بالخصوص ایسی حالت میں کہ اس غیر معمولی کارروائی کی کوئی ضرورت بھی نہ ہو!"

لارس جس نے اس سے پہلے کبھی کسی جلسہ میں تقریر نہ کی تھی۔ اب پلیٹ فارم (منبر) پر آیا! سب لوگ تصویر حیرت تھے! اُس کی آواز کانپ رہی تھی، لیکن یہ بات کہ آواز کا یہ تزلزل نڈ کے خیال کی وجہ سے تھا یا اس تشویش کی بنا پر کہ اُس کی مخالفانہ معرکہ آرائی کہیں ناکام نہ ثابت ہو، ہمیشہ ایک راز سربستہ رہے گی! لیکن اُس نے جو دلائل پیش کیں، وہ معقول اور واضح تھیں اور اُن میں خوب ہی داد منطقیت دی گئی تھی! مزید براں اُن سے ایک وثوق اور اعتماد ٹپکتا تھا جو اس سے قبل جمیعتہ کے کسی جلسہ میں بمشکل مشاہدہ کیا گیا تھا! اور جب اس نے بحث کے سارے مراتب کو طے کر لیا تو خاتمہ سخن میں یہ الفاظ کہے:

"اس سے ہم کو کیا بحث ہونی چاہئے کہ تجویز کا بانی مبانی ناظر ہے یا کوئی اور؟ اس بالکل خارج از بحث بات کا اصل مبحث سے اتنا ہی تعلق ہو جتنی کہ اس بات کا کہ عمارت کو فلاں شخص نے بنایا یا فلاں طریقے سے وہ پبلک (عامتہ الناس) کے قبضہ میں آئی!"

نڈ آکرے کا چہرہ شرم و خجالت سے سرخ ہو گیا، وہ اس معاملہ میں بہت ذکی الحس واقع

ہوا تھا۔ وہ بےچینی کی حالت میں پہلو بدل رہا تھا۔ اضطراب کے عالم میں اُس کی یہی کیفیت ہو جاتی تھی۔
لیکن اُس نے محسوس کیا کہ ڈرنے اور دب کی بات کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو۔ اب بھی کافی دلائل
اس کی تائید میں موجود ہیں، چنانچہ ایک اصولی استدلال یہی ہے کہ "ملک میں سیونگ بنک
کافی تعداد میں ہیں، اور بعض انہیں سے بالکل قرب و جوار میں واقع ہیں۔ کہنا چاہئے کہ بالکل ہمارے
گرد و پیش! لیکن اگر پھر بھی یہ ضروری اور قرین مصلحت سمجھا گیا ہے کہ ہمارا اپنا بھی ایک بنک
ہو، تو یہ مقصد یقیناً دوسرے وسائل سے بھی حاصل ہو سکتا تھا اور اس کے لئے مرے ہوئے
لوگوں کے اوقاف کو پامال کرنے اور زندوں کے حیات کو مجروح کرنے کی ضرورت نہ تھی!"
چنانچہ اپنی تقریر میں جب وہ ان الفاظ پر آیا تو اُس کی آواز میں ایک ارتعاش اور رقت پیدا ہو گئی!
لیکن وہ جلدی سنبھل گیا اور غلہ کے گودام کے اصل محور بحث سے ہم ربط ہو گیا اور اس کو قائم
رکھنے کے فوائد و مصالح بیان کرنے لگا۔

لارنس نے اسی آخری امرِ نزاعی کو اپنے جواب الجواب کا آماجگاہ بنایا اور پھر کہا:
"بہر حال ایک بات ایسی ہو جس کی وجہ سے مجھ پر یہ امر مشتبہ ہو گیا ہے کہ گرجا اور اُس
کی جائداد کا نظم و نسق زندوں کے فائدے کے لئے کیا جاتا ہے یا اُس کی رہنمائی مُردوں
کے مصالح کرتے ہیں ؟! نیز یہ کہ کسی ایک خاندان کی محبت یا نفرت کے جذبات معاملات کا
انصرام کرتے ہیں یا عامۃ الناس کا سود و بہبود اُس میں مدنظر ہوتا ہے ؟!
اس پر نڈ فوراً بولا کہ : "میں نہیں جانتا کہ جس شخص نے ابھی تقریر کی ہے وہ اس خاندان
سے کچھ کم مستفید ہوا ہے، اور اس خاندان کے مردوں اور زندوں کی طرف سے !"
ترکش کے اس پہلے تیر کا نشانہ یہ حقیقت تھی کہ نڈ کے دادا کے طفیل میں لارنس کے دادا
کی اراضی بچ گئی تھی اور یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جب کہ آخر الذکر ایک کلیسائی توبہ گاہ کی زیارت
کو گیا ہوا تھا۔

جو تنکا لارنس کے منہ میں تیزی سے متحرک تھا، یکبارگی ساکن ہو گیا!

"میرا یہ طریق نہیں کہ اپنی ذات اور اپنے خاندان کے قصیدے ہر جگہ پڑھتا پھروں!" لارس نے کہا اور اُس کے بعد سکون اور وقار کے ساتھ نفس مضمون کی طرف رجوع ہو گیا اور اصل موضوع سخن کو پیش نظر رکھتے ہوئے تمام نقاط بحث پر ازسرنو تبصرہ کیا۔

نڈ نے اپنے دل میں اعتراف کیا کہ اُس نے اس معاملہ پر اتنی وسیع المشربی سے کبھی نظر نہ ڈالی تھی۔ بے اختیار اُس کی آنکھیں اُٹھیں۔ اور لارس سے دوچار ہو گئیں! لارس اس کے سامنے ہی اپنے بلند و بالا قد اور بھاری بھرکم جسم کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اور اُس کی چشم و ابروسے ایک قوت ایمانی ہویدا تھی! ہونٹ سختی سے بھچے ہوئے تھے اور تنکا اب بھی منہ کے ایک گوشے میں مصروف گردش تھا! چہرے کے ان تمام آثار و علامات سے عزم و وثوق ظاہر تھا۔ اُس کے ہاتھ پشت کی طرف تھے اور سر پوری طرح بلند تھا! اُس کی آواز میں اس درجہ گہرائی تھی کہ وہ "اعماق قلب" تو کیا "قلب زمین" سے نکلتی معلوم ہوتی تھی!! نڈ نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ اس کو اس "شان جلال" میں دیکھا اور اس پرہیبت منظر سے سچ مچ اُس کی روح لرز گئی! اس نے محسوس کیا کہ واقعی اس شخص کی فطرت مجھ سے بہت بلند ہے! نڈ جو کچھ جانتا تھا اور اُسکو سکھا سکتا تھا وہ سب اُس نے جذب کر لیا تھا، اُس نے اس علم و تعلیم کے سارے فضلے کو چھانٹ دیا تھا اور اُس مغز کو لے لیا تھا جس نے پوشیدہ روح کی یہ زبردست نشوونما کی تھی!

نڈ نے واقعی محبت سے اُس کی پرورش اور تربیت کی تھی لیکن اب لارس کے سینہ میں ایسا زبردست اور پرجلال دل تھا جو نڈ کی کوئی ہستی نہ سمجھتا تھا اور اس کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا! نڈ اس راز کی کوئی تشفی بخش تشریح نہ کر سکتا تھا لیکن جب وہ لارس پر نظر ڈالتا تھا تو وہ اس حقیقت نفس الامری کا مشاہدہ ضرور کرتا تھا! اس وقت وہ انہی خیالات میں بالکل غرق ہو گیا اور پھر یکبارگی چونک کر بولا:

"لیکن لارس! او لارس! خدا را بتاؤ کہ تم کو کیا ہو گیا؟!" اُس کی تقریر اُس کے اضطراب قلب سے مغلوب ہو گئی۔ وہ منقطع جملے اس طرح کہہ کر رہ گیا: "تم جس کو میں نے —— تم جو —!"

اُس کی زبان گرفتہ ہوگئی اور وہ ایک لفظ بھی زائد ادا کرنے سے قاصر ہو گیا! لیکن اپنے غیض و غضب پر قابو پانے کی ناکام کوشش میں اُس نے اپنی مصنوعی زبان حال سے لارس کو ناقابل التفات ظاہر کیا۔ اُس نے زور سے اپنی مٹھی میز پر ماری اور اُس کی گھنی ابرو والی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے!

لارس نے اس خطاب و عتاب کو بالکل نذر تغافل کر دیا اور اپنے انداز سے کسی تشویش کا اظہار نہ کیا اور پھر حاضرین جلسہ کی طرف رُخ کرکے پوچھا کہ "کیا میرے دوست کی یہ آخری زور آزمائی ہے! اور اگر انکے دلائل و براہین کی یہی کل کائنات ہے تو مجھکو اس کے ردّ الرد میں کچھ کہنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی!

وقار و اطمینان کا یہ مظاہرہ نڈ کے لئے ناقابل برداشت تھا!

"میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہم کو آخر یہ ہو کیا گیا ہے؟!" نڈ نے آخرکار کہا، "کیا راز ہے کہ ہم جو آجتک آپس میں ایسے ولولہ محبت سے سرشار رہے۔ اب ایک دوسرے سے اس طرح دست و گریباں ہو رہے ہیں، گویا کوئی بھوت ہم پر سوار ہو گیا ہے!" یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک آتشیں نگاہ غلط انداز لارس پر ڈالی!

لارس نے اُس پر کہا:

اس بھوت کے تمہیں مرکب بنے ہو، نڈ! کیونکہ تم نے دیکھا کہ میں سختی سے معاملہ زیر بحث سے وابستہ رہا اور اُسی کے عیب و صواب اور نشیب و فراز پر نظر ڈالی، لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ جس چیز کو تم پسند نہ کرو اُس کے فوائد کو کسی طرح تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اچھا اب اگر یہ معاملہ ہم سب کے حسب صوابدید طے ہو جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ہماری سابقہ محبت و خلوص باہمی کیسے قائم نہیں رہتا ہے!"

اچھا تو کیا میں نے گرجا کے مصالح کے خلاف کوئی بات کی؟" نڈ نے کہا۔

لارس نے کوئی جواب نہ دیا۔ نڈ اس سکوت پر ملول ہوا اور اُس نے کہا کہ:

"میں سچ مچ اپنے دل کو سمجھاتا تھا کہ میں نے بہت سے کارنامے انجام دئے ہیں۔ بہت سے ایسے کام جو گرجا کے اغراض و مقاصد کے لئے فیض سے خالی نہ تھے۔ لیکن شاید میرے نفس نے مجھکو دھوکہ دیا!"

اتنا کہکر وہ اپنے جذبات سے پھر مغلوب ہوگیا۔ وہ بہت حساس اور مغرور المزاج آدمی تھا، ساتھ ہی اُس کی طبیعت میں تلون بھی بہت تھا۔ لارس کے ساتھ جو غیر متوقع بدمزگی ہوئی تھی وہ اُس پر اس قدر شاق گذری تھی کہ وہ از خود رفتہ سا ہو رہا تھا! آخر لارس نے اُس کے جواب میں کہا:

"ہاں، یہاں جو کچھ ہوتا ہے اُس کا سہرا آپ اپنے ہی سر پر باندھا کرتے ہیں، اور اگر مجلس کے جلسوں میں آپ کی تقریروں اور خطبوں اور آپ کے سارے زبانی جمع خرچ کا حساب لگایا جائے تو بیشک یہی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ آپ کی کارگذاریاں اپنی نظیر نہیں رکھتیں!"

"لیکن وہ جو حقیقی خدمات ہیں اُنکے بجا لانے کا بھی کیا یہی طریقہ ہے جو آپ اختیار کرتے ہیں؟!" نڈ نے پرشور آواز میں لارس پر تیز نگاہیں ڈالکر پوچھا "کیا پھر آپ ہی گرجا کے محسن اعظم ہیں؟!"

"خیر، ذاتیات کی یہ بحثیں بعد میں ہوتی رہیں گی" لارس نے کہا، "سردست میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس مجلس میں پیش ہونے سے پہلے اس مسئلہ کے سارے پہلوؤں پر فریقین نے پورے طور پر غور و خوض کر لیا تھا، اور صدر کی اس مطلق العنان مداخلت کا کوئی موقع نہ تھا!"

یہاں مشاق نڈ آکرے کو اپنی دنیا دارانہ طرز گفت گو کا سر رشتہ پھر ہاتھ آگیا اور اُس نے کہا:

"میں آپ کو خدا کا واسطہ دیکر کہتا ہوں کہ یہ اعزاز صدارت آپ خود سنبھالئے! میں بغیر اس کے بھی زندہ رہ سکتا ہوں، وہ کوئی ایسی سعادت نہیں جس سے میں دست بردار نہ ہوسکوں!"

نڈ نے یہ کہتے ہوئے لارس کی طرف دیکھا لیکن دونوں کی نگاہوں کا تصادم نہ ہوسکا۔ لارس کے منہ کا "ٹھکا" یکبارگی پھر جنبش میں آیا اور اُس نے کہا:

"میری رائے ناقص تو یہ ہے کہ مجلس کے ارباب حل و عقد نے بمشکل کوئی خدمات جلیلہ ایسی

انجام دی ہیں جن پر اُن کو ناز ہو! بلاشبہ گرجا کا امام اور ملحقہ مدارس کے اساتذہ اپنی جگہ پر قانع ہیں لیکن اس محدود حلقے کے باہر رائے عامہ یہ ہے کہ ٹیکسوں کی گرانباری میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا ہے۔"

ان الفاظ پر مجمع میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور لوگ پہلو بدلنے لگے۔ لارنس نے اپنے سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"لیکن آخر کار آج مجلس کے سامنے ایک ایسا مسئلہ آگیا ہے جس کا اصولی اور صحیح حل شاید کسی قدر تلافی مافات کر دے گا۔ یہی غالباً وجہ ہے کہ اُس کی بحث و تمحیص میں مستبدانہ طریقوں کی ایسی سخت مزاحمت کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا تمام تر تعلق گرجا کے حلقے ہی سے ہے۔ اُس کے پیش کرنے میں عوام کی بہبودی ہی منظور ہے، ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ایک خالص پبلک مسئلہ کو محض ایک خاندان کا نجی معاملہ بننے سے باز رکھیں!"

سامعین میں معنی خیز نگاہوں کا تبادلہ ہوا! زیر لب لہجہ میں ایک دوسرے سے کچھ کہنے لگا۔ ایک شخص نے جب کہ وہ اُٹھکر جا رہا تھا کہا کہ: "یہ سب سے زیادہ حق پرستانہ کلمات ہیں جو سالہا سال کے بعد اس مجلس کے اجلاس میں سننے میں آئے ہیں! اب سب لوگ اپنی نشستگاہوں میں کھڑے ہوگئے اور گفتگو عام مخلوط ہونے لگی۔ نڈآکرے اکیلا بیٹھا رہ گیا! اُس نے محسوس کیا کہ "معاملہ ہاتھ سے نکل گیا، سارا طلسم ٹوٹ گیا اور صورت حالات بالکل لاعلاج ہوگئی! اور اب کوئی مزید کوشش وقار رفتہ کو واپس لانے کی بے سود ہے!" حقیقت یہ ہے کہ اُسکا مزاج کچھ اُس قسم کا واقع ہوا تھا جو اہل فرانس کی فطرت سے منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ حملہ خوب کرنا جانتا تھا اور پیہم حملے ایک سے ایک بڑھ کر کر سکتا تھا، لیکن مدافعانہ کارروائیوں کے وقت وہ بہت کمزور ثابت ہوتا تھا کیونکہ اُس کے خیالات اُس کے جذبات سے مغلوب ہو جاتے تھے۔

یہ سارا انقلاب بہ مشکل نڈ کی سمجھ میں آتا تھا! اُس میں زیادہ بیٹھے رہنے کی بھی تاب نہ تھی، چنانچہ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اُسے نائب صدر کے حوالہ کر کے خود چل دیا لوگوں کے لئے یہ منظر دیکھکر اپنی ہنسی کو ضبط کرنا مشکل تھا!

نذ جلسہ میں لارس کی معیت میں آیا تھا لیکن جلسہ سے رخصت ہوا تو تنہا تھا۔ اگرچہ "یوسف بے کارواں" بنکر اس کو یہ دور دراز راستہ طے کرنا اور بھی مشکل تھا!

یہ موسم خزاں کا ایک سرد خشک اور ویران و بدمنظر دن تھا۔ جنگل ننگے اور اُجڑے ہوئے تھے، سبزہ زار اور چراگاہیں زرد ہو رہی تھیں، کہرا پڑنا شروع ہو گیا تھا اور راستہ پر دونوں طرف جا بجا منجمد اور یخ بستہ ہو کر جمع ہو گیا تھا۔ گویا ساری کائنات نے ماتمی لباس پہن لیا تھا! خدا یاس حرماں کو بھی کسی کا شریک حال نہ بنائے! آنذ سارے ارض و سما کے اس ملفوف یاس منظر میں اپنے کو کتنا مغموم و ملول، حقیر و ذلیل، اور تباہ و برباد محسوس کر رہا ہے! وہ تنہا چلا جا رہا ہے لیکن پھر بھی لارس اُس کے یہیں ویسا معلوم ہوتا ہے! لارس اپنے پورے بلند قد و قامت کے ساتھ ایک آسیب کی طرح شام کے جھٹپٹے میں آسمان تک اپنے سر کو دراز کئے ہوئے نظر آ رہا ہے!

اس بات کے تصور سے اس کو بہت کوفت ہو رہی تھی کہ اس نے لارس سے خود یہ لڑائی مول لی اور اس سبازرطلبی کو ایسی اہمیت دی کہ وہ ایک فیصلہ کن معرکہ ثابت ہوئی۔ اُس نے خیال کیا کہ اگر وہ ایک غیر متعلق ضمنی نقطہ پر اس قدر زور نہ دیتا تو نتائج اتنے تباہ کن نہ ہوتے اور اُس کے سارے وقار و اقتدار پر اس طرح ایک ضرب کاری نہ لگتی! یہ حیرانی، غم و غصہ، اور اذیت روحانی اُس پر کامل استیلا حاصل کئے ہوئے تھی اور یہ آتشیں جذبات برابر سوزاں تھے اور اُن کی سوزش و گزیدگی اور اُن کی شورش و یورش اُس کو ایک طوفان غم کے گرداب میں تھپیڑے کھلا رہی تھی!

یکبارگی اُس نے گاڑی کے پہیوں کی آواز اپنے پیچھے سے سنی: یہ لارس تھا جو اپنے گھوڑے کو اڑائے ہوئے لئے جا رہا تھا! بادپا گاڑی آنذ کے پہلو میں سے گزری، اور گھوڑے کی ٹاپوں سے سڑک کی زمین عرصۂ محشر کی طرح ہل گئی! آکر سے نے اس چوڑے چکلے بر و دوش والے نوجوان کو دیکھا کہ گاڑی میں سیدھا بیٹھا ہوا ہے، گھوڑا "شوق راحتِ منزل" سے از خود اڑا چلا جا رہا ہے اور لارس کو کسی مہمیز یا تازیانہ کی ضرورت نہیں پڑ رہی ہے! بلکہ اس نے باگیں ڈھیلی کر دی ہیں جانور کو اُس کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ گویا لارس کی تصویر نہ تھی بلکہ اُس کی

معنوی طاقت اور اُس کے مجلسی اقتدار کی ایک تعبیر تھی! تیز رفتار گھوڑے کو دیکھکر نڈ کو "عالم مثال میں ایسا نظر آ رہا ہے کہ اس کا حریف بلا مزاحمت اپنی منزل مقصود کا عازم ہے! انڈ کے توہمات میں سے ایک دوسری بات یہ تھی کہ وہ اپنی مرضی سے پا پیادہ نہیں چل رہا ہے بلکہ لارس نے اپنی "فاتحانہ رتھ" سے اس کو ڈھکیل دیا ہے اور وہ سرما و خزاں کی ایک تاریک رات میں ٹھوکریں کھاتا چلا جا رہا ہے!!

نڈ کی بیوی گھر پر اُس کی منتظر تھی، وہ پہلے سے جانتی تھی کہ نڈ اور لارس میں آج کے طوفانی اجلاس میں تصادم کا ہونا ایک ناگزیر خطرہ ہے۔ اُس نے اپنی ساری زندگی میں لارس کی ذات پر کبھی اعتماد نہ کیا تھا اور اب تو وہ مثبت طور سے اس کو غدار اور ایک خوفناک دشمن سمجھ رہی تھی! اس کے لئے یہ بات کچھ موجب تسکین نہ تھی کہ یہ دونوں ایک ہی گاڑی میں سوار ہو کر گئے تھے، اور اگر وہ ایک دوسرے کی معیت و رفاقت میں اسی طرح گھر کو واپس بھی آتے تب بھی اُس کے لئے یہ کوئی امید افزا علامت نہ ہوتی!۔

لیکن اب تو پوری تاریکی ہو گئی ہے اور ہنوز دونوں میں سے ایک بھی نہیں لوٹا ہے! وہ اپنے دروازے میں کھڑی ہوئی سامنے کو جانیوالی سڑک پر راہگیروں کو دیکھ رہی ہے - وہ دروازے سے نکلکر تھوڑی دور تک باہر جاتی ہے اور پھر واپس آ جاتی ہے لیکن افسوس کہ کوئی گاڑی نظر نہیں آتی!

بالآخر سڑک پر پہیوں کی گھڑ گھڑاہٹ گوش زد ہوئی۔ عورت کا دل سینہ میں دھڑکنے لگا! پہیوں کی گردش کے ساتھ اس کی نبض افتاں و خیزاں ہونے لگی! وہ ایک ستون سے چمٹ گئی اور رات کی تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی! گاڑی نزدیک آتی ہے! مگر اُس کے اندر صرف ایک آدمی ہے!؟! وہ دیکھکر پہچانتی ہے کہ لارس ہے! لارس بھی اُس کو دیکھتا ہے اور شناخت کرتا ہی مگر بغیر گاڑی کو ٹھہرائے ہوئے سیدھا نکلجاتا ہے؟!! اب وہ سچ مچ ڈری! اُس کے اعصاب جواب دینے لگے، وہ لڑکھڑاتی ہے اور کھڑکی میں رکھی ہوئی بنچ پر گر پڑتی ہے!

بچے گھبرا کر اُس کے پاس آجاتے ہیں اور ماں کے گرد حلقہ کر لیتے ہیں سب سے ننھے بچے نے کہا:
"ابا کہاں ہے ؟" بچوں کے ساتھ اُنکی ماں کا موضوع گفتگو صرف اُنکا باپ ہی ہوا کرتا تھا۔ وہ بڑا محبت
پرست دل رکھتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اپنی بیوی اور بچوں کے دل پر اُسکا پورا قبضہ تھا۔ لیکن آج نذر
کے خانۂ دل میں نذر کے اہل و عیال کا خیال نہیں ہے اس کے دل و دماغ پر ایک ایسی مصیبت
کبریٰ کا ہجوم ہے کہ وہ سرتاپا اُسی میں غرق ہے اور اس کی محبوب بیوی اور پیارے بچوں پر
بھی ایک ماتم ہے !

اگر اُس پر کوئی حادثہ نہیں ہوا ہے تو پھر یہ کیا بات ہے ؟! یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ایک
گرم مزاج آدمی ہے ! ہاں لارنس کا آج تنہا آنا خالی از علت نہیں ہے ! اور پھر اس کا یہاں نہ ٹھہر
اور بھی معنی خیز ہے ! کیا وہ اُس کی گاڑی کے پیچھے دوڑ کر حال دریافت کرے یا پھر اپنے بدقسمت
شوہر کے فراق میں سڑک پر پاپیادہ چل کھڑی ہو ؟! اُس کی روح ایک عذاب میں مبتلا تھی اور
اور بچے تھے کہ اُس سے چمٹ جاتے تھے اور بیتاب ہو ہو کر پوچھتے تھے کہ کیا بات ہے ! لیکن
یہ مخدوش راز وہ انکو کیونکر بتاتی ؟ خیر وہ کھڑی ہوئی اور بچوں سے کہا کہ اچھا تم کھانا تو کھالو
آج اکیلے ہی سہی ! یہ کہکر اس نے دسترخوان کی ترتیب و تیاری شروع کی۔

بچے کھانا کھا رہے ہیں اور وہ اُنکے پاس بیٹھی ہوئی بار بار اضطراری طور سے باہر دیکھ
دیکھ لیتی ہے لیکن :

نہ قاصد سے نہ پیاسے نہ مرغ نامہ بر سے !

اس نے بچوں کے کپڑے اتارے اور اُنکو بستروں پر لٹایا۔ سلاتے وقت جب وہ ایک
ایک کے منہ پر جھکی تو ننھے نے "شام کا ترانۂ حمد" پڑھا ! آج وہ خود بھی اس دعائے معصومانہ
میں شریک ہوگئی اور اس درد و سوز اور ایسے خضوع و خشوع سے بارگاہ الٰہی میں فریاد کی کہ
اس ہنگامۂ مناجات میں اس نے باہر کے قدموں کی چاپ بھی نہ سنی !

نذر دہلیز میں ساکت و صامت کھڑا ہوا اپنی ننھی سی امت کی نماز جماعت کا نظارہ کر رہا ہے !

بچوں کی ماں یکبارگی سمت کر کھڑی ہوگئی اور سارے لڑکے لڑکیاں ہم آواز ہو کر چلا اُٹھے :

"پاپا! پاپا!"

"آہستہ! آہستہ!" نڈ نے کہا اور معًا ایک نشست پر بیٹھ گیا، "ہاں ننھے کو یہی کلمے پھر کہنے دو! ہاں بھائی کیسے؟"

ماں اس اثنا میں بستر کی طرف متوجہ ہوئی اور اُس کے درست کرنے میں مشغول ہوگئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ نڈ اُسکا بدحال چہرہ دیکھ لے۔ قبل اس کے کہ وہ اس کام سے فارغ ہوتی اس کے حلیہ میں اتنا تغیر ہو جاتا کہ زیادہ مزاج پرسی کا موقع نہ رہتا۔ اس وقت اس کے چہرہ پر آثار ہموم وغموم کے علاوہ مستفسرانہ علامات بھی تھیں، لیکن وہ اس بات کو مصلحت نہ سمجھتی تھی کہ وہ خود اپنی طرف سے آج کی غیر معمولی تاخیر اور دیگر خلاف معمول واقعات کے اسباب بتانے کا تقاضا کرے۔ بخلاف اس کے وہ اس کو بہتر سمجھتی تھی کہ نڈ خود ہی اس ماجرے پر روشنی ڈالے۔

ننھے نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ سینہ پر باندھے اور سب بھائی بہن اُس کی امامت میں اقتدار کے لئے اسی وضع سے کھڑے ہوگئے! ننھا امام نغمۂ حمد وشکر شروع کرتا ہے:-

"میں ایک چھوٹا بچہ خدائے عرش وکرسی سے التجا کرتا ہوں، کہ میری خطائیں معاف کی جائیں،

رفتہ رفتہ میں بڑا ہوتا جاؤں گا، اور میری دین ودانش بڑھتی جائے گی، اور اپنے باپ اور ماں کی مسرت کا سامان بنوں گا بشرطیکہ اے میرے پروردگار! تیری توفیق میری رفیق ہو اور تیرے مقدس پیمان عبودیت پر ثابت قدم رہنے کی مجھکو ہدایت نصیب ہو!

اب جبکہ عنقریب ہم سو جائیں گے، ہم اپنی روحوں کو "آسمانی باپ" کی، برکت ورحمت کی امان میں دیتے ہیں!"

کمرے میں ایک سکون و امن کی فضا طاری ہوگئی! اس آسودگی پر ور آب و ہوا نے ایک ہی منٹ کے اندر سارے بچوں کو اس طرح تھپک تھپک کر سلا دیا گویا کہ وہ خود خدائے قدوس کی کنارِ رحمت میں مصروف خواب ہوگئے ہوں! ماں اس بیچ میں آہستہ سے کھسک گئی اور شوہر کے سامنے کھانا رکھا۔ نِنڈ نے کھانے سے انکار کیا، اس لئے کہ وہاں

لختِ دل کھانے کو اور خونِ جگر پینے کو!

بہت تھا! وہ بستر پر جاکر لیٹ گیا، اور تھوڑی یکسوئی کے بعد اُس نے کہا:

"آئندہ سے میں خانہ نشین ہوجانیکا ارادہ رکھتا ہوں"

قریب تھا کہ اس مژدۂ جاں فزا کو سنکر نِنڈ کی بیوی کو شادی مرگ جاتی! وہ شوہر کے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی، اور اس ناقابل برداشت خوشی کے احساس سے اس کے بدن کے ریشہ ریشہ میں ایک "لرزش خفی" تھی جس کو وہ ایک سربمہر راز ہی رکھنا چاہتی تھی! اس نے اپنے دل سے کہا: "خدایا! کس زبان سے تیرا شکرانہ ادا کروں! میرے لئے کیا ہی نعمت غیر مترقبہ تونے نازل فرمائی!

ہزار شکر خدا، صد ہزار شکر خدا!

خیر، اس طول طویل مصیبت کے درمیانی منازل میں جو کچھ بھی ہوا ہو لیکن انجام یقیناً بخیر ہوا، اور

سفینہ جبکہ کنارے پہ آ لگا اپنا　　　خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے"

شذرات

اس مہینے میں ہندوستان کے مسلمانوں کو دو ایسے بزرگوں کا ماتم کرنا پڑا جو حقیقی معنوں میں قوم کے خادم اور مخدوم تھے اور جن کا وجود اس وقت حیات ملی کے لئے بے حد ضروری تھا۔ پہلے مولٰنا مظہر الحق کے انتقال کی جانفرسا خبر آئی۔ اس کے چند ہی دن بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی وفات کی دلگداز اطلاع پہنچی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہر شخص جس کے دل میں ملک وقوم کا درد ہے ان دونوں سانحوں سے متاثر اور ملول نظر آتا ہے۔ خصوصًا ان کے عزیزوں اور دوستوں کے رنج کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ خداوند تعالیٰ مرحومین کی مغفرت کرے اور انکے سوگواروں کو صبر جمیل عطا کرے۔

مولانا مظہر الحق ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کی اور انکے دل میں آزادی کے ولولے کو ابھارا۔ کانپور کی مسجد کے واقعے سے لے کر ترک موالات کے زمانے تک مرحوم نے ملت اسلامی کی جو خدمات انجام دیں وہ سب پر روشن ہیں۔ مرحوم بہت عرصے سے کانگریس کے ممبر تھے اور ہندو مسلمانوں کے اتحاد اور ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں دل وجان سے کوشش کرتے تھے۔ باوجود اس کے کہ آخر عمر میں بعض جانکاہ صدمات نے مرحوم کا دل توڑ دیا تھا اور وہ عملی جد وجہد سے علٰحدہ ہو کر گوشۂ تنہائی میں زندگی کے دن گذار رہے تھے، ان کا جذبۂ قومی اور جوش آزادی ذرا بھی کم نہیں ہوا تھا اور ضرورت کے وقت وہ اپنے وسیع تجربے اور اپنے شخصی اثر کو کام میں لاکر قومی تحریک کی گتھیوں کو سلجھایا کرتے تھے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے ممدوح نے اپنے دوستوں کی درخواست پر یہ ارادہ کیا تھا کہ مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں جو انتشار پیدا ہو گیا ہے اسے دور کریں اور سب

پارٹیوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے ان کا ایک متحدہ پروگرام ترتیب دیں۔ ظاہر ہے کہ مرحوم سے بڑھ کر اس کام کا اہل کوئی شخص نہ تھا۔ افسوس ہے کہ موت نے انہیں یہ ارادہ پورا نہ کرنے دیا۔ اب مرحوم کے دوستوں اور قدردانوں کا یہ فرض ہے کہ ان کی اس آخری خواہش کو پورا کرنے میں امکانی کوشش کریں۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب کا میدان عمل سیاست نہ تھی بلکہ تعلیم تھی۔ مرحوم علیگڈھ کالج کے مایہ ناز فرزندوں میں سے تھے اور انہوں نے اپنی زندگی کو مسلمانوں کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ایک عرصہ تک انہوں نے نہایت خلوص اور محنت سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکرٹری کے فرائض انجام دئے اور مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو ہردلعزیز بنانے میں ان کی خدمات بہت قابل قدر ہیں۔ یورپ سے واپسی کے بعد مرحوم نے بہ حیثیت وائس چانسلر کے مسلم یونیورسٹی کی اصلاح اور ترقی کی انتہائی کوشش کی اور جب بعض خودغرض اور مفسد لوگوں کے سبب سے اس میں ناکامی ہوئی تو انہیں اسکا اتنا سخت صدمہ ہوا کہ انکی صحت بالکل برباد ہو گئی اور دو سال کی مسلسل علالت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مرحوم کا خلوص اور جوش ہمارے نوجوانوں کے لئے قابل تقلید مثال ہے۔ خدا کرے علیگڈھ سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو اس کام کو پورا کریں جسے مرحوم ادھورا چھوڑ گئے ہیں۔

مسلمانان ہند کی جماعتی زندگی میں یہ عجیب حسرتناک بات ہے کہ انکے بڑے لوگ بہت کم اپنے بعد کوئی ایسا کام چھوڑتے ہیں جسے خود انکے تربیت دادہ لوگ انجام دیتے رہیں یا جس سے قوم کی کوئی پائدار خدمت ہوتی رہے۔ اول تو بہت کم اپنے ذمہ کوئی ایسا کام لیتے ہیں جسمیں ایک سے زیادہ نسلیں کام کر سکیں۔ اور جو کوئی ایسا کام شروع بھی کرتے ہیں تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان کی مدت حیات بہت محدود ہے اور بڑے اور واقعی مفید کام صبرآزما ہوتے ہیں اور دیرطلب تعلیمی کاموں میں پچھلے سو سال کے

اندر سید احمد خاں، مولوی محمد قاسم صاحب، مولنا شبلی اور حکیم اجمل خاں کے ناموں پر نظر پڑتی ہے۔ ان چاروں بزرگوں کو اپنے اپنے حالات کے مطابق اپنے جانشینوں کی تربیت کا موقع بھی ملا اور انہوں نے اس موقع سے فائدہ بھی اٹھایا۔ چنانچہ بُرے یا بھلے انکے کام آج بھی چل رہے ہیں۔ اگرچہ ممکن ہے بعض جگہ جانشینوں کی تربیت کی خامی کے باعث، یا اپنے رہنما کے مقاصد کی غلط یا تنگ تعبیر کی وجہ سے وہ مقاصد اچھی طرح حاصل ہوئے ہوں جو ان بزرگوں کے پیش نظر تھے لیکن سانچے قائم ہیں۔ ان میں اصلاح بھی ہو سکتی ہے اور جوں جوں ان اداروں کی عمر بڑھتی جاتی ہے انکی روایات مضبوط ہوتی جاتی ہیں اور حیات ملی میں انکا اثر ترقی کرتا جاتا ہے۔ مگر اس حقیقت سے انکار خود فریبی کے مرادف ہوگا کہ ان اداروں کا اثر بہت محدود ہے اور انکا میدان عمل بہت تنگ۔ ملی زندگی کے بے شمار شعبے سوائے خفیف سے بالواسطہ اثر کے انکے دائرہ عمل سے اسوقت بھی باہر ہیں۔ تنگ معنوں میں تعلیمی اور علمی کام ہی کو لے لیجئے تو یہ ادارے ہماری حیات قومی کی بساط کے حواشی تک پر حاوی نہیں ہیں۔ ابتدائی تعلیم کا مسلمانوں کی مخصوص ضروریات کے لحاظ سے ہماری قوم نے کیا انتظام کیا ہے۔ انتظام کرنا تو بڑی بات ہے کتنے آدمی ہیں جنہوں نے دیانت سے کچھ وقت اسپر صرف کیا ہے کہ مسلمانوں کی مخصوص ضروریات کس قسم کی ابتدائی تعلیم کی متقاضی ہیں۔ ثانوی تعلیم کے مسائل ہیں اور پیشہ کی تعلیم ہے اس کے تعلق پر کتنے مسلمان "ماہرین تعلیم" دو فقرے بھی معقولیت سے بول سکتے ہیں؟ "اعلیٰ" تعلیم کے سراب سے اس مفلس و نادار قوم کو بچانے میں کتنے ساعی ہیں، اور پھر کتنے ہیں جو اسکی تدابیر سوچ رہے ہیں کہ اہلیت وصلاحیت رکھنے والے اسی سراب سے قوم کے لئے آب حیات کے چشمے نکالدیں۔ دینی تعلیم کے مسئلہ پر کتنوں نے چند منٹ بھی ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے اور کتنے ہیں جو دین کی تعلیم کو قانون اور غلط سلط سے ناقص واقفیت کا ذریعہ نہیں (کہ یہی ہمارے موجودہ دینی مدارس کا کام معلوم ہوتا ہے) بلکہ سچی مذہبیت پیدا کرنے کا وسیلہ بنانیکی فکر کر رہے ہیں۔ افسوس کہ ہم ان لوگوں کے وجود سے بےخبر ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ کچھ ٹھکانے ہیں۔ اور اگرچہ آج ان سے بھی یہ سب نہیں بن پڑتا مگر کل ان سے اسکی توقع کیجا سکتی ہے علیگڑھ اور دیوبند، اعظم گڈہ، لکھنؤ اور دہلی اس وقت نہ سہی امید ہے کہ کچھ

دن بعد ان اہم کاموں کو سلیقہ سے کرینگے۔ یہاں آدمی موجود ہیں، اپنی قوم کی مصیبت کا احساس بھی غالباً ہی۔ کچھ کرنیکا ولولہ بھی شاید موجود ہو؟ اگر کوئی سیدھا راستہ دکھانے والا، اور اسپر چلنے کے لئے دل کو مضبوط کردینے والا ملجائے تو کیا عجب ہی کہ یہ ادارے کچھ کرسکیں اور اپنے بانیوں کی آرزوؤں کے محض مرقد بنکر نہ رہ جائیں۔

البتہ ہماری قومی زندگی کی ایک خصوصیت اسوقت اسکا عدم تسلسل ہی جس سے سارے مفید اور پائدار کام خطرہ میں ہیں، ہمارا حال جہاز کا سا ہی جو طوفانی سمندر میں اپنی راہ سے ہٹ گیا ہو، جس کا انجن یا دمخالف اور تموج دریا پر غالب آنیکے بجائے بند ہوگیا ہو اور جہاز منزل کی سمت چلنے کے بجائے ادہر اُدہر ہچکولے کھاتا ہو۔ ہماری اس حالت کا تکلیف دہ منظر ہماری سیاسی زندگی میں نظر آرہا ہی۔ اور چونکہ سیاست والے سب سے زیادہ زور سے چلاسکتے ہیں اسلئے زندگی کے دوسرے شعبوں کے حامل سہم جاتے ہیں اور خود اپنے کام کے تسلسل کو قائم نہیں رکھ سکتے اس طرح مسلمانوں کی سیاسی زندگی کی دھوپ چھاؤں اور اسکے روز کے اُتار چڑھاؤ ہماری ساری حیات قومی کا آئینہ بن گئے ہیں۔ اب ذرا اس سیاسی زندگی کو دیکھئے۔ ایکدن مسلمان کانگریس سے الگ رہ کر تمامتر توجہ اپنی تعلیم پر صرف کرنا چاہتے ہیں، دوسرے دن سیاست میں اس انہماک سے کودتے ہیں کہ تعلیم و تعلم کا نام نہیں سننا چاہتے! ایکدن انگریزوں کو اپنی بقا اور ترقی کا تنہا وسیلہ جانکر اہل کتاب کے ساتھ سلوک کر دسیل کے سارے امکانات دریافت کرنیکے لئے کتابیں کھنگالی جاتی ہیں تو دوسرے دن نصاریٰ سے موالات کے خلاف فتوی پر فتوے نکلتا ہی؟ ایکدن فرنگی تہذیب مظہر شان ربانی ہوتی ہی دوسرے دن سراسر فریب طاغوتی۔ ایکدن ہندو بھائی ہوتا ہی، دوسرے دن دشمن۔ اور لطف یہ کہ سب حالتوں میں ایک سا انہماک، ایک سا شغف، ایک سا غلو۔ یہی سبب ہے کہ پچھلے پچاس سال کی جد وجہد میں مسلمانان ہند اپنے لئے کوئی سیاسی روایات نہ قائم کرسکے کسی ایک مسئلہ پر اصولی ہو یا فروعی یہ چند دن سے زیادہ جم کر کام نہیں کرسکتے۔ سالہا سال میں یہ مشکل سے کبھی خود کسی بات کی ابتدا کرتے ہوں تو کرتے ہوں، ورنہ ہمیشہ کوئی دوسرا جب کچھ کرتا ہی تو یہ اسکے حامی یا مخالف

ہو جاتے ہیں۔ اور عموماً مخالف! کسی نے ذرا چھیڑ دیا اور یہ بپھر گئے۔ ذرا چمکارا اور یہ رام ہو گئے! جس سے
ذرا خفا ہوئے اسکے لئے "دشمن" سے کم درجہ کا کوئی لفظ انکے پاس نہیں جس سے خوش ہوئے وہ بھلا حقیقی
بھائی سے کم مرتبہ پر کیسے رہ سکتا ہے؟ جس تحریک کی موافقت یا مخالفت کی تو اسمیں یہ خیال رکھنا کہ تجویز
کی اہمیت کتنی توجہ کی محتاج اور مستحق ہے انکی لغت میں کمزوری کہلاتا ہے۔ آزادی ملک کا مطالبہ اپنی
قوم کی تعلیم و تربیت کا انتظام، عقائد اسلامی کی اس طوفان الحاد و بے دینی میں حفاظت، اور ابن
سعود، فلسطین، شاردا ایکٹ، راج پال، اور علم دین سب بالکل مساوی اہمیت رکھتے ہیں سب بالکل
ایک طرح مسلمانوں کے "حیات و ممات" کے مسئلے ہیں، اور سب ایک ہی سی توجہ اور ایک ہی سے
صرف قوت، کے مستحق۔ جب کسی مسئلہ کی طرف یہ جوشیلی قوم اپنی توجہ منعطف کر دیتی ہے تو معلوم ہوتا ہے
کہ اسکے سامنے کوئی اور مسئلہ ہی نہیں۔ اگر کوئی اس وقت دوسرے گوشوں کیطرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی
جرأت کرے تو غدار کہلائے، کافر قرار دیا جائے اور مسلمانوں کا "دشمن"۔ اس انتشار ذہنی میں یہ گمان
رکھنا کہ کوئی بھی مفید اور پائدار کام ہو سکیگا اپنے کو دھوکا دینا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے
بڑا کام اس وقت یہ ہے کہ ان میں زندگی کے مختلف شعبوں پر توجہ کرنے والوں کے کچھ گروہ پیدا ہو جائیں۔
ظاہر ہے یہ چھوٹے چھوٹے ہی گروہ ہو سکتے ہیں لیکن ایسا ایک چھوٹا سا گروہ جو اپنی عمر کسی ایک شعبہ حیات
ملی کے سمجھنے اور اس کے مسائل کے حل کرنے میں صرف کریگا۔ ان تمام بڑی بڑی انجمنوں، اور
کامیاب جلسوں، اور شاندار جلوسوں سے زیادہ دیرپا نتائج پیدا کر سکیگا، جن سے اور صرف جن سے
افسوس کہ اسوقت ہماری حیات ملی عبارت ہے۔ کاش مسلمان نوجوانوں کے دل جلد اس نظر فریب
مگر روح کش انتشار ذہنی سے اکتا جائیں اور وہ بجائے اسکے کہ کچھ لوگوں کو برا کہنے، اور کچھ سراہنے
میں اپنی زندگیاں کاٹیں ان زندگیوں کو ایک قومی امانت سمجھیں اور زندگی کے جس شعبے میں وہ سب
سے بہتر اور مفید کام کر سکتے ہوں۔ اس کے لئے اپنے کو وقف کر دیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو انکی کوشش
ہرچند شروع میں کتنی ہی حقیر ہو وہ اس بدنصیب قوم کے دن پھرنے کی علامت ہونگے اور اس کا
سبب۔ ورنہ اپنی مشکلوں کو دوسروں سے حل کرانے کی کوشش، اپنی کمزوریوں کا اعتراف

کرکے دوسروں سے خواہش کہ وہ ہمیں تقویت دیں، اپنی تعلیمی کمی، معاشی بے مائگی، اخلاقی پستی کا واسطہ دے دیکر اپنی سیاسی اہمیت کا اقرار کرانا، غیور اور خود دار مسلمان نوجوانوں کے لئے باعث شرم ہونا چاہئے۔ اپنی تعداد کی کمی سے پراگندہ خاطر اور مایوس ہونا اس قوم کا شعار کیوں ہو جس کے مٹھی بھر آدمیوں نے تہذیب کہن کی بساط پارینہ کو الٹ کر رکھ دیا تھا۔ ہمارا شعار تو کبھی رو رو کر یا روٹھ روٹھکر حقوق طلب کرنا نہ تھا، بلکہ اپنی مردانگی سے، اپنے کام سے، اپنے پرائے کی خدمت سے، اپنی محنت و ہمت سے حقوق پیدا کرنا تھا۔ کیا یہ توقع بیجا ہوگی کہ مسلمان نوجوان اپنی حیثیت ملی کو تسلیم کرانے کے لئے روٹھنے، یا خوشامد کرنے، یا گالیاں دینے سے جلد شرمانے لگیں گے اور اپنے بے نفس خلوص اور مخالفت سوز ایثار سے اپنی ملی زندگی کی کیفیت کو ایسا بنانے کی کوشش کریں گے کہ اس کے سامنے "کمیت" کے سب فریب ٹوٹ جائیں اور انکا وجود کسی مشترکہ قومیت کے لئے بار نہ ہو بلکہ باعث فخر۔ اگر یہ توقع بھی باقی رہے تو غیرت مند مسلمان کے لئے زندگی واقعی عذاب ہو جائے

انتباہ

"جامعہ" جلد ۱۳ کی فہرست مضامین انشاء اللہ ماہ فروری میں شائع ہوگی

The Cultural Side of Islam

Madras Lectures on Islam

(NO. 2.)

BY

MUHAMMAD MARMADUKE PICKTHALL

DELIVERED AT MADRAS IN JANUARY 1927.

CONTENTS.

رجسٹرڈ
نمبر ۱۸۹۲
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
جلد ۱۴
بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۳۰ع
نمبر ۲
مجلہ مکتبہ
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927

فہرست مضامین رسالہ "جامعہ" بابتہ جلد ۱۲

از جولائی تا دسمبر ۱۹۲۹ء

اسلامیات

تاریخ

ادب

تاریخ ادب

آرٹ

افسانہ

تعلیم

اجتماعیات

حصۂ نظم

تنقید و تبصرہ

(رسائل و اخبارات)

(کتب)

فہرست مضمون نگاران

حسین حسان صاحب ندوی

خالدہ ادیب خانم

درد کاکوروی

دل شاہجہانپوری

ذاکر حسین خاں (ڈاکٹر)

سعید انصاری صاحب

سلما لاگرلاف

سلیم الزمان (ڈاکٹر)

عابد حسین (ڈاکٹر سید)

عبدالجلیل صاحب ندوی (مولنا)

غلام الحسنین صاحب فاضل پانی پتی

لالہ لاجپت رائے آنجہانی

محمد مجیب (پروفیسر)

محمود حسین خانصاحب جامعی از ہائڈل برگ

محمد یحییٰ تنہا صاحب وکیل غازی آباد

محمد حسین (مولنا) محوی صاحب از اورنگ آباد

نذیر (سید نیازی صاحب

نصیر الدین ہاشمی صاحب از پیرس

وہاج الدین صاحب

کا

بہترین شاہکار

یعنی رسالہ خضر راہ کا شبلی نمبر منصۂ جہاں

جس میں

ہندوستان کے مایۂ ناز مصنف علامہ شبلی نعمانی کی حیات طیبہ اور آپ کی علمی خدمات کا تذکرہ کیا جائیگا اور ——— عہد حاضرہ کے مشہور ترین اہل علم اور فاضل ترین ائمہ علم و ادب کے گرانقدر اور بلند پایہ مضامین زیب صفحات ہوں گے۔

امام الاحرار مولانا ابو الکلام آزاد،
فخر ملت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی
صدر الصدور امور مذہبی مولانا حبیب الرحمان خانصاحب شروانی
سر اقبال،
خواجہ حسن نظامی
مولانا عبد الماجد بی۔ اے دریابادی
مولانا ظفر علیخاں صاحب
مولانا عبد اللہ صاحب عمادی
سید جالب دہلوی، ملا رموزی،

مرزا فرحت اللہ بیگ رجسٹرار
شوکت تھانوی، جگر مرادآبادی
سیماب اکبرآبادی
حامد شاہجہانپوری
لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی
لسان القوم حضرت صفی لکھنوی
ظفر الملک صاحب علوی،
حضرت ریاض خیرآبادی
شمس العلماء نواب علی حسن خان صاحب

وغیرہ کے اسمائے گرامی اسکی عظمت و فضیلت کی کافی ضمانت ہیں

غرضکہ یہ عمدہ دلچسپ و دلفریب قصائد، پر بلند پایہ علمی ادبی مضامین پر کیف نظموں اور نتیجہ خیز دلچسپ افسانوں کا بہترین مجموعہ جسکا حجم تقریباً دو سو صفحات ہوگا اپریل ۱۹۳۰ء میں آپ کے پیش نظر کیا جاویگا عوام سے عام طلباء مستقل خریداروں متعدد دارالمطالعوں اور قومی لائبریریوں کو بالکل مفت دیا جائیگا۔ منیجر خضر راہ نیا گاؤں لکھنؤ

اعلان

امید دچه قوم ته به ډ خوشحالی مقام دی چه سرے دست پښتو اکیډمی مندرجه ذیل کتابو په ډیر خوب صورت او سپین چاپ کښې کړل موثر ته دچنل قوم ډ علم دوستئ نه پوره یقین دے۔ چه هغوئ به اکیډمی د کوشش استقبال هوکړی او زر تر زره به ډ چنل حسب المنشا کتابو نو آرډر راکړی فقط

نام کتاب	قیمت	
پښتو فارسی لغات	صر	روپئے
" عربی لغات	صر	"
" انجنیری لغات	۵	"
" جرمن ډکشنری	عـ۵	"
" صرف نحو	صه	"
حقیقت الافغانی	عا	"
Pushto-English Grommer	للعه	"

ملنے کا پتہ

پاسبان پښتو اکیډمی کردی سکنه و ډاکخانه گردی ضلع پشاور

(صوبه سرحدی)

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۱۴	بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۳۰ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

*

ازمنہ وسطیٰ کے بعض ہندو شاعروں پر اسلامی اثر

دور سے اور سطحی طور پر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام اور ہندو دھرم نے باوجود تقریباً آٹھ سو برس پہلو بہ پہلو رہنے کے ایک دوسرے کا کوئی گہرا اثر نہیں قبول کیا۔ دنیا ان دونوں مذہبوں کے اختلاف کو جانتی ہے۔ دنیا یہ نہیں جانتی کہ ان دونوں مذہبوں کے رسم و خیال کی تاریخ میں ایسی کوششیں بھی ہوئی ہیں، دانستہ اور کبھی غیر دانستہ جن کا منشا ہندو اور مسلمانوں کے خیال و عمل کی زندگی میں ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ ہندوستان کی ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں ان اعتقادی تصوروں کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے جو باہمی ہندی اسلامی اثر سے پیدا ہوئے اور جنہوں نے بعد میں تحریکوں اور مستقل اداروں کی شکل اختیار کرلی۔ بیشتر اس قسم کے مذہبی رواداری کے خیال شہری زندگی کی خود غرضیوں سے دور گاؤں کے رہنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں میں پیدا ہوئے جو آپس میں مل جل کر سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور جن کا تخیل تصنع سے اسی قدر پاک تھا جس طرح کہ اُنکا خلوص بے لاگ تھا۔ شمالی ہند میں اسلام اور ہندو دھرم کی پہلی مڈبھیڑ کے وقت ہمیں بہت سے ایسے ہندو بھگت شاعر ملتے ہیں جن کے خیال اور زندگی کو دیکھنے کے انداز پر اسلامی رنگ کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہ شاعر محض شعر ہی نہیں کہتے تھے بلکہ اپنی تعلیم اور زندگی سے ہندو دھرم کی اصلاح بھی کرنا چاہتے تھے۔ ازمنہ وسطیٰ کی مذہبی تحریک بھگتی انہیں شاعروں کی تعلیمات سے عبارت ہے۔ ہم ذیل میں ان شاعروں کا ذکر کرتے ہیں۔

---

* ان میں سے ایک نامدیو ہوئے ہیں۔ انکے بھجن گرنتھ صاحب میں ملتے ہیں۔ مگر مالا

کے بیان کے مطابق نامدیو پندھارپور ضلع شولاپور میں پیدا ہوئے۔ انکے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ چھیپی (کپڑا چھاپنے کا کام کرنے والے) تھے اور بعض دوسرے بیانوں کے مطابق وہ درزی کے گھر میں پیدا ہوئے۔ انکی پیدائش اور موت کی کوئی قطعی تاریخ ابتک نہیں معلوم۔ وہ خود ایک جگہ ترکوں کی بت شکنی کا ذکر کرتے ہیں جس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ علاءالدین خلجی کے زمانے میں کسی وقت دکن میں تھے۔ ممکن ہے کہ وہ کبیر داس کے ہمعصر ہوں یا یہ کہ انکے پیروؤں میں سے ہوں۔ اس لئے کہ انکی تعلیمات بیشتر وہی ہیں جو کبیر داس کی۔ انکا سماجی زندگی اور روح کے متعلق بھی وہی نقطۂ نظر ہے جو کبیر کا تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ نامدیو کی اندرونی زندگی کی فیصلہ کن تبدیلی اوندانگناتھ کے مندر میں واقع ہوئی۔ وہ مندر میں مہاشیوا تری کے دن بیٹھے اپنے بھجن گا رہے تھے۔ چاروں طرف مخلوق جمع تھی۔ ہر کوئی بھجنوں کے خلوص سے متاثر تھا۔ ایک طرف سے کہیں چند برہمن آرہے تھے۔ مندر کے مجاوروں نے انکے لئے راستہ صاف کرنے کو لوگوں کو مجبوراً تتر بتر کر دیا تاکہ یہ مقدس ہستیاں عوام الناس کی چھوت سے دور رہیں۔ نامدیو پر ان پنچ ذات والوں کی بے بسی کا بڑا اثر ہوا۔ انہوں نے دل میں ٹھانی کہ کسی نہ کسی طرح برہمنوں کے غرور کو نیچا دکھائیں گے۔ سفر سے واپسی پر انہوں نے اپنی زندگی تحریک بھگتی (خلوص و عقیدت) کو عام لوگوں میں پھیلانے کے لئے وقف کر دی وہ اپنے شخصی خدا کو وٹھوبا یا بٹھل کے نام سے پکارتے ہیں اور برہمنی ذہنی علوم کے خلاف عقیدہ کو نجات کا بہترین ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ کبیر کی طرح انہوں نے بھی ذات پات کی امتیازات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ وہ نہایت بلند آہنگی سے بت پرستی کی ان لفظوں میں برائی کرتے ہیں۔

آنیلے کمبھ بھرے لے اودک ٹھاکر کو اشنان کراؤں
بیالیس لکھ جی جل مہی ہوتے بٹھلو بھیلا کاسے کراؤں
آنیلے پھول پردی لے مالا ٹھاکر کی ہوں پوج کراؤں

پہلے باسولے ہے بھورا بیٹھلا بھیلا کا ئی کراؤں
آنیلے دودھری دہی سے کھیر ٹھاکر کو نیویدکراؤں
پہلے دودھو بٹاریو بھڑے بٹھلو کا ئے کراؤں
ایہنے بٹھل اوبے بٹھل نو سنسارو ناہیں

(میں بت کو اشنان کرانے کے لئے ایک برتن میں پانی بھر کے لاتا ہوں۔ پانی میں بیالیس لاکھ جانیں ہیں۔ اے بھائی! میں بٹھل (خدا) کے لئے کیا کروں؟ میں بت کے لئے پھول لاتا ہوں اور ہار پروتا ہوں تاکہ پوجا کے وقت اسے چڑھاؤں۔ بھونرے نے پہلے ہی پھولوں کی خوشبو اڑالی۔ اے بھائی! میں بٹھل کے لئے کیا کروں؟ میں دودھ لاتا ہوں۔ کھیر بناتا ہوں تاکہ بت کے سامنے پیش کروں۔ بچھڑے نے پہلے ہی دودھ کو بگاڑ دیا۔ اے بھائی! میں بٹھل کے لئے کیا کروں؟۔ خدا یہاں بھی ہے خدا وہاں بھی ہے۔ بغیر خدا کے دنیا نہیں قائم رہ سکتی)

دوسرے موقع پر نامدیو بت پرستی کے متعلق یوں کہتے ہیں:

ایکے پاتھر کیجے بھاؤ ۔۔۔ دوجے پاتھر دھرئے پاؤ
جواہو دیو تو اوہو بھی دیوا ۔۔۔ کہی نامدیو ہم ہری کے سیوا

(ایک پتھر کو لوگ پوجتے ہیں اور دوسرے پر پاؤں دھرتے ہیں۔ اگر ایک ہے تو دوسرا بھی خدا ہوا۔ نامدیو کہتا ہے کہ میں تو ہری کی سیوا کرتا ہوں)

اسلام اور ہندو دھرم کے امتزاج کا خیال بھی کبیر کی طرح نامدیو کی شاعری میں پایا جاتا ہے وہ نہایت بے تکلفی سے عربی فارسی الفاظ ہندی تلفظ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

میں گریب میں سکین تیرا نام ہے ادھارا
کریما رحیما اللہ تو گنی
دریاؤ تو دھنہ تو بسیار تو دھنی
دہی لہی ایک تو دیگر کوئی نہیں

تم دانا توں بینا میں بچارا کیا کہری

ہندو اندھا ترکو کانا

دوہن تے گیانی سیانا

ہندو پوجے دھرا مسلمان مسیت(1)

نامے سوئی سیویا جہاں دھرا نہ مسیت

ذات پات کی تمیز انکے نزدیک بیکار ہے۔ زندگی کی نجات وہ اعتقاد میں سمجھتے ہیں

کہا کرو جاتی کہا کرو پاتی

رام کو نام جیو دن راتی

تیرتھ کی بے معنی رسوم کے متعلق نامدیو کی رائے سنئے :

گنگا جاؤ گوداوری جائے تے

کمبھی(2) جاؤ کیدار نا ہیو

گومتی کہس گو دانو کیجے

کوڑی جو تیرتھ کرے

تو جو ہو اسے گا رسے

رام نام سری تونہ پوجے

(تم گنگا اور گوداوری کو تیرتھ کرنے جاتے ہو۔ کیدار ناتھ ہر بارہویں سال نہانے جاتے ہو گومتی کے لئے ہزار گائیں نذر کرتے ہو۔ چاہے تم ایک کروڑ تیرتھ کرو، چاہے تم اپنے جسم کو ہمالیہ میں (برف میں) گاڑ دو۔ لیکن یہ سب کچھ رام کے نام کی پرستش کے لئے ناکافی ہے)

نامدیو کبیر(2) کی طرح انسان دوست (humanist) ہیں وہ انسانی خلوص

---

(1) مسجد

(2) ملاحظہ ہو ہمارا مضمون "کبیرداس اور انکی شاعری"، رسالہ اردو۔ جنوری ۱۹۳۰ء

گہرائیوں کو رسم و آئین کے معیار سے نہیں جانچنا چاہتے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا میں تمام مگر انسان دوستی کے مشربِ بشریت کے احترام کو مذہبوں اور قانونوں سے بالاتر سمجھا ہے اور انسانی شخصیت کے حقوق کو برقرار رکھنے کے لئے رسوم کی سخت گیریوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے اس قسم کے انسان دوستی کے مشرب اکثر دو مختلف شائستگیوں کے آپس میں ملنے سے وجود میں آتے ہیں۔ شائستگیوں کے ملاپ سے افراد جو مدتوں کے جماعتی رویہ اور چلن سے اپنی ذاتی شخصیت کھو بیٹھے ہیں، از سرِ نو بیدار ہوتے ہیں اور پھر سے اپنا کھویا ہوا اعتماد حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ انسان دوستی (humanism) کی تحریک ہندوستان کی ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں مسلمانوں کی رہینِ منت ہے۔

نامدیو کا خطاب کبیر کی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں سے ہے۔ وہ ایک جگہ کس سادگی سے اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ مسجد کا وجود عبادت کے لئے ضروری نہیں۔ انسانی خلوص در و دیوار اور اینٹ گارے کا شرمندۂ احسان کیوں ہو؟

دیہی مسجد ی مَن مولانا

سہج نیاج گجارے

(جسم مسجد ہے۔ دل مولانا ہے۔ جب یوں ہو تو نیاز گذارنا کیسا آسان ہے)

نامدیو کے خیال کی گہرائیوں میں ہندی ہمہ اوستی تصوف کی صاف جھلک نظر آتی ہے۔ وہ ایک خدا کو پوجتے ہیں لیکن انکا خدا متصوفانہ داخل و ساری (immanent) خدا ہے۔

آپن دیو دھرا آپن آپ لگا وے پوجا

جل تے ترنگ تے ہے جل کہن سنن کو دوجا

آپہی گاوے آپہی ناچے آپ بجاوے تورا

کہت نامدیو تو میرو ٹھاکر جن اورا تو پورا

(وہ خود بت ہے خود مندر ہے۔ خود اپنی پوجا آپ کرتا ہے۔ پانی سے لہر بنتی ہے اور لہر خود

پانی ہے ۔ یہ بس کہنے سننے کو دو الگ چیزیں ہیں۔ وہ خود ہی گاتا ہے ناچتا ہے اور آپ ہی مجیرے بجاتا ہے ۔ نامدیو کہتا ہے کہ تو میرا آقا ہے۔ آدمی میں کچھ بھی نہیں ۔ تو مکمل ہے ۔

پندرہویں صدی عیسوی میں ایک ہندو صوفی دھرم داس ہوئے ہیں۔ انکے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کبیر کے شاگردوں میں ہیں ۔ یہ بھی اعلیٰ ذات کے آدمی نہیں۔ انکے خاندان ریوا کے کسودن بنیوں میں سے تھا ۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ پندرہویں سولہویں صدی کے بیشتر ہندی صوفی بھگت نیچی ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں ایسی اور مثالیں اس کثرت اور تواتر سے کسی اور عہد میں نہیں ملتیں ۔ اس کی وجہ سوائے اسلامی اثر کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ اسلام کا وجود بجائے خود ہندوستان میں ذات پات کے خلاف ایک مستقل پروپگنڈے کا حکم رکھتا ہوگا۔ اس لئے اس بات پر کوئی تعجب نہیں کہ اسلام کے ہندوستان میں آنے کے فوراً ہی بعد اس ملک کے تمام حصوں میں اور خصوصاً شمال میں جہاں اسلامی قوت سیاسی اور معاشرتی، زیادہ زوردار تھی، ایسے مفکر پیدا ہوئے جنہوں نے اسلامی خیال اور شائستگی کا اثر جذب کرنے کے بعد ہندو دھرم کی برائیوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ دھرم داس بھی اور بھگت مصلحوں کی طرح اپنے پیام کو شاعری کی زبان سے لوگوں تک پہنچاتے ہیں ۔ہم انکی شاعری کے بعض نمونے یہاں پیش کرتے ہیں:۔

واکرتا کو سیئے جن سرشٹی اُپجائے
کوٹن برہما وید پڑھی پڑھی جنا گنوائے
کوٹن وشنو ہوئی گئے کوئی پار نہ پائے

(اس خدا کی پرستش کرنی چاہئے جس نے دنیا پیدا کی۔ کروڑوں برہمن وید پڑھ پڑھ کر اپنی جان کھو دیتے ہیں۔ کروڑوں وشنو کو مانتے ہیں لیکن کوئی بھی پار نہیں ہوتا۔

تیرتھ اور دوسری مذہبی رسموں کے متعلق بھی دھرم داس کی رائے سنئے :

تیرتھ گئے کوئی نا تیرے چلی چلی مرجائے

جل دیچ اُس لگائی کے گمر تن پائے۔

جھوٹے پنڈت وید پڑھی پڑھی جگ بھرمائے

اُنکے پر کھا مری گئے ان کو ہ ناجیائی

کہہ کبیر دھرم داس سے ہنسا سمجھائی

(جو تیر تھ کے لئے چلتے چلتے مر جاتے ہیں وہ تیرے نہیں۔ انکی امیدوں کی بنا پانی ہے۔ یہ مگر مچھ کا دوسرا جنم لیں گے۔ جھوٹے پنڈتوں نے وید پڑھ پڑھ کر دنیا کو دھوکے میں ڈالا ہے۔ انکے جو بزرگ مر گئے انہیں (منتروں) سے زندہ کیوں نہیں کر لیتے؟ کبیر نے دھرم داس کو ہنس[1] یوں سمجھایا ہے۔

دھرم داس اپنے گرو کبیر کے متعلق ان لفظوں میں ذکر کرتے ہیں :

میرے من بسی گئے صاحب کبیر

ہندو کے تم گرو کراؤ مسلمان کے پیر

دو دین سے جھگڑا مانڈیو پیو نہیں سریر

شیل سنتوش دیا کے ساگر پریم پرتیت متی دھیر

وید کتیب میٹ کے آگر دو دین کے پیر

بڑے سنتن ہنکری اکشر امر سریر

دھرم داس کی بنو گوسائیں ناؤ لگاؤ تیر

(میرے دل میں کبیر صاحب سما گئے ہیں۔ تم (کبیر) ہندوؤں کے گرو ہو اور مسلمانوں کے پیر ہو۔ دونوں مذہب ایک دوسرے سے لڑتے رہے اور انہیں تمہارا جسم نہیں ملا[2]۔ تم

---

(۱) بھگت شاعروں کے ہاں "ہنس" روح کے لئے استعمال ہوا ہے۔ کبیر جب روح کا ذکر کرتے ہیں تو ہنس کی تمثیل استعمال کرتے ہیں۔

(۲) اشارہ ہے کبیر کی موت کی طرف۔ ہندو جلانا اور مسلمان دفن کرنا چاہتے تھے۔ اسی بات پر ہندو مسلم فساد ہوا۔ کہتے ہیں کہ لاش غائب ہو گئی۔ کچھ پھول ملے جنہیں ہندوؤں نے جلایا اور مسلمانوں نے دفن کیا۔ یہ دیسے

مٹھاس، لطف وکرم۔ مہر ومحبت، علم وعقل کے سمندر ہو۔ تم وید قرآن پر حاوی ہو اور دونوں مذہبوں کے پیر ہو۔ تم بڑے بڑے اولیا کے دوست ہو۔ تمہارا جسم ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ اے میرے آقا! دھرم داس کو پاک کردو اور اس کی کشتی کو پار لگادو)

ایک اور بھگت شاعر چار تھے۔ انکا نام رائے داس ہے۔ یہ راما نند کے شاگردوں میں سے تھے۔ اور اس لئے کبیر کے پیر بھائی ہوئے۔ یہ اپنی عوامی زبان میں تعلیم وتلقین کرتے تھے۔ انکے ہاں اسلامی رنگ کی جھلک ذرا اور زیادہ صاف نظر آتی ہے۔ یہ بھی ہندوؤں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ اور اس لئے بے معنی رسوم کی تنقید میں یہ ذرا سا بھی جھجکتے نہیں۔ کہتے ہیں:

کہا بھیو جے چرن پکھارے جو لو تتو انہ چینھے
کہا بھیو جو مونڈ منڈ لئے کہا تیرتھ برتا کینھے

(پیر دھونے سے کیا فائدہ جب تک کہ اس ذات کا خیال نہ کیا جائے۔ سر منڈانے سے کیا فائدہ اور تیرتھ اور روزوں میں کیا رکھا ہے؟)

دیگر

تھوتھی کایا تھوتھی مایا تھوتھی ہری بن جنم گنوایا
تھوتھی پنڈت تھوتھی بانی تھوتھی ہری بن سبے کہانی
تھوتھی مندر بھوگ بلاسا تھوتھی آن دیوا کی آسا

(جسم خالی (بیکار) ہے، مایا (دنیا) خالی ہے۔ زندگی بغیر ہری کے خالی ہے اور گم ہے پنڈت اور اسکے وعظ خالی ہیں۔ بغیر ہری کے سب کہانیاں خالی ہیں۔ مندر خالی ہے اور عیش و طرب خالی ہے۔ کسی دوسرے خدا میں[1] (سوائے خدا کے) امید رکھنا خالی ہے)

تو ایک عوامی اور ناقابل یقین روایت ہے لیکن اسکی گہرائیوں میں ہماری قومی زندگی کا ایک بڑا اہم مسئلہ پوشیدہ ہے جس کا کوئی حل اب تک نہ مل سکا۔ عوامی تخئیل بڑی بڑی حقیقتوں کو یوں ہی سیدھی سادی روایتوں میں بیان کرنے کا عادی ہے۔

(۱) الا اللہ

اپنی نیچی ذات کا وہ ایک جگہ یوں ذکر کرتے ہیں:-

ناگر جنم میری جاتی بکھیات چمارن

رِدے رام گوبند گن سارن

سر سری سلل کرت بارونی

اے سنت جن کرت نہیں پانن

سورا اپاوتر نتا اورا جل

اے سُر سری بلت نہیں ہوئے آنن

(اے شہر کے رہنے والو! میری ذات پات مشہور ہے۔ میں چمار ہوں۔ میرے دل میں رام اور گوبند تمام صفات کی روح بنکر رہتے ہیں۔ اگر شراب گنگا کے پانی سے ملا کر بنائی جائے تو بھی نیک لوگ اسے نہیں پیتے۔ شراب ناپاک ہے۔ اور دوسرا پانی ملنے سے بھی ناپاک رہتی ہے لیکن بہتی گنگا کے پانی میں اگر شراب ڈالدی جائے تو وہ ناپاک نہیں ہوتا)

دوسری جگہ کہتے ہیں:

برہمن ویشیں شدر ار کھتری

ڈوم چنڈار ملیچھ من سوئی

ہوئی پنیت بھگونت بھجن تے

آپو تاری تارے کُل دوئی

(برہمن، ویشیں، شدر، کھتری، ڈوم، چنڈال اور ملیچھ[1] سب کی ایک روح ہے۔ اعتقاد و عبادت سے جو پاک ہو جائے بس وہی خود کو اور اپنے خاندان کو پار لگا سکتا ہے)

---

(۱) مدتوں تک برہمن مسلمانوں کو ملیچھ یعنی "ناپاک اجنبی" کے لفظ سے یاد کرتے تھے۔ مسلمانوں کی تخصیص نہیں۔ یونانی اور سیتھین قبائل بھی اس وقت تک قدیم ہندی کتابوں میں اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں جب تک کہ وہ ہندویت میں بالکل جذب نہ ہو گئے۔

رانے داس کو یہ فخر حاصل ہے کہ اسے رانی میرا بائی جیسا شاگرد ملا۔ میرا بائی والی مارواڑ دوداجی راؤ کی پوتی تھیں۔ سیسودیا کے شاہی خاندان میں سنگھا جی کے بیٹے بھوج راج سے انکی شادی ہوئی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ میرا بائی کی تلسی داس اور بادشاہ اکبر سے بھی خط و کتابت تھی اور ایک مرتبہ خود اکبر مع تان سین میرا بائی سے ملنے کے لئے مارواڑ آیا تھا۔ اگرچہ تاریخی ثبوت اس واقع کی تصدیق میں موجود نہیں لیکن ممکن ہے کہ اس عوامی روایت میں تھوڑی بہت صحت ہو۔ اکبر کے لئے جو خود ایک ایسا مذہب بنانا چاہتا تھا کہ جو اسلام اور ہندو دھرم دونوں کے عناصر پر مبنی ہو یقیناً میرا بائی سے ملنے میں ایک خاص دلچسپی ہو گی۔

میرا بائی بھی دوسرے بھگت شاعروں کی طرح انسان دوستی کے مشرب کو بطور اپنے مذہب اور روحانی ہدایت کے سمجھتی تھی۔ اس کی بھگتی کا قبلۂ مقصود، بخلاف کبیر، دھرم داس اور رائے داس کے جو رام پر اعتقاد رکھتے تھے، سری کرشن تھے۔ وہ سری کرشن کو گردھر گوپال کے لقب سے پکارتی ہے۔ اس کے ہاں خدائے واحد کا تخیل بڑی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے عہد پران کی روایتوں اور بھگتی کی جذباتی اعتقادی تحریک سے ملا کر اپنا ایک الگ خدا کا تصور پیدا کر لیا تھا۔ اس کی شاعری میں ایک ایسا اعتقادی جوش ہے جو اس عہد سے پہلے ہندوستانی خیال اور شاعری میں نہیں پایا جاتا۔ ممکن ہے کہ میرا بائی تھوڑی بہت فارسی جانتی ہو کیونکہ ازمنۂ وسطیٰ میں فارسی ہندوستانی شائستگی کی زبان تھی اور ہندو امرا کے یہاں بھی اسی زبان میں کارروائی ہوتی تھی۔ وہ فارسی کے الفاظ نہایت بے تکلفی سے استعمال کرتی ہے۔ مثلاً

سب میں مہیما تیری دیکھی کدرت[1] کے کربان[2]
مجھ پر تو پربھو کرپا کیجے بندی اپنی جان

---

(۱) قدرت

(۲) قربان

(ہر چیز میں تیری شان دیکھی۔ میں تیری قدرت کے قربان جاؤں۔ اے میرے پربھو مجھ پر کرم کرو اور اپنی لونڈی سمجھو)

ہندو دھرم کی رسوم کے خلاف وہ کہتی ہے:

اس دیہی کا گرب نہ کرنا ماٹی میں ملجاسی
کہا بھیو تیر تھ برت کنیہے کہا لئے کرو ٹ کاسی
کہا بھیو ہے بھگوا پہریاں گھر تج بھئے سنیاسی
جوگی ہو یا جگتی نہیں جانی الٹی جنم پھراسی

(تیرتھ اور روزوں میں کیا رکھا ہے؟ بھلا بنارس (کاشی) کی طرف کروٹ لیکر سونے سے کیا حاصل؟ اس جسم پر غرور بیکار ہے۔ یہ تو مٹی میں عنقریب ملجائے گا۔ رنگے ہوئے کپڑے پہننے اور گھر بار چھوڑ کے سنیاسی بننے کا کیا نتیجہ؟ لوگ جوگی ہوجاتے ہیں لیکن صحیح جگت (فقیری) سے نا واقف ہیں اور اپنی زندگی کو الٹا راستہ چلاتے ہیں)

میرا بائی کی شاعری میں ایک خاص زور اور جوش ہے۔ وہ اپنے عشق کا اظہار اُس زبان میں کرتی ہے جسے یا تو عورتیں جانتی ہیں یا صوفیا۔ مثال کے طور پر ہم چند شعر نقل کرتے ہیں:-

میرے تو گردھر گوپال دوسرا نہ کوئی
دوسرا نہ کوئی سادھو دوسرا نہ کوئی
پریم کا متھنیاں ساتھی بھگتی سے بلوئی
گھرت گھرت کا ڑی لینھو چھاچ پیو کوئی
آنسواں جل سینچی سینچ پریم بیلی بوئی
اب تو بیل پھیل گئی آنند پھل ہوئی
سنتن ڈِگ بیٹھ بیٹھ لوک لاج کھوئی

چھانڑ دی کل کی ریت کیا کری ہے کوئی
آئی میں بھگتی کاٹ جگت دیکھ موہی
داسی میرا گردھر پربھو تارو اب موھی

(میرے تو گردھر گوپال[1] ہیں اور کوئی دوسرا نہیں ۔ اور کوئی دوسرا نہیں ۔ ارے بھلے لوگو! اور کوئی دوسرا میرا نہیں ۔ محبت کی متھانی سے میں متھتی ہوں اور اس منھانی کو اعتقاد و خلوص گھماتے ہیں ۔ گھی گھی سارا میں نے لے لیا اب باقی مٹھا جو بچا تو جو چاہے پی لے ۔ آنسوؤں کے پانی سے محبت کی بیل کو میں نے جمایا ہے ۔ اب بیل پروان چڑھی اور اسکا پھل اصلی خوشی (آنند) ہے نیکوں کی صحبت میں بیٹھ بیٹھکر میں نے دنیا کی شرم و حیا کھو دی ۔ ذات پات کی ساری رسمیں چھوڑ دیں ۔ بھلا دیکھوں کوئی میرا کیا کرے ؟ میں یہاں اپنا خلوص نذر چڑھانے آئی ہوں اور ساری دنیا مجھے دیکھتی ہے ۔ اے میرے مالک اپنی لونڈی میرا کو پار اتار دو)

دیگر

ہری میں تو پریم دوانی میرا درد نہ جانو کوئی
سولی اوپر سیج ہماری کس بدھی سونا ہوئی
درد کی ماری بن بن ڈولوں ویدی ملا نہیں کوئی
میرا کے پربھو پیر مٹے گی جب وید سانولیا ہوئی

(اے ہری! میں تو محبت کی دیوانی ہوں ۔ میرے درد کا حال کسی کو نہیں معلوم ۔ میرا بچھونا سولی پر ہے ، بھلا میں کیسے سو سکتی ہوں ؟ درد کے مارے بنوں میں ماری ماری پھرتی ہوں ۔ کوئی اس درد کو دور کرنے والا طبیب نہیں ملا ۔ اے میرا کے مالک ! میرا کا دکھ تو اسی وقت دور

---

(۱) گردھر بمعنی پہاڑ کو تھامنے والا اور گوپال گڈریئے کو کہتے ہیں ۔ یہ دونوں لفظ سری کرشن جی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں ۔

ہوگا جب سانولے رنگ والا اسکا طبیب ہوگا)

انہیں بھگت شاعروں کے سلسلہ میں ایک دادو دیال ہوئے ہیں کبیر کے بعد انکا اثر سب سے زیادہ گہرا اور پھیلا ہوا ہے۔ ان کی تعلیمات کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے اسلام اور ہندو دھرم کے بہترین روحانی عناصر کو ملا کر ایک اعتقادی نصب العین اپنے دیس والوں کے لئے پیش کیا۔ انکے ماننے والے آجتک راجپوتانے اور وسط ہند میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ دادو پنتھی کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ دادو دیال نے، گجراتی، مارواڑی، ہندی اور فارسی میں شعر کہے ہیں۔ دادو دیال کے مذہبی اصول میں کوئی نئی بات نہیں ملتی۔ انسان اور خدا کے متعلق انکے خیالات بالکل وہی ہیں جو کبیر کے تھے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستان میں ازمنہ وسطیٰ کی پوری اعتقادی تحریک کا مدار کبیر اور اسکی تعلیمات ہیں۔ کبیر کا وجود اس عہد کے خیال اور مذہب کی تاریخ میں مرکزی صورت رکھتا ہے۔

دادو دیال کی تعلیمات کا خلاصہ ایچ ایچ ولسن نے ان لفظوں میں دیا ہے:

" اُس کو قبلۂ توجہ بناؤ جس نے سب کچھ پیدا کیا۔ پنڈت اور قاضی پاگل ہیں۔ انہوں نے جو کتابوں کا ڈھیر جمع کیا ہے اس سے کیا حاصل؟ ویدوں کو پڑھنے میں اپنی زندگی مت برباد کرو۔"[1]

دادو دیال بلا واسطہ طور پر اپنے مشن کا روحانی تعلق کبیر سے یوں بتاتے ہیں:-

کبیر بچارہ کہی گیا بہت بھانتی سمجھائے
دادو دنیا باوری تاکے سنگ نہ جائے

(کبیر بچارہ نے طرح طرح سے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اے دادو! دنیا

---

(۱) "دی ریلیجن آف دی ہندوز" ، صفحہ ۱۹۲

بولی ہے اس کے ساتھ نہیں چلتی)

معلوم ہوتا ہے دادو نے مسلمان صوفیوں کے ساتھ اچھا خاصہ وقت گذارا۔ وہ صوفیوں کے اصطلاحی لفظ بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں :

اللہ تیرا ذکر فکر کرتے ہیں

عاشک مشتاک تیرے ترس ترس مرتے ہیں

ملک سیش دگر نیس بیٹھے دن بھرتے ہیں

دایم دربار تیرے گیر محل ڈرتے ہیں

تن شہید من شہید رات دن لڑتے ہیں

گیان تیرا دھیان تیرا عشق آگ جلتے ہیں

جان تیرا جند تیرا پاؤں سر دھرتے ہیں

دادو دیوان تیرا زر شریہ گھر کے ہیں

دیگر

دادو میں ہی میرا عرس میں ہی میرا تھان

میں ہوں میر دٹھور میں آپ کہے رحمٰن

دیگر

نور ہی کا دھر نور ہی کا گھر

نور ہی کا یار دمیرا

نور ہی کا میلا نور ہی کا شیلا

نور اکیلا

نور ہی منجھی بسیرا

نور ہی کا انگ

نور ہی کا سنگ

نور ہی کا رنگ میرا[1]

نور ہی راتا نور ہی ماتا

نور ہی ستا دادو تیرا

دیگر

دادو الکھ اللہ کا کہو کیسا ہے نور

بے حد واکو حد نہیں سکل رہا بھرپور

(اے دادو! ان دیکھے اللہ کا ذکر کرو۔ اسکا نور کیا ہے؟ وہ بے حد ہے۔ اسکی کوئی حد نہیں۔ وہ ہمیشہ بھرپور قایم رہتا ہے)

دادو کے ہاں کبیر کی طرح خدا کی وحدانیت کا تخیل بالکل متعین ہے: مثلاً

انتر جامی ایک تو آتم کے آدھار

جو تم چھوڑو ہاتھ تے کون سنوارھار

(اندرونی (یعنی روحانی) زندگی کو بس تو ہی اکیلا درست کرنے والا ہے۔ تو ہی روح کی ڈھارس ہے۔ اگر تو اپنا مدد کا ہاتھ چھڑا لے تو مجھے اور کون سہارا دے سکے گا؟)

دیگر

راکھن ہارا ایک تو مارن ہارا انیک

دادو کو دیا نہیں تو ن ہی آپ ہی دیکھ

(تو ایک اکیلا ہی حفاظت کرنے والا ہے۔ مارنے والے بے گنتی ہیں۔ دادو کے لئے اور کوئی دوسرا نہیں ہے۔ تو خود دیکھ)

---

(۱) صبغۃ اللہ ۔ بالکل اسلامی اور سامی خیال ہے۔ اسلام سے پہلے [illegible] مذہبی خیال اس سے ناآشنا تھا۔

دیگر

دادو یاہ تن پنجرا ماہیں من سودا
ایک ناؤں اللہ کا پڑھی جاپجی ہودا

(اے دادو! یہ تن ایک پنجرا ہے جس میں دل ایک طوطے کی طرح قید ہے۔ یہ دل ایک اللہ کا نام پڑھ پڑھ کے اس کا حافظ ہو گیا ہے)

دیگر

صاحب میرا پڑا صاحب میرا کھان
سو صاحب سرتاج ہے صاحب پنڈ پران

(صاحب (اللہ) ہی میرا لباس ہے۔ صاحب ہی میری خوراک ہے۔ وہی صاحب میرا سرتاج ہے اور میرا بدن اور روح بھی وہی ہے)

دیگر

سوئی گیانی سوئی جنگما سوئی صوفی سوئی سیش
سوئی سنیاسی سے بڑے دادو ایک ایش
سوئی کاجی سوئی ملا سوئی مومن مسلمان
سوئی سیانے ست بھلے جے جاتے رحمن
رام نام کو باتجیا بیٹھے تاپے مڈیا ہاٹ
سائیں سہودا کرے دادو شولی کپاٹ

(وہی عالم ہے۔ وہی اصلی سادھو ہے۔ وہی صوفی اور شیخ ہے۔ وہی سنیاسی سے بڑا ہے جو اسے دادو ایک خدا کی تشریح کرے۔ وہی قاضی اور ملا ہے، وہی مومن اور مسلمان ہے۔ وہی عاقل اور سچا ہے جو رحمن سے محبت رکھے۔ میں نے رام کے نام کی تجارت کر رکھی ہے اور ایک ہاٹ جما رکھا ہے۔ سائیں سے سودا کر کے دادو نے (دل کے یا دکان کے) دروازے

کے پات کنول دستے ہیں۔

دادو دیدار الٰہی کو صوفیوں کی طرح اپنی زندگی کی نجات سمجھتے ہیں:-

دین دُنی صدکے کروں دیکھن دے دیدار

تن من چھن کروں بہشت دوجگ بھی وار

(میں دین اور دنیا دونوں صدقہ کرتا ہوں۔ مجھے اپنا دیدار دیکھنے دے۔ تن من اور جنت دوزخ سب (اس دیدار کی خاطر قربان)

ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی رسموں کے اختلاف پر اور اس اہمیت پر جو اس اختلاف کو دی جاتی ہے۔ دادو بہت افسردہ خاطر ہو کر یوں کہتے ہیں:

ہندو ترک نہ جانو دوئی

سائیں سبنی کا سوئی ہوئی

اور نہ دوجا دیکھوں کوئی

کوئی رام کوئی اللہ ساوی

پنی اللہ رام کا بھید نہ پاوی

کوئی ہندو کوئی ترک کری مانی

پنی ہندو ترک کی کھبری نہ جانی

دادو دیکھی آتم ایک

کہیا سنیا اننت انیک[1]

(ہندو اور ترک (مسلمان) دونوں ناواقف ہیں۔ خدا سب کا ایک ہی ہے مجھے دوسرا

---

(۱) " دادو دیال کا شبد" صفحہ ۱۴۰۔ ہم نے دادو کے سب دوہے اور شبد اس کتاب یا " دادو دیال کی بانی" ہر د مطبوعہ آگری پرچارنی سبھا سے لئے ہیں۔

خدا نہیں دکھائی دیتا۔ کوئی اللہ کہتا ہے اور کوئی رام کہتا ہے لیکن رام کا اصلی بھید انہیں نہیں معلوم۔ کوئی اپنے کو ہندو کہتا ہے اور کوئی ترک لیکن یہ سب ہندو اور ترک بننے کے راز سے بے خبر ہیں۔ داود کو تو ہر جگہ بس ایک روح مطلق نظر آتی ہے اور وہ اُسی ابدی ایک کا ذکر کرتا سنتا ہے)

اُسے ہندو کے بُت سے بھی اتنی ہی کم دلچسپی ہے جتنی کہ مسلمان کی مسجد سے اس لئے کہ وہ بقول غالب دونوں کو راہ شوق میں تھکے ہوؤں اور پست ہمتوں کی پناہیں سمجھتا ہے۔[1] کہتا ہے :-

ہندو لاگے دیو ہرا مسلمان مہتی

ہم لاگے ایک الکھ سون سدا نرنتر پریتی

(ہندو بت پوجتا ہے مسلمان مسجد میں عبادت کرتا ہے۔ ہم ایک ان دیکھے سے تعلق رکھتے ہیں جس کی محبت میں ابدیت ہے)

وحدانیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی ؟

اوپر کے صفحوں میں ازمنہ وسطیٰ کی عوامی مذہبی تحریک کے مصلح شاعروں کا سرسری ذکر کیا گیا ہے۔ ان شاعروں کی تاریخ پیدائش و وفات کی صحیح تعیین اس قدر مشکل ہے جتنی کہ ان کے کلام کی لسانیاتی تنقید۔ بعض دفعہ ایک ہی شاعر کی طرف مختلف عہدوں کی زبان منسوب کی گئی ہے۔ ہوا اصل میں یہ ہے، جیسا کہ اردو دوسری جگہ بھی ہوا ہے، کہ بعد کی آنے والی

---

(۱) دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا

واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

(نسخۂ حمیدیہ)

نسلوں نے نام سے فائدہ اٹھانے کے لئے اور خود اپنی باتوں کو موثر بنانے کے لئے اپنے متقدمین کی طرف اشعار منسوب کرنے میں کوئی اخلاقی ہرج نہ سمجھا۔ خصوصاً کبیر کے ہاں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ یہ عہد ہمارے مورخ اور ادیب دونوں کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جس قدر اہمیت زیادہ ہے اتنا ہی کم کام اس عہد کی تاریخ و ادب میں کیا گیا ہے۔ اس مذہبی تحریک کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت اسلامی تہذیب و تعلیم کا وہ گہرا اثر ہے جو ہندو خیال اور تمدنی نظاموں پر پڑا۔ سوائے اسلامی اثر کے اور وہ کیا تھا جس کے باعث چودھویں پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں شمالی ہند کا کونا کونا وحدانیت سے بھرے ہوئے گیتوں اور ذات پات کے نظام کے خلاف صدائے احتجاج کے شور سے گونج اٹھا۔ ہم نے بن بھگت شاعروں کا اوپر ذکر کیا انہیں کا روحانی سلسلہ برابر اٹھارہویں صدی عیسوی تک قائم رہا۔ ملوک داس، ہری چند، یاری صاحب (مسلمان بھگت شاعر ہوئے ہیں) دھرنی داس، دریا صاحب بہاری (مسلمان) سب کے سب ایک ہی راگ الاپنے والے تھے۔ ان سب کی تعلیمات وہی ہیں جو کبیر کی اور ان سب کے مخاطب گاؤں کے لوگ تھے۔

یہ سب بھگت شاعر صوفی تھے۔ اور تصوف ایک گہرا انفرادی نفسی تجربہ ہے۔ جو رسم و آئین سے بے نیاز ہے۔ جب وہ ادارہ بننا چاہتا ہے تو اس کے لئے تشکیل لازمی ہے۔ اور تشکیل بغیر رسم و آئین کے ممکن نہیں۔ یہ دیکھکر کچھ تعجب نہیں ہوتا کہ جنہوں نے ذات پات کو مٹانا اپنی تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا تھا انہیں کے پیرؤوں نے خود اپنے آپ کو ذات پات کے تنگ دائرہ میں محدود کر دیا اور امتداد زمانے سے ان کے ہاں بھی سخت گیریوں اور رسوم کی پابندی کو وہی جگہ حاصل ہو گئی جو ہندوؤں کے دوسرے طبقوں میں پہلے سے موجود تھی۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے کہ کبیر اور اس کے اسکول

کے دوسرے صوفی مصلحوں کا یہ ہرگز منشا نہ تھا کہ ان کی تعلیم کو سننے اور ماننے والوں کے الگ گروہ بن جائیں۔ یہ سب لوگ انسان دوست تھے اور انسان دوستی کی ذہنی اور روحانی آزادیوں کو ہندو سماج میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ اسلام ان کے خیال و ذہن کے لئے محرک بنا۔ لیکن انکے بس کی بات نہ تھی کہ اپنے پیروؤں کو الگ ذات بننے سے روک سکتے۔ دنیا میں ہر جگہ یہ ہوا ہے کہ خیال اپنی موثری کے لئے تشکیل چاہتا ہے۔ یہی تشکیل ادارہ بن جاتی ہے۔ اداروں کا اصلی خیال سے قریب تر ہونا اُن کے حاملوں کے روحانی اور ذہنی توازن پر مبنی ہے۔ انسانی غرضوں نے اس توازن کو نایاب بنا دیا ہے۔

مسئلہ افلاس ہند

اور

جدید معاشیاتی تحقیقات

(گذشتہ سے پیوستہ)

مسئلہ توازن تجارت اور افلاس ہند

ہمیں معلوم ہو چکا کہ ہندوستانی زرعی پیداوار پر دو صحیح اعتراضات کئے جاتے ہیں اول تو یہ کہ ہندوستانی باوجود استطاعت کے اس قدر دولت ہی پیدا نہیں کرتے جو تمام آبادی کے لئے کافی ہو۔ دوسرے یہ کہ یہاں کی معاشی دولت زیادہ تر متوسط اور ادنیٰ درجہ کی ہوتی ہے اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں دیکھنا ہے کہ مسئلہ توازن تجارت کا تعلق افلاس ہند سے کیا ہے۔

توازن تجارت سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ کسی ملک کی درآمد و برآمد میں توازن رہے یعنی یہ کہ جس قدر قیمت کا مال کسی ملک میں داخل ہو اُسی قیمت کا مال ملک کے باہر جائے، فرض کیجئے کہ ایران سے ہر سال بیس کروڑ کا مال جاتا ہے اور سولہ کروڑ کا مال آتا ہے۔ یہ چار کروڑ کی زائد برآمد مروجہ اصول کے مطابق ایران کے لئے "بچت ہے" اُسکے حق میں "مفید" ہے لہذا معاشیین اس قسم کی تجارت کو تجارت موافق (Favourable Trade.) کہتے ہیں۔ اگر ایران سولہ کروڑ کا مال دوسرے ممالک کو بھیجے اور دوسرے ممالک سے بیس کروڑ کا مال ایران میں داخل ہو تو یہ تجارت اُس کے لئے مضر ہے اور معاشیین اُس کو "ناموافق تجارت" سے تعبیر کرتے ہیں ثبوت میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ملکی درآمد و برآمد شخصی آمدنی و اخراجات سے مماثل ہیں جس طرح کسی شخص کی آمدنی سے اس کے اخراجات کا زائد ہونا معاشی پسماندگی کی علامت ہے اور آمدنی کا اخراجات سے زائد ہونا ترقی کی نشانی ہے ایسا ہی حال اقوام و ممالک کی درآمد

برآمد کا ہے کیونکہ درآمد برآمد سے بڑھی رہے تو دوسروں سے رقم واجب الوصول ہوتی ہے جو معاشی ترقی کی نشانی ہے لیکن اگر درآمد برآمد سے بڑھی رہے تو ملک کو رقم ادا کرنی پڑتی ہے جو معاشی تنزل کی علامت ہے لہذا زاید درآمد افلاس سے اور زائد برآمد دولتمندی سے تعبیر کیجاتی ہے ۔ اسی غرض سے کم سے کم مجموعی درآمد اور مجموعی برآمد کی قیمتوں میں توازن مطلوب ہوتا ہے ۔

معاشئین سمجھتے رہے ہیں کہ درحقیقت توازن تجارت کا نظریہ صحیح و مکمل ہے لیکن جدید معاشیاتی تحقیقات نے یہ بات واضح کردی ہے کہ نظریہ توازن تجارت صرف محدود معنی میں صحیح ہے اور وہ عام طور پر منطبق نہیں کیا جا سکتا لہذا درآمد برآمد سے بڑھی رہے تو یہ ہمیشہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ ملک مفلس ہو رہا ہے اور برآمد درآمد سے بڑھی رہے تو ملک معاشی ترقی کر رہا ہے کیونکہ بسا اوقات درآمد کا برآمد سے کم رہنا زوال کی نشانی ہے اور یہی ہندوستان کا حال ہے ۔

ہندوستانی درآمد و برآمد کے اعداد و شمار کا جب مقابلہ کیا جاتا ہے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی تجارت کا رجحان تدریجی اضافۂ برآمد کی طرف ہے جو حسب ذیل اعداد سے عیاں ہے[1]:-

سنہ	خالص زاید برآمد	سنہ	خالص زاید برآمد
۱۸۷۰	۸ کرور	۱۹۱۷	۳۶ کرور
۱۸۸۰	۱۴ "	۱۹۱۹	۴۹ "
۱۹۰۰	۶ "	۱۹۲۳	۷۲ "
۱۹۱۰	۴۳ "	۱۹۲۴	۵۳ "
۱۹۱۳	۲۱ "	۱۹۲۵	۹۹ "

انگریزی حکما، ماہرین سیاسیات اور عام اخبار نویس اس سے (خیالی نظریہ موافق ناموافق توازن تجارت کے بموجب) یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہندوستان امیر ہوتا جا رہا ہے اور

---

[1] ماخوذ از Indian Economics مصنفہ ہیری اور جاتھر مطبوعہ تاراپور والا ۱۹۲۹ء جلد دوم صفحہ ۲۶۹

اُسے زاید برآمد کی وجہ سے یہ مفید اور قابل رشک موقع مل رہا ہے کہ دوسروں سے کام کرائے یہی وجہ ہے کہ برطانوی عہدہ دار و سپاہی ہندوستان میں کام انجام دے سکتے ہیں اگر اس کی برآمد اسکی درآمد سے بڑھی نہ ہوتی تو اسے سخت مشکل کا سامنا ہوتا بہر طور ہندوستان کی مثال اس امیر کی سی ہے جس کی آمدنی بتدریج بڑھ رہی ہے اور جیسے جیسے اُس کی دولت و آمدنی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے وہ زیادہ نوکر رکھتا ہے، زیادہ کھیل تماشہ دیکھتا ہے، زیادہ خدمات لیتا ہے، غرضکہ بحیثیت مجموعی بہتر زندگی بسر کرتا ہے۔

عام تعلیم یافتہ حضرات کا یہ خیال صحیح ہوتا اگر توازن تجارت کا نظریہ بھی صحیح ہوتا۔ مگر جیسا کہ ہم ابھی ثابت کرنے کی کوشش کرینگے یہ نظریہ قطعی طور پر صحیح نہیں، اور موافق و ناموافق توازن تجارت اور معاشی ترقی و تنزل میں کوئی ربط و تناسب نہیں، لہذا کسی ملک کی مادی بہبودی کا اندازہ کرنے کے لئے توازن تجارت پر کلی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

نظریہ توازن تجارت کی قطعیت کے خلاف دلائل

فرض کیجئے کہ ہندوستان کا ایک تاجر دس ہزار روپیہ کا مرادآبادی سامان فروخت کی غرض سے جاوا بھیجتا ہے اور ہندوستان کے برآمد کے رجسٹر میں ۱۰۰۰۰ کی رقم درج کیجاتی ہے، اور یہی تاجر اپنے نمائندہ مقیم جاوا کو لکھتا ہے کہ جو کچھ رقم مرادآبادی سامان کے فروخت کرنے سے حاصل ہو اُسکی شکر تم ہندوستان بھیج دو۔ اس مثال میں بین الاقوامی تجارت کی سہل ترین ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ صرف سہولت تفہیم کی خاطر ہم نے اس سہل ترین صورت کو پیش نظر رکھا ہے۔ حالانکہ درحقیقت تجارت میں بالعموم دو فریق اور اقسام دولت ہی نہیں ہوتے بلکہ مختلف خریدار و فروشندے اور مختلف اقسام دولت ہوا کرتے ہیں۔ بہر طور دنیا کا کاروبار اسی نہج پر چل رہا ہے۔

یہی مرادآبادی سامان جاوا پہنچکر ۱۲۰۰۰ روپیہ کا ہو جاتا ہے کیونکہ تاجر کو سامان کے پیکنگ اور حمل و نقل کے اخراجات اور جاوا کا درآمدی محصول ادا کرنا پڑتا ہے، ان حالات میں دو صورتیں ممکن ہیں :-

اول یہ کہ مراد آبادی سامان کی قسم عمدہ نہ ہونے کے باعث اور سامان خوش وضع اور جاوا والوں کے احتیاجات کے لئے ناموزوں ہونے کے باعث اس کی مانگ جاوا میں زیادہ نہ ہو، اور اس سبب سے مال کسی طرح ۵۰۰۰ سے زیادہ پر نہ بک سکے۔ پس جاوا کے نمائندے نے مجبوراً ۵۰۰۰ کی شکر ہندوستان روانہ کی جو اخراجات حمل ونقل کو ملا کر مراد آباد پہنچنے پر ۶۰۰۰ کی ہوئی اور یہی رقم ہندوستان کے درآمد کے رجسٹر میں داخل کر دی گئی۔

موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۰،۰۰۰ کا مال بھیجا گیا اور ۶۰۰۰ کا مال خریدا گیا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ توازن تجارت ہندوستان کے لئے موافق ہے اور نظریہ توازن کے مطابق ہندوستان کو ۴۰۰۰ کی رقم واجب الوصول ہے (کس طرح؟ کس سے؟) اس نظریہ کے حامی کہتے ہیں کہ ہندوستان نے ۱۰،۰۰۰ کا مال بیچا اور ۶۰۰۰ کا خریدا، لہٰذا وہ منافع میں رہا مگر ہم کہتے ہیں کہ ہندوستان کو ۱۲،۰۰۰ کے مال کے معاوضہ میں صرف ۶۰۰۰ کا مال ملا لہٰذا ہندوستان کو ۶۰۰۰ کا نقصان ہوا۔

اس تبادلۂ دولت کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اسی قدر مراد آبادی سامان عمدہ قسم کا ہونے، خوش وضع اور خوشنما ہونے، اور جاوا والوں کے احتیاجات کے مناسب بنائے جانے کے باعث ۲۰،۰۰۰ روپیہ میں بکا اور جاوا والے نمائندے نے مراد آبادی تاجر کو ۲۰،۰۰۰ کی شکر بھجوا دی اور ہندوستان کے درآمدی رجسٹر میں ۲۰،۰۰۰ کی رقم داخل کر دی گئی۔ نتیجہ موازنہ یہ کہ ہندوستان کے حق میں یہ ناموافق تجارت ہے۔ کیونکہ اس مرتبہ ہندوستان نے ۲۰،۰۰۰ کا مال منگوایا حالانکہ اس نے صرف ۱۰،۰۰۰ کا مال بھیجا تھا یہ زاید درآمد توازن تجارت کے "زریں" اصول کے مطابق ہندوستان کا نقصان ہے مگر جدید معاشیاتی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اس صورت میں ہندوستان کا سراسر نفع ہے کیونکہ ہندوستانی تاجر کو ۱۰،۰۰۰ کا سامان بھیجتے وقت ۲۰۰۰ حمل ونقل کے لئے دینے پڑے۔ اور شکر منگانے کے لئے ۳۰۰۰ اس طرح کل ۵۰۰۰ کا مزید خرچ ہوا مگر ۲۰،۰۰۰ کی شکر حاصل ہوئی یعنی ۵۰۰۰ کا منافع ہوا۔ مگر اس نظریہ کے خلاف رائے

رکھنے والے، جو اس گہری نظر سے معاشی حقائق کا مطالعہ کرنے سے قاصر ہیں، اور حقیقت معاشیات سے واقف نہیں یہی گمان کرتے ہیں، درآمد زیادہ برآمد کم نتیجہ معاشی تنزل!!

گویا موافقین نظریہ توازن تجارت کی منطق کے مطابق اعلیٰ تنظیم، اعلیٰ کارکردگی، عمدہ مذاق اور عمدہ قسم سامان ہو تو نتیجہ معاشی تنزل ہوتا ہے اور بدنظمی، ادنیٰ کارکردگی، پھوہڑپن، بدمذاقی سے معاشی ترقی حاصل ہوتی ہے!!

نظریہ توازن تجارت کے سراسر ناقابل اعتماد ہونیکے ثبوت میں بہترین مثال یہ پیش کیجا سکتی ہے:- فرض کیجئے کہ وہ جہاز جو مرادآبادی سامان جاوا لیجا رہا تھا کسی وجہ سے غرق ہو جائے ظاہر ہے کہ جاوا والا نمائندہ اس مرتبہ ایک روپیہ کا بھی سامان اپنے مرادآبادی مالک کو نہ بھیج سکیگا۔ نظریہ توازن تجارت کے قائل فوراً اعداد و شمار سے یہ نتیجہ نکال لیں گے کہ برآمد...۱۰۰۰۰ اور آمد ندارد۔ ہندوستان کی موافق تجارت بقدر دس ہزار ہے جو دوسروں سے وصول طلب ہیں (جہاز کے ساتھ سامان بھی غرق ہو گیا تو پھر رقم کس سے اور کیونکر وصول ہوا؟)

جن لوگوں میں فہم عامہ اور صحیح ذہنیت موجود ہے، جن لوگوں کا دماغ سطحی معاشی نظریات سے مرعوب نہیں ہوتا، اور اصول معاشیات کے جاننے کے باوجود حقیقی حالات کے پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہے، جس سے نظریاتی معاشیات پڑھتے پڑھتے ذاتی غور و فکر کی طاقت سلب نہیں ہو گئی ہے۔ وہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ طرز استدلال صحیح نہیں، اور نظریہ توازن تجارت کسی طرح قطعیت کا دعویدار نہیں ہو سکتا اور موافق و ناموافق توازن تجارت سے کسی ملک کی مرفہ الحالی یا معاشی تنزل کا پتہ نہیں چل سکتا۔

توازن تجارت کی موافقت و ناموافقت کے غلط تصورات اس قدر عام ہیں کہ وہ ماہرین سیاسیات، مصلحان قوم و معاشرت، رہبران سیاست، مقالہ نویسوں، رسالہ نگاروں اور عام پڑھے لکھے اشخاص کے علاوہ خود گروہ معاشئین میں پائے جاتے ہیں چنانچہ معاشیات کی اکثر "مستند" اور جامع کتب میں بھی توازن تجارت کی محدود صلاحیت انطباق (Limited range of

applicability پر مطلق بحث نہیں ہوتی۔

اس غلطی و غلط فہمی کے اسباب کا پتہ چلانا آسان نہیں اس کے لئے نظریات قدر و قیمت کا بیان کرنا ضروری ہوگا، اور مسئلہ توازن تجارت و مسئلہ زر (توازن وادوستد) کے باہمی تعلقات ظاہر کرنے پڑیں گے۔ اگر مجھ سے یہ کام انجام پا سکے تو بھی یہاں اس کے تذکرہ کا کوئی موقع نہیں۔ مجبوراً اس اجمال پر اکتفا کرتا ہوں کہ توازن تجارت کا مسئلہ اس وجہ سے بھی غلط ہے کہ دار و مدار قیمت اشیا ر (بوقت درآمد و برآمد) پر رکھا گیا ہے اور زیادہ تر مقدار زر کا لحاظ کیا جاتا ہو توازن تجارت کے اعداد و شمار سے بندرگاہوں پر چیزوں کی جو قیمت ہوتی ہے اُسکا اندازہ کیا جاتا ہو۔ اُن چیزوں کا کیا حشر ہوتا ہو، آیا وہ کم قیمت پر فروخت ہوتی ہیں، یا زیادہ داموں بکتی ہیں، وہ صرف میں آتی بھی ہیں یا یونہی اکارت جاتی ہیں، ان واقعات کا کچھ بھی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ میرے خیال سے توازن تجارت کا نظریہ اس وقت تک قابل اطمینان نہیں ہو سکتا جبتک کہ اس کی بنیاد دولت اور اُس کی اضافی و مطلق قدر پر نہ رکھی جائے۔ اسی طرح درآمد و برآمد کے اعداد ناقابل استماد ہیں اور اسپر نظر کرتے ہوئے علم و عمل میں بین اختلافات رہیں گے۔

یہ تو ثابت ہوگیا کہ موافق توازن تجارت بھی ملک کی معاشی تنزل کا سبب ہو سکتا ہے اور حقیقت حال یہ ہو کہ موجودہ زمانہ میں ہندوستانی تجارت کی حالت کچھ ایسی ہی ہے جو مال ہندوستان سے برآمد ہوتا ہو وہ زیادہ تر متوسط اور ادنی درجہ کا ہوتا ہے، یعنی ہماری تنظیم و کارکردگی ادنے ہونے کے باعث ہمارے مال کی قدر غیر ممالک میں زیادہ نہیں ہوتی اسی وجہ سے ہم بہت سامان کم قیمت میں بیچتے ہیں، اور تھوڑا مال زیادہ قیمت پر خریدتے ہیں جس کی وجہ یہی ہو کہ اُن کی تنظیم و کارکردگی اعلیٰ اور ہماری ادنے ہوتی ہے چونکہ ہم بہ شکل زر خریدتے کم ہیں اور بیچتے زیادہ ہیں (حالانکہ اشیا کی حقیقی قدر کا لحاظ کرتے ہوئے ہماری چیزیں مقابلۃً بہتر ہوتی ہیں[۱]) ہمیں حقیقی

---

[۱] یہاں یہ اصولی اعتراض ممکن ہو کہ جس چیز کی قدر زیادہ ہو اس کی قیمت کیونکر کم ہو سکتی ہو اور اسی طرح کم قدر

نقصان ظاہر منافع کی شکل میں دکھائی دیتا ہے اور ہم اپنی نادانی ولاعلمی میں خوش وخرم ہیں اور "موافق توازن تجارت" کے حقیقی راز سے واقف نہیں شکایت اگر کرتے ہیں تو صرف اس کی کہ ہندوستان میں توازن تجارت قائم نہ ہونے کے باوجود توازن داد وستد قائم ہے اور مالی کاروبار میں کوئی ابتری نہیں ہونے پاتی، وہ زیادہ تر "مطالبات وطن" کی وجہ سے جس سے ہندوستان پر بہت بڑا بار پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی تجارت کی درآمد سے برآمد اوسطاً بقدر ۶۰ کروڑ سالانہ بڑھی رہتی ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہندوستان کو یہ رقم دوسرے ممالک سے وصول بھی ہوتی ہے۔ کچھ حصہ کا تو قدر و قیمت میں تفاوت کے باعث بلاشبہ خود بخود غائب ہو جاتا ہے، اور بقیہ رقم جو واجب الوصول ہوتی ہے، اس کی ادائی نقد رقم کی شکل میں نہیں ہوتی۔ نہ اس قیمت کا مال ہندوستان بھیجا جاتا ہے اور نہ اس کے ذمہ قرض رہتا ہے بلکہ اس رقم کی ادائی خدمات کے ذریعہ کر دی جاتی ہے۔

ہندوستان ہر سال تقریباً ۲۴۰ کروڑ کا سامان بھیجتا ہے اور ۲۰۰ کروڑ کے قریب کا سامان درآمد ہوتا ہے جو رقم ہندوستان کو واجب الوصول ہوتی ہے وہ حقیقتاً ادا نہیں کی جاتی بلکہ زیادہ تر "مطالبات وطن" کی مد میں صرف ہو جاتی ہے۔ یہ ہندوستان والوں کی عام شکایت ہے کہ مطالبات وطن ہندوستان پر بیجا بار ہیں۔ اس معرکۃ الآرا مسئلہ کی بحث کا یہاں کوئی موقع نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے جدید معاشیاتی تحقیقات سے جو کچھ روشنی اس مسئلہ پر ڈالی جا سکتی ہے ہمیں صرف اسی کے متعلق تذکرہ کرنا ہے۔[۱]

کی چیزیں کیونکر زیادہ قیمت میں بک سکتی ہیں اصولاً یہ بات صحیح ہے مگر عملی تجارتی واقعات سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس طرح ہندوستانی مال کم قیمتوں خریدا جاتا ہے اور وہاں کا مال زاید قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔ زیادہ تر تو "تجارتی چالاکیوں" کا نتیجہ ہے مگر ہندوستانیوں کی لاعلمی، عدم واقفیت، نااتفاقی وغیرہ بھی اہم اسباب ہیں۔

[۱] کسی قدر تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے (Indian Economics از جاتھر و بیسری

مطالبات وطن مسئلہ افلاس ہند اور اقسام محنت و دولت	مطالبات وطن کا مسئلہ یعنی یہ کہ وہ جائز ہیں یا ناجائز، مفید ہیں یا مضر، اور اگر مفید یا مضر ہیں تو کس حد تک، اُسی وقت بخوبی حل ہو سکیگا جبکہ ہم اقسام دولت و محنت سے بخوبی واقف ہو جائیں۔
اقسام دولت و محنت	عمرانیاتی تحقیقات کے بموجب دولت کی تقسیم اس اعتبار سے کہ انسانی

احتیاجات یکساں اہمیت نہیں رکھتے یوں کیجا سکتی ہے کہ اُس قسم کی دولت جو انسانی لازمی احتیاجات (مثلاً بھوک، پیاس، پناہ) کے پورا کرنے کے لئے مستعمل ہو ہم ٹھیٹ معاشی دولت سے تعبیر کریں مثلاً صحت بخش غذا، توانائی پیدا کرنے اور بڑھانے والی غذا، رہنے سہنے کے لئے صاف ستھرے مکان، تن کو دھوپ اور سردی کی تکالیف سے بچانے کے لئے کپڑا، یہ سب چیزیں بقائے حیات و فلاح نسل کے لئے ضروری ہیں لہذا ہم اس قسم کی دولت کو جو انسان کی لابدی ضروریات پورا کرتی ہو ٹھیٹ دولت اور جس محنت سے یہ اشیا، تیار ہوتی ہیں قطع نظر اس کے کہ وہ مادی ہوں یا غیر مادی محنت قسم اعلیٰ کہتے ہیں مثلاً عام طور طبیب کی محنت، کسان کی محنت، جلاہے کی محنت، معمار کی محنت، دوم اس قسم کی دولت کو جو انسان کی لابدی و قطعی احتیاجات کو نہیں

مطبع Taraporevala بمبئی ۱۹۲۹ء جلد دوم صفحہ ۳۰۰ تا ۳۱۴ سخت تعجب کی بات ہے کہ اس اہم موضوع پر ابتک انگریزی زبان میں بھی کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی اور نہ نظریہ Drain کو کسی نے ترتیب دینے کی کوشش کی ہے خصوصاً جبکہ مطالبات وطن معاشیات ہند کے سب سے زیادہ بحث طلب مسئلہ Drain کا سنگ بنیاد ہے نظریہ ڈرین ابتک مکمل طور پر کبھی بھی پیش نہیں کیا گیا۔ وہ کس درجہ نامکمل صورت میں ہے اسکا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ پروفیسر شاہ جیسے محقق معاشیات ہند نے اس کا اندازہ ۲۱۸ (دو سو اٹھارہ!!) کرور کا کیا ہے ملاحظہ ہو
Shah and Khambata "The wealth + Taxable Capacity of India" تاراپوری والا ۱۹۲۴ء صفحہ ۳۰۳ اور ۲۲۴

بلکہ تمدنی احتیاجات کو پورا کرنے یعنی بقائے حیات و نسل انسانی کے علاوہ کسی قدر چین و آرام ترقی و خوشحالی کے لئے ضروری ہوں ہم تمدنی دولت سے تعبیر کرتے ہیں، مثلاً میز کرسی، پلنگ، سائیکل، سینے کی مشین، ادبی کتابیں، سبق آموز اور مہذب دلچسپ ناولیں، شائستہ اخبار، مفید رسالے وغیرہ۔ تمدنی دولت کو پیدا کرنیوالی محنت کو محنت قسم اوسط کہہ سکتے ہیں سوم:
دولت کی تیسری قسم وہ ہے جو انسان کی حقیقی یا تمدنی احتیاجات و ضروریات کو نہیں بلکہ انسان کی نفسانی خواہشات کو پورا کرتی ہو۔ یعنی وہ دولت جو عیش و عشرت، نمود و نمائش اور نفس پرستی کے لئے کام آتی ہو۔ مثلاً تمام مشروبات، تمباکو، سگریٹ، زیورات، سونے چاندی کے برتن محض جنسی جذبات کو مشتعل کرنے والے ناول، مضر اخلاق، فضول، لغو خبریں شائع کرنیوالے اخبار اور رسالے۔ اس قسم کی دولت آسائشی دولت ہے، اور وہ محنت جس سے عیش و عشرت میں کام آنے والی دولت پیدا کیجاتی ہے اسے ہم محنت قسم ادنیٰ کہتے ہیں۔

تھیٹ دولت کے متعلق تو کسی کو زیادہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ اس میں کونسی چیزیں داخل کیجانی چاہئیں مگر تمدنی دولت اور شاید آسائشی دولت کے متعلق یہ قطعی طور پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ساتھ ہی فہم عامہ سے مدد لے کر انسان تمیز و تفریق ضرور کر سکتا ہے مثلاً کسی شخص کے برتن مٹی یا تانبے یا چینی کے اور کانٹے چمچے جرمن سلور کے ہوں تو ہم بآسانی اسکو تمدنی دولت تصور کر سکتے ہیں۔ اور اگر کسی کے ہاں سونے کے برتن، چاندی کی رکابیاں اور نہایت نفیس خوشنما گلاس اور چمچے ہوں تو اس دولت کو بلاشبہ آسائشی دولت میں شمار کرینگے۔

تھیٹ دولت، تمدنی دولت، آسائشی دولت اور محنت قسم اعلیٰ اوسط اور ادنیٰ کا مطلب سمجھ جانیکے بعد ہم اس کے چند کلیے بیان کرتے ہیں، جن کا جاننا بھی ضروری ہے، تاکہ مسئلہ افلاس ہند کا ان سے تعلق بھی ظاہر ہو جائے۔

فرض کیجئے کہ افریقہ کے دو گاؤں ہیں جو ایک دوسرے اور باقی دنیا سے بالکل علیحدہ معاشی زندگی بسر کرتے ہیں۔ پہلے گاؤں میں اگر فرض کیجئے کہ ۱۰۰ میں سے نصف بیکار پڑے

رہتے ہیں اور بقیہ نصف میں سے ۳۰ محنت قسم ادنیٰ کرنیوالے مثلاً گانے بجانے، ڈھول پیٹنے، مسخرہ پنا کرنے والے، بھانڈ وغیرہ ہیں اور صرف ۲۰ آدمی ملکر کھیتی باڑی اور ضروری کام کاج کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس گاؤں کی مادی بہبودی زیادہ نہیں ہوسکے گی کیونکہ تقسیم کار اقسام محنت کے اعتبار سے صحیح نہیں۔ دوسرے گاؤں میں فرض کیجئے کہ نناوے میں سے صرف پانچ بیکار رہتے ہیں، پانچ کھیل تماشے، نقالی وغیرہ کرتے ہیں، ۱۰ فیصدی آسائشی دولت مثلاً شراب وغیرہ تیار کرتے ہیں اور پندرہ فیصدی تمدنی دولت پیدا کرنے میں مصروف ہیں، اور بقیہ ۶۵ ٹھیٹ دولت پیدا کرتے ہیں، تو ہم یہ توقع کرینگے کہ اس گاؤں کی مرفہ الحالی زیادہ ہوگی۔

مثال بالا سے حسب ذیل کلیے اخذ کئے جاسکتے ہیں اور انکی تشریح بھی آسان ہے۔

اقسام دولت و محنت اور مرفہ الحالی کے اصول

(۱) جس قدر جس ملک میں تقسیم کار کا عمل اقسام محنت کے اعتبار سے صحیح ہوگا اسی قدر اس ملک کی مادی بہبودی مستحکم اور دیرپا ہوگی۔

(۲) جس قدر جس ملک میں محنت قسم اعلیٰ کرنیوالے یعنی ٹھیٹ دولت پیدا کرنے والے زیادہ ہوں گے اسی قدر اس ملک کی مرفہ الحالی زیادہ ہوگی۔

(۳) کسی ملک میں اگر ادنے محنت کرنیوالے حد سے زیادہ ہوں گے تو اُس ملک کی معاشی زندگی دشوار ہوجائیگی۔

تبادلہ مختلف اقسام دولت کا افلاس ہند پر اثر

مسئلہ افلاس ہند کی تحلیل کے لئے مبادلہ دولت کا سوال نہایت ضروری ہے فرض کیجئے کہ دو گاؤں ملکر معاشی زندگی بسر کرتے ہیں اور بقیہ عالم سے انکے کوئی تعلقات نہیں۔ ایک گاؤں کے لوگ باقاعدہ محنت و مشقت کرکے ضروری سامان مہیا کرتے ہیں، اور دن دن بھر محنت کرکے دولت پیدا کرتے ہیں، اور دوسرے گاؤں سے ہر روز چار چار پانچ پانچ آدمی آکر کھیل تماشے دکھاتے ہیں چند لوگ آکر گانا گاتے ہیں غرضیکہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ خوش کرکے بہت سا غلہ وغیرہ لیجاتے ہیں پہلے گاؤں والے اس طرح روز کھیل تماشے اور گانے بجانے کو پسند تو کرتے نہیں مگر کمزور طبیعت ہونے کی وجہ سے مستقل مزاج

نہیں ہوتے، اور دوسرے گاؤں والے انکی کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں، گویا اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنیکے لئے انہیں گودی بھر بھر کے چاول آٹا گیہوں وغیرہ دینا پڑتے ہیں۔

چند روز اور اگر یہی لیل و نہار رہا تو دونوں گاؤں کی معاشی بہبودی میں کیا فرق واقع ہوگا؟ اول الذکر گاؤں کی دولت میں تخفیف ہوگی اور دوسرے گاؤں کی دولت میں اضافہ ہوگا۔ کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ محنت قسم اعلیٰ کا تبادلہ محنت قسم ادنیٰ سے ہوا۔ ایک نے دوسرے کی نفسانی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر علی الاعلان استحصال کیا۔

اسی طرح فرض کیجئے کہ دو گاؤں ہیں، اور دونوں میں کاشت بھی ہوتی ہے مصنوعات بھی تیار کیجاتی ہیں، ایک گاؤں دوسرے گاؤں کو چاول بھیجتا ہے اور اسی قدر قیمت کا گیہوں منگاتا ہے، اسی طرح مصنوعات میں بھی تبادلہ ہوتا ہے اور ایک گاؤں کے لوگ دوسرے گاؤں جاکر اپنے کھیل تماشے اور سرکس کے کرتب دکھاتے ہیں تو دوسرے گاؤں کے لوگ پہلے گاؤں جاکر شعبدے دکھاتے ہیں گانا سناتے ہیں، اس طرح محنت قسم اعلیٰ کا تبادلہ قسم اعلیٰ سے، محنت قسم اوسط کا قسم اوسط سے، محنت قسم ادنیٰ کا قسم ادنے سے ہوتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اس تبادلہ سے دونوں گاؤں میں کسی کی دولت کم نہیں ہوئی۔ بلکہ دونوں کو اس اعتبار سے کہ موافق مبادلہ عمل میں آیا۔ فائدہ ہوا۔

جس طرح ہم نے "دو گاؤں اور دو تین چیزیں فرض کر لی تھیں، اسی طرح ہم کئی فریق اور کئی قسم کی دولت فرض کرلیں تو ہمارے پیش نظر بین الاقوامی کاروبار کا ایک خاکہ ہوجائے گا۔ نتیجہ ہمیشہ وہی نکلے گا کہ اقسام دولت کے اعتبار سے تبادلہ اس طرح ہونا چاہئے کہ ٹھیٹ دولت کے معاوضہ میں ٹھیٹ دولت دیجائے۔ اگر کمتر قسم کی دولت کے معاوضہ میں ٹھیٹ دیجائیگی تو ٹھیٹ دولت دینے والے کو نقصان ہوگا۔

اقسام دولت و محنت کا مفہوم سمجھ لینے اور انکے تبادلہ کے اثرات سے بخوبی واقف ہو جانے کے بعد ہمیں ان اصول و قوانین کو حالات پر منطبق کر کے دیکھنا ہے کہ افلاس ہند پر انکا کیا اثر پڑتا ہے۔

ہندوستان ہر سال کثیر رقم کی ایسی تمدنی و آسائشی چیزیں بھی منگاتا ہے جس کے معاوضہ میں ظاہر ہے یہاں سے روپیہ پیسہ یا سرکاری نوٹ تو جاتے نہیں بلکہ ٹھیٹ دولت بھیجی جاتی ہے۔ مثلاً ہر سال لکھوکھا روپیہ کی شراب، سگریٹ وغیرہ ہندوستان آتے ہیں، اور ہر سال ہندوستان لکھوکھا روپیہ کا اناج بیرون ہند بھیجنے پر مجبور ہے ہمارے چند گھنٹے تو لطف و سرور میں گذر جاتے ہیں مگر اسکا خمیازہ ہم ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہمارے ہی لوگ قلت غذا کی وجہ سے فاقہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ قومی نقطۂ نظر سے اس تبادلہ سے ہمیں نقصان ہوتا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ اقسام دولت میں فرق تھا۔ اگر یورپی مشروبات کے معاوضہ میں یہاں سے دیسی شراب جاتی تو ظاہر ہے کہ ہندوستانی بازار اناج پر اس تبادلہ کا مطلق اثر نہ پڑتا، نہ تو چیزیں گراں ہو جاتیں اور نہ آبادی پر گرانی کے مضر اثرات پڑتے۔

اسی طرح جب ہندوستانی نواب، راجہ، سیٹھ ساہوکار نمود و نمائش اور عیش و عشرت کے لئے Rolls Royce موٹریں خریدتے ہیں اور جب ہندوستانیوں کو "خوش" کرنے کے لئے کروڑھا فیٹ کی سینما فلمیں آتی ہیں اور ہزار ہا روپیہ کے ٹیاٹرے آتے ہیں تو ہندوستان سے اسی قدر و قیمت کا آسائشی سامان نہیں جاتا بلکہ ہزاروں کپاس کے گٹھے بیرونی ممالک کو روانہ کئے جاتے ہیں۔ دوسروں نے تو کھیل تماشے کر کے نسبتہً تھوڑی محنت و مشقت سے فلمیں تیار کر دیں مگر ہندوستان کو اُس کے معاوضے میں قریب قریب اسی قیمت کی خام پیداوار بھجوانی پڑی، جس کے لئے زیادہ محنت اور دردسری کرنی پڑتی ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہوا کہ اقسام دولت میں اہم فرق ہونے کے باعث جو مبادلہ ہو رہا ہے وہ ہندوستان کے حق میں سراسر مضر ہے۔

یہاں تک تو درآمدی و برآمدی سامان کے تبادلہ سے ہندوستان کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کا ذکر تھا۔ اب دیکھنا ہے کہ "مطالبات وطن" کے کیا اثرات پڑتے ہیں۔

مطالبات وطن کے ہندوستانی افلاس پر اثرات | مطالبات وطن سے مراد اس معاوضہ سے ہے جو ہندوستان

انگلستان کو انگریزی اصل اور انگریزوں کے حالیہ یا گذشتہ خدمات کے صلہ میں پیش کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سب کا سب حق بجانب ہے یا نہیں ہمارا نظریہ (جس کو میں امید کرتا ہوں کہ میں نے ثابت کر دیا ہے) حسب ذیل ہے:۔

اگر ٹھیٹ دولت کا تبادلہ ٹھیٹ دولت سے، تمدنی دولت کا تمدنی دولت سے، آسائشی دولت کا آسائشی دولت سے ہوتا رہے تو طرفین کو کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہوگا۔ مگر جب دولت قسم اعلیٰ کا تبادلہ دولت قسم اوسط یا ادنیٰ سے ہو تو آخر الذکر کو فائدہ اور اول الذکر کو نقصان ہوگا، اور جس قدر زیادہ تبادلہ ٹھیٹ دولت کا آسائشی دولت سے ہوگا اسی قدر نقصان ٹھیٹ دولت دینے والے کو ہوگا۔

ان بدیہات کو تسلیم کر لینے کے بعد غور کر کے دیکھئے کہ افلاس ہند میں کس طرح اضافہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر افواج ہند کو لیجئے:۔ معاشی نقطۂ نظر سے چونکہ امن و امان کا ہونا لازمی ہے اور سرشت بشری کچھ ایسی ہے کہ بغیر فوج و پولیس کے کام نہیں چلتا تو ماننا پڑے گا کہ وہ افواج اور پولیس جو بیرونی اور اندرونی دشمنوں اور بدمعاشوں سے ملک کو محفوظ رکھتے ہیں، ہمارے لئے قطعی ضروری ہیں یعنی یہ کہ وہ لوگ محنت قسم اعلیٰ کرتے ہیں اور اگر ہندوستانی محنت قسم اعلیٰ کر کے ٹھیٹ دولت معاوضہ میں دیں تو کوئی مضائقہ نہیں چونکہ محنت قسم اعلیٰ کے لئے محنت قسم اعلیٰ کی گئی مبادلہ جائز اور فریقین کے لئے مفید ہے۔

برعکس اس کے افواج کا وہ حصہ جو دوسروں کو ڈرانے دھمکانے یا محض شان و شوکت یا رعب داب قائم رکھنے کے لئے یعنی نفسی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے رکھا جاتا ہے، معاشی نقطۂ نظر سے غیر ضروری ہے۔ پس افواج کا یہ غیر ضروری نمایہ حصہ (جدید عمرانیاتی تحقیقات کے بموجب) محنت قسم ادنیٰ کرتا ہے۔ مگر ہندوستان اس کے بھی معاوضہ میں ٹھیٹ دولت دیتا ہے۔ پس یہ دولت ہندوستان کی رائگاں جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ افلاس ہند میں اس فوجی پالیسی سے اضافہ ہوتا ہے۔

اب صرف یہ تحقیقات طلب ہے کہ ہندوستانی فوج صرف ہندوستان کی حفاظت کے لئے رکھی گئی ہے یا یہ کہ اُسکا کچھ حصہ جبر و تشدد و نمود و نمائش یا کسی اور مصلحت سے رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر رائے دینے کا مجھے کوئی حق نہیں، لہذا میں دوسروں کے اقوال نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:۔

نیم سرکاری طور پر جو برطانوی ممالک کا انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا گیا ہے اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ " برطانوی حکومت ہند تقریباً ساڑھے چار لاکھ فوج رکھتی ہے، تاکہ وہ ملک کی حفاظت کرے اور وقت ضرورت برطانوی سلطنت کی فوجی امداد کر سکے[۱] اسی طرح انگلستان کے معروف محقق معاشیات سر رابرٹ گفن کہتے ہیں: " ہندوستانی فوج سے برطانوی اغراض اور عام ضرورتوں کے لئے اکثر کام نکالا جاتا ہے اور صرف ملک کی حفاظت کے لئے اس سے کام نہیں لیا جاتا[۲]"

برطانیہ کے موجودہ وزیر اعظم جیمز رمزے میکڈانلڈ اپنی کتاب "حکومت ہند" میں لکھتے ہیں کہ " ہندوستانی افواج کا ایک بڑا حصہ (کم سے کم نصف) ایسا ہے جو ہم شہنشاہی ضرورتوں کے لئے استعمال کرتے ہیں، لہذا اُس کے اخراجات کی ادائی برطانوی خزانے سے ہونی چاہئے[۳]"

ان مختلف بیانات سے ظاہر ہو گیا کہ ہندوستانی فوج کا کچھ حصہ بیجا طور پر رکھا جا رہا ہے۔ اور یہ معاشی نقطۂ نظر سے بلا سبب ہونیکی وجہ سے ناجائز ہے، اور قومی معاشی نقطۂ نظر سے یہ

I "The Encyclopedia of the British Empire" Published by Rankin, Bristol 1923 vol II P. 734

II "Economic Inquiries and Studies" مطبوعہ Bell لندن ۱۹۰۴ء جلد دوم صفحہ ۳۷۵

III The Swarthmore مطبوعہ The Government of India Press لندن ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۵۴

سراسر فضول خرچی ہی جو رقم اس سلسلہ میں ہندوستان کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس سے ہندوستانیوں کے افلاس میں بلاشبہ اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح ثابت ہوا کہ مطالبات وطن کے اس حصہ سے ضرور ہندوستانیوں کی غربت پر خراب اثر پڑتا ہے۔

افواج کے علاوہ انگریزوں کی خدمات، انتظامی امور، سیاسی رہبری عدالتی معاملات اور تعلیمات کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں۔

ان خدمات کے متعلق رائے دہی گو کسی قدر دشوار ہے اور شخصی رائے کو بہت دخل ہے مگر بجز چند مستثنیات کے یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دو تہائی کام جو عہد برطانیہ میں ہمارے ملک میں انجام پایا وہ اوسط قسم کا تھا، نہروں کے بنانے میں، بعض ریلوں کے افتتاح کرنے میں اور بعض عمارتوں کے تعمیر کرنے میں جو محنت انگریزوں کی صرف ہوئی وہ بلاشبہ محنت قسم اعلیٰ تھی مگر جو انصاف انگریزی ججوں کے ذریعہ ہندوستانیوں کے حق میں کیا جاتا ہے جو معمولی کام، انگریز حکام، عہدہ دار، بڑے چھوٹے افسر مختلف یونیورسٹیوں کے علوم فطری و ذہنی کے پروفیسر انجام دیتے ہیں وہ اوسط قسم کا ہوتا ہے جن کی خدمات کا صلہ دہی ٹھیٹ دولت کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک کا حال دیکھئے۔ امریکہ باوجود اس قدر امیر ہونے کے دوسرے ممالک سے صحیح طور پر تبادلہ کرتا ہے۔ امریکہ سے دس بارہ پروفیسر ہر سال جرمانیہ یونیورسٹیوں میں Exchange Professors اقتصادیات و علوم کے متعلق اگر لکچر دینے جاتے ہیں تو ہر سال جرمانیہ سے بھی دس بارہ پروفیسر جرمانی علوم و فنون کے متعلق لکچر دینے امریکہ جاتے ہیں۔ امریکن فلمیں جرمانیہ اور جرمانوی فلمیں امریکہ جاتی ہیں۔ اسی طرح جرمن کتب امریکہ اور امریکی کتب جرمانیہ بھیجی جاتی ہیں۔ غرضیکہ صحیح اصول پر عمل ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے طرفین فائدہ میں رہتے ہیں نہ یہ کہ مثل ہندوستان کے ایک کو فائدہ اور دوسرے کو نقصان ہو۔

بہر طور جدید عمرانیاتی تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ہم محنت قسم اعلیٰ کر کے ٹھیٹ دولت پیدا کرتے ہیں، مگر اپنی لاعلمی و نادانی سے اس کا تبادلہ تمدنی بلکہ اکثر صورتوں میں آسائشی دولت سے

کرتے ہیں جس سے ہم کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اور دوسرے ہماری نادانی سے استحصال کرتے ہیں

آخر میں اگر ہم اس مضمون کا لب لباب بیان کرنا چاہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید معاشیاتی عمرانیاتی تحقیقات کے بموجب موافق توازن تجارت سے یہ لازمی طور پر نہیں اخذ کیا جا سکتا کہ ہندوستان کی دولت و مرفہ الحالی میں مطلقاً یا نسبتہً اضافہ ہو رہا ہے۔ ہندوستانیوں کی غربت و بیکسی کا باعث گوناگوں اسباب ہیں جن میں مصر طریق مبادلہ اور مطلق و اضافی اسراف بھی داخل ہیں۔ بیشتر اسباب غربت ہم ہی لوگوں کی بے خبری، لاعلمی و ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہیں یہ خصوصیات علمی تنظیم کی ضد ہیں لہٰذا اگر ہم ایک مختصر جملہ میں مسئلہ افلاس ہند اور جدید معاشیاتی تحقیقات کا تعلق ظاہر کرنا چاہیں تو صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ "ہندوستان کی غربت کا اصلی سبب ناقص و ناکافی تنظیم ہے" اور اس جملہ میں ہندوستانیوں کی تمام سیاسی سماجی اور معاشی ابتری کا راز مضمر ہے۔

بہائیت

سید علی محمد باب

سید علی محمد "باب" کے لقب سے مشہور ہیں جنوبی ایران کے مشہور شہر شیراز میں یکم محرم ۱۲۳۵ھ (مطابق ۲۰ اکتوبر ۱۸۱۹ء) پیدا ہوئے۔ "باب" خاندان سادات میں سے تھے۔ بچپن ہی میں انکے سر سے سایۂ پدری اٹھ گیا۔ اس لئے بچپن میں انکی دیکھ بھال تعلیم و تربیت انکے ماموں نے نہایت توجہ سے کی۔

قدیم رسم کے مطابق انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی جس میں قرآن شریف کا حفظ کرنا اور معمولی حساب و کتاب کا جاننا تھا۔ اُن کے ماموں بوشہر میں رہتے تھے اور تجارت کرتے تھے۔ اس لئے باب کو بھی تجارت ہی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ جوں جوں انکا سن بڑھتا گیا انکا تورع و تقویٰ بھی روز بروز بڑھتا گیا۔ انکی شرافت، محبت، اخلاق اور خشیۃ اللہ زبان زد عوام تھی۔ باب کے مخالف جنہوں نے انہیں ہر قسم کی جانی، مالی اور وطنی تکالیف پہنچائیں وہ بھی انکی شرافتِ طبع اور چال چلن پر حملہ نہ کر سکے۔ ہاں البتہ انہوں نے یہ کہا کہ کثرتِ ریاضت سے اُنکا دماغ چل گیا ہے۔

پچیس برس کی عمر میں یعنی ۱۲۶۰ھ (مطابق ۱۸۴۴ء) میں انہوں نے "بابیت" کا دعوےٰ کیا۔ اس وقت ایران کے مختلف حصوں سے بہت سے لوگوں نے انکے دعوائے "بابیت" کی تصدیق کی اور باب کے پیرو کہلائے۔ ان لوگوں میں سے اٹھارہ لوگوں کو منتخب کیا اور ایران کے مختلف حصوں میں روحانی حقائق کی تعلیم کے لئے روانہ کیا باب نے ان مبلغین کی روانگی سے پیشتر انکے سامنے "بابیت" کی مکمل تشریح کر دی اور کہا کہ اسکا مقصد یہ ہے کہ میں ایک آسمانی معلم اعظم کے ظہور کے لئے بطور باب یا مبشر کے ہوں۔ یعنی قدرت کی طرف سے ایک مبشر کی حیثیت سے

لوگوں کو ہشیار کرتے اور آنے والے روحانی معلم کے استقبال کے لئے لوگوں کو تیار کرنے کے لئے آیا ہوں تاکہ تمام لوگ اپنے آپ کو تمام آلائشوں سے پاک وصاف کر کے "من یظہرہ اللہ" کی آمد کے منتظر رہیں۔

باب نے اپنے ان شاگردوں کو جنہوں نے انکے پیغام کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا "حروف حیی" کا لقب دیا۔ اس کے بعد باب حج بیت اللہ کے ارادے سے مع اپنے ایک مرید کے مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے انہوں نے ایک لاکھ حاجیوں کے سامنے اپنا دعوے مہدیت پیش کیا اور لوگوں کو ایک آنے والے کی بشارت دی۔ حج کے بعد بوشہر واپس آئے۔ اس عرصہ میں انکے پیرووں نے ایران کے گوشہ گوشہ میں انکی تعلیمات کو پھیلایا اور باب کا نام ہر شخص کی زبان پر جاری تھا۔ ایرانی مجتہدوں نے باب کی سخت مخالفت کی۔ اب یہاں سے باب کی تکالیف اور مصائب کا دور شروع ہوتا ہے۔

باب بوشہر سے شیراز گئے جہاں مجتہدین انکے ساتھ نہایت سختی سے پیش آئے اور حکومت کی طرف سے بھی نہایت سختی سے نگرانی کی جانے لگی اور اپنے گھر میں نظر بند کئے گئے۔ یہاں تک کہ تمام بیرونی دنیا سے انکے تعلقات منقطع کئے گئے تاہم انکے شیدائی ان تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ باب کی تعلیمات کا سلسلہ وسیع ہوگیا چنانچہ ان کے پیرووں میں ہر قسم کے لوگ شامل ہو چکے تھے جن میں امیر، غریب، علما، فضلا اور شعرا سب ہی قسم کے لوگ شامل تھے۔ باوجود سخت مخالفت اور رکاوٹ کے لوگ باب کے پاس آتے اور اظہار عقیدت کرتے تھے۔ دنیا کی مخالفت انکی ہمت اور استقلال کے سامنے پرکاہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ صبر و استقلال اور ہمت انکے رگ و ریشے میں سرایت کر چکی تھی۔ دنیا کی کوئی طاقت انکے ارادے میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔

باب نے دوسرا سفر اصفہان کی طرف کیا جہاں انکے پیرووں کی کافی تعداد ہو چکی تھی وہاں کے گورنر نے باب کا استقبال نہایت شاندار طریقہ پر کیا اور ان کی دعوت کو لبیک کہا۔ مختلف

طریقوں سے اظہار عقیدت کیا۔ اور اس نے باب کے قیام کے لئے ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں اور عوام الناس کو اُنکے پاس آنیکا موقع دیا۔

ان واقعات نے اصفہانی مجتہدوں کے غصہ کو بڑھا دیا۔ یہانتک کہ وہ انکے قتل کے لئے تیار ہوگئے۔ مجبوراً گورنر نے باب کو حکومت ہی کے مکان میں پوشیدہ رکھا مگر چند دنوں کے بعد اس گورنر کا انتقال ہوگیا۔ لوگوں کو باب کے قیام گاہ کا علم ہوگیا۔ اور ایران کی مرکزی حکومت کی طرف سے انکی گرفتاری کا حکمنامہ صادر ہوچکا تھا۔ کہ انکو طہران روانہ کیا جائے۔ باب نہایت سخت نگرانی میں دارالسلطنت کی طرف روانہ کئے گئے راستہ میں جو شہر اور گاؤں پڑتے تھے لوگ جوق در جوق جمع ہو جاتے تھے اور باب کا پیغام سنتے تھے یہاں تک کہ پہرہ داروں نے بھی انکے دعوئے بابیت کی تصدیق کی۔ اور بابی بن گئے۔

حکومت بابی تحریک کی روز افزوں ترقی دیکھ کر ڈری اور خیال کیا کہ ایسا نہ ہو کہ علمائے طہران برافروختہ ہو کر بلوہ کردیں چنانچہ باب کو ایران کے ایک قلعہ ماکو نامی میں قید کر دیا اس سفر کی وجہ سے باب کی شہرت اور تعلیم لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی۔

باب کے متبعین میں ایک مشہور شاعرہ اور خطیبہ عورت قرۃ العین نامی بھی تھیں جو علمی فضیلت اور خداداد قابلیت، عزم و استقلال اور دین کی محبت میں شہرۂ آفاق تھیں۔ اس خاتون نے دور ابتلاء و فتن میں نہایت جوش سے اس نئے دین کو پھیلایا۔ آخرالامر انہیں گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔

جب حکومت نے دیکھا کہ تعلیمات تمام قلمرو میں نہایت سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہیں تو اس نے باب کو ماکو سے منتقل کر کے چہریق میں مقید کر دیا اور مجتہدین ایران نے عوام الناس اور حکومت کو باب کے خلاف اکسایا۔

بالآخر یہ طے ہوا کہ مجمع عام میں تحقیق کیجائے اس مقصد کے لئے ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں باب کو چہریق سے بلایا گیا۔ بجائے بحث و مباحثہ اور تحقیق و تفتیش کے باب کی تذلیل کی گئی

اور باب کو عوام الناس کے سامنے کوڑے لگوائے گئے اور پھر چہریق میں دوبارہ قید کر دیا گیا اب وہ زمانہ شروع ہوتا ہے جبکہ بابیوں کا قتل عام ہونے لگا۔ مجتہدین نے انکے مال اور خون کو عوام الناس کے لئے حلال کر دیا۔ بابی ہونا ہی جرم کے لئے کافی تھا۔ نہایت بے دردی اور سنگدلی کے ساتھ بابی بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل کیا گیا اور انکے مکانوں کو جلایا گیا۔ ان واقعات کی تفصیل نہایت دردانگیز ہے۔ جگہ جگہ بابیوں پر ظلم ہوئے گئے اگرچہ بابیوں نے بھی کسی کسی جگہ مدافعانہ مقابلہ کیا لیکن ٹڈی دل کے مقابلہ میں قتل ہو گئے۔ مگر یہ مظالم بجائے رکاوٹ کے تحریک بابیت کی ترقی کا باعث ہوئے۔

آخرالامر صدراعظم ایران نے بابی تحریک کی روزافزوں ترقی دیکھکر باب کے قتل کا حکم صادر کیا صدراعظم کا یہ خیال تھا کہ یہ معاملہ اسی طرح ختم ہو جائے گا مگر اس کے برخلاف ہوا۔ باب چہریق سے صوبہ کے صدر مقام تبریز میں لائے گئے۔ اور وہیں ۹ر جولائی ۱۸۵۰ء میں شہید کر دیے گئے۔

یہ واقعہ اس طریقہ سے بیان کیا گیا ہے کہ انکو مع انکے ایک فدائی کے قتل گاہ میں لایا گیا اور دونوں کو ایک دیوار کے ساتھ رسی سے جکڑ دیا گیا۔ اور فوج کے ایک دستہ نے اُن پر گولیاں چلائیں گولی چلی اور دھوئیں کے چھٹ جانے کے بعد حاضرین کو یہ دیکھ کر حیرت اور استعجاب ہوا کہ باب مع فدائی کے نہایت اطمینان اور تبسم کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہیں اور تمام رسیاں جل چکی ہیں۔ گولی چلانے والے سپاہیوں نے دوبارہ گولی چلانے سے انکار کر دیا تب افسر نے دوبارہ دوسرے سپاہیوں کو گولی چلانے کا حکم دیا چنانچہ اب گولیاں کاری تھیں اور چہرہ کے سوا تمام جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔ اور باب اور انکے فدائی نے ہمیشہ کے لئے دنیا کو خیرباد کہا۔

حکومت کی طرف سے باب کی نعش کی نہایت سختی سے نگرانی کی گئی مگر انکے شیدائی لاش کو نہایت جرأت اور دلیری سے اٹھا کر لے گئے اور مختلف اوقات میں مختلف جگہوں پر منتقل کرتے رہے۔ یہانتک کہ ۱۹۰۹ء میں تمام دنیا کے بہائی زائرین کے سامنے باب کے جسم کو عبدالبہاء نے کوہ کرمل (علاقہ شام) میں دفن کیا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ باب نے بالکل ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی لیکن ان کی علمی قابلیت کے سامنے بڑے بڑے مجتہد نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ باب نہایت تیز لکھنے والے تھے۔ چند گھنٹوں میں انہوں نے بڑی ضخیم کتابیں لکھ ڈالیں۔ باب نے اپنی قید و بند کے زمانہ میں چند الواح اور توقیعات تحریر کیں تھیں جن کا مضمون زیادہ تر "من یظہرہ اللہ" کی بشارت ہے۔ ان الواح اور توقیعات میں باب نے اپنے پیروؤں کو نہایت تاکید اور تکرار کے ساتھ حکم دیا ہے کہ جب "من یظہرہ اللہ" ظاہر ہو۔ تم لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

بیان باب کی مشہور تصنیفات میں سے ہے جو فارسی اور عربی دونوں میں الگ ہے اسمیں قرآن مجید کے سربستہ اسرار کو ظاہر کیا گیا ہے۔ خاصکر قیامت وحشر اور دیدار خدا کی نسبت مفصل بیانات ہیں۔ ایک کتاب قیوم الاسماء اور "تفسیر سورہ یوسف" بھی اسی سلسلہ کی ایک مشہور کتاب ہے۔

بہاء اللہ

میرزا حسین علی نوری جو بہاء اللہ کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ ماہ نومبر ۱۸۱۷ء طہران پایۂ تخت ایران میں پیدا ہوئے۔ انکا خاندان تمام ایران میں شریف و نجیب اور متمول خیال کیا جاتا تھا۔ بہاء اللہ کے والد اور دوسرے رشتہ دار حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے۔ والد کے انتقال کے بعد بہاء اللہ نے خاندان کی نگرانی اپنے ذمہ لی اور تمام جائداد کی دیکھ بھال اور اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتے تھے۔ بچپن ہی سے بہاء اللہ اپنے حسن اخلاق اور ذہانت کی وجہ سے مشہور تھے۔

بہاء اللہ اگرچہ معمولی لکھے پڑھے آدمی تھے مگر انکی علمی قابلیت اور فضیلت شہرۂ آفاق تھی۔ جس وقت باب نے "بابیت" کا اعلان کیا اور شیراز سے اپنے شاگردوں کو ملک کے اطراف واکناف میں روانہ کیا اس وقت بہاء اللہ کی عمر ۲۷ برس کی تھی اور طہران میں مقیم تھے۔ جوں ہی باب کی

خبر طہران میں پہنچی بہاء اللہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس کی تصدیق کی اور " بابیت " کی نشر و اشاعت کے لئے ہمت و استقلال سے کھڑے ہو گئے اپنے قصبہ نور اور اس کے گرد و نواح میں بابیت کی اشاعت کرتے رہے۔

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ باب اور بہاء اللہ کا آپس میں کوئی خاندانی تعلق نہ تھا کیونکہ باب عربی النسل تھے اور بہاء اللہ خالص ایرانی النسل۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ دونوں کی کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ لیکن دونوں کا قلباً، روحاً اور خیالاً ایک زبردست تعلق تھا باب کے قتل تک دونوں کے درمیان خط و کتابت جاری تھی۔

جب باب کو معلوم ہوا کہ تبریز کی طرف منتقل کئے جا رہے ہیں اور قتل کی سزا ملنے والی ہے تو اس وقت انہوں نے اپنے مخلص پیرو کے ذریعہ تمام نوشتجات، قلمدان اور مہر ایک صندوقچہ میں بند کر کے بہاء اللہ کو پہنچا دی۔ بہاء اللہ اگرچہ باب کے زبردست حامیوں اور مددگاروں میں سب سے زیادہ مشہور تھے۔ مگر یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ یہی شخص آنے والا معلم روحانی ہے۔ باب کے قتل کے بعد بابیوں پر مصائب و آلام کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک نوجوان بابی جو باب کی تعلیمات سے بالکل بے خبر تھا اپنے احباب کے مصائب دیکھکر متاثر ہوا اور جوش مذہبی کی وجہ سے اس سے آپے میں نہ رہا گیا اور اپنے ہم مذہبوں کی بہتر حالت بنانے کے لئے اس نے شاہ ایران پر حملہ کیا۔ یہ شخص مجرم تھا گرفتار ہوا اور وہیں درباریوں کے ہاتھوں قتل کیا گیا۔ مگر وزرائے حکومت نے بغیر تحقیق و تفتیش کے اس جرم کو تمام بابی جماعت کی طرف منسوب کیا۔ کتنے بے گناہ بابی قتل کئے گئے کتنے بچے یتیم کئے گئے کتنی عورتیں بیوہ کی گئیں۔ صرف یہ خیال ہی ثبوت جرم کے لئے کافی تھا کہ اگر کوئی شخص یہ شبہ کرے کہ فلاں شخص بابی ہے تو اسکی سزا دار کا تختہ تھی۔ اسی بابی عوام الناس میں تقسیم کئے گئے جن کو طرح طرح کی تکلیفیں دے کر قتل کیا گیا۔

نمونہ کے طور پر چند واقعات ان بابیوں کے یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے ہنستے

ہوئے اپنی جانیں اپنے محبوب کے اشتیاق میں دیں اور مستانہ اداؤں سے اپنے جلادوں اور قاتلوں کے لئے باعث عبرت اور تحیر بنے۔ ایک بابی کو جلاد نے گردن مارنے کی ضرب لگائی۔ اسکا سبز عمامہ سر سے گر گیا اس بوڑھے بابی نے عمامہ کو اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے اپنے سر پر رکھ لیا۔

اے خوش آں عاشق سرمست کہ در پائے حبیب — سر و دستار نداند کہ کدام اندازد

ایک دو سو بابی کو جلاد قتل گاہ کی طرف پابزنجیر لیجا رہے تھے اور وہ جلادوں کو مصری کی ڈلیاں بانٹتا جا رہا تھا اور کہتا تھا کہ تمہارے ذریعہ آج مجھکو بڑی عزت ملنے والی ہے اس کی خوشی میں تمہارا منہ میٹھا کرنا چاہتا ہوں۔

ایک نوجوان بابی حاجی سلیمان نامی کے بدن میں لوگ زخم کر کے جلتی ہوئی موم بتیاں ٹھونستے جاتے تھے اور شہر کا گشت لگوا رہے تھے وہ ہنستا بولتا اور خوش ہوتا چلا جا رہا تھا اور گیت گا رہا تھا جس کا پہلا شعر یہ تھا ؎

باز آمدم باز آمدم از راہ شیراز آمدم — با عشوہ و ناز آمدم ہذا جنون العاشق

اگرچہ بابیوں پر تمام دنیا کی مصائب و ابتلا ڈالی گئیں مگر وہ اس قدر ثابت قدم رہے کہ ایک انچ بھی نہ ہٹے تمام بلیات اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا ایک یوروپین سیاح ان واقعات کے مشاہدہ کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ "جب مورخ ایران کی تاریخ لکھے گا تو ان واقعات کو نہایت جلی حرفوں میں لکھے گا۔"

اس مصائب و آلام کے زمانے میں بہاء اللہ اپنی عجیب و غریب شجاعت کے ساتھ بابی دوست یا مظلوموں کی امداد کے لئے آگے بڑھے۔ حکومت نے چار سال تک بہاء اللہ کو نہایت سخت قید و محن میں بند رکھا جب تحقیق ہوئی اور یہ بات ثابت ہوئی کہ بابیوں کا دامن سازش سے بالکل پاک ہے تو بہاء اللہ حکومت ایران اور ترکی کی باہمی مفاہمت سے ایشیائی ترکی کے شہر بغداد میں جلاوطن کئے گئے۔ اس کی وجہ یہ خیال کی گئی کہ بہاء اللہ کا تعلق بابیوں سے منقطع رہے گا

اور یہ لوگ انکی رہنمائی سے محروم رہیں گے۔

چنانچہ بارہ برس کے قریب بہاء اللہ بغداد میں نظربند رہے اسی زمانہ میں انکا ایک رشتہ دار سفیر بغداد ہوکر آیا اور انکے خلاف ایک سازش میں ساتھ دیا اور حکومت ایران کو شکایت لکھی کہ "بہاء اللہ کا بغداد میں رہنا ایران کے مومنین کے لئے اچھا نہیں ہے کیونکہ بہت سے ایرانی باشندے عتبات عالیہ کی زیارت کو جاتے ہوئے بغداد سے گذرتے ہیں اور بعض بابیوں سے ملکر بابی ہوجاتے ہیں" چنانچہ سفیر کی یہ کوشش کامیاب ہوئی۔ حکومت ایران نے حکومت عثمانیہ کو درخواست کی کہ بہاء اللہ کو بغداد سے ہٹائے۔ سلطان عبدالعزیز نے سب کو قسطنطنیہ بلایا اور پانچ ماہ تک وہاں نظربند رکھا۔ اور اس کے بعد ادرنہ (ایڈریانوپل) بھیجدیا۔ جہاں وہ ایک عرصہ تک مصائب و آلام میں گرفتار رہے۔ ایڈریانوپل میں بہاء اللہ نے اعلان کیا کہ جس شخص کی بشارت باب نے دی اور جس کی راہ میں انہوں نے اپنی جان قربان کی تھی وہ میں ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آپ کو من یظہرہ اللہ کہا۔ سب لوگوں نے انکے دعوے کو سچا مانا مگر ایک شخص جو صبح ازل کے نام سے مشہور تھا اس نے انکار کیا اور آخر وقت تک بہاء اللہ کے دعوے کو نہ مانا۔

اس کے بعد بہاء اللہ نے سب سے پہلا یہ کام کیا کہ دنیا کے تمام بادشاہوں اور حکمرانوں کے نام خط لکھے۔ اُن خطوط میں سے جو خط شاہ ایران کے نام تھا اور جس کو ایک شخص بدیع نامی شاہ ایران کے پاس لے گیا اس خط کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

> "خدا کی قسم! اگر دکھ درد کے صدمے مجھے کمزور بنا دیں بھوک اور پیاس کی تکلیفیں مجھے ہلاک کردیں۔ سخت پتھر میرا بستر بنا دیا جائے اور جنگل کے جانور اور درندے میرے مونس و ہمدم کردئے جائیں تو میں مطلق فریاد و زاری نہ کروں گا۔ خدا کی مدد سے جو ازل کا مالک اور قوموں کا پروردگار ہے ویسا ہی صبر کروں گا جیسا کہ دوراندیش اور اپنے ارادے پر ثابت قدم رہنے والوں نے کیا ہے۔ میں ہر حالت میں خدا کا شکر ادا کروں گا . . . .

آخر میں اس جملہ پر یہ خط ختم ہوتا ہے "کہ ہمیشہ بلا و مصائب کی موجودگی میں خدا کا حکم جاری

ہوا ہے۔ یہی خدا کی سنت ہے جو اگلے وقتوں سے اسی طرح جاری ہے۔"

خط لانے والا یعنی بدیع شاہ ایران کے حکم سے طرح طرح کے دُکھ دینے کے بعد مار دیا گیا۔ تین سال تک بہاراللہ اپنے متبعین کے ساتھ ایڈریانوپل میں نظر بند رہے۔ تکالیف و مصائب میں بجائے کمی کے اور اضافہ ہوا اب دشمنوں نے بہاراللہ کے خلاف مختلف الزام لگائے آخر میں سلطان نے تنگ آکر بہاراللہ اور اس کے ساتھیوں کو مختلف مقامات پر جدا جدا قید کر کے بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سب لوگوں کو صدمہ ہوا بہاراللہ کے بڑے بیٹے عبدالبہا عباس آفندی نے اس حکم کو منسوخ کرانیکا ارادہ کر لیا ایک ہفتہ کی محنت کے بعد عبدالبہا عباس آفندی اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ اس اثناء میں غلطی سے کسی نے بہاراللہ کے ایک فدائی کو خبر دی کہ حکم ابھی تک منسوخ نہیں ہوا ہے۔ اس نے اپنا گلا کاٹ لیا اور کہا کہ اگر اس دنیا میں ہم اپنے محبوب کے ساتھ نہیں رہ سکتے ہیں تو دوسری دنیا میں جا کر انتظار کریں گے لیکن زخم کاری نہ تھا خود بہاراللہ نے اس کو بچا لیا۔

اب حکومت ترکیہ نے بہاراللہ کو ایڈریانوپل سے جلاوطن کر کے عکہ (جو شام میں ہے) بھیجنے کا حکم صادر کیا۔ بہاراللہ اور انکے ساتھی سب اکٹھے روانہ ہوئے ابھی تک ان لوگوں کے دلوں میں یہ خیال موجود تھا کہ مبادا حکومت انکو مختلف مقامات پر جدا جدا قید کر کے روانہ کرے۔ ہمراہی افسر بھی انکے دلوں میں اس خیال کو تازہ کر رہے تھے۔ راستہ میں جہاں جہاں جہاز بدلتا تھا سب لوگ ایک ہی کشتی میں سوار ہوتے تھے اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دوسرے سے جدا کئے جائیں چنانچہ ایک فدائی نے جسے دوسری کشتی میں بٹھا کر جدا کرنا چاہتے تھے اس نے سمندر میں کود کر اپنے آپ کو عمیق موجوں کے حوالہ کیا ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہاراللہ کے فدائی اس سے کس قدر محبت و عقیدت رکھتے تھے۔

۱۸۶۸ء میں بہاراللہ شہر عکہ میں نظر بند کی حیثیت سے لائے گئے اور انکے ساتھ ۷۰ فدائی تھے جو ایران اور مختلف ملکوں کے بڑے بڑے لوگ تھے جو اپنی عیش و عشرت کو خیرباد کہہ کر

ہمیشہ کے لئے بہاء اللہ کے ساتھ رہنا اپنی خوش نصیبی خیال کرتے تھے۔

۱۸۶۸ء سے لیکر ۱۸۹۲ء تک بہاء اللہ عکہ میں نظر بند رہے اور پچھتر سال کی عمر میں چار سال کی سخت قید اور چالیس سال کی متواتر نظر بندی کے بعد عکہ سے ایک میل کے فاصلہ پر باغ بھجی میں رحلت کی اور اپنا کام اپنے بیٹے عبد البہا عباس آفندی کے سپرد کیا۔

بہاء اللہ کی شخصیت کے متعلق مشہور مستشرق پروفیسر براؤن اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:-

"میرا رہنما ایک پردہ کے قریب تھوڑی دیر ٹھہرا۔ یہانتک کہ میں نے اپنے بوٹ اتارے اس کے بعد میں پردہ اٹھا کر ایک وسیع کمرہ میں داخل ہوا۔ میرے سامنے ایک مسند تھا اور دروازہ کے قریب دو تین کرسیاں رکھی تھیں مجھے کچھ یونہی سا خیال پیدا ہوا کہ کہاں لیجایا جا رہا ہوں اور کس سے ملاقات کرنے والا ہوں۔

دو تین سکینڈ گذرے ہوں گے کہ رعب اور تعجب سے میرا دل دھڑکنے لگا کیونکہ وہ کمرہ خالی نہ تھا کمرہ میں مسند پر ایک صاحب وقار اور محترم بزرگ کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ایک ٹوپی جو درویشوں کے تاج کی طرح تھی بلکہ اس سے ذرا اونچی انکے سر پر تھی اور اس تاج کے گرد ایک سفید چھوٹا سا عامہ لپٹا ہوا تھا۔ اس چہرہ کو جس پر میری نظر پڑ رہی تھی کبھی نہیں بھول سکتا ہوں اگرچہ اسکا بیان کرنا میری قوت سے باہر ہے چمکتی ہوئی آنکھیں جو انسان کی روح کو دیکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں کشادہ پیشانی جس سے جلال و بزرگی ہویدا تھی۔ پیشانی اور چہرہ کی جھریاں جو کبر سنی کا اظہار کر رہی تھیں۔ انکے سیاہ بال اور سیاہ داڑھی اس کی تردید کر رہے تھے یہ بات تبلانے کی ضرورت نہیں کہ میں کس کے حضور میں کھڑا تھا۔ تقدیم مراسم تعظیم کے لئے اُس کے سامنے جھک گیا جس کی ایسی محبت کیجاتی ہے کہ اولو العزم شہنشاہ رشک کرتے ہیں۔

ایک ملائم مگر پُر رعب آواز نے مجھے بیٹھنے کا حکم فرمایا۔" "الحمد للہ تم فائز ہوئے۔ تم ایک

قیدی، جلاوطن سے ملنے کے لئے آئے ہو۔" اس کے بعد یوں اپنے ارشاد کو جاری کیا "ہم لوگ بجز اصلاح عالم کے کچھ نہیں چاہتے ہیں مگر ہم لوگوں سے مفسدوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے ہم چاہتے ہیں کہ تمام قومیں متحد ہو جائیں۔ تمام انسان بھائی بھائی بن جائیں۔ انسانوں میں محبت و اخوت کا رشتہ مضبوط ہو جائے مذہبی اور قومی تنازعات انکے درمیان سے اُٹھ جائیں۔ ان باتوں میں کیا عیب ہے؟ یہ تمام جھگڑے اور تباہ کن لڑائیاں برطرف ہو جائے گیں۔ انکے بجائے صلح اکبر قائم ہو گی۔"

عبدالبہا عباس آفندی

عبدالبہا عباس آفندی ۱۸۴۴ء مئی کی اسی جمعرات کو پیدا ہوئے جس جمعہ کو باب نے "بابیت" کا دعوےٰ کیا تھا۔ عبدالبہا کی زندگی کا آٹھواں سال تھا کہ جسمانی آرام کا زمانہ ختم ہو گیا انکے والد بہاراللہ طہران میں قید کر دئے گئے اور اس کے بعد تمام موروثی جائداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط ہو گئی اور جو بچی کچی تھی وہ بھی لٹ گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ باب تازہ قتل کئے گئے تھے اور بابیوں کے خلاف ایران میں ایک محشر بپا تھا۔ اگر کوئی جھوٹ موٹ بھی بابی مشہور ہو جاتا تو جان کی خیر نہ تھی تمام بابی مخفی طور پر زندگی گذارتے تھے۔ رات کو تہ خانوں میں بغیر چراغ اندھیرے میں ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تھے۔

غرض عبدالبہا بھی کسنی میں ان مصائب میں گرفتار رہوئے اپنے باپ کے ساتھ بغداد میں جلاوطنی اختیار کی مصائب و تکالیف میں باوجود کسنی اپنے باپ کے دست و بازو بنے۔ عبدالبہا نے کسی کالج یا مدرسہ میں بالکل تعلیم نہیں پائی تھی کیونکہ موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ ہاں البتہ کچھ ابتدائی تعلیم اپنے باپ یعنی بہاراللہ سے حاصل کی تھی۔ باوجود کمی تعلیم کے بغداد کے بڑے بڑے علما انکے تبحر علمی سے متحیر تھے۔ ایک مرتبہ ایک صوفی علی شوکت پاشا نامی نے بہاراللہ سے اس حدیث کا مطلب پوچھا "کنتُ کنزاً مخفیاً" بہاراللہ نے عباس آفندی کی طرف اشارہ کیا اور اس کے لکھنے

کا حکم دیا۔ عبد البہا عباس آفندی اس وقت پندرہ سولہ برس کے تھے۔ ایک رسالہ مندرجہ بالا حدیث کی تفسیر میں لکھا۔ اس رسالہ نے صوفی مذکور کو ورطۂ حیرت میں ڈالدیا۔ یہ رسالہ علمی دنیا میں کافی شہرت رکھتا ہے۔ اور اسکا نام "شرح کنت کنزاً مخفیاً" ہے۔ عبد البہا اپنی نوجوانی میں اپنے اوقات کا ایک بہت بڑا حصہ غربا کی خدمت، بیماروں کی تیمارداری اور جاہلوں کی تعلیم میں صرف کرتے تھے۔ دوران نظر بندی ایڈریانوپل میں عبد البہا کی ہر دلعزیزی مشہور تھی۔ عوام الناس ان کو "سرکار آغا" کے لقب سے پکارتے تھے۔ عکہ میں جب عبد البہا اپنے باپ کے ساتھ نظر بند تھے۔ اس وقت بیماروں اور ناداروں کی خدمت کرنا انکا سب سے بڑا شغل تھا۔ بیماروں کو خود اپنے ہاتھوں سے نہلاتے اور خود کھانا تیار کر کے ضعیفوں اور ناداروں کو کھلاتے تھے۔ چنانچہ ہر شخص عبد البہا سے محبت کرنے لگا۔ اور عکہ میں "حامی الغربا والمساکین" کے لقب سے مشہور ہوئے۔

بہاراللہ کے انتقال کے بعد عبد البہا نے تمام کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اور بڑی شد و مد کے ساتھ "بہائیت" کی نشر و اشاعت کی کوشش کی۔ عبد البہا اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق کوہ کرمل کے ایک پہلو میں ایک عمارت بنوا رہے تھے۔ جس میں باب کا مقبرہ اور کچھ کمرے عبادات اور مجلس روحانی کے انعقاد کی غرض سے بنائے گئے تھے۔

دشمنوں نے عبد البہا کے خلاف حکومت سے شکایت کی کہ یہ شخص ایک قلعہ اس مقصد سے تعمیر کرا رہا ہے کہ حکومت کے خلاف لڑے اور ملک شام پر قبضہ کرے۔

چنانچہ ترکی حکومت نے عبد البہا اور اس کے متبعین کو عکہ کی فصیل میں نظر بند کر دیا یہ صرف عکہ کے ارد گرد چند میل تک آ جا سکتے تھے۔ سات سال تک عبد البہا اسی نظر بندی کی حالت میں رہے مگر مذہب بہائی کی اشاعت باوجود اس رکاوٹ کے نہ رک سکی۔ امریکہ اور یورپ سے لوگ آتے تھے اور ہدایات لیکر پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتے تھے

۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۷ء میں حکومت ترکیہ کی طرف سے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا تاکہ وہ ان الزامات کی تحقیق کرے جو عبد البہا کے خلاف لگائے گئے تھے۔ عبد البہا نے نہایت خندہ پیشانی سے ان الزامات

کی تردید کرتے ہوئے ہر اس حکم کو جو کمیشن انپر لگانا چاہتا تھا قبول کیا۔

اسی اثنا میں اٹلی کے قنصل نے متعدد بار عبدالبہا سے درخواست کی کہ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے لئے جہاز بہم پہنچا سکتا ہوں اور جہاں چاہیں وہاں پہنچا دوں۔

مگر عبدالبہا نے کہا کہ میں صبر و استقلال کے ساتھ ان تمام مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کروں گا جو مجھ پر ڈالی جائینگی۔ اور بہاء اللہ کے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ باپ نہیں بھاگا بیٹا بھی نہیں بھاگے گا۔

۱۹۰۸ء میں کمیشن نے اپنا کام ختم کیا قسطنطنیہ واپس گیا۔ اور باب عالی کے سامنے کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جانے لگا کہ عبدالبہا کو یا تو جلاوطن کیا جائے گا یا سولی دیدی جائے گی۔ مگر عجیب اتفاق ہوا کہ ٹرکی میں انقلاب واقع ہوگیا اور نوجوان ترکوں نے تمام مذہبی قیدیوں کو رہائی دیدی۔ ۱۹۰۸ء میں عبدالبہا کو جبکہ انکی عمر چونسٹھ سال تھی قید سے آزادی ملی۔ چنانچہ فوراً انکو یورپ اور امریکہ سے دعوتیں آئیں۔

۱۹۱۱ء میں عبدالبہا مغربی دنیا کے پہلے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس سفر میں عبدالبہا کو ہر خیال کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اسی سال ستمبر میں عبدالبہا لندن پہنچے ایک ماہ تک وہاں قیام کیا۔ انگلستان کے پریس نے بہائی مذہب پر مضامین شائع کئے اور عبدالبہا کی تصویر شائع کی۔

اس عرصے میں عبدالبہا نے بڑے بڑے مجمعوں کے سامنے لکچر دئے۔ جو بڑے زبردست فصیح و بلیغ ہیں اور جدید فارسی لٹریچر میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد عبدالبہا فرانس پہنچے وہاں بڑے بڑے مجمعوں کے سامنے موجودہ ضروریات و مسائل پر خطبے دئے جس سے تمام فرنچ پریس گونج اٹھا۔ اس سفر کے بعد عبدالبہا مصر واپس آئے۔ کچھ دن مصر میں آرام کیا۔ اس کے بعد ولایتہائے متحدہ امریکہ سے پرزور دعوت نامے آئے۔ چنانچہ اپریل ۱۹۱۲ء میں عبدالبہا امریکہ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ امریکہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک

سفر کیا۔ ہر قسم کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بڑے بڑے پروفیسروں، پادریوں اور لا مذہبوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور تمام یونیورسٹیوں میں لکچر دئے اور سب لوگوں کو صلح اور آشتی کا پیغام دیا اور امتیازات نسلی کے مٹانے کے لئے اپیل کی۔ مرد اور عورت کو برابر حقوق دینے پر زور دیا۔ امریکہ سے واپسی میں عبدالبہا پھر انگلستان گئے جہاں چھ ماہ تک قیام رہا۔ اسی اثناء میں لورپول، لندن اور اڈنبرا میں شہرہ آفاق لکچر دئے جو بہائی لٹریچر میں خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد جرمنی اسٹریا ہوتے ہوئے مصر میں اپنے اس تبلیغی سفر کو ختم کیا۔

ستمبر ۱۹۱۳ء میں عبدالبہا حیفا (علاقہ شام) میں واپس آ گئے۔ یورپ اور امریکہ کے طویل سفر نے عبدالبہا کے جسمانی قوٰے کو کمزور بنا دیا چنانچہ اس زمانے میں عبدالبہا نے چند الواح لکھی ہیں جس میں اپنے متبعین کو بہائی ازم کے پھیلانے کی دعوت دیتے ہیں جن میں سے ایک لوح کا مختصر اقتباس پیش کرتا ہوں وھو ہذا۔

"اے دوستو! وقت آ رہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہ ہوں گا جو کچھ مجھ سے ہو سکتا تھا میں کر چکا۔ امر بہائی کی میں نے استعداد بھر خدمت کی۔ اپنی زندگی میں دن رات اس کی خدمت میں مشغول رہا ہوں۔"

عبدالبہا نے اپنی زندگی کے بقیہ دن حیفا میں گذارے۔ زیادہ وقت بہائیوں کی تنظیمی اور تعلیمی اسکیموں کے تیار کرنے پر صرف کیا چنانچہ تنظیمی ترتیب کا ایک خاکہ یہ ہے۔

۱۔ ولی امر اللہ یعنی ایک واحد قومی سردار کا انتخاب۔

۲۔ ایادی امر اللہ یعنی مبلغین دین کا نظام مرتب کرنا۔

۳۔ محافل روحانی۔ مقامی اور بین الاقوامی کا قیام۔

۲۸ نومبر ۱۹۲۱ء کو عبدالبہا نے نہایت اطمینان و سکون کی حالت میں حیفا میں انتقال کیا اور اپنے پیچھے ایک کارکن جماعت چھوڑی۔

شوقی آفندی ولی امراللہ

عبدالبہانے شوقی آفندی کو ولی امراللہ مقرر کیا۔ شوقی آفندی عبدالبہا کی سب سے بڑی بیٹی ضیا خانم کے بڑے بیٹے ہیں اور انکے والد کا نام میرزا ہادی شیرازی ہے۔ جو سید باب کے خاندان کے ایک فرد ہیں۔

مسند ولایت پر بیٹھتے وقت شوقی آفندی کی عمر چبیس برس کی تھی اور اس وقت اکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہاں سے بلائے گئے اور ولایت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ سب سے پہلے شوقی آفندی نے یہ کام کیا کہ محافل روحانی تمام بہائی آبادیوں میں قائم کرائیں اور باقاعدہ ایک نظام کے ماتحت تبلیغ اصول بہائی کے لئے نظام قائم کیا۔ اور تمام بہائی مردوں، بچوں اور عورتوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔ شوقی آفندی نے بہائی نظام کو اسقدر منظم کیا ہے کہ بڑی بڑی حکومتوں کے نظام بھی اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ اس وقت شوقی آفندی کی عمر ۳۲ سال کی ہے۔ انگریزی۔ عربی، فارسی ترکی اور فرانسیسی زبان پر کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ انکی علمی اور اخلاقی قابلیت کا سکہ تمام ملنے والوں کے دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔ حد درجہ منکسر مزاج ہیں انہوں نے اپنے تمام تبعین کو ہدایت کر دی ہے کہ مراسلات میں انکے لئے بڑے بڑے القاب نہ استعمال کریں۔ ہر بات میں مساوات اور اخوت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

مختلف ممالک کے اخبارات اور رسائل شوقی آفندی کی تصویر اور انکے موجودہ نظام پر مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ چند ماہ ہوئے کہ "ٹائمز آف انڈیا" کے ہفتہ وار ایڈیشن نے انکا فوٹو شائع کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بہائی مذہب پر ایک سلسلہ مضمون بھی شائع کیا تھا۔ جس کے کچھ حصہ کا ترجمہ بہت مشہور ہو کر نکل چکا ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں بہائی اصول اور تحریک بہائی کی موجودہ رفتار ترقی کا ایک مجمل خاکہ پیش کرکے اس مضمون کو ختم کروں۔

تعلیمات بہائی

خدا:۔ غیب لایدرک ہے اسکی حقیقت کو کسی نے نہیں سمجھا مگر اس کی ہستی پر ہر ایک ضمیر و وجدان اور عقل و فہم گواہ ہے۔ جس پر کافی سے زائد علمی دلائل موجود ہیں۔ خدا کی قدرت اب بھی ویسی ہی ہے جیسے پہلے تھی۔ اس کی کوئی قوت کم نہیں ہوتی ہے وہ اپنی صفات کمال میں یکساں ہے وہ اپنی کائنات میں اپنی قدرت کے نئے سنئے ظہور دکھاتا رہتا ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کے نام اور اس کی نسبت مختلف بیانات ہیں لیکن سب کا مقصد ایک ہے۔ اس کی قدرت کی کوئی ابتداد انتہا نہیں وہ ہمیشہ سے خالق و مالک ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کی صفات میں کبھی حدوث نہیں ہوا نہ کبھی تعطل ہوتا ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً ایک باقاعدہ پروگرام کے اندر دنیا کو ہدایات دیتا رہتا ہے خاص خاص لوگوں کو اپنے کلام کا جلوہ گاہ مقرر کرکے اصلاح خلق کے لئے مبعوث کرتا رہتا ہے یہ سلسلہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ کیونکہ یہ اس کی صفت ربوبیت کا تقاضا ہے اور خدا کی کوئی صفت کبھی بھی مفقود نہیں ہوسکتی ہے۔

پیغمبر:۔ اس کی شان ہدایت سے مظہر ہوتے ہیں۔ سب پیغمبر برحق ہیں۔ انکی شریعتیں خدائی پروگرام کے مطابق اپنے اپنے وقت کے لئے نہایت پرحکمت اور ضروری تھیں۔ ان سب کا مقصد ایک ہی تھا یعنی وہ انسانی دنیا کی بہبودی اور ترقی چاہتے تھے۔ سب پیغمبر واجب التعظیم ہیں۔ پیغمبر ہر ملک میں آئے ہیں۔ ہر پیغمبر کی عزت کرنی چاہئے۔ سب پیغمبر دنیا کے لوگوں کو اتحاد و اتفاق کی تعلیم دیتے ہیں۔

دین:۔ وہ حقیقت جس کا خدا کی طرف ظہور ہوا اور جو انسانوں کی بہبودی کا صحیح ذریعہ ہے۔ حقیقت ایک ہے جو متعدد نہیں ہوتی اس لئے دین بھی ایک ہے۔ ہاں وہی حقیقت لباس جدید میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہے اس لئے وہ مختلف صورتوں میں نظر آتی ہے لیکن ہے وہی ایک ہی حقیقت۔ اس واسطے وحدت ادیان یا اتحاد مذاہب ایک زبردست بنیاد ہے جس پر تمام قوموں کے

اتحاد کی تعمیر ہوگی۔ دین کے اصول کبھی نہیں بدلتے لیکن جزئیات ضرور بدلتے رہتے ہیں تاکہ دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ نوع انسان کے لئے ترقی کی راہیں صاف ہوتی جائیں۔ دین ہمیشہ تجدد حاصل کرتا رہتا ہے جیسا کہ حضرت آدم سے تا ایندم ہوتا چلا آیا ہے۔ بہائیوں کے عقیدہ میں آج دین حقیقت ایک نئی شکل میں جلوہ گر ہوا ہے۔

الہامی کتابیں:۔ سب ایک ہی سرچشمہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ انکے لانے والے اگرچہ مختلف زمانوں میں ہوئے ہیں لیکن ان کا مدعا ایک ہی تھا۔ سب کتابیں حقیقت کی تعلیم دیتی ہیں۔ سب محبت سکھاتی ہیں وہ سب ایک ہی منزل پر لیجاتی ہیں۔ ہر دور میں جو خدا کی طرف سے ایک مقررہ مقدار کا ہوتا ہے۔ ایک الہامی کتاب شریعت نازل ہوتی ہے۔ اس کا دور ختم ہونے پر اس کتاب کی روحانی تاثیر بہت ہی مدھم پڑجاتی ہے۔ اس لئے اس کے ماننے والے قرون اولیٰ کی طرح ایمان و ایقان میں چست اور کامل نہیں ہوتے۔ اس وقت پھر خدا اپنے فضل سے جدید کتاب نازل کرتا ہے جو زندگی کا تازہ جام پلاتی ہے۔ خدا کی کتاب ہی حجت کاملہ ہوتی ہے۔ لوگوں کے تفسیری خیالات الہامی کتابوں کے برابر نہیں ہوسکتے ہیں۔ الہامی کتاب میں جو قدرتی طاقت ہوتی ہے وہ ایک نئی قوم بناتی ہے یا بالفاظ دیگر مردہ قوموں کو زندہ کرتی ہے۔ بکھری ہوئی جماعتوں کو ملاتی ہے۔

ترک تعصبات: بہائی تعلیمات میں سے ایک تعلیم ترک تعصبات ہے یعنی جنسی، وطنی، مذہبی، نسلی لسانی وغیرہ ہر قسم کے تعصبات کا چھوڑ دینا ایک بہائی کا فرض ہے۔ دنیا میں مختلف قوموں کا خیال بالکل باطل ہے۔ تمام عالم صرف ایک ہے یعنی "انسان"، ہر طرح کی قومی تفریقیں جھگڑے ہیں انہیں دور کرنا چاہئے۔ تمام روئے زمین انسان کا وطن ہے۔ تمام زبانیں انسان کی ہیں جن کا مقصد اظہار ما فی الضمیر ہے۔ کسی کو کسی زبان سے نفرت نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن زبانوں کی کثرت کی وجہ سے انسانی تعلقات میں بہت کچھ مشکلات پیش آرہی ہیں۔ اسلئے بہائی تحریکات میں سے ایک تحریک لسانی عمومی کی بھی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ

تمام دنیا میں ایک مشترکہ زبان قائم کیجائے چنانچہ "اسپرنٹو" زبان کی ترقی میں بہائی سب سے آگے آگے ہیں جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا کی عمومی زبان ہوسکیگی۔

مساوات مرد وزن: بہائی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ ہے کہ مرد اور عورت کے حقوق برابر ہیں یعنی مالی اور تعلیمی حقوق میں مرد اور عورت کو یکساں ہونا چاہئے۔ عبدالبہا کہتے ہیں کہ عالم انسانی ایک پرند کے مانند ہے جس کے دو بازو ہیں ایک مرد اور دوسرا عورت جب پرند کے بازو یکساں صحیح اور تندرست اور برابر قوت کے ہوں گے تو پرند خوب پرواز کر سکتا ہے۔ لہٰذا مرد وعورت کی مساوات ضروری ہے ورنہ عالم انسانی کا پرند ہوائے ترقی میں پرواز نہ کر سکے گا۔

تحصیل علم: بہائی تعلیمات میں سے ایک تعلیم فرضیت تحصیل علم ہے۔ نماز کی طرح ہر انسان پر فرض ہے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دلائے ابتدائی تعلیم جبری ہونی چاہئے

کسب معاش: ہر بہائی پر فرض ہے کوئی نہ کوئی کام کرے جس سے دولت وثروت پیدا کرے اپنے خاندان اور ناداروں کی امداد کرے اس کے ساتھ ساتھ گداگری بالکل قطعی حرام ہے۔ ہاں اگر اپاہج لوگ ہیں تو انکے لئے متمول اور باثروت لوگوں کو چاہیے کہ ہر شہر میں محتاج خانے بنوائیں۔

انسداد غلامی: ۔ بہائیوں کے نزدیک غلاموں کا خریدنا بیچنا قطعی حرام ہے۔ بہائیوں کے نزدیک ہر طرح کی غلامی یعنی ذہنی اقتصادی اور دماغی غلامی کو دنیا کے تختہ سے اڑا دینا چاہئے بہائی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ پیر ومرشد، مذہبی بلا شخصی حکومت اور سرمایہ داری غلامی کی زنگار زنگ زنجیریں انہیں توڑ دینا چاہئے۔ مگر تشدد سے نہیں بلکہ قوت ضمیر اور تدبر سے۔

جمعیۃ الاقوام: بہائی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ بھی ہے کہ دنیا میں ایک بیت العدل قائم کیا جائے جس میں تمام اقوام کے نمائندے متحد ہو کر تنظیم عالم کی تدابیر اختیار کریں جنگ کو دنیا سے اٹھا دیں ہتھیاروں کو کم کر دیں۔ باہمی رقیبانہ جذبات کو محبت کے جذبات سے بدل دیں۔

بہائیوں کے عقیدے میں یہ مندرجہ بالا احکامات خدائی احکام ہیں جو بہاء اللہ کے ذریعہ نازل ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ بہائی اسکو بھی مانتے ہیں کہ یہ سب باتیں ایک دن دنیا میں قائم ہو کر رہیں گیں۔

بہائی تحریک کی موجودہ رفتار ترقی

اس کے متعلق مختصراً عرض ہے کہ اس وقت دنیا کا ایسا کوئی ملک نہیں ہے جہاں بہائی کافی تعداد میں موجود نہ ہوں۔ ہر ملک میں بہائیوں کے اپنے ادارے موجود ہیں جس کے ماتحت بہائی مذہب کی نشر و اشاعت کرتے ہیں۔ ہر ملک اپنی قوت سے کام کر رہا ہے۔ ہر ملک میں بہت سے عالم و فاضل مرد اور عورتیں بہائی تحریک کو پھیلانے میں مصروف ہیں لیکن دنیا میں سب سے زیادہ ترقی اس تحریک کو امریکہ میں ہے۔ امریکہ کی ایک کروڑپتی خاتون مسز ساف لاکر نے اپنی زندگی بہائی ازم کی تحریک کے نشر و اشاعت کے لئے وقف کر دی ہے مسز موصوفہ نے سفر ہندوستان کے وقت ہماری جامعہ میں بھی تشریف لاکر بہائی تعلیمات پر ایک لیکچر دیا تھا۔ اور اسی طرح اعلیحضرت ملکہ رومانیہ بھی اسی تحریک کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے کوشش کر رہی ہیں۔

بہائی پریس

تعلیمات بہائی کی اشاعت کے لئے دنیا کے مختلف ملکوں میں مختلف ادارے ہیں۔ اخبارات اور رسائل کے نام تحریر کرتا ہوں۔

بہائی ایئر بک:۔ یہ ضخیم اور مصور مجلہ نیویارک امریکہ سے سال میں ایک مرتبہ نکلتا ہے۔ جس میں تمام بہائی دنیا کی سالانہ رپورٹیں ہوتی ہیں۔

لانو واٹاگو:۔ یہ ماہانہ رسالہ اسپرنٹو زبان کی ترویج کے لئے شائع ہوتا ہے۔ اسکا مقام اشاعت برلن ہے۔

ہیرلڈ آف دی ساوتھ:۔ یہ ہفتہ وار بہائی اصول کا آرگن ہے جو ملک لینڈ نیوزی لینڈ سے
سے نکلتا ہے۔

اسٹار آف دی ویسٹ:۔ یہ رسالہ ماہواری ہے انگریزی زبان میں چکاگو امریکہ سے شائع
ہوتا ہے۔

خورشید خاور:۔ یہ رسالہ بھی ماہواری ہے اور فارسی و ترکی زبان میں عشق آباد روس سے
نکلتا ہے۔

اسٹار آف دی ایسٹ:۔ یہ ماہانہ رسالہ انگریزی زبان میں ٹوکیو دارالسلطنت جاپان سے
شائع ہوتا ہے۔

چلڈرنس نیوز:۔ یہ ماہوار رسالہ کلیفورنیا سے بہائی بچوں کے لئے شائع ہوتا ہے۔

کوکب ہند:۔ یہ رسالہ ہر انیسویں دن بہائی مہینہ کی پہلی تاریخ کو دہلی سے اردو زبان میں شائع
ہوتا ہے۔ اور علاوہ ازیں یہ ادارہ بہائی اصول پر اُردو کتابیں اور چھوٹے چھوٹے
رسالے شائع کرتا ہے۔

ریل کی سڑک اور قبرستان

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

ایک سال کے اندر اندر لارس مجلس نابین کا صدر ہو گیا۔ سیونگ بنک کا بھی پریزیڈنٹ ہو گیا اور عدالت ثالثی کا سب سے زیادہ ذی اثر رکن بن گیا۔ الغرض جس جس عہدے اور منصب کی امیدواری کا اس کو استحقاق ہو سکتا تھا، اُن سب پر وہ بذریعہ انتخاب عام فائز ہو گیا!،

ضلع کی مجلس نمائندگان میں داخل ہونے کے ایک سال تک وہ مہر بہ لب رہا۔ لیکن دوسرے سال کی سیشن میں ایک خاص موقع کو منتخب کر کے اُس نے وہی پر ہیجان منظر پیدا کر دیا جس کی نظیر وہ گرجا کی مجلس نابین میں نڈر کے خلاف کر چکا تھا! یہاں بھی جو شخص جز و کل کا مالک اور سیاہ و سفید کا مختار رہا تھا اس کی مخالفت میں اچانک میدان میں آکر اُس نے ایسی اُس کی ہوا بگاڑ ی کہ اُس کو کامل شکست کا اعتراف کرنا پڑا۔ اور لارس پورے طور پر مظفر اور منصور ہو کر آئندہ اس نئے حلقۂ حکومت میں فرمان فرما بن گیا! اور یہاں پہنچکر اُس نے ملک کی پارلیمنٹ کی ممبری کی آخری معراج کی طرف پیشقدمی کی جہاں اُس کا شہرہ مقدمۃ الجیش بن کر پہلے ہی پہنچ چکا تھا لیکن دار العلوم کے اس زبردست سیاسی اکھاڑے میں مد مقابل حریفوں کی کچھ کمی نہ تھی، یہی وجہ تھی کہ یہاں وہ کسی قدر دبا دبا رہتا تھا اگرچہ اپنی ذاتی پوزیشن کو سنبھالنے میں پورا مضبوط و مستقل تھا۔ وہ کسی ایسے حلقے میں صدارت دریاست کے مرکز پر قبضہ کرنیکی کبھی ناعاقبت اندیشا نہ کوشش نہ کرتا تھا جہاں لوگ اُس سے پورے طور پر شناسا اور اُسکی قابلیتوں کے پورے مرتبہ داں نہ ہوں! اس کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ پارلیمنٹ میں کسی نمود و اقتدار کی جگہ پر گرفت حاصل کرنے کی ناکام جدوجہد میں وہ اپنے وطن اور ضلع کی مقامی مجالس کی علمبرداری بھی کھو بیٹھے!

اس لئے کہ اپنے گھر کی وہ حاکمانہ زندگی اُس کے لئے بہت ہی لذت انگیز تھی جس وقت اتوار کے دن وہ گرجے کی دیوار کے پاس کھڑا ہوتا اور ساری نماز گذار جماعت آہستہ آہستہ اور مودب انداز میں اُس کے بازو سے گذرتی ہوئی اس کو سلام نیاز پیش کرتی اور گوشہائے چشم سے مشتاق اور دزدیدہ نگاہوں کے ساتھ اُس کو دیکھتی جاتی اور وہاں اسی پر شوکت جلوس کے کسی فرد سے (اُس کو کھڑا کرکے) ازراہ التفات دو چار باتیں کرلیتا، تو سچ مچ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے "تنکے" کے بل پر گرجا کی ساری سلطنت پر ایک مطلق العنان شہنشاہ کی سی حکومت کررہا ہی!

واقعہ یہ ہی کہ وہ اپنے اس اعزاز و اقتدار کا بجا طور سے مستحق تھا۔ گرجا کے لئے جو خدمات اُس نے انجام دی تھیں اُنکا اعتراف نہ کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ اُس نے گرجا کو جانیوالی سڑک کو کھلوا دیا تھا، وہ نیا گرجا جس میں لوگ اب جماعت یا اجلاس کیا کرتے تھے، اُسی نے تعمیر کرایا تھا، اور یہ سب باتیں۔ معہ شے زائد کے۔ گرجا کے نئے قائم شدہ سیونگ بنک کے منافعوں کے اولین اثمار تھے! بنک کی یہ سرسبزی اور بارآوری بھی اُسی کی آبیاری کی رہین منت تھی کیونکہ وہی اُسکا منتظم و مہتمم تھا۔ گرجا کی جائداد و وسائل میں روزافزوں اضافہ ہوتا رہا تاآنکہ وہ تمام دوسرے کلیساؤں اور مذہبی اوقاف کے لئے حکومت خود اختیاری اور عمدہ نظم و نسق کی ایک شاندار، قابل تقلید مثال بن گیا!

نڈآکرے پبلک سرگرمیوں کے میدان سے بالکل ہٹ آیا تھا۔ شروع شروع میں اس نے مجلس کی بعض نشستوں میں شرکت کی تھی کیونکہ اس نے بعض لوگوں سے یہ وعدہ کرلیا تھا کہ وہ حسی المقدور اس مذہبی مرکز کے لئے اپنی ناچیز خدمات پیش کرتا رہے گا۔ اگرچہ اس میں اُس کو اپنی غیرت و خود داری کو تھوڑا مجروح ہی کرنا پڑے! مگر جب اُس نے اپنی نئی حیثیت سے پہلی تجویز پیش کی تو اس نے دیکھ لیا کہ اُس کے لئے میدان بالکل تنگ ہوگیا ہی اور اس کے کامیاب رقیب نے اُسکے لئے گرجا کی پبلک خدمت کی زمین اس قدر گرم کردی ہی کہ وہاں اب اُسکے قدم جمنا مشکل ہے۔ چنانچہ نڈ کی محولہ بالا قرارداد کی پیشی کے وقت مشاق لارسن نے پہلی اصطلاحی مشکل یہ پیدا کی کہ صاحب تجویز

سے یہ درخواست کی کہ وہ ازراہ کرم اُس کی تمام تفصیلات و جزئیات پر ذرا روشنی ڈالیں۔ ٹنڈ کچھ ایسا سراسیمہ ہوا کہ فرومات کے اس مطالبہ کو قبل از وقت قرار دینے کی کوشش میں اُس کی زبان سے نکل گیا کہ: "جب کلمبس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا تو اُس نے وہاں آبادکاری کے پہلے ہی قدم پر ملک کو کلیسائی حلقوں میں نہ تقسیم کیا تھا بلکہ یہ سب ارتقائی منازل رفتہ رفتہ از خود ظہور میں آگئی تھیں!" لارس نے اس خطیبانہ انداز بیان پر فوراً گرفت کی اور اپنے جواب میں کہا کہ "تب ہم کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ہمارے دوست ٹنڈ آکرے کی تحریک ایک ایسا ہی عظیم الشان او رمعرکۃ الآرا تاریخی کارنامہ ہے جیسا کہ براعظم امریکہ کا اکتشاف!"

یہ ہجو ملیح ایک قیامت تھی! اُسی دن سے غریب ٹنڈ کا نام ہی مجلس میں "اکتشاف امریکہ" پڑ گیا!!

ٹنڈ نے جان لیا کہ اپنا "عہد اقبال" اب ختم ہوچکا ہے! اب عوام اُس کو بجز مذاق کا نشانہ بنانے کے کسی اور مصرف کا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اُس نے پبلک خدمات کے تمام اخلاقی مقتضیات کی ذمہ داری سے اپنے کو بری سمجھ لیا، اور مجلس نگراں کار کے آئندہ انتخابات میں اپنے کو پیش کرنے سے انکار کردیا!

لیکن اس نے اپنے بعض مشاغل کو ترک نہیں کیا اور انہیں پوری تندہی سے انجام دیتا رہا اور اپنی قسمت سے یہ امید وابستہ رکھی کہ ممکن ہے میں آئندہ کبھی کسی کام کا اہل سمجھا جاؤں۔ چنانچہ اُس نے اپنے سنڈے اسکول پر توجہ مرکوز کی، اُس کو کافی وسعت دی، اور مختلف قسم کے چھوٹے اور بڑے چندوں اور مالی اعانتوں سے وہ اسکو اس حیثیت میں لے آیا اور اُس کے سارے سررشتہ کا خود ہی "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ" کے بمصداق مختار و سربراہ کار قرار پایا اس مرکز کی شاخیں اور شعبے دور دور گرد و نواح کے اضلاع میں بھی تھے۔ ٹنڈ کی اس جدوجہد پر لارس نے یہ معنی خیز فقرہ کسا کہ "جب ٹنڈ آکرے کسی مقصد کے لئے روپیہ جمع کرتا ہے تو وہ پہلے سے طے کرلیتا ہے کہ یہ رقم وطن سے ہزارہا میل کے فاصلہ پر خلق اللہ کو فیضیاب کرے گی!"

لیکن دونوں کے حلقۂ کار کے حدود اب اس قدر علیحدہ تھے کہ آپس میں کسی تصادم کا موقع نہ رہا تھا، اور آئی دست و گریبانی بالفعل ختم ہو گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے بھی نہ تھے، لیکن کوچہ و بازار میں جب کبھی اتفاقیہ مڈبھیڑ ہو جاتی تو رسمی علیک سلیک اور مزاج پرسی ہو جاتی! لارس کا خیال ہی آنے پر نڈ کے دل میں ایک ٹیس پیدا ہوتی لیکن وہ اس جذبہ کاوش و کاہش کو دباتا اور اپنے دل کو سمجھاتا کہ تقدیر ہی میں یہ لکھا تھا کہ ایک نیلا ہرا دتنے حریف سے ایسی زک اٹھانی پڑی، شاید صورت معاملات ہی اس طرح آن پڑی تھی کہ اپنا یہ انجام ناگزیر تھا! الغرض اس نے اپنے دل کو ڈھارس دے لی تھی اور لارس کی طرف سے شاید تمام خلش و پرخاش کو نکال دیا تھا۔

اب یہ سالہا سال کے بعد ایک محفل شادی کا موقع تھا۔ نڈ اور لارس دونوں اس تقریب میں شریک تھے اور دونوں بہت خوش خوش تھے۔ نڈ ایک کرسی پر کھڑا ہو لا ور لارس کے اعزاز میں ایک مداحانہ تقریر شروع کی! اس نے "گرجا کی مجلس نابین کے صدر اور کلیسائی حلقے کے اولین نمائندۂ پارلیمنٹ" کے شاندار القاب سے لارس کی شخصیت کی طرف اشارہ کیا اور اپنے وطن کی اس مایہ ناز ہستی کا جام صحت تجویز کیا! نڈ اپنی تقریر سے خود متاثر ہونے لگا اور گویا سامعین میں وہ خود ہی سب سے زیادہ ہمہ تن گوش تھا! حسب معمول اس نے اپنے خیالات بڑی خوبصورتی و خوش اسلوبی سے بیان کئے۔ سب لوگ نڈ کی عالی منشی" اور سینہ بے کینہ" کے قائل ہو گئے۔ لارس بھی قدم بڑھا کر اس کے پاس آیا اور کسی قدر حجاب اور زود دیدہ نگاہی کے ساتھ اس نے مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ "اس وقت کا طرز عمل نڈ آکر سے جیسی ممتاز شخصیت کے عین شایان شان تھا! سچ یہ ہے کہ مجھکو جو کچھ آتا ہے وہ سب میرے اسی محسن و مربی کے فیض صحبت کا طفیل ہے اور میری اس وقت جو کچھ بھی حیثیت ہے اس کے لئے تمام و کمال میں اپنے اسی محترم دوست کا مرہون احسان ہوں!"

ان دیرینہ دوستوں میں خوشگوار تعلقات کی بحالی کا یہ نتیجہ ہوا کہ آئندہ انتخاب میں نڈ گرجا کی مجلس نگراں کا رکا پھر پریزیڈنٹ تھا!

لیکن لارس کو کچھ معلوم نہ تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا ؟! اگر وہ ان غیر نیرنگیوں کے ظہور کی پیش بینی کرلیتا تو اس وقت وہ ٹنڈ کا کبھی حامی و مدد گار نہ ہوتا اور اپنے اثر ور سوخ سے کام لیکر اس کو ہرگز اس منصب پر نہ پہنچاتا!

جس وقت ٹنڈ دوبارہ گرجا کی نمائندہ مجلس میں داخل ہوا ہے تو وہاں ایک خاص نقشہ پیش تھا۔ لارس کے زمانۂ قیادت میں مجلس کے ارکان کے اندر ذاتی کاروبار کرنے کا ایک برا دستور قائم ہوگیا تھا اور یہ چسکا اب اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ بالکل ایک "جنون" سے تعبیر کیا جاسکتا تھا۔ ناتجربہ کاری اور قمار بازانہ طریق تجارت نے ایسے تباہکن نتیجے پیدا کئے تھے کہ ہر شخص کی مالی حیثیت سخت معرض خطر میں تھی اور یہ ناعاقبت اندیشانہ شوق اپنی قربانگاہ پر اب قربانیاں مانگ رہا تھا! عام طور پر کہا جاتا تھا کہ اس اندوہناک صورت حالات کا بانی مبانی لارس ہاگسٹیڈ ہے کیونکہ اُسی نے بالارادہ تعلیم و تلقین کرکے اپنا یہ غلط تاجرانہ مذاق ساری مجلس میں عام کر دیا تھا۔ خود مجلس نگرانکار اپنی سرکاری حیثیت میں ایک سخت جوئے باز جماعت تھی اور وہی دوسرے متوسلین کلیسا کے لئے ایک گمراہ کن مثال بنی تھی۔ اب اس خبط کی ہمہ گیری کا یہ حال تھا کہ دو پیسہ کا مزدور بھی سٹہ باز بننے کے لئے تیار رہتا اور ایک ایک کے چھ چھ کرنے کی دھن میں تھا! لوگ اس زر پرستی میں جیسے حریص بن گئے تھے ویسے ہی فضول خرچ اور اپنی عادات میں بے اصول بھی ہوگئے تھے۔ اس جنگ زرگری کا ایک سب سے ناگوار نتیجہ یہ تھا کہ روپیہ کمانے کی جدو جہد اور کشمکش میں لوگ ایک دوسرے کو حریف و رقیب ہوگئے تھے۔ آپس میں رشک وحسد کا مادہ پیدا ہوگیا تھا، جو نفرت و عداوت کی شکل میں مبدل ہو رہا تھا! "مسجد کے زیر سایہ خرابات" کا یہ رنگ حد درجہ افسوسناک تھا! اب نوبت یہ تھی کہ باہمی بددیانتیوں اور بدمعاملگیوں کے نتیجہ میں عدالتوں میں ایک دوسرے پر مقدمے قائم ہوئے تھے۔ یہ سعادت بھی گرجا ہی سے منسوب کیجاتی تھی اس لئے کہ لارس نے چیرمین بن کر جو پہلی اصلاحی دتادینی کارروائی کی تھی وہ گرجا کے کہن سال اور محترم امام پر بعض مشتبہ اور خیانت آمیز کارروائیوں کے سلسلے میں مقدمہ کا چلانا ہی تھا! اگرچہ اس مواخذۂ قانونی میں لارس کو کامیابی ہوئی تھی لیکن گرجا کی ایک مقدس ہستی

کو عدالتی داروگیر میں جکڑنا اور اس طرح اس کو رسوا کرنا بجائے خود ایک نازیبا اور بیدردانہ بات تھی،
چنانچہ اس مقدمہ پر اگر بعض لوگوں نے لارنس کے عمل کو حق بجانب اور قابل تعریف بتایا تو بعض
نے اس کی مذمت بھی کی۔ اس لئے کہ غریب امام کو اس ثابت شدہ الزام کے سلسلے میں اپنے
کلیسائی منصب سے مستعفی بھی ہونا پڑا تھا۔

اب لارنس کی بے راہ روئیوں اور مجتہدانہ کارروائیوں کے نتائج بد سامنے تھے۔ آپس
کی چپقلش اور اس کے سلسلہ میں نزاعوں اور مقدمہ بازیوں کا یہ انجام ہوا تھا کہ ہر شخص قلاش
اور تباہ ہو گیا تھا۔ لارنس کے عہد حکومت کے زیر سایہ گرجا اور نواح گرجا میں ان مصائب کا
آخر رنگ لایا اور رائے عامہ میں گرجا کی مجلس نگراں کا رکی اس رہنمائی کے اثر و ہر دلعزیزی کے
بارے میں ایک یکسر انقلاب ہو گیا! اور ان باغیانہ خیالات کو سربراہی کے لئے بہت جلد
ایک لیڈر بھی مل گیا۔ یہ نڈآکرے تھا جس کو لارنس ہی نے "مارآستین" بنا کر مجلس میں صدارت
کے عہدے پر فائز کرا دیا تھا!

معرکہ آرائی فوراً شروع ہو گئی۔ وہ سارے نوجوان جنہوں نے اپنے زمانہ طالبعلمی میں
ناؔ کے سامنے زانوے ادب تہ کیا تھا اب بڑے ہو گئے تھے۔ پبلک معاملات میں حصہ لینا شروع کر دیا
تھا اور گرجا کی مجلس نابین کے بھی بڑے کامیاب اور صاحب اثر ممبر تھے۔ مجالس کی کارروائیوں
میں وہ خوب طاق و مشاق ہو گئے تھے اور ان کے ما لہ و ما علیہ پر پورا عبور رکھتے تھے۔ یہی لوگ
نڈآکرے کے علم کے نیچے جمع ہونے والے تھے اور لارنس کا انہی سے مقابلہ تھا۔ یہ ساری جماعت
بچپن ہی سے لارنس پر خار کھائے ہوئے بیٹھی تھی اور اس سے انتقام لینے کے لئے موقع کی
منتظر تھی۔ ایک دن شام کے وقت جبکہ مجلس نابین کا ایک طوفانی اجلاس ختم ہو چکا
تھا لارنس اپنے مکان کے پیش دروازے پر کھڑا ہوا تھا اور سامنے نظر آنیوالے گرجا اس کی اراضیات
ومتعلقات ایک خاص منظر پیش کر رہے تھے، ابر آلود مطلع میں اس نے زبردست رعد و برق
سنی۔ ان سماوی تنبیہوں کو لارنس کے واہمہ نے سیاسی موسم کے خوفناک تغیر کی علامات سے تعبیر

کیا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا کہ "جس دن ان لوگوں کی اقتصادی مصیبتیں اپنے عروج کو پہنچکر کوئی حادثہ پیش لائیں اُسی دن سے گرجا کے سیونگ بنک کا بھی خاتمہ ہے، اور اُسی کے ساتھ میرے اقتدار کا بھی جنازہ اُٹھ جائے گا۔"

اسی کشمکش و پیچاپش اور یاس و ناامیدی کا وقت تھا کہ ریلوے کے کمشنروں کی ایک جماعت بسلسلہ تحقیقات اُدھر نکل آئی۔ یہ لوگ ایک نئی مجوزہ ریلوے لائن کے پیمائش و معائنہ پر مامور کئے گئے تھے۔ یہی گشت کرتے ہوئے ایک دن شام کو یہ انجنیر ہاسٹیڈ (لارس ہاگسٹیڈ کا گاؤں اور مسکن) میں وارد ہوئے۔ گرجا کے متعلقہ حلقہ اراضی میں داخل ہوئے۔ ہاگسٹیڈ پہلا قطعہ تھا۔ ریلوے کمشنروں سے گفتگو کے دوران میں یہ حقیقت بے نقاب ہوئی کہ صیغہ ریلوے کے ارکان کے ہاں یہ تجویز زیر غور ہے کہ آیا جدید لائن اسی وادی سے نکالی جائے جس میں ہاگسٹیڈ وغیرہ کی زمینیں پڑتی تھیں۔ یا اُسی کے متوازی ایک دوسری وادی سے۔

ایک برق مثال تیزی سے اُس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ "اگر میں ریل کو اپنی زمین میں سے گذرنے کی اسکیم کو حکام ریلوے ہاں مقبول کرانے کی جد و جہد میں کامیاب ہو جاؤں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یکبارگی ان گرد و پیش کی اراضیات کی قیمتیں دوچند سہ چند ہو جائیں گی اور نہ صرف میں اس آنے والی تباہی سے بچ جاؤں گا بلکہ میرا نام زندہ جاوید ہو کر پشتہا پشت تک مشہور ہو جائے گا۔ یہ اتنا دلفریب اور امید پرور خیال تھا کہ اُس کی دلکشی کے تصور میں وہ ہمہ تن غرق ہوگیا اور خوشی کی شدت میں ساری رات اس کو نیند نہ آئی۔ وہ ایک نظروں کو خیرہ کرنیوالی روشنی اپنے عالم تخیل میں دیکھتا تھا اور انہماک و استغراق میں اس کو کبھی کبھی ریلوے ٹرین کی گھڑ گھڑاہٹ تک مسموع ہوتی تھی!

دوسرے دن صبح جب ریلوے والے زمین کو دیکھنے کے لئے نکلنے لگے تو اُس نے اپنا گھوڑا گاڑی اُنکو لیجانے کے لئے پیش کی، چنانچہ گاڑی انکو لے بھی گئی اور واپس بھی لائی۔ لارس اس تمام "گرد آوری" میں اُنکے ہمرکاب تھا۔ دوسرے دن جب وہ دوسری وادی کے

معائنہ کے لئے جانے لگے تو اُس دن بھی اُس کی سواری اُنکے لئے حاضر تھی اور وہ خود بھی حسب معمول اُنکی دمبالہ روی میں تھا! کمشنر لوگ ہاگسٹیڈ کے موقع کی خوبصورتی سے بیحد متاثر ہوئے۔ روانگی کے وقت ان لوگوں کے اعزاز میں ایک عظیم الشان الوداعی جلسہ کا لارنس نے اہتمام کیا اور گرجا کی آبادی کے تمام سربرآوردہ لوگوں کو شرکت کی دعوت دی جلسہ بہت کامیاب رہا اور اُسکی ہنگامہ خیزیاں شام سے صبح تک جاری رہیں! لیکن افسوس کہ اصل غرض وغایت کے اعتبار سے یہ ساری مصیبتیں بیسود ثابت ہوئیں کیونکہ ریلوے کے مہندسین جتنا غور کرتے تھے اس فیصلہ کی معقولیت اُن پر ظاہر ہوجاتی تھی کہ زیر پیمائش لائن کا ہاگسٹیڈ والے خطے سے لیجانا غیر ضروری مصارف کو برداشت کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس وادی کا دروازہ ایک تنگ اور دشوار گذار درہ میں سے ہو کر تھا اور جو ندی اس میں بہتی تھی وہ برسات کے موسم میں اس نواح میں ایک سیلابی کیفیت پیدا کردیتی تھی۔ پس اس طرح دو ہی چارہ کار تھے: یا تو لائن پہاڑی کے پہلو بہلو معلومہ پیدل شاہراہ کے محاذ میں نکالی جائے اور اس طرح اُس کو بلاوجہ ایک غیر معمولی بلندی تک لیجایا جائے اور ساتھ ہی ندی کو دو جگہ سے عبور کرنے کے لئے دُہرے دُہرے پل تعمیر کئے جائیں، اور یا پھر یہ ریل کی سڑک بخط مستقیم چلے اور اُس قدیم قبرستان میں سے گذرے جو اب غیر مستعمل تھا۔ گرجا کو اس موقع سے منتقل کئے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا اور ماضی قریب ہی میں آخری میت کی تجہیز وتدفین کے مراسم یہاں عمل میں آئے تھے۔

واقعی کون تھا سچّا شاعر؟

از جناب احتشام الدین صاحب ایم اے

گذرے اُردو کے ہر ایک عہد میں صدہا شاعر
شہر و قصبات میں دیہات میں ہر جا شاعر

مختلف قسم پہ ہے یہ بھی جماعت تقسیم
کوئی ادنیٰ کوئی اوسط کوئی اعلےٰ شاعر

چند اقسام پہ اور اُن کی ہے ممکن تقسیم
کوئی کورا کوئی کچّا کوئی پکّا شاعر

ہیں جو انسان تو ہیں عیب زدہ بھی بے شک
کوئی اندھا کوئی کانا کوئی لنگڑا شاعر

ذوق ہر ایک کا جدا طرز جدا رنگ جدا
کوئی میٹھا کوئی پھیکا کوئی روکھا شاعر

محفل شعر میں غول شعرا کیا دیکھا
کوئی ٹیڑھا کوئی بانکا کوئی بونگا شاعر

بعض کی وضع سے ظاہر ہے ہیچ ہونا
کوئی گدڑا کوئی چیتھڑا کوئی اُدھڑا شاعر

بعض فی "احسن تقویم" کے پتلے یعنی
کوئی پھپّس کوئی لمبا کوئی بدڑا شاعر

خوشنوائی کا سر بزم یہ عالم دیکھا
کوئی گونجا کوئی کڑکا کوئی رینکا شاعر

لحن داؤد بھی بعضوں کو دیا قدرت نے
کوئی بلبل کوئی طوطی کوئی مینا شاعر

جس سے اشعار کہے جا سکیں اچھے نہ بُرے
بے مزہ اُس کا کلام اور وہ پھیکا شاعر

جو قصیدہ و غزل مثنوی تینوں میں کسی
صنف میں چل نہ سکے ہے وہی لنگڑا شاعر

بعض بحروں میں طبیعت ہو رواں بعض میں بند
ایک طرف سے اُسے کہہ سکتے ہیں کانا شاعر

صرف موزوں ہو کوئی بات نہ جس میں نکلے
اور کیا کہئے جو نہ کہئے اُسے کورا شاعر

درد اور لطف سے اشعار ہوں خالی جس کے
کیا کلام اس میں جو کہئے اُسے روکھا شاعر

کر سکے جو نہ رجز اور رمل میں تمیز
شاعروں میں وہ بلا شبہ ہے اندھا شاعر

جو سر بزم غزل اپنی سناتے شرمائے
مرد وا ہو کے وہ بنتا ہے زنانہ شاعر

جو غزل اور کی سنکر نہ غزل اپنی سنائے
گو جگہ سے نہ ٹلے ہے وہ بھگوڑا شاعر

جو سنانے میں غزل شعر کی سورت بن جائے
نقل محفل ہو وہ آپ اپنا تماشا شاعر

گا کے محفل میں جو داد اپنے سخن کی چاہے
کیا خبر ہے وہ سخنور کہ گویا شاعر

زہد اور تقوے سے لبریز ہوں جس کے اشعار
زیب دیتا ہے لقب اسکا ہو ملّا شاعر

جس کو تعقید و غلو اور اضافت کا مرض
نہیں شاعر وہ حقیقت میں ہو بنتا شاعر

شوق شاگردوں سے ہو جسکو اور اصلاح کا خبط
"کام شاعر" پھرے آواز لگاتا شاعر

جس کے ممدوح بکثرت ہوں قصیدے ازاں
بھیک کیوں مانگے نہ وہ لیکے طنبورا شاعر

جس کے اشعار میں ہو حسن طلب کی کثرت
شعر کہتا ہے وہ یا پیٹ بجاتا شاعر

ہم بتائیں گے تو وہ رائے ہماری ہو گی
کیا خبر کون ہو مرغوب تمہارا شاعر

جرأت و سوز کوئی مصحفی و میر کوئی
کوئی چرکین و زٹل اور کوئی انشا شاعر

جتنے شاعر ہیں غرض اتنی ہی قسمیں ان کی
ایک سے ایک مشابہ نہیں پورا شاعر

غالب و میر و نظیر اکبرآبادی تینوں
آگرے میں ہوئے یہ نام کو پیدا شاعر

ہے مگر یہ بھی مسلم نہیں محتاج ثبوت
ان کو دلی ہی کی گلیوں نے بنایا شاعر

لیکے دیوان نہ خود دیکھ لو کیا پوچھتے ہو
کون اچھا تھا یہاں کون برا تھا شاعر

گرچہ سچا تھا مگر کچا تھا افسوس نظیر
اور غالب وہ تصنع سے بھرا تھا شاعر

چیستاں طرز سخن، معنی و مطلب مجہول!
عرض مطلب میں جو قاصر ہو وہ گونگا شاعر

سیل و طوفان و غریو طبل جنگ کہو
سید انشا تھا غرض زور بلا کا شاعر

درد میں درد و تصوف کا مزا ملتا ہے
اور مومن کو بھی سب کہتے ہیں اچھا شاعر

پختہ سودا تھا ہوا ذوق بھی کامل فن میں
مانتے اس کو مخالف بھی ہیں پورا شاعر

جرأت و مصحفی و سوز ہر ایک میں ایک بات!
کوئی پوا کوئی آدھا کوئی پونا شاعر

انگلی ایک ناک پہ انداز سے بولے رنگیں
جان صاحب بھی تھا کیا کوئی نگوڑا شاعر؟

میر جعفر کی زٹل میں بھی ہے جدت موجود — گو کہ چرکین بھی موجد تھا پہ گندا شاعر
سادگی لطف زبان طرز ادا کی شوخی — ان سے تسلیم ہوا داغ بھی یکتا شاعر
پختہ شاعر تھے امیر احمد مینائی بھی — کہنہ مشاق مگر قافیہ پیما شاعر
جو دو دو غزلہ سے بھی بڑھ جائے سہ غزلہ لکھے — شعر کہتا نہیں ہے جان کو آتا شاعر
مرثیہ قوم کا حالی نے بھی اچھا گایا — بن گیا قوم کا ممدوح وہ بگڑا شاعر
شاعری چیزے دگر چیزے دگر استادی — سخت مشکل کسی استاد کا ہونا شاعر
کم ہوئی جمع یہاں شاعری و استادی — شعر و فن دونوں میں کامل تو ہے عنقا شاعر
ہاں مگر میر کہ شاعر بھی ہے استاد بھی ہے — جس کو ہر عہد کے استاد نے مانا شاعر

آج بھی جس نے کلام اُسکا پڑھا بول اٹھا
میر تھا میر تقی میر تھا تنہا شاعر!

غزل

از حضرت اصغر

یہ راز ہے میری زندگی کا
پہنے ہوئے ہوں کفن خودی کا

پھر نشترِ غم سے چھیڑتے ہیں
اک طرز ہے یہ بھی دلدہی کا

کونین پہ اک نگاہ نفریں
اللہ رے دماغ بے دلی کا

پھر ڈھونڈھ رہا ہوں بیخودی میں
کھویا ہوا لطف آگہی کا

مجکو نہیں جسم وجاں کی پروا
سودا ہے اک اور زندگی کا

او لفظ و بیان میں چھپنے والے
اب قصد ہے اور خامشی کا

مرنا تو ہے ابتدا کی اک بات
جینا ہے کمال منتہی کا

عالم پہ ہے اک سکون بیتاب
یا عکس ہے میری خامشی کا

ہاں! سینہ گلوں کی طرح کر چاک
دے مر کے ثبوت زندگی کا

یاس ایک جنون ہوشیاری
امید فریب زندگی کا

جنگی بیڑے

آج کل لندن میں مختلف دول کے نمائندوں کا جو اجتماع اس غرض سے ہوا ہے کہ جنگی بیڑوں کی روز افزوں قوت کے لئے کوئی حد مقرر کرے۔ اس کی کارروائی ہر اس شخص کے لئے نہایت اہمیت رکھتی ہے جسے دنیا کے سیاسی مستقبل سے کچھ بھی تعلق ہے۔ ذیل میں ہم چند اعداد و تشریحات اس لئے درج کرتے ہیں کہ اس کانفرنس کی کارروائی کو صحیح طور پر سمجھنے میں مدد ملے۔ ۱۹۱۴ء میں جرمن بیڑے کی بڑھتی ہوئی قوت نے انگلستان کو جنگ میں شریک کرایا۔ اور دنیا کو اس مصیبت میں مبتلا کیا جو جنگ عظیم کے نام سے تاریخوں میں یاد رہے گی۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں جرمن بیڑے پر سالانہ جو خرچ ہوتا تھا اس سے سہ چند سے بھی زیادہ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے گذشتہ سال میں اپنے بیڑے پر خرچ کیا یعنی ایک ارب ۱۲ کروڑ اڑتیس لاکھ روپیہ کے قریب! انگلستان نے بھی اس سال میں کوئی ۸۲ کروڑ روپئے اپنے بیڑے پر صرف کئے۔

جرمنی کے پاس ۱۹۱۴ء میں جتنا بیڑا تھا آج امریکہ کے پاس اس سے ۳ لاکھ ٹن زیادہ وزن کا بیڑہ موجود ہے۔

دنیا کی سرآوردہ دول کے بیڑوں کے وزن درج ذیل ہیں:-

ملک	تیار جہاز (ٹن)	جو جہاز تیار ہو رہے ہیں (ٹن)	میزان (ٹن)
امریکہ	۱۳۲۹۳۵۳	۲۰۴۰۲۰	۱۵۳۳۲۷۳
برطانیہ	۱۵۸۷۰۳۷	۱۷۸۶۴۰	۱۷۶۵۶۷۷
جاپان	۹۱۵۵۴۷	۹۰۹۴۰	۱۰۰۶۴۸۷
فرانس	۵۴۸۵۶۳	۱۶۱۰۰۳	۷۰۹۵۰۶
اٹلی	۴۰۷۴۰۵	۱۱۶۹۷۹	۵۲۴۳۸۴

ملک	تیار جہاز (ٹن)	جو جہاز تیار ہو رہے ہیں (ٹن)	میزان (ٹن)
جرمنی	۱۲۳۲۹۰	۳۴۰۰۰	۱۵۷۲۹۰
روس	۱۳۳۰۲۶	۱۵۲۰۰	۱۴۸۲۲۶

ان ملکوں کے جنگی بیڑوں میں جو آدمی کام کرتے ہیں انکی تعداد یہ ہے :-

امریکہ	۹۳،۳۲۴
برطانیہ	۸۹،۰۰۷
جاپان	۸۱۵۹۵
فرانس	۶۰۸۳۴
اٹلی	۴۵۳۹۷
جرمنی	۱۴۹۱۷
روس	۳۲۰۰۰

پچھلے پچیس سال کے اندر جنگی بیڑوں پر سالانہ خرچ میں جو حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے (سوائے جرمنی اور روس کے جہاں کمی ہو رہی ہے) وہ اعداد ذیل سے ظاہر ہو جائے گا :-

ملک	سنہ ۱۹۰۴	سنہ ۱۹۲۹	اضافہ یا تخفیف
امریکہ	۱۰۹۱۹۶۱۲۳	۳۷۴۶۰۸۰۵۴	+۲۶۵۴۱۱۹۳۱
برطانیہ	۱۷۳۵۴۸۰۵۸	۲۷۸۴۸۷۰۰۰	+۱۰۴۹۳۹۹۴۲
جاپان	۱۷۵۵۳۲۷۹	۱۳۱۲۲۲۷۲۲	+۱۱۳۶۶۹۴۴۳
فرانس	۵۹۷۴۰۲۲۲	۹۹۵۶۸۰۰۰	+۳۹۸۲۷۷۷۸
اٹلی	۲۳۵۲۲۴۰۰۰	۶۳۶۲۲۹۸۲	+۴۰۱۰۰۵۸۲
جرمنی	۵۰۵۴۴۰۰۰	۴۷۰۶۴۰۱۹	-۲۷۷۹۹۸۱
روس	۶۰۰۱۸۸۹۵	۴۲۳۲۹۲۸۹	-۱۷۶۸۹۶۰۶

کانفرنس میں جو جو قومیں شریک ہیں ان میں سے بعض چاہتی ہیں کہ بڑے جنگی جہاز بالکل بند یا کم کردیے جائیں ۔کوئی آبدوزوں کے خلاف ہے کوئی کروزروں کی تعداد گھٹانا چاہتا ہے ۔اس لئے یہ معلوم ہونا بھی مفید ہوگا کہ ان مختلف اقسام کے جہازوں کی تیاری پر کیا لاگت آتی ہے اور سال بھر میں ہر ایک پر کتنا خرچ پڑتا ہے :-

اوسط جنگی جہاز تقریباً ۱۰ کروڑ روپیہ میں تیار ہوتا ہے۔

اوسط کروزر " ۵ کروڑ میں

اوسط آبدوز " پونے دو کروڑ میں

ایک جنگی جہاز پر کل سالانہ خرچ تقریباً ۶۰ لاکھ روپیہ ہوتا ہے۔

ایک کروزر پر " " ۴۰ لاکھ روپیہ ہوتا ہے

ایک آبدوز پر " " ۱۲ لاکھ روپیہ ہوتا ہے

شذرات

"خود ہمارے ملک میں کیا کم کانفرنسیں ہوتی ہیں کہ ہم لوگ دنیا کے دوسرے سیاسی یا دیگر اجتماعوں کو بھی مستحق توجہ سمجھیں" یہ وہ جواب ہے جو لندن بحری کانفرنس کا ذکر آنے پر ہمارے ملک کے ایک ممتاز سیاسی کی زبان سے سنا گیا۔ اگر اس کے معنی ان بے معنی کانفرنسوں سے بیزاری کے ہیں جو صرف دفع الوقتی یا شخصی اقتدار کی خاطر ہمارے ہاں آئے دن ہوتی ہیں تو بہت اچھا ہے۔ لیکن اگر دنیا سے بے تعلقی یا سیاسی قوتوں کے باہمی تاثرات سے بے خبری اس کی وجہ ہو تو افسوس ہے۔ شاید لندن کانفرنس ہم ہندوستانیوں کے لئے بڑی دلچسپی کی چیز بن جائے اگر ہم کو معلوم ہو کہ اس کے فیصلوں کی وجہ سے ممکن ہے کچھ عرصہ بعد ہندوستانی سپاہی اسی فرانس کو فتح کرنے کے جائیں جس کو جرمن "بربریت" سے بچانے کے لئے انہوں نے ۱۵ سال قبل اپنا خون پانی کی طرح بہایا تھا۔ اور اسی جرمنی میں جہاں ہمارے سپاہی صرف جنگی قیدی کی طرح جاتے تھے ۔ ہماری افواج کا خیر مقدم تہذیب و تمدن کے محافظوں کی حیثیت سے ہو۔ اسی طرح ہم اس کانفرنس کی روئداد سے بے تعلق نہ رہیں اگر ہم جانیں کہ اٹلی اور فرانس کے باہمی تعلقات پر اثر ڈال کر یہ سارے شمالی افریقہ کے مستقبل پر کتنا گہرا اثر ڈالے گی اور بالواسطہ ترکوں کے انگلستان و اٹلی کے ساتھ یا روس و فرانس کے ساتھ ہو جانے کا فیصلہ بھی شاید اسی کانفرنس کے نتائج پر مبنی ہو۔

ہم لندن کانفرنس کے ظاہری مقصد یعنی مختلف دول کی بحری قوت پر پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کے متعلق کسی دوسری جگہ چند اعداد دیتے ہیں جن سے معلوم ہو سکے گا کہ دنیا کی یہ مالی فرزانہ قومیں طاقت کے کس جنون میں مبتلا ہیں کانفرنس کے پوشیدہ سیاسی نتائج و امکانات پر کسی

آئندہ اشاعت میں کچھ لکھیں گے۔ اس وقت ہم ناظرین کی توجہ موجودہ یورپین سیاست کی ایک خصوصیت کی طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں جو خود ہمارے لئے سبق آموز ہوسکتی ہو۔

جنگ عظیم سے قبل کا یورپ باوجود اپنی اندرونی رقابتوں کے جنہوں نے بالآخر اس مہلک جنگ کی شکل اختیار کی، ایک مشترک خیال رکھتا تھا یعنی مغربی تہذیب کے دوسرے تمدنوں اور تہذیبوں سے برتر و افضل ہونے کا یقین اور ان "پست" اور "نیم تمدن" قوموں سے ہر قسم کا سیاسی اور معاشی فائدہ حاصل کرنے کا خداداد حق۔ جنگ نے اس یقین کو متزلزل کر دیا اور اس حق کو تقریباً مٹا دیا۔ خود ساری مغربی دنیا دو ٹکڑے ہوگئی اور جنگ کے ختم ہونے کے ۷،۸ سال بعد تک یہ ٹولیاں تقریباً اس طرح بندھی رہیں۔ لیکن یورپ نے محسوس کرلیا کہ معاملہ اس طرح زیادہ دن نہیں چل سکتا۔ دشمن دوست کی پرانی تقسیمیں آخر کب تک قائم رکھی جائیں۔ دول یورپ نے پھر اپنے تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش شروع کی۔ ۱۹۲۴-۲۵ء میں یورپین سیاست نے ایک کروٹ لی۔ سیاسی فضا بدلی۔ ہر طرف اتفاق واتحاد کے چرچے ہونے لگے۔ اور سب ملکوں کے سیاسی خطیبوں کی متحدہ کوشش نے وہ چیز پیدا کر دی جسے "لوکارنو کی ذہنیت" کہا جاتا ہے۔ لیکن خطیبوں کا پیدا کیا ہوا اتحاد بہت اتھلا اتحاد ہوتا ہے۔ چنانچہ یورپ میں بھی تھوڑے دن تو اتحاد و اتفاق کی یہ غیر حقیقی فضا رہی۔ مگر جب ہر ملک کے مدبروں نے اس فضا میں اپنے حقیقی مسائل کا حل نکالنا چاہا تو یہ اتفاق واتحاد مشکل نظر آیا اور ہر قوم نے سمجھ لیا کہ ایک متحدہ یورپ بنانے کے لئے پہلے اپنے مخصوص مقاصد کی نگہبانی کرلینی چاہیے تاکہ جب مغربی تہذیب کے متحدہ ایوان کی بنیادیں پڑیں تو انکا مخصوص گوشہ نظر انداز نہ کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی سب بااثر اور مقتدر قومیں آج یورپ اور دنیا کے مستقبل کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھ رہی ہیں۔ ہر ایک کسی خیال، کسی تصور کا حامل اور حامی بنا ہوا ہے اور اس سے اپنی سیاست میں کام لے رہا ہے۔

انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ اینگلو سیکسن نسل اور انگریزی زبان کے اتحاد کے تصور کے زیر اثر اپنی رقابتوں کو طے کرنے پر آمادہ ہیں۔ خود برطانیہ میں سلطنت کے تصور کو پھر بہت فروغ دیا جا رہا ہے۔ ہوور اور میکڈانلڈ کی گفتگوؤں میں امریکہ کے صدر نے اگرچہ بالکل واضح کر دیا کہ ہمیں یورپ کے معاملات میں دخل دینے کی خواہش نہیں۔ یہ کام انیگلو سیکسن دنیا کی طرف سے انگلستان کو انجام دینا چاہئے، اور اس وقت سے یوروپین سیاست میں انگریزی وزارت خارجہ کی بات کا وزن بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن موجودہ وزارت بظاہر بالڈون کی کمزور وزارت سے بھی زیادہ احتیاط سے کام لے رہی ہے اور یورپ کی سیاسی الجھنوں میں آلودہ ہونے کے بجائے پوری کوشش کر رہی ہے کہ سلطنت برطانوی کے تصور کو زیادہ قوی کیا جائے۔ لارڈ بیور بروک نے اپنے سارے اخبارات اس خیال کی حمایت و اشاعت کے لئے وقف کر دیے ہیں، لارڈ ملجت نے معاشی حلقوں کو اسکا ساتھی بنا دیا ہے۔ مصر سے معاملہ اور ہندوستان کو کانفرنس کا بلاوا اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ اس سال سلطنت برطانیہ کی جو کانفرنس ہوگی اس سے بھی تصور اتحاد کو بہت کچھ تقویت دیجائے گی۔

اپنے مخصوص مقاصد اور جدا نصب العین کا احساس اٹلی میں بھی بہت قوی ہے۔ اس نے فاشزم کے نئے مسلک کو فروغ دے کر اپنی ساری قومی زندگی کو اس کے تحت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ نیز دیگر ممالک میں جہاں پارلیمنٹی حکومت کے نقائص ظاہر ہو رہے ہیں اس تصور کو پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے وہ جنوب و مغربی یورپ میں بھی اپنا تسلط چاہتا ہے۔ اور شمالی افریقہ میں بھی۔ لیکن قوم میں ریاست کا ایک نیا تصور پیدا کر کے ایک نئے خیال کی تخلیقی اور توسیعی قوت سے کام لے کر۔

فرانس کے جذبہ وطنیت اور اپنی تاریخی و تمدنی قوتوں پر اعتماد کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ وہ

یورپ ہی میں نہیں، افریقہ میں بھی اپنی رندی وہوسناکی کا سکہ جمانے کے درپے ہے سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء میں یورپ کے اندر اسکا بنا ہوا نقشہ ذرا بگڑنے لگا تھا۔ لیکن سنہ ۲۶ء سے یہ برابر اس کو مضبوط کرنے میں ساعی ہے۔ اس کی سیادت میں ائتلاف صغیر کی ریاستوں نے جو فوجی اور معاشی معاہدے کیے ہیں اُن سے اسکا ثبوت ملتا ہے۔ فرانس ہی یورپ میں اس وقت ایسی قوم ہے جس نے دس سال سے بھی زیادہ سے ریاستوں کا ایک جتھا بنا رکھا ہے جس پر اس کے نزدیک یورپ کے آئندہ امن چین کا بڑی حد تک دار و مدار ہے۔ یہی ایک ملک ہے جو اپنی مخصوص روایات، اپنی ملک پرستی کے باعث اپنے ماحول کے تغیرات و انتشارات سے سب سے کم متاثر ہے۔

جرمنی جو ابھی تک جنگ عظیم کے زخموں سے چور ہے وہ بھی جہاں یورپ کی دوسری قوموں کے اختلافات سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے وہاں اس سے بھی بے خبر نہیں کہ بغیر اپنے کسی مخصوص قومی خیال اور مقصد کے اسکا آگے بڑھنا مشکل ہے۔ اس نے بھی جرمانی اللسان وسطی یورپ کے اتحاد کو اپنا قومی مقصد بنایا ہے۔ اور اس کے لئے نہایت مستعدی اور بہت کچھ کامیابی کے ساتھ ساعی ہے۔

روس تو تہذیب حاضر کی بنیادوں ہی کو بدل دینے کے درپے ہے اور اس نے اپنے نئے خیال کے ساتھ بے مایہ اور نادار طبقہ کی تلخی روحانی اور کرب قلبی کو ملا کر دنیا کی سیاست اور دنیا کی ذہنیت میں ایسے انقلاب کی طرح ڈالی ہے جس کی کامیابی یا ناکامی، نتائج و عواقب کی اہمیت و ہمہ گیری کے لحاظ سے تاریخ عالم کی بڑی سے بڑی تحریک کی کامیابی یا ناکامی کے ہم پلہ ہوگی۔

ان سب باتوں کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ ان سے ہندوستان کی موجودہ سیاست خصوصًا مسلمانان ہند کی سیاست کے لئے سبق ملتا ہے۔ یورپ کی طرح ہندوستان میں بھی تقریروں اور نظموں اور جلسوں اور اخباری تحریروں کے زور پر جسم سیاسی کے دو اہم ترین حصوں، ہندو اور مسلمانوں میں، اتحاد و تعاون کی سبیل نکالی گئی تھی۔ یہ کوشش کامیاب ہوئی لیکن دیرپا نہ ہو سکتی تھی نہ ہوئی۔ یورپ کی طرح ضرورت تھی کہ مقرروں کی جگہ مرتب ذہن اور ٹھنڈے مزاج کے لوگ قومی مقاصد کا تعین کر کے معاملات میں مفاہمت کی کوشش کریں۔ مفاہمت نہ ہو سکے اور اختلافات اصولی ہوں تو ہاں لڑیں جھگڑیں بھی۔ لیکن یہ جانکر کہ کس چیز کے لئے لڑ جھگڑ رہے ہیں اور ایسی چیز کے لئے جس پر لڑنا جھگڑنا کسی جماعت کے شایاں شان ہو ایسی چیزوں کے لئے جن میں عملی انہماک اس بات کا زندہ ثبوت دیتا ہو کہ یہ جماعتی زندگی کے لئے اصولی چیزیں ہیں جنہیں پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔

ہندوؤں میں ہندو مہاسبھا نے مخصوص ہندو اغراض کی تنگ دلی اور کوتہ بینی کے ساتھ ترجمانی کی لیکن ایک نہایت محدود قسم کی وطن پرستی کے علاوہ جو ایک مخصوص گروہ کی فلاح کی کوشش سے عبارت تھی اس نے خود ہندو قوم کے سامنے کوئی مثبت تصور تعمیری پیش نہیں کیا۔ تنفر اور بیزاری کے منفی جذبوں پر اپنے کام کی بنیاد رکھکر اس نے اس کام کی ناپائداری اور بے وقعتی کا انتظام کر لیا ہے۔ مسلمانوں میں بھی کسی جماعت نے کوئی مثبت مطمح نظر سیاسی اور تمدنی زندگی کا نہ اپنے لئے بنایا نہ دوسروں کے سامنے پیش کیا۔ افسوس کہ مقرروں اور خطیبوں کے بعد جن مدبروں کی ضرورت تھی وہ ہم میں نہ نکلے۔ اور ہم جب ملک کی دوسری جماعتوں سے ملے تو اس وقت بھی کوئی مخصوص اسلامی مطمح نظر ہم نے پیش نہیں کیا۔ کوئی مطمح نظر جو ہمارے مخصوص حقوق کو حق بجانب ہی نہ بناتا بلکہ خود ملک کی سیاسی اور تمدنی زندگی کو اپنے اثر سے بہتر اور جامع تر بنا سکتا۔ ہم جب اٹھے تو اس وقت بھی ہم نے تمدنی

زندگی کے کسی خاص تشکیل، قومی زندگی کے کسی خاص ذہنی عنصر کی خاطر ایسا نہیں کیا یا اگر کیا تو بے جانے اور اوروں کو جتائے بغیر۔ ہر شخص مسلمانوں کے لئے مخصوص نیابت کا حق مانگتا ہے، ہر شخص انکے لئے جگہیں محفوظ کرانا چاہتا ہے، نیابتی جماعتوں ہی میں نہیں ملازمتوں میں۔ مدرسہ میں طالبعلموں کی تعداد میں، وظائف میں، خطابوں میں، انعامات میں۔ لیکن کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں بتلاتا کہ حیات قومی میں مسلمان کن مفید چیزوں کے حامل ہیں، کن اچھے مقاصد کے حامی ہیں، زندگی اور اسکے مسائل کے حل کے لئے کیا خاص نقطہ نظر انکے اثر سے فروغ پا سکتا ہے، یہ خود اپنی کن چیزوں کی حفاظت کے لئے نمائندگی و نیابت میں تحفظ کے طالب ہیں، اب اس وقت اپنی کوشش اور عمل سے اپنی جماعتی زندگی کے لئے ان چیزوں کے ضروری ولابدی ہونے کا کیا اور کتنا ثبوت دے رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ خود ہماری سیاسی زندگی میں آج جتنا انتشار ہے شاید پچھلے پچاس سال میں کبھی نہیں ہوا۔ کوئی مسلمانوں کے نام سے اپنی حیثیت کے سدھارنے یا برقرار رکھنے میں ساعی دکھائی دیتا ہے، کوئی اپنے لئے نوکری چاہتا ہے، کوئی اپنے عزیزوں کے لئے، کوئی خطاب کا طالب ہے، کوئی بس ایک تبسم لطف آمیز کا، یہ سب چیزیں محدود ہیں اور کچھ کو ملجائیں تو لازماً کچھ کو محروم رہنا پڑتا ہے۔ اس لئے ہر شخص کامیابوں کے زمرہ میں داخل ہونے کے لئے دوسروں کی ناکامی کا ارادۃً یا بلا ارادہ سامان کرتا ہے۔

اگر مسلمانوں کا مطالبہ حقوق واقعی چند اشخاص کے شخصی فائدہ یا نقصان کا معاملہ ہوتا تو اس میں کچھ زیادہ فکر کی بات نہ تھی۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس ملک کی حیات اجتماعی میں مسلمانوں کے بعض مخصوص وظائف ہیں جن کا صحیح طور پر انجام پانا مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ ملک اور انسانیت کے لئے ضروری ہے۔ اگر مسلمان اکثر ہندوستان کی توہم پرستی میں آزادی خیال کے حامی رہے ہیں اور رہ سکتے ہیں، اگر بیجا جماعتی پابندیوں کی فضا میں یہ شخصیت انفرادی کے حق کی اہمیت جتا کر ایک صحیح جماعتی توازن پیدا کرنے کے باعث ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ اگر تنگ نظر ملک پرستی کی غلطی نے انکی وسعت نظر سے اصلاح پائی ہے اور اب بھی پا سکتی ہے، اگر انکی بین الاقوامی حیثیت سے آزاد ہندوستان کی سیاست کے لئے نہایت قیمتی خدمات انجام پا سکتی ہیں، اگر تمدن ہند

میں انکا حصہ، زبان میں، ادب میں، تعمیرات اور فنون لطیفہ میں، مذہبی اور معاشرتی تحریکوں میں ایسا رہا ہے کہ اس حصہ کا تلف ہو جانا ہندوستان کے تمدن کو اپنی موجودہ حیثیت سے بمراتب پست کر سکتا اور جس کا ترقی پانا اس تمدنی زندگی کو چار چاند لگا سکتا ہے۔ تو ان صفات کے حاملوں کو بہ حیثیت جماعت، قائم رکھنا، اور انکی ترقی کے وسائل بہم پہنچانا مسلمانوں کی خاطر نہیں بلکہ ہندوستان اور انسانیت کی خدمت ہے۔ مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ اپنے ان مخصوص وظائف کا احساس اپنے اندر پیدا کریں اور اپنے عمل سے سب پر ثابت کریں کہ انکی جماعتی زندگی کی غایت انہیں مقاصد و خدمات کا پورا کرنا ہے۔ مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی سب سے اہم ضرورت ایسی قیادت ہے جو انکے تخیل کی سطح کو شخصی اغراض کی پستی سے اٹھا کر مخصوص جماعتی صلاحیت خدمت کے احساس پر پہنچا دے۔ اور ایسی جماعتیں جو ان مخصوص وظائف کو اس وقت سے بلا لحاظ اس کے کوئی ہمارے حقوق کو تسلیم کرے یا نہ کرے، ہم کسی سے ملے ہوں یا روٹھے ہوں، استقلال و پامردی سے انجام دیتی رہیں کہ یہی مخصوص حقوق کے تسلیم کرنے کی تنہا ضمانت ہے۔ ان دونوں چیزوں کو افسوس کہ آنکھیں ڈھونڈتی ہیں پر نہیں پاتیں۔ نہ ہم میں وہ مفکر ہیں جو ہمارے سرمایۂ ذہنی کو زندہ رکھیں اور ترقی دیں، نہ وہ خطیب و مبلغ ہیں جو اس سرمایہ کو ساری جماعت کی ذہنی ملک بنا دیں۔ نہ وہ اہل دل ہیں جو دوسرے کے دلوں میں ان اعلیٰ مقاصد کو عمل کا جامہ پہنانے کی لگن لگا دیں، نہ وہ مستقل مزاج کارکن ہیں جو ناکامی و کامیابی کی دھوپ چھاؤں سے بے نیاز اپنے کام میں لگے رہیں۔

اپنی محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

کیا یہ توقع بیجا ہوگی کہ مسلمانوں کی تعلیم گاہیں بہ حیثیت ذہنی مرکزوں کے اس صورت حال کے بدلنے میں کچھ مدد دے سکیں گی؟ اگر کچھ امید ہے تو انہیں سے ہے۔ باقی تو اللہ کا نام ہے اور بس۔

The Cultural Side of Islam

Madras Lectures on Islam

(NO. 2.)

BY

MUHAMMAD MARMADUKE PICKTHALL

DELIVERED AT MADRAS IN JANUARY 1927.

CONTENTS.

Price /8/-
Bound 12/-

To be had of:—

NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY BOOK DEPOT,
KAROL BAGH,
DELHI.

رجسٹرڈ
نمبر ۱۸۵۲
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
جلد ۱۲
بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء
نمبر ۳
"مجلہ مکتبہ"
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

نمبر ۳	بابتہ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء	جلد ۱۴

فہرست مضامین

جارج برنارڈ شا

(ڈرامانگار کی حیثیت سے)

شا کی امتیازی خصوصیت یہ ہو کہ وہ ہر ناٹک کے ساتھ ایک مفصل دیباچہ لکھتا ہے جس میں وہ اپنے فنی و اخلاقی نقطۂ نظر کی تشریح کرتا ہو، اور نقادوں کے اعتراضات کا جواب دیتا ہے اس جدت کو بہت سے لوگ سینہ زوری سمجھتے ہیں، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو وجہوں سے یہ طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ محض جمالیاتی ذوق کی خاطر نہیں بلکہ سماج کی تنقید واصلاح کی غرض سے لکھتا ہے۔ وہ اخلاق و معاشرت کے بارے میں اپنے مخصوص خیالات رکھتا ہے اور انہیں رواج دینا چاہتا ہے۔ ناٹک کے اشخاص کی گفتگو میں موقع بے موقع اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، مگر قصہ آخر قصہ ہی ہے۔ اس میں اتنی گنجائش نہیں کہ کوئی نظریہ منطقی ترتیب سے پیش کیا جاسکے۔ اس لئے شا کو یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ دیباچہ میں وہ مسائل جن کا ناٹک میں سرسری طور پر ذکر آیا ہے زیادہ مفصل اور مدلل طریقے پر بیان کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ابتدا میں انگلستان کے سارے نقاد شا کی مخالفت میں یک زبان تھے اور اس کا طرفدار کوئی نہ تھا، اس لئے وہ اس پر مجبور ہوا کہ اپنی حمایت میں خود قلم اٹھائے۔ اس کی دیانتداری اور صاف گوئی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنی زبان سے اپنی تعریف کرتے نہیں شرماتا۔ اپنے ناٹکوں کے دیباچوں میں وہ طنز اور مضحکے کی تلوار سے معترض پر وار کرتا ہے اور ظرافت کی سپر سے اپنی شہرت کی حفاظت کرتا ہے اور اس میں بھی دوسرے مصنفوں کی طرح شہرت پسندی اور دادطلبی کی کمزوری ہے، مگر اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض اپنی تصانیف اور اپنے خیالات کی ترویج چاہتا ہے، اپنے ہم عصروں کی طرح اپنی زندگی کی جزویات کو اخباروں میں شائع نہیں کرتا۔ اور اپنی خودستائی

کو ظرافت کے پیرائے میں اس خوبی سے نبھاتا ہے کہ وہ بدنما نہیں معلوم ہوتی۔

بہرحال یہ دیباچے اُس کے خیالات کی اشاعت اور اسکی شہرت کی حمایت کے لئے خواہ کتنے ضروری کیوں نہ ہوں لیکن خالص آرٹ کے نقطۂ نظر سے ضرور قابل اعتراض ہیں اس لئے کہ آرٹ کی دلکشی اور دلفریبی کا راز یہ ہے کہ وہ علم کی طرح زندگی کو بے جان اور بے رنگ معانی میں تحلیل نہیں کرتا بلکہ اسکی نیرنگیوں کی جیتی جاگتی تصویریں دکھاتا ہے۔ خصوصاً ڈراما کا تو کام ہی یہ ہے کہ ایک زندہ اور سالم مرقع مشاہدے کے سامنے پیش کرے۔ برنارڈ شا یہ غضب کرتا ہے کہ اپنے ناٹک میں ایسا مرقع بنا کر اسے دیباچے میں پھر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ اس کے اکثر ناٹکوں میں زندگی تازگی اور جرأت موجود ہے۔ اگر اُنکے دیباچے پڑھ کر انہیں پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ محض سرد اور خشک علمی مقالے ہیں۔

بات یہ ہے کہ برنارڈ شا جس طرح آرٹ کا کوئی علیحدہ اور مستقل مقصد تسلیم نہیں کرتا اسی طرح وہ اس کے مخصوص قوانین کا بھی قائل نہیں۔ وہ صرف اپنے ناٹک کے ساتھ دیباچہ لکھکر ان قوانین کو پامال نہیں کرتا بلکہ خود ناٹک کے انداز تحریر، قصے کی ترتیب، اشخاص کی سیرت نگاری میں بھی اصول فن کی طرف سے بے پروائی برتتا ہے۔ اسکا اسلوب بیان سادہ بے تکلف اور پرزور ہے جیسا علمی مسائل پر عام فہم رسالے لکھنے میں اختیار کیا جاتا ہے۔ وہ عموماً اپنی عبارت میں ادبی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا البتہ کہیں کہیں (جیسے کینڈیڈا میں نوجوان شاعر کی گفتگو، یا "جان بُل کا دوسرا جزیرہ" میں مجنون پادری کی تقریر) خطیبانہ بلند پروازی سے بھی کام لیتا ہے۔ لیکن ظرافت اور طنز کی چاشنی اس کے یہاں ایسی ہے کہ خواہ وہ کیسے ہی خشک مسئلے پر بحث کرے۔ اسے بے حد دلچسپ بنا دیتا ہے۔ سیرت نگاری اس کے ڈراما کا کمزور پہلو ہے۔ اس کے اشخاص عموماً کوئی اپنی علیحدہ شخصیت نہیں رکھتے بلکہ مختلف طبقوں اور مختلف پیشوں کے نمائندے ہوتے ہیں خصوصاً وہ جن کی زبان سے وہ اپنے خیالات ادا کرتا ہے کٹ پتلی بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے سارے ناٹکوں میں صرف دو اشخاص ایسے ہیں جن کی

خیالی تصویر میں جان ڈالنے میں وہ کامیاب ہوا ہے: سینٹ جون اور جولیس سیزر، اور یہ دونوں تاریخی شخصیتیں ہیں جنہیں اس نے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ اپنے ناٹکوں میں دلچسپ "مواقع" پیدا کرنے میں بھی وہ کوئی خاص اہتمام نہیں کرتا، لیکن ڈراما کی حقیقت کے خلقی احساس کی بدولت وہ محض گفتگو کی گرمی اور جوش سے ناٹک کے مناظر کو موثر بنا دیتا ہے۔ اس کا سارا کمال گفتگو کے زور شور اور طنز و ظرافت کی نوک جھونک میں ہے۔ خوش طبعی کی جن تین قسموں کا ہم ذکر کر چکے ہیں ان میں سے دل لگی کا تو برنارڈ شا کے یہاں کہیں نام ہی نہیں۔ البتہ ظرافت اور طنز سے اس کی تصانیف کا ہر صفحہ مالا مال ہے۔ بعض ناٹکوں مثلاً "واللہ اعلم بالصواب" اور شادی کی بات چیت" میں تو قصے اور واقعات کا جز و محض برائے نام ہے اول سے آخر تک سوائے ظریفانہ طنز آمیز مکالمے کے کچھ نہیں۔ لیکن ان مکالموں ہی میں اس نے یہ کمال دکھا دیا ہے کہ دونوں ناٹک پڑھنے میں دلچسپ ہیں اور اسٹیج پر بھی کامیاب۔

اسلوب بیان اور زور کلام کے اعتبار سے برنارڈ شا کے ابتدائی دور اور آخری دور کے ناٹکوں میں کچھ بڑا فرق نہیں ہے۔ وہ جوانی میں بڑھاپے کی پختہ کاری رکھتا تھا اور بڑھاپے میں جوانی کی تازگی اور جوش رکھتا ہے۔ البتہ خیالات کے اعتبار سے اسکی تصانیف کا رنگ بہت کچھ بدلتا رہا ہے۔ ہم اس کے نظریہ زندگی کی ارتقار کے تین دور قرار دے سکتے ہیں۔

(۱) تخریبی تنقید

(۲) تعمیری تنقید

(۳) ایک مستقل فلسفہ حیات کی تشکیل

تخریبی تنقید سب سے پہلے شا کے سات ناٹکوں کا سلسلہ "خوشگوار اور ناخوشگوار" کے نام سے شائع ہوا جو حسب ذیل تمثیلوں پر مشتمل تھا:۔

(۱) "اسلحہ اور انسان"

(۲) "تقدیر کا بندہ"

(۳) "کیسنڈیڈا"

(۴) "عشقباز"

(۵) "مسز وارن کا پیشہ"

(۶) "رنڈووں کا گھر"

(۷) "واللہ اعلم بالصواب"

یہ ہمارے ڈرامانگار کے شباب کا زمانہ تھا۔ سب مخلص نوجوانوں کی طرح وہ بھی اپنے سینے میں ایسا دل رکھتا تھا جو انسانی ہمدردی اور اصلاحی جوش سے معمور تھا۔ مروجہ رسوم و اخلاق کی خرابیاں اس کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ قدیم طرز معاشرت کی بنیادیں بالکل کھوکھلی ہوگئی ہیں اور جب تک اس عمارت کو گراکر اور اس کی بنیادوں کو بدل کر دوسری بنیادیں قائم نہ کیجائیں کسی جدید زندگی کا تعمیر کرنا ناممکن ہے۔ اسے قدیم سماج سے سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ کائنات اور زندگی کے مشاہدے میں اپنی آنکھوں سے کام نہیں لیتی بلکہ ہر چیز کو عینیت یا رومانیت کی عینک سے دیکھتی ہے۔ عینیت سے شا کی مراد ہے اخلاق و معاشرت کے ان اصولوں کو جو انسان کی ہدایت اور بہتری کے لئے بنائے جاتے ہیں مستقل مقاصد سمجھ لینا اور انسان کی راحت و مسرت یا اس کی زندگی کو ان اصنام خیالی پر قربان کر دینا۔ اور رومانیت اس کے نزدیک عقل کے بجائے جذبات کو عقیدے اور عمل کا معیار بنانے کا نام ہے۔

رومانیت کے روح رواں عشق و شجاعت کے جذبات ہیں۔ اس کا نصب العین زندگی یہ ہے کہ انسان محبت کو منزل مقصود اور ذلیل راہ سمجھے اور محبوب کی راہ میں جانبازی اور سرفروشی کے کارنامے دکھائے۔ شا اس نصب العین پر سختی سے نکتہ چینی کرتا ہے اور رومانیوں کے نزدیک عشق اور شجاعت کا جو مفہوم تھا اس کا مضحکہ اڑاتا ہے۔

"اسلحہ اور انسان" اور "تقدیر کا بندہ" ان دونوں ناٹکوں میں شا شجاعت کی حقیقت سے بحث کرتا ہے۔ رومانی نقطۂ نظر سے شجاعت اسے کہتے ہیں کہ انسان بڑے سے بڑے خطرے کی کوئی حقیقت نہ سمجھے اور ہر چہ بادا باد کہہ کر بے تامل اپنی جان ورطۂ ہلاکت میں ڈال دے۔
"اسلحہ اور انسان" میں ایک لڑکی کا قصہ ہے جس کی تربیت انہیں خیالات کی فضا میں ہوئی ہے۔ ایک بار جنگ کے زمانے میں اتفاقاً ایک سوئٹسانی سپاہی اس کے یہاں پناہ لیتا ہے۔ یہ آزمودہ کار جنگ آزما اُسے شجاعت کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کے خیال میں بے سمجھے بوجھے اپنی جان پر کھیل جانا حماقت ہے۔ اچھے سپاہی وہ ہیں جو بغیر اشد ضرورت کے خطرے کے پاس نہیں جاتے ہیں، جب جاتے ہیں تو اپنی بچانے کا پورا سامان کر لیتے ہیں۔
"تقدیر کا بندہ" میں اُس نے عہد جدید کے سب سے بڑے فوجی ہیرو (نپولین) کی تصویر کھینچی ہے اور اس عام خیال کی تردید کی ہے کہ نپولین غیر معمولی رعب اور دبدبے کا آدمی تھا اور بڑے سے بڑے خطرے کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ شا کا نپولین بہت سی باتوں کے لحاظ سے معمولی آدمی ہے، البتہ اُس میں ارادے کی پختگی، چالاکی، مردم شناسی، دوسروں سے زیادہ ہے۔
عشق کے جس تصور نے رومانیت کی آب و ہوا میں پرورش پائی تھی وہ یہ تھا کہ یہ ایک مبارک جذبہ ہے جو یکایک انسان کے سینے میں بھڑک اٹھتا ہے اور اس کے جسم و روح پر چھا جاتا ہے۔ سچے عشق میں یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ جادو بن کر معشوق کے دل کو تسخیر کر لیتا ہے۔ یہ جذبہ زندگی کے عام قوانین کے تحت میں نہیں آتا بلکہ اپنا جداگانہ قانون رکھتا ہے۔ اس کی بدولت انسان کی سعادت اور مسرت کی تکمیل ہوتی ہے اور اُسے اعلیٰ روحانی مدارج حاصل ہوتے ہیں۔ شا نے کینڈیڈا میں عشق کے اس تصور کو آماجگاہ بنایا ہے۔ عاشقوں کی بے چینی اور بے قراری کو وہ جوانی کی جذبات پرستی کا نتیجہ سمجھتا ہے جو انسان کی شان خودداری کے خلاف ہے۔ اس ناٹک میں ایک نوجوان شاعر کے عشق مضطرب کا مقابلہ ایک پختہ کار خاتون کی پرسکون دوستی سے کیا گیا ہے۔ وہ ایک پادری کی بیوی ہے اور اپنے شوہر سے محبت رکھتی

ہے باوجود اس کے شاعر کے جوش محبت سے وہ متاثر ہوتی ہے اور اس سے بہت مانوس ہوجاتی ہے، لیکن وہ جانتی ہے کہ اپنے عاشق سے جو رابطہ ہے وہ جذبات کے عارضی ہیجان پر مبنی ہے مگر اپنے شوہر سے جو تعلق ہے وہ مصالح زندگی کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ اس لئے وہ شاعر کے عرض نیاز کو خوش اسلوبی سے رد کر دیتی ہے۔

شا کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نقادوں کی تقید اور مصلحوں کی اصلاح پر بہت زور دیتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ نئے زمانے والے پرانے لوگوں کی جن کمزوریوں پر اعتراض کرتے ہیں، وہ ایک دوسری شکل میں خود ان میں موجود ہیں۔ مثلاً یہی عینیت اور رمانیت جو اس کے ہمعصروں کی نظر میں قابل مضحکہ ہیں۔ "عشقباز" میں اس نے "ابسن کلب" کا نقشہ پیش کیا ہے جس کے ارکان آزاد خیال اور ترقی پسند ہونے کے مدعی ہیں، مگر ان میں سے سن رسیدہ جماعت (جس کا نمائندہ کرنل کریون ہے) عملاً ان تعصبات میں مبتلا ہے۔ نوجوان ممبروں میں بھی جو لیا جذبات پرستی میں رومانی عہد کی عورتوں کو مات کرتی ہے۔ سب سے دلچسپ شخصیت، ایک نوجوان ڈاکٹر کی ہے جو کرنل کریوں کا معالج ہے۔ اسکا خیال ہے کہ کرنل کریون ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہے جسے سب سے پہلے اس نے معلوم کیا ہے۔ ڈاکٹر کو اپنی اس تحقیق پر بڑا ناز ہے، مگر اس کی اشاعت سے پہلے وہ مزید اطمینان کر لینا چاہتا ہے۔ بعض فیصلہ کن تجربوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اسکا خیال غلط تھا اور کرنل کریوں کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ بجائے اس کے کہ ڈاکٹر کو اپنے مریض کی سلامتی سے خوشی ہو اسے اپنے مرض کے ثابت نہ ہونے سے سخت صدمہ ہوتا ہے ادھر کریوں اس پر خفا ہے کہ ڈاکٹر کے اس خیالی خطرے کی بنا پر وہ عرصے تک گوشت اور شراب کے استعمال سے محروم رہا بلکہ انجمن مخالفین شراب نوشی کا صدر بھی بن گیا۔ یہاں برنارڈ شا کو جدید عین پرستی کی خبر لینا منظور ہے۔ اس کے خیال میں جس طرح پرانے خیال کے لوگ، مجرد مذہبی اور اخلاقی تصورات کی پرستش کرتے تھے اسی طرح نئے زمانے کے لوگ سائنس کی کرتے ہیں۔ اس زمانے کے پادریوں کو گنہگاروں کی نجات

سے زیادہ گناہ کی حقیقت سے دلچسپی تھی، اسی طرح آج کل ڈاکٹروں کو مریض کی صحت سے زیادہ مرض کی ماہیت سے ذوق ہے۔ جس طرح جیتے جاگتے انسانوں کو دینداری یا نیکی کے نام پر قربان کر دیتے تھے۔ اسی طرح یہ لوگ انہیں علمی تحقیقات کی دیوی پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

"مسز وارن کا پیشہ" اور "رنڈوؤں کا گھر" میں شا نے دو بڑی اخلاقی خرابیوں کی پردہ دری کی ہے۔ جنہوں نے موجودہ مغربی تمدن کی جڑوں میں گھن لگا دیا ہے، عصمت فروشی کا باقاعدہ کاروبار کی حیثیت سے فروغ پانا اور بے مایہ غریبوں کا سرمایہ داروں کے ہاتھ سے لوٹا جانا۔ ان دونوں ناٹکوں میں اُس نے یہ دکھایا ہے کہ ان خرابیوں کے ذمہ دار وہ خاص طبقے نہیں ہیں جو انہیں پیشے کے طور پر اختیار کرتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں جن میں سے ہزاروں کو اپنی اس آلودگی کی خبر بھی نہیں ہے۔ مثلاً مسز وارن نے یورپ کے بہت سے شہروں میں قحبہ خانے قائم کر رکھے ہیں، مگر ان میں ایسے ایسے لوگوں کا سرمایہ اور مشورہ شریک ہے جو سوسائٹی میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی اولاد کو یہ خبر نہیں کہ والدین کی آمدنی کس شرمناک کاروبار پر موقوف ہے، اسی ناپاک روپے سے تعلیم پاتی ہے۔ مسز وارن کی لڑکی کو جس نے نہایت اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت پائی ہے، جب اس کی خبر ہوتی ہے تو وہ گھر کی ناز و نعمت کو لات مار کر چلی جاتی ہے اور اپنی قوت بازو سے روزی پیدا کر کے عزت کی زندگی بسر کرتی ہے۔ مگر اتنی غیرت اور حمیت ہر شخص میں نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگ یہ جانتے ہیں کہ انکی آمدنی کا ذریعہ ناجائز ہے اور اس سے نفرت بھی رکھتے ہیں مگر ان میں اتنی ہمت نہیں کہ اس سے ہاتھ اٹھائیں اور حلال کی روٹی کما کر کھائیں۔

"رنڈوؤں کا گھر" میں ایک نوجوان کا قصہ ہے جو اپنی منسوبہ کے باپ پر یہ الزام لگاتا ہے کہ وہ ناجائز ذرائع سے روپیہ کما کر امیر ہو گیا ہے۔ وہ چند مکانوں کا مالک ہے جن میں غریب مزدور کرایہ پر رہتے ہیں، مکان اس قدر تنگ و تاریک، بوسیدہ اور گندے ہیں کہ رہنے والوں کو سخت تکلیف ہے اور انکی صحت برباد ہو رہی ہے۔ وہ ان کی کبھی مرمت نہیں کراتا مگر بیچارے غریبوں

سے کرایہ خوب دبا کر وصول کرتا ہے۔ نوجوان کے طعنوں کے جواب میں بڈھا یہ ثابت کرتا ہے کہ نوجوان کی آمدنی بھی ایسے ذرائع سے ہوتی ہے جو غریبوں کو لوٹنے پر موقوف ہے۔ نوجوان کو سخت ندامت ہوتی ہے مگر بجائے اس کے وہ اپنے دامن کی آلودگی کو دور کرے وہ دوسرے کی تردامنی سے چشم پوشی کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

ان سب ناٹکوں میں شا نے سماج کی ریاکاری کی جھاڑ کی ہے ریاکاری کو بڑا اخلاقی گناہ سمجھتا ہے اس لئے اس کی تضحیک قریب قریب اس کے ہر ناٹک میں موجود ہے۔

اس کے بعد شا کے تین ناٹک "پیوریٹن لوگوں کے لئے تین ناٹک" کے نام سے شائع ہوئے۔ ان سے شا کے تعمیری تنقید کا دور شروع ہوتا ہے۔ اب وہ مسلمہ عقائد اور مروجہ اخلاق پر نکتہ چینی کرنے پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے نظریۂ زندگی کی ایک جھلک بھی دکھاتا ہے۔ اس کے اصول اخلاق کا لب لباب یہ ہے کہ:۔ انسان بالطبع نیک ہے لیکن اس کے ماحول کی خرابیاں اس کی سیرت کو برباد کر دیتی ہیں، اس کی اصلاح وعظ و نصیحت سے نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ وہ رکاوٹیں دور کر دی جائیں جو اس کی فطرت کی آزاد نشو و نما میں حائل ہیں۔ نیکی وہی ہے جو انسان اپنی فطرت کے تقاضے سے کرتا ہے، نہ کہ کسی خارجی مقصد کے لئے۔

"شیطان کا مرید" میں ایک ایسے شخص کا قصہ ہے جو سماج کے نقطۂ نظر سے مجرم سمجھا جاتا ہے۔ وہ ایک عورت کو جس سے وہ واقف تک نہیں، ہلاکت سے بچانے کے لئے اپنی جان دیدیتا ہے۔ اُس کے پیش نظر عشق و محبت یا ہمدردی یا ایثار، غرض کوئی شعوری روحانی یا اخلاقی مقصد نہیں ہے بلکہ ایک مصیبت زدہ کو دیکھ کر اُسکا جی بے اختیار چاہتا ہے کہ اپنی جان دے کر اُسے بچائے اور وہ بے سوچے سمجھے یہ کر بھی گذرتا ہے۔

"کپتان براس باونڈ کا انتقام" میں شا نے انتقام کے جذبے کے رومانی طلسم کو دور کر کے اس کی بدنمائی اور مضرت دکھائی ہے۔ براس باونڈ اپنے ایک رشتہ دار جج کے خلاف جس نے اس کے خیال میں اس کی ماں کے ساتھ ظلم کیا تھا، انتقام کا جذبہ دل میں سلئے

ہوئے ڈاکو بن گیا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ ماں اپنی بدکرداری کے سبب سے اسی برتاؤ کی مستحق تھی۔ اتفاق سے وہ جج افریقہ کے صحرا میں براس باؤنڈ کے ہاتھ پڑ جاتا ہے۔ مگر اس کی بہن لیڈی سسلی کی ہمت دانشمندی اور سبکدستی کی بدولت اس کی جان بچتی ہے وہ بہ لطائف الحیل براس باؤنڈ کو روکتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ اسے سچے واقعات سے آگاہ کرتی ہے۔ اس کا طلسم انتقام ٹوٹ جاتا ہے، آنکھیں کھول کر زندگی کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھنے لگتا ہے۔

تیسرا ناٹک جولیس سیزر اس دور کا سب سے اہم ڈراما ہے اور شا کی بہترین تصانیف میں اس کا شمار ہے۔ جولیس سیزر کا کیریکٹر گویا شا کے آئیڈیل ہیرو کی تصویر ہے۔ اس میں ذہانت نکتہ سنجی، معاملہ فہمی ظرافت وغیرہ ذہنی خوبیوں کے علاوہ وہ اخلاقی صفات بھی موجود ہیں جو شا کے نزدیک ایک قائد اور فاتح کے لئے ضروری ہیں۔ اولوالعزمی، حوصلہ مندی، ہمت استقلال انہیں صفات کی بدولت وہ دلوں پر حکومت کرتا ہے۔ اس کے مزاج میں اس کے طرز زندگی میں اس کی گفتگو میں انتہائی سادگی ہے، تکلف یا بناوٹ کا نام تک نہیں۔ اس کے رعب وداب اور اس کے اثر ونفوذ کا راز محض اس کی شخصیت میں نہاں ہے وہ اپنی طبیعت پر پورا قابو رکھتا ہے اور عارضی جذبات کے جوش میں اپنے مستقل مقاصد کو نہیں بھولتا۔ وہ ضرورت کے وقت حکمت عملی اور دروغ مصلحت آمیز سے کام لیتا ہے لیکن بدعہدی یا بیوفائی کبھی نہیں کرتا۔ اپنوں اور غیروں کے بڑے سے بڑے قصور کو عفو کر دیتا ہے لیکن اس کی وجہ رحم و مروت نہیں بلکہ تدبر اور مصلحت اندیشی اپنے وفادار رفیقوں کی بڑی قدر کرتا ہے لیکن کسی سے اس کو اتنا تعلق خاطر نہیں جسے دوستی کہہ سکیں۔ اس کی زندگی مافوق الافراد مقاصد کے لئے وقف ہے۔ ذاتی محبت اور عداوت کی نہ وہ صلاحیت رکھتا ہے نہ فرصت۔

"میجر باربرا" اور "جان بل کا دوسرا جزیرہ" میں یہ تعمیری تنقید اور بھی صاف نظر آتی ہے "میجر باربرا" میں شا نے مذہبی احساس اور جذبۂ خدمت کی قدر و قیمت سے بحث کی ہے۔ باربرا ایک لکھ پتی انڈر شیفٹ کی بیٹی ہے جو دینداری اور انسانی ہمدردی کے

جوش میں مکتی فوج میں داخل ہوجاتی ہے۔ اسکا باپ بہت سے کارخانوں کا مالک ہے اور اپنے کاروبار کو جدید ترین طریقے پر نہایت خوش اسلوبی سے چلاتا ہے اس کے یہاں مردوں کو معقول اجرت ملتی ہے انکے لئے حفظان صحت تعلیم و تربیت، سیر و تفریح کا بہت معقول انتظام ہے۔

باربرا اپنے باپ کو غاصب، جابر، بے دین اور اُس کے روپئے کو ناپاک سمجھتی ہے۔ اسکا عقیدہ ہے کہ یہ دولت مند سرمایہ دار دنیا کو ہلاکت کی طرف لے جا رہے ہیں اور اس کی نجات صرف مکتی فوج کی تحریک ہو سکتی ہے۔ وہ اس تحریک میں نہایت خلوص اور سرگرمی سے کام کرتی ہے اور سچی ہمدردی، دلسوزی، پاک نفسی کی بدولت بہت سے بدنصیب لوگوں کی جو جرم و افلاس میں مبتلا ہیں بڑی حد تک اصلاح ہو جاتی ہے۔ لیکن اسکی جماعت کو مالی امداد کے لئے اس کے باپ کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے جس کے صدمے سے اسکا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ شا اس ڈرامے میں مذہبی تحریکوں کے خلوص کا اعتراف کرتا ہے لیکن اس کے خیال میں جدید زمانے میں دنیا کی نجات غریبوں کی بھولی بھالی دینداری اور ایثار سے نہیں ہو سکتی بلکہ فرض شناس امیروں کی تنظیم اور تدبیر سے۔

"جان بل کا دوسرا جزیرہ" میں بھی شا نے مغربی تمدن کے دور جدید کی روح کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شا نے ترقی پذیر انگلستان اور جمود میں مبتلا آئرستان کا مقابلہ کرکے یہ دکھایا ہے کہ جو قوم زمانے کو نہیں پہچانتی اور اس کے ساتھ نہیں چلتی وہ ہمیشہ مغلوب رہے گی۔ شا کے نزدیک آئرستان والے انگریزوں سے زیادہ گہرا تخیل رکھتے ہیں۔ ان سے زیادہ سمجھدار اور ذہین ہیں لیکن زمانے کی رفتار سے ناآشنا ہیں، اس لئے میدان عمل میں دست پاچہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ انگریز ان سے ذہنی اوصاف میں کم ہیں لیکن انہوں نے اپنے زمانے کی روح کو جذب کر لیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ انکی یہ کم نظری اور کم فہمی انکے حق میں نعمت ہے کیونکہ اسی کی بدولت وہ بغیر کسی خاص کوشش کے اور بغیر محسوس کئے ہوئے روح زمانہ کے آلۂ کار بن گئے ہیں۔ زمانے کا رجحان افادیت، صنعت و حرفت، شہری

زندگی، مشترکہ کاروبار کی طرف ہے۔ آرستانیوں کو ابھی تک ان چیزوں سے مناسبت نہیں پیدا ہوئی، انگریز مدتوں پہلے اپنی طبیعت کو انکے مطابق بنا چکے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ آرستان پر حاوی ہیں۔

مستقل فلسفہ حیات کی تشکیل

اب تک برنارڈ شا کے پیش نظر کوئی مکمل اور مربوط نظریۂ زندگی نہیں تھا اسے کوئی چیز ایسی نہیں ملی جسے وہ زندگی کی بنیاد اور اس کی کنجی قرار دے سکے مگر اس کا عقیدہ تھا کہ زمانہ ترقی کر رہا ہے۔ ہر دور پچھلے دور سے بہتر ہے جس کی بڑی علامت یہ ہے کہ زندگی سے جذبات و تخیلات کا اثر کم ہوتا جاتا ہے اور عقل کا عنصر بڑھتا جاتا ہے۔ اصنام خیالی کی پرستش چھوڑنے سے انسان کی قوت مشاہدہ آزادی سے نشو و نما پا رہی ہے اس کی آنکھوں سے حجابات اُٹھ رہے ہیں اور وہ زندگی کی حقیقت کو دیکھنے اور سمجھنے لگا ہے لیکن جب اُس نے یونانی ادب اور فلسفہ خصوصًا افلاطوں کی تصانیف کا مطالعہ کیا تو اُسے معلوم ہوا کہ دنیا میں ڈھائی ہزار برس پہلے ایک قوم موجود تھی جو خیال آزادی اور نظر کی گہرائی اور وسعت میں آج کل لوگوں سے پیچھے نہ تھی اس سے وہ یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوا کہ ذہنی اور روحانی اعتبار سے دنیا نے کچھ زیادہ ترقی نہیں کی ہے لیکن اس کے اس عقیدے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی کہ انسانی زندگی میں ترقی کی صلاحیت اور قوت موجود ہے۔ اس قوت کے فعل میں نہ آنے کا سبب اس نے یہ قرار دیا کہ انسان ابتک زندگی کی حقیقت کو نہیں سمجھا ہے اور عمل ارتقا میں مدد دینے کے بجائے اس میں رکاوٹیں ڈال رہا ہے۔ اسکا تصور کائنات ایک حد تک شوپن ہاویر کے فلسفے سے ماخوذ ہے۔

شوپن ہاویر کے نزدیک ہماری زندگی اور ہماری دنیا کی اصل "ارادہ للحیات ہے" یہ ایک رندہی قوت ہے جس نے اپنے اظہار کے لئے یہ بے معنی گورکھ دھندا بنا رکھا۔ انسان کی

نجات اس میں ہے کہ زندگی کو مٹا کر اس جابر قوت کے پنجے سے چھوٹ جائے۔ شا نے اس عالمگیر قوت کا نام قوت حیات رکھا ہے۔ اس کے خیال میں بھی یہ قوت شعور اور احساس سے خالی ہے مگر اندھی نہیں ہے کیونکہ اس کا رُخ ایک اعلیٰ مقصد کی طرف ہے۔ وہ مقصد یہ ہے کہ دنیا میں ایک ایسی نسل پیدا کرے جو نسل انسانی سے بہتر اور برتر ہو۔ یہی نیٹشے کا مافوق البشر کا نصب العین ہے۔ شا کے نزدیک یہ قوت عورت میں ظاہر ہوتی ہے وہ اپنے لئے ایسا مرد ڈھونڈتی ہے جو اس سے جسمانی اور روحانی مناسبت رکھتا ہو۔ یہ انتخاب بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی پر آئندہ نسل کی صورت اور سیرت کا انحصار ہے۔

"بشر اور مافوق البشر" میں شا نے ٹینر اور این کا قصہ سنا کر اس نظریے کی تشریح کی ہے۔ یہ اس کا سب سے مشہور ڈرامہ اور بعض لوگوں کے نزدیک اس نے اس میں اپنا سارا کمال صرف کر دیا ہے۔

اپنے فلسفۂ حیات کے بنیادی اصول کو معین کرنے کے بعد شا نے اس کے ماتحت زندگی کے جزوی مسائل پر غور کرنا شروع کیا۔ اس کے اخلاقی نظریے میں بہت بڑی تبدیلی ہوگئی۔ پہلے وہ اخلاق کا مقصد اور معیار فرد کی شخصی فلاح کو قرار دیتا تھا مگر ایک مافوق الافراد قوت کا قائل ہوجانے کے بعد وہ ان مسائل کو بہت وسیع زاویۂ نظر سے دیکھنے لگا۔ "شادی کی بات چیت" میں جو محض نام کے لئے ڈراما ور نہ اصل میں ایک مکالمہ ہے اس نے شادی کے مسئلہ پر بحث کی ہے۔ نکاح کے مروجہ طریقے کی مخالفت اور موافقت میں بہت سی دلیلیں پیش کیجاتی ہیں۔ عورت اور مرد کے تعلق کی متعدد صورتیں ہیں مگر کوئی بھی وسیع اجتماعی نقطہ نظر سے قابل قبول نہیں ٹھہرتی۔ آخر فیصلہ ہوتا ہے کہ پرانے طریقے میں تبدیلی کرنا سہل نہیں ہے "ڈاکٹروں کی حیرانی" کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شا اس دور میں اپنے اخلاقی اصول میں افلاطون کی طرح بہت سخت گیر ہوگیا ہے۔ وہ سماج کی مجموعی فلاح کے لئے افراد کی زندگی قربان کرنے کو تیار ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک بدچلن اور بدخصال آرٹسٹ جو اپنے

فن میں کمال رکھتا ہے ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہے اس کے جاں بر ہونے کی صرف یہ صورت ہے کہ ڈاکٹر غیر معمولی توجہ اور اہتمام سے علاج کریں لیکن ڈاکٹروں میں اس معاملے میں اختلاف رائے ہے۔ بعض کے نزدیک مریض کو اچھا کرنے کی انتہائی کوشش کرنا چاہئے کیونکہ اس کے کمال فن سے سماج کو فائدہ پہنچے گا۔ بعض کے نزدیک اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ اسکی زندگی اخلاقی حیثیت سے دوسروں کیلئے مضر ہوگی۔ دونوں فریق فرد کی زندگی کی قدر و قیمت محض سماج کی نسبت سے معین کرتے ہیں اور دونوں اسپر متفق ہیں کہ طبیب کا کام محض مریض کا علاج کرنا نہیں ہے، بلکہ اس علاج کے اخلاقی نتائج کا بھی وہ ذمہ دار ہے۔ ان دونو چیزوں میں افلاطون کا اثر صاف ظاہر ہے۔

"بشر اور مافوق البشر" میں شا نے "مافوق البشر" کا جو تصور قائم کیا تھا اسکا پورا خاکہ اس نے "رجوع بہ میتھوسلا" میں کھینچا ہے۔ مافوق البشر کا تدریجی ارتقا اس طرح ہوتا ہے کہ قوت حیات بعض لوگوں کو منتخب کرکے ان کی عمر بڑھا دیتی ہے۔ پہلے لوگوں کی عمر تین سو سال کی ہوتی ہے پھر رفتہ رفتہ ہزاروں سال تک نوبت پہنچتی ہے۔ انکا علم اور تجربہ بڑھتا جاتا ہے۔ ان کی عقل اور تدبیر میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ ان پر کائنات کے بھید جن کے سمجھنے سے ہماری عقل عاجز ہے کھل جاتے ہیں انکے ہاتھوں سے زندگی کی گتھیاں جن کا سلجھانا ہمارے نزدیک ناممکن ہے سلجھتی جاتی ہیں۔

اس دور کا آخری ڈراما سینٹ جون ہے اس میں شا نے مذہبیت کے جذبے اور الہام کی حقیقت سے بحث کی ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ بچپن ہی میں نہ صرف مذہب عیسوی کا بلکہ مطلق مذہب کا مخالف ہوگیا تھا۔ اس میں کچھ تو اس کے ذاتی تلخ تجربات کو دخل تھا کچھ زمانے کی ہوا کو۔ صنعتی انقلاب سے تمدنی زندگی میں اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دلوں میں بہت انتشار پیدا ہوگیا تھا۔ ان میں اضطراب، بےچینی، غرور اور شک کا مادہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ ظاہر ہے ایسی آب ہوا میں فلسفہ اور مذہب دونوں کا پنپنا بہت مشکل تھا۔

برنارڈ شا ان لوگوں میں سے ہے جو خیالات کے دریا میں دھارے کے ساتھ بہنے پر

قناعت نہیں کرتے بلکہ تیر کر کنارے پر جانا چاہتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شک اور نفی میں الجھنے کے بعد اس نے زندگی اور کائنات کے بنیادی مسائل کا ایک عقلی حل تلاش کر لیا۔ لیکن اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ محض عقل کی الجھن دور ہونے سے کام نہیں چلتا۔ انسان کی فطرت جس چیز کے لئے سب سے زیادہ تڑپتی ہے وہ یہ ہے کہ حقیقت کائنات سے روحانی اتحاد کا رشتہ قائم کرے اور اپنی زندگی کو اس کے منشا کا پابند بنا دے۔ اس معاملے میں اسے عقل سے کوئی مدد نہیں ملتی کیونکہ وہ تو کائنات کا محض ایک بیجان معنوی تصور قائم کرتی ہے جس سے انسان کو کسی گہرے روحانی اتحاد کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ جس کے قوانین کی پابندی پر کوئی اندرونی تحریک اسے نہیں ابھارتی۔ یہاں اس کی ضرورت ہے کہ انسان باطنی مشاہدے اور وجدان سے کام لے کر حیات و کائنات کا صرف علم نہیں بلکہ عرفان حاصل کرے۔ یعنی اس میں اس طرح ڈوب جائے کہ اسے سرچشمۂ حقیقت سے یگانگی کا احساس ہونے لگے اور اس کے قوانین خود اپنی فطرت کے قوانین معلوم ہونے لگیں۔ یہ انسان کی ذہنی نشو و نما کی آخری سیڑھی ہے اور اسی کو مذہبیت کہتے ہیں۔ یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ انسان کے خیال اور عمل اس کے ارادے اور جذبات میں ہم آہنگی ہو یعنی اس کی سیرت میں وحدت پیدا ہو چکی ہو۔ جب برنارڈ شا تہذیب نفس کی اس منزل سے گذر چکا تو وہ خود بخود مذہبیت کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ نوعمری کی خاکساری میں اس نے مذہب کو بے حقیقت سمجھ کر رد کر دیا تھا زندگی کے گہرے مشاہدے کے بعد سب سے برتر حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا۔ سینٹ جون میں اسی کا اعتراف ہے

لیکن مذہب کے متعلق دو نقطۂ نظر ہو سکتے ہیں جو بظاہر بالکل متضاد ہیں ایک کی رو سے حقیقت اور قدرت کا سرچشمہ جسے خدا کہتے ہیں، زمان و مکان کی سرحد سے باہر ہے۔ انسان خود اپنی مخصوص کوشش سے اسکا عرفان حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کی طرف سے بعض مخصوص بندوں پر وحی آتی ہے اور بعض کو الہام ہوتا ہے جس سے انسانوں پر حیات و کائنات کے آخری بھید کھلتے ہیں انہیں ان کی زندگی کا مقصد اور اس کے حاصل کرنے کے ذرائع بتائے جاتے ہیں۔ دوسرے کی رو سے خدا اسی زمان و مکان میں موجود ہے اور انسان باطنی مشاہدے

اور وجدان کی بدولت بغیر کسی خارجی تحریک کے اس کی اور اسکے قوانین کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ پہلے کو لاہوتی مذہب کہتے ہیں دوسرے کو ناسوتی۔ برنارڈ شا زمانۂ حال کے اکثر پروٹسٹنٹ لوگوں کی طرح اسی ناسوتی مذہب کا قائل ہے اسی نقطہ سے اُس نے جون کی مذہبیت کا مطالعہ کیا ہے جون کو جو ندائیں سنائی دیتی تھیں وہ خدا کا پیغام سمجھتی ہے جو اسے اولیاء اللہ کی زبانی پہنچتا ہے۔ برنارڈ شا کے نزدیک یہ ندائیں خود جون کے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ ایک جاہل دیہاتی بھولی بھالی لڑکی ہے مگر اس میں غیر معمولی روحانی قوت ہے وہ روح کائنات کا بلاواسطہ مشاہدہ کرتی ہے لیکن چونکہ اس نے قدیم مذہبی روایات کی فضا میں پرورش پائی ہے، اس کے دل میں اولیاء اللہ اور انکی کرامتوں کا خیال بسا ہوا ہے اور وہ اپنی واردات قلب کو ولیوں کی طرف منسوب کرتی ہے۔ وہ مذہب کے ایک نئے تخیل کی علم بردار ہے جو تیرہویں صدی میں پیدا ہو چلا تھا اور جس سے رومی کلیسا کو سخت خطرہ تھا۔ کیتھولک مذہب کی رو سے کلیسا خلافت الٰہی کا وارث اور دینی اور دنیاوی حکومت کا حامل تھا۔ بندہ بلاواسطہ خدا تک نہیں پہنچ سکتا اسے چاہئے کہ کلیسا کے آگے سر تسلیم خم کرے۔ اس کی اطاعت کو خدا کی اطاعت اور اس کے احکام کو قانون الٰہی سمجھے۔ جون اس اصول کی منکر ہے۔ اسکا یہ دعوٰی کہ اس کے پاس خدا کا پیام اولیاء کی زبانی آتا ہے یہ معنی رکھتا ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان کلیسا کے واسطے کی ضرورت نہیں۔ یہ کلیسا کی دینی حکومت سے بغاوت ہے۔ پھر اسکا یہ کہنا کہ خدا نے اسے انگریزوں کو فرانس سے نکال دینے پر مامور کیا ہے کیونکہ اس کی یہ مرضی نہیں کہ کسی ملک پر غیر ملک کے لوگ حکومت کریں کلیسا کے لئے ایک اور خطرہ کا پیش خیمہ ہے کیونکہ اس میں قومیت کا خیال مضمر ہے یعنی یہ کہ ہر ملک کے رہنے والے ایک روحانی اتحاد رکھتے اور ان کا حاکم صرف ان کا ہم قوم ہو سکتا ہے۔ یہ کلیسا کی دنیاوی حکومت کے خلاف بغاوت ہے۔ جون کو خود اسکا احساس نہیں مگر کلیسا والے اسے خوب سمجھتے ہیں۔ انہیں کی کوششوں سے وہ جادوگری کے الزام میں انگریزوں کے ہاتھ گرفتار ہو کر اسی الزام میں جلا دی جاتی

ہے۔

غرض برنارڈ شا کے نزدیک جون لوتھر کی پیشرو اور پروٹسٹنٹ مذہب کی ہراول ہے۔
اس کا فیصلہ کہ اس نے جون کی جو تصویر پیش کی ہے وہ صحیح ہے یا ان لوگوں کا کام ہے جنہیں
پندرہویں صدی کی تاریخ پر پورا عبور ہو مگر اس میں شبہ نہیں کہ برنارڈ شا نے کیتھولک اور
پروٹسٹنٹ مذہبوں کی بنیادی فرق کو اور اس انقلاب کو جو تیرہویں صدی میں رونما ہو رہا تھا۔
خوب دکھایا ہے۔ اس نے دونوں میں سے کسی ایک کو صاف الفاظ میں دوسرے پر ترجیح
نہیں دی ہے۔ اس کے انداز تحریر سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود پروٹسٹنٹ مذہب
کا پیرو ہے اور اسے روحانی ارتقار کا بلند تر زینہ سمجھتا ہے۔ البتہ اسکا عقیدہ عام پروٹسٹنٹ
عقیدے سے اس بارے میں مختلف ہے کہ وہ خدا کو دنیا کے باہر نہیں بلکہ دنیا کے اندر
مانتا ہے۔

شا نے اس ناٹک میں قرون وسطیٰ اور عہد جدید کے عام تمدن کا بھی مقابلہ کیا ہے۔
کسی زمانے میں وہ اسکا قائل تھا کہ ہر نیا دور، تمدن کو ترقی کے بلند تر زینے پر پہنچا دیتا ہے
لیکن اب اس کے خیالات میں اتنا انقلاب ہو گیا ہے کہ وہ قرون وسطیٰ کو ایک حد تک عہد جدید
پر ترجیح دیتا ہے۔ خصوصاً اس اعتبار سے کہ اس زمانے میں زندگی کا ایک مکمل اور مرتب
نظام موجود تھا جو آج کل مفقود ہے۔ عہد جدید کی بنیاد اس کے خیال میں قرون وسطیٰ کی بنیاد
سے زیادہ وسیع اور مضبوط ہے لیکن اس بنیاد پر جو عمارت بن رہی ہے وہ ابھی تک ناقص
اور ناتمام ہے۔

برنارڈ شا کی عمر اب ۷۰ برس کی ہو چکی ہے، اس کی شہرت عالمگیر ہے۔ اس کی تصانیف
مقبول عام ہیں۔ جس سیاسی اور سماجی تحریک کا وہ علمبردار تھا آج انگلستان میں گرم بازاری
ہے جس جماعت کا وہ رفیق تھا وہ آج برسر حکومت ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو عمر بھر کی ناکامیوں

کے بعد اس کامیابی کو غنیمت سمجھتا۔ نصف صدی کی محنت شاقہ کے بعد آرام کا لطف اٹھاتا۔ لیکن برنارڈ شا کو سکون و اطمینان سے کیا غرض۔ آرام سے واسطہ۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے ہم خیالوں کو جتنی کامیابی ہوئی ہے وہ محض ابتدائی ہے۔ زندگی کی بڑی گتھیاں ابھی سب سلجھنے کو باقی ہیں۔ وہ بدستور سرگرمی سے اپنے کام میں مشغول ہے یعنی زندگی کو طنز و ظرافت کی مہمیز سے چھیڑ رہا ہے اور تنقید کی باگیں ہاتھ میں لئے اسے ترقی کی سیدھی راہ پر چلانے کی کوشش کر رہا ہے۔

مذہب اشتراک کے بانی

رسالہ' جامعہ' کی کسی پچھلی اشاعت میں ہم نے اس جماعتی ماحول پر نظر ڈالی تھی جس میں مذہب اشتراک نے نشو و نما پائی اور ان تخیلات و نظریات کی طرف اشارہ کیا تھا جن سے اسے ذہنی غذا حاصل ہوئی۔ یہ ماحول نہ ہوتا اور یہ نظریے نہ ہوتے تو غالباً مذہب اشتراک بھی پیدا نہ ہوتا۔ لیکن یہ ممکن تھا کہ ان نظریوں کا اثر اور اس ماحول کا ردعمل اشتراک کے علاوہ کسی اور شکل میں رونما ہوتا۔ اس نے جو اشتراکیت ہی کی شکل اختیار کی اس کی وجہ وہ شخصیتیں ہیں اور ان شخصیتوں کی نفسی کیفیات جو اس ذہنی و جماعتی ماحول سے متاثر ہوئیں، یعنی بانیان مذہب اشتراک کی شخصیتیں۔

نتائج تاریخی کے لئے ماحول اور شخصیت کی اعتباری اہمیت کا مسئلہ بہت پیچیدہ اور مختلف فیہ ہے۔ کچھ لوگ تاریخ کو تمام تر حالات گرد و پیش کا میکانکی نتیجہ تصور کرتے ہیں، کچھ اسے بالکل بڑی شخصیتوں کی کارگذاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ فلسفہ تاریخ کے اس دشوار مسئلہ کے متعلق بحث کرنا یہاں مقصود نہیں۔ صرف اس لئے اس طرف اشارہ کیا گیا کہ ہماری رائے میں مذہب اشتراک کے فہم کے لئے اس کے بانیوں کی نفسی کیفیت سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ محض ماحول جماعتی و ذہنی کی تشریح اس کے لئے کافی نہیں ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اشتراکیت جدید کی ذہنیت در اصل مارکس کی ذہنیت ہے۔ اس لئے اگر مارکس کی ذہنی و نفسی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو اس مذہب کی بہت سی خصوصیات کے سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ لیکن مذہب اشتراک کے مورخ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ مارکس اور اس کے رفیق انگلس کے خیالات کا اہم ترین حصہ خود ان کی اختراع نہیں بلکہ ان سے پہلے اشتراکی مصنفوں کی تحریروں میں تقریباً وہ سب اصول ملتے ہیں جو عام طور پر مارکس اور انگلس کے ساتھ مخصوص کئے جانے لگے ہیں۔ اشتراکیت کے فہم کے لئے ان اگلوں کی کیفیت نفسی کو بھی

پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

اس گروہ اولین میں وہ انگریز، فرانسیسی، اور جرمن اشتراکی ہیں جنہوں نے ۱۷۵۵ء اور ۱۸۴۸ء کے درمیان اپنی تصانیف مرتب کیں۔ ۱۸۴۸ء میں اشتراکیت کے ارتقار ذہنی میں گویا تخم ریزی کا زمانہ ختم ہوجاتا ہے۔ اس سال کے بعد سے آج تک اس مذہب میں کسی اہم بنیادی خیال کا اضافہ نہیں ہوا۔ اس ابتدائی زمانہ کے لوگوں میں مندرجہ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۔ فرانسیسی موریلی نے ۱۷۵۵ء میں اپنی اصولی کتاب "آئین فطرت" لکھی۔

۲۔ انگریز گاڈون نے ۱۷۹۳ء میں "عدل سیاسی" کے نام سے ایک معرکۃ الآرا کتاب شائع کی۔

۳۔ فرانسیسی چارلس فوریے نے "نظریہ حرکات اربعہ" ۱۸۰۸ء میں شائع کی۔

۴۔ رابرٹ اوون (انگریز) نے ۱۸۱۲ء میں "جماعت کا نیا نظریہ" پیش کیا۔ اور ۱۸۲۰ء میں "نئے عالم اخلاقی" پر ایک کتاب لکھی۔

۵۔ فرانسیسی سین سیموں نے ۱۸۲۱ء میں نئی صنعتی دنیا" کے نام سے اپنی کتاب چھاپی۔

۶۔ ۱۸۲۴ء میں انگریز ولیم ٹامسن نے "تقسیم دولت" کے اصول پر بحث کی۔ اس کے بعد فرانس میں اس قسم کے مضامین اور کتابیں بھی نکلتی رہیں۔

۱۸۴۸ء کے بعد جن مصنفوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے ان کی تحریریں زیادہ واضح لیکن ذرا زیادہ تلخ و درشت بھی ہیں۔ ان میں خاص طور پر مستحق توجہ یہ ہیں۔

۱۔ لوئی بلاں جس نے ۱۸۴۰ء میں "تنظیم محنت" کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔

۲۔ پرودھاں نے "ملکیت" کے مسئلہ پر بحث کی اور اسے سرقہ سے تعبیر کیا۔

۳۔ وائٹ لنگ نے "حریت اور ہم آہنگی کی ضمانتوں" کے نام سے جرمن میں اپنی کتاب شائع کی

انکے علاوہ موسئی ہس، دیسامی، کابے، لیرو وغیرہم نے بھی کتابیں لکھیں۔ انہیں لوگوں

کے کام پر مارکس اور انگلس کے ابتدائی تصانیف مبنی ہیں۔ چند تنقیدی کتابوں کے بعد ان دونوں نے وہ "اعلان اشتراک" لکھا جس پر کل مذہب اشتراک جدید کی بنیاد ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ مارکس اور انگلس کا بعد کا تصنیفی کام خود اسی اعلان کی تفسیر و توضیح پر مشتمل ہے۔ اور اس کے بعد سے انہیں دو آدمیوں کی ذہنیت اس مذہب سے متعلق ہر تحریک میں کارفرما ہے۔ انہیں کے تابعین میں ولیم لیب کنشٹ، بیکر و تسیگن وغیرہ ہیں۔ تبع تابعین میں کاوٹسکی، ببیل، پلیخانو بانڈمین، وغیرہم اور متاخرین میں کچھ تو اپنے پیغمبر کی اصلی تعلیم میں ترمیم کے طالب ہیں یعنی برن شٹائن، کونو، فانڈر ولڈ، کول، ہابسن، آڈلر وغیرہ، کچھ تعلیم قدیم کو قائم رکھنے پر مصر ہیں جیسے روزا لکسمبرگ، کارل لیب کنشٹ، لینن، ٹرڈسکی، راوک، بخارین۔

ناموں کی یہ فہرست خاصی طویل ہوگئی۔ اور پھر بھی اس میں بہت سے نام نہیں آتے اب اس مضمون کا جو مقصد ہے یعنی بانیان مذہب اشتراک کی کیفیات ذہنی کا ایک مختصر خاکہ ناظرین کے سامنے رکھنا، اگر وہ اسی طرح پورا ہوسکتا ہے کہ ان سب اشخاص کے حالات ذہنی کو علیحدہ علیحدہ۔ مختصر طور پر ہی سہی پیش کیا جائے تو اس کے لئے تو ایک خاصی ضخیم کتاب درکار ہوگی۔ اور اگر کہیں ان سب کے سوانح حیات پر تفصیلی گفتگو کی نوبت آئے تو تو ایک سلسلہ کتب کی ضرورت ہے۔ اس وقت اس پر نہ راقم آمادہ ہے، نہ ناظرین راضی ہوں گے۔

اس دشواری سے نکلنے کی کیا کوئی راہ نہیں؟ غالباً ہے۔ اور وہ یہ کہ کسی شخصیت کو قابل فہم بنانے کے لئے سوانح نگاری اور ترجمہ کے علاوہ ایک اور طریقہ بھی ہے یعنی وہ شخصیت جس گروہ سے تعلق رکھتی ہو اس گروہ کی ذہنی کیفیات کو سمجھا جائے۔ اس کے مشترک نفسی حالات پر نظر ڈالی جائے اور اس سے افراد کے سمجھنے میں مدد لی جائے۔

اس طریقہ پر کاربند ہوکر ہم بھی بانیان مذہب اشتراک کی ذہنی کیفیات کو سمجھنے کے لئے ترجمہ اور سوانح نگاری کی راہ چھوڑ کر یہ صورت اختیار کرتے ہیں کہ نظریین مذہب کو دماغی لوگوں کو

اس وقت نظرانداز کرتے ہیں) ایک گروہ تسلیم کرکے انکی مشترک ذہنی کیفیات کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہوا تو شاید اس چھوٹے سے مضمون میں ان بہت سے لوگوں کے متعلق جن میں سے بعض کے نام اوپر گذر چکے ہیں کچھ نفسیاتی بصیرت حاصل ہو سکے۔ یہ عام نفسیاتی تبصرہ بڑی حد تک اپنے اُستاد پروفیسر زومبارٹ المانی کی معرکۃ الآرا کتاب "پرولتاری اشتراک" اور اسی موضوع پر انکے چند امالی پر مبنی ہے۔

اگر ہم انسانوں کو دو قسموں پر تقسیم کریں تو ان میں ایک گروہ تو انکا ہوگا جنہیں ہم قدرتی آدمی کہہ سکتے ہیں، دوسرا انکا جنہیں مصنوعی آدمی کہنا چاہئے۔ قدرتی آدمی وہ جن کا تعلق فطرت سے عضوی ہوتا ہے، مصنوعی وہ جن کا رشتہ اس سے میکانکی ہوتا ہے۔ وہ جبلت اور جذبات والے آدمی ہوتے ہیں، یہ عقل اور ادراک والے، وہ دنیا میں رہتے ہیں، یہ دنیا کے خلاف، وہ اپنے ماحول میں گھل مل جاتے ہیں۔ ان میں ہر دم اس سے کچھ تناؤ سا رہتا ہے، وہ ہر حال میں مگن رہتے ہیں، اور یہ ہر وقت ذہنی کشاکش کا شکار، وہ اپنے پیروں سے چلتے ہیں اور یہ سر کے بل، کائنات سے انکا تعلق قریب کا ہوتا ہے، انکا بعد کا، اُنہیں ہر جگہ ہر طرف حل ملتے ہیں، انہیں نرے مسئلے، وہ ہم آہنگ ہوتے ہیں، یہ بے آہنگ، وہ افراد سے تعلق رکھتے ہیں یہ جنس سے، اُنہیں انسانوں کی فکر ہوتی ہے، انہیں انسانیت کی، وہ عملی ہوتے ہیں یہ نظری۔ وہ بڑی بڑی چیزوں میں سمجھوتے کر لیتے ہیں، یہ ذرا ذرا سے اصولوں پر لڑ مرتے ہیں۔ وہ سیاسی ہوتے ہیں، یہ غیر سیاسی۔

عجیب بات یہ ہے کہ رابرٹ اووِن اور انگلس کے علاوہ، کہ پہلا اپنے انسان دوستی کے کاروباری تجربوں کے سلسلے میں اس گروہ میں آن ملا اور دوسرا محض مارکس کی دوستی کی وجہ سے، باقی سب کے سب بانیان اشتراکِ جدید انسانوں کے اسی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے، یعنی سب کے سب مصنوعی انسان تھے۔

لیکن اس تقسیم سے بانیان اشتراک کی شخصیتوں کی پوری پوری تشریح نہیں ہوتی۔ مصنوعی انسانوں کی بھی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض کا رجحان طبع انفرادی ہوتا ہے، بعض کا اجتماعی کسی تصور کی اتباع میں حقیقت سے دونوں بیزار ہوتے ہیں لیکن ایک کی بیزاری اسے حقیقت سے الگ کر کے خود اپنی انفرادی شخصیت میں پناہ لینے پر مجبور کرتی ہے۔ دوسرے کی بیزاری اس سے دوچار ہونے اور اس میں تغیر پیدا کرنے کی محرک ہوتی ہے۔ ایک کے نزدیک زندگی کی قدروں میں شخصی قدریں افضل ہوتی ہیں، دوسرے کی نظر میں جماعتی قدریں۔ ایک دنیا سے بچتا اور اس سے بھاگتا ہے، دوسرا اپنا دامن اس سے چھڑا سکتا ہے نہ چھڑانا چاہتا ہے۔ ایک فلسفیانہ تخیلات اور مذہبی واردات کی پرامن و سکون فضا میں محو فکر رہتا ہے، دوسرا ماحول سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار انقلابی سرگشتگی اور پریشانی سے کرتا ہے۔ یہ جماعتی رجحان والا آدمی اگر مصنوعی انسان بھی ہو تو پھر یہ جماعت کی کسی مخصوص برائی سے کر اس کی اصلاح کی کوشش نہیں کرتا بلکہ بہ حیثیت عام 'ظلم' اور 'ناانصافی' سے برسرپیکار ہوتا ہے۔ اور اپنے اس جذبے میں ایسا گم ہو جاتا ہے کہ سوائے جماعتی نظام کو بنیادی طور پر بدلنے کی کوشش کے کوئی دوسری چیز اسے مطمئن نہیں کر سکتی۔ بانیان اشتراک سب کے سب مصنوعی انسان ہونے کے ساتھ ساتھ یہ اجتماعی رجحان بھی رکھتے تھے۔

'مصنوعی' اور 'اجتماعی' میلانات کے علاوہ ان بانیان اشتراک میں ایک اور چیز بھی مشترک تھی جس نے ان سب کو موجودہ نظام جماعت کی ہر چیز اس کے ہر ادارے سے بیزار کر دیا تھا اور ان میں وہ منفی انکاری کیفیت پیدا کر دی تھی جو ان سب کی امتیازی خصوصیت ہے۔ وہ چیز کیا تھی؟ ایک سی قسمت، ایک سی تقدیر! کیا یہ ممکن ہے؟ بانیان اشتراک کے ناموں کی فہرست پر نظر ڈالئے تو یہ بات ناممکن سی معلوم ہوتی ہے۔ ان میں مختلف حیثیت کے لوگ ہیں، ان میں اگر رئیس زادے ہیں جیسے سین سیموں اور باکونین تو متوسط الحال بھی

ہیں، جیسے ہس، لاسال، کابے، لوی بلاں، وائٹلنگ جیسے دستکار ہیں تو لیرو اور پرودھاں جیسے مفلس و نادار بھی! انکا ماحول، انکی زندگی ایسی مختلف، اور سب کی ایک سی قسمت، ایک سی تقدیر! بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے مگر واقعہ یوں ہی ہے۔ یہ سب کے سب ایک نہایت اہم حیثیت میں ایک سے ہیں اور وہ یہ کہ تمام کے تمام اپنی زندگیوں میں ناکام و نامراد انسان ہیں۔

ان میں سے بعض تو پیدائش ہی سے کچھ ذات باہر سے تھے۔ مثلاً غریب وائٹلنگ کہ ماں باپ میں باضابطہ رشتہ مناکحت نہ ہونے کے باعث اپنے ہم چشموں میں ذلیل و خوار تھا۔ یا ہس، مارکس لاسال یہودی ہونے کی وجہ سے کبھی اپنے جماعتی ماحول کے ساتھ شیر و شکر نہ ہو سکتے تھے اور ان پر برابر حقارت کی نظریں پڑتی تھیں۔ گشر کے ابتدائی حالات معلوم نہیں ورنہ غالباً بچپن کے خاندانی حالات ہی میں بہتوں کی پریشانیوں اور ناکامیوں کے اسباب ملجاتے۔ مارکس کے متعلق معلوم ہے کہ لڑکپن برابر باپ سے جھگڑے ٹنٹے میں کٹا۔ لوی بلاں کا باپ ۱۸۳۰ء کے انقلاب میں بالکل مفلس ہو گیا، سینٹ سیموں اچھا خاصہ مالدار آدمی تھا لیکن اسراف سے ناداری کا منہ دکھایا۔ فوریے نے ۱۲ سال کی عمر میں سٹہ کر کے ساری جائداد ختم کر دی۔ پرودھاں کے مطبع کا دیوالہ نکلا، کابے کارسیکا کا گورنر تھا اپنا عہدہ کھو بیٹھا، مارکس تعلیمی صیغہ میں ملازمت چاہتا تھا نہ مل سکی، لاسال، باکونین ہس نے اپنے اپنے پیشوں کو خیرباد کہا اور پھر ان سبنے کیا کیا؟ اکثر نے وہی جو اس زمانے میں سب ناکام و نامراد لوگ کرتے تھے یعنی صحیفہ نگاری، تصنیف و تالیف! پرودھاں، ہس، مارکس بلاں، لیرو، گوڈون، کابے، سب اخبار نویس اور مصنف بن گئے! بعضوں نے کچھ اور چھوٹا موٹا کام کر کے زندگی کے دن گذارے۔ رئیس زادہ سینٹ سیموں نقل نویس بنا اور فوریے نے دلالی کا پیشہ اختیار کیا۔ غرض ان غریبوں نے اپنے ساتھیوں، ہم چشموں سے الگ ہی اپنی زندگی گذاری وطن میں بھی رہے تو مہاجر کی طرح اور جب وطن چھوڑ کر گئے یا نکالے گئے تو مہاجر تھے ہی غرض اپنے زمانے کی سوسائٹی سے باہر رہے اور اپنے مصنوعی جماعتی رجحانات کے باعث اس کے مخالف۔

ان لوگوں کے "تصنع"، انکے جماعتی رجحانات، ان کی ناکامی ونامرادی کو پیش نظر رکھئے تو سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ کیوں اس پر مجبور تھے کہ دنیا کے ساتھ انکار رشتہ منفی اور انکاری ہو۔ اس منفی تعلق اور ناکامی کی الجھنوں کا لازمی اور سب سے پہلا نتیجہ تنقید و نکتہ چینی ہے۔ مختلف اشخاص کی طبائع اور انکی صلاحیتوں کے اعتبار سے یہ نکتہ چینی مختلف شکلیں اختیار کرلیتی ہے۔ کہیں یہ جنون تخریب کی شکل اختیار کرتی ہے کہ جو سامنے آئے اُسے توڑ ڈالو، گرادو، جماعتی اور تمدنی زندگی کی کوئی عمارت کھڑی نہ رہنے پائے، سب کچھ ڈھادو۔ اس کی سب سے نمایاں مثال باکونن ہے لیکن مارکس اور دوسرے بانیان مذہب اشتراک بھی اس سے بری نہیں۔ کہیں یہ انقلاب معیار کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔ یعنی آدمی دنیا کے سب معیاروں سے انکار کرنے لگتا ہے اور انکے بالکل مخالف معیار بنالیتا ہے۔ عرف عام میں جو اچھا ہوتا ہے وہ اسکے نزدیک برا ہے۔ جو اوروں کی نظر میں حسین وہ انکے لئے بدصورت ہے، جو دوسروں کے اعتبار سے خیر ہے وہ انکے خیال میں شر ہے۔ معروف اور مسلمہ محاسن کی تحقیر اور ان سے انکار اس رویہ کی خصوصیت ہے۔ اس میں آدمی کو انگور نہ ملیں تو وہ یہ نہیں کہتا کہ انگور کھٹے ہیں بلکہ یہ کہ انگور کی مٹھاس نہایت لغو چیز ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ اگر اس انقلاب معیار کے ساتھ تھوڑے سے تخلیقی تخیل کی آمیزش ہوگئی تو پھر آدمی بہتر دنیاؤں کے خاکے تیار کرتا ہے۔ اور اپنی موجودہ زندگی کی حرماں نصیبیوں کی تلافی اس مکمل خیالی دنیا کی امکانی کامیابیوں سے کرتا ہے، اور حقیقت کی نامرادیوں سے اپنے بنائے ہوئے فسانے کی کامرانیوں کے تخیل میں پناہ لیتا ہے۔ ع

واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں!

بانیان اشتراک جدید کی تصانیف پڑھئے، اس تنقید و نکتہ چینی، اسی جنون تخریب، اسی انقلاب معیار، انہیں مکمل تر دنیا کے نقشوں سے پر پائیگا کہ یہی ان میں سے اکثر کی ذہنی و نفسی زندگی کے عناصر ہیں۔

جس گروہ کا اوپر ذکر ہوا انکا سرخیل کارل مارکس تھا۔ دیکھیں کہ اشتراکیوں کا یہ امام انقلابیوں کا یہ سردار بھی اپنی نفسی زندگی میں ان عناصر کی جھلک دکھاتا ہے یا نہیں پہلے اس کی پرشاغل زندگی کی اہم تاریخیں پیش کرکے ہم اس کی ذہنی زندگی پر ایک نفسیاتی نظر ڈالیں گے۔

مارکس ۱۸۱۸ء میں یعنی روسی انقلاب سے پورے سو سال پہلے جرمنی میں بمقام تریر پیدا ہوا۔ ماں باپ یہودی تھے اور پہلے انکا نام مور دخائی تھا۔ مارکس ابھی ۶ برس ہی کا تھا کہ ۱۸۲۴ء میں باپ نے مسیحی مذہب اختیار کرلیا۔ ۱۸۳۵ء میں یہ بان یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ خاندان والوں کی آن جان براؤن شوائیگ کے ڈیوک کے معتمد خاص فان وسٹ فالن کے یہاں تھی انکی صاحبزادی سے ۱۸۳۶ء میں مارکس کی نسبت ہوگئی اور ۱۸۴۳ء میں شادی۔ ۱۸۳۶ء سے ۱۸۴۱ء تک برلن میں تعلیم پائی ۱۸۴۱ء میں سینا سے ڈاکٹر کی سندلی۔ ۱۸۴۲ء میں ایک لبرل اخبار کا مدیر مقرر ہوا لیکن خیالات کی انتہا پسندی کے باعث دوسرے سال ہی علحدہ بھی کردیا گیا۔ ۱۸۴۳ء میں جلاوطن بھی کردیا گیا اور پیرس میں مقیم ہوا اور فرانسیسی فلسفیوں اور اشتراکیوں کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا۔ ایک سال بعد روگے کے ساتھ مل کر جرمن۔ فرانسیسی سالنامہ نکالنا شروع کیا۔ اور اسی سال مسئلہ یہود پر ایک کتاب اور ہیگل کے فلسفۂ قانون پر تنقید شائع کی۔ ۱۸۴۵ء میں خاندان پر ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا تنقید تنقید۔ اسی سال پیرس سے نکالا گیا اور برسلز میں جاکر قیام کیا۔ ۱۸۴۷ء میں پرودھان کی کتاب فلسفۂ فلاکت کا جواب فلاکت فلسفہ لکھا۔ ۱۸۴۸ء-۱۸۴۷ء میں انگلس کے ساتھ مل کر حزب الاشتراکیین کا اعلان مرتب کیا جدید رائنی اخبار شروع کیا جو سال بھر بعد ہی بند ہوگیا اور مارکس پر غداری کا مقدمہ چلایا گیا جرمنی سے فرار ہوکر لندن میں پناہ لی اور آخر عمر تک وہیں رہا۔ نہایت تنگی وعسرت سے زندگی گذاری۔ مصارف کا تھوڑا سا حصہ نیویارک کے اخبار ٹریبیون کی نامہ نگاری کرکے کماتا اور کچھ انگلس سے لیتا۔ یہاں کے قیام کا زیادہ تر وقت مطالعہ میں صرف کیا۔ اور ۱۸۵۹ء میں تنقید معاشیات کتاب شائع کی۔ ۱۸۶۴ء میں بین الاقوامی حزب العمال کی بنا ڈالی۔ ۱۸۶۷ء

میں اپنی مشہور تصنیف "سرمایہ" کی پہلی جلد شائع کی جس کی دوسری جلد ۱۸۸۵ء میں اور تیسری ۱۸۹۴ء میں انگلس نے شائع کیں۔ ۱۸۸۳ء میں انتقال کیا۔

اشتراکیوں میں مارکس کی فضیلت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں اس گروہ کی وہ تمام خصوصیات جن کا خاکہ ہم نے اوپر پیش کیا ہے بدرجہ اتم موجود تھیں۔ یہ اس گروہ میں غالباً سب سے زیادہ حرماں نصیب، سب سے زیادہ مصنوعی اور سب سے زیادہ جماعتی اداروں میں تغیر کا طالب تھا۔ خاندانی حالات نے اسکے مزاج میں شروع ہی سے عجیب تلخی اور تیسری پیدا کر دی تھی۔ جگر کی خرابی خاندان کو ورثہ میں ملی تھی۔ مارکس کا باپ بھی جگر کے مرض میں مرا اور خود مارکس بھی۔ خاندان کی دماغی و روحانی کشمکش کی مصیبت بھی کچھ کم نہ تھی۔ یہ لوگ یہودی تھے۔ لیکن جرمنی میں یہودیوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا تھا اس نے انہیں عیسائی ہوجانے پر مجبور کیا۔ پھر مارکس کے باپ نے ایک پردیس سے شادی کی تھی اور اس ذہین وطباع لڑکے کارل مارکس کی ماں مرتے مرتے صحیح جرمن زبان نہ بول سکی۔ یہ لڑکا بلا کا ذہین وطباع تھا۔ اس کے ہر کام ہر بات سے معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی قوت اس میں سے ابلی پڑتی ہے۔ قدرت نے ذہنی صلاحیتوں کے عطا کرنے میں غیر معمولی فیاضی سے کام لیا تھا۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس لڑکے کو زندگی سے براہ راست دوچار ہونے دیا جاتا، بجائے اس کے کہ یہ لڑکوں میں کھیلتا کودتا اور چڑیوں کے گھونسلے تلاش کرتا پھرتا اس کے باپ نے ہوش سنبھالتے ہی اسے کتابوں پر لگا دیا، حرف شناس ہوئے ابھی بہت دن نہ ہوئے تھے کہ اس کے ہاتھ میں والٹیر اور راسین کی کتابیں دیدی گئیں! جو کتابیں یہ خود نہ پڑھ سکتا وہ باپ پڑھ پڑھ کر سناتا تھا۔ لڑکپن ہی میں اس سے اسکا باپ فلسفہ، مذہب، تاریخ کے مشکل سے مشکل مسائل پر بحث کرنا چاہتا تھا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عمر بھر مارکس نے زندگی کو کتابوں کی معرفت سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ خود طالب علمی کے زمانے کے متعلق لکھتا ہے: "مناظر قدرت، فنون لطیفہ، ساری دنیا

سب کچھ پس پشت ڈالدیا گیا تھا، دوستوں سے بیزاری تھی، ۔صرف مطالعہ کی خاطر!" وہی باپ جس نے بچپن میں اس غریب کو کتابوں کی دھت لگائی تھی اسے خط میں لکھتا ہے: "یہ کیا ہے کہ تم علم کے ہر گوشہ میں جھانکتے پھرتے ہو، اور رات کو لیمپ ہے اور تمہارا طرح طرح کے خیالات میں غلطاں و پیچاں ہونا" ۲۲ برس کی عمر میں جب یہ پیرس میں جلاوطن ہے تو روگے اس کے متعلق ایک دوست کو لکھتا ہے" مارکس پڑھتا بہت ہے .... لیکن ختم کوئی چیز نہیں کرتا۔ ہمیشہ بیچ میں سے چھوڑ دیتا ہے اور پھر کتابوں کا ایک سمندر ہے جس میں غوطے لگانے لگتا ہے"۔ ایک کارخانے دار نے اس سے ہنسی میں کہا کہ تمہاری کتابوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تم خود کارخانے دار ہو تو اس پر یہ کہتا ہے: "اگر کہیں لوگ جانتے کہ میں اس ساری حماقت سے کس قدر کم واقف ہوں!" اس کی طبیعت کا لگاؤ سراسر غیر مرئی، نظری، مجرد چیزوں کے ساتھ تھا۔ اور ساری تاریخ کو مادیت کی تعبیر دینے والا خود دنیا کی مادی حقیقتوں سے بہت کم آشنا تھا!

اس پر ستم یہ ہے کہ اس کتابی آدمی کے سینہ میں جذبات کا ایک کوہ آتش فشاں ابل رہا تھا۔ اسکا دوست انگلس جب "ترِیر کے اس سیاہ بالوں والے" کا ذکر کرتا ہے" جو غصہ میں بھرا ادھر اُدھر پھرتا ہے، اور غضب سے گھونسے باندھے کے چلاتا ہے گویا ہزاروں شیطان اسے پکڑے ہوں اور وہ ٹھان چکا ہو۔ کہ آسمان کے خیمہ کو تہ کر کے زمین پر لا ڈالے گا!" تو اسے اس کتابی آدمی کے اندرونی جذباتی کشمکش کا صحیح اندازہ ہے۔ حقیقت سے دوری اور جذبات کی یہ شدت مل کر قوی سے قوی آدمی کو پراگندہ خاطر کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ چنانچہ مارکس کی طبیعت کی پریشانی و پراگندگی انہیں کا نتیجہ تھی۔ اسکی ۱۹ برس کی عمر تھی جب باپ نے اسے ایک خط لکھا "یہ پراگندگی مجھے ایک آن نہیں بھاتی۔ اور پھر تم سے تو اس کی توقع ہی نہ تھی۔ آخر کوئی وجہ بھی ہو؟ ذراسی خلاف مزاج بات، ذراسی خواہش کا پورا نہ ہونا ایس پریشانی و پراگندگی کے لئے کافی ہے! اسی کو مضبوطی کہتے ہیں، مردانگی اسی کا نام ہے؟"۔ غریب باپ نہیں جانتا تھا کہ خود

اس کی زندگی اور اسکی تعلیم اور پھر بعد کو اسے بیٹے کی سیرت سے ناواقفیت، خود اس پراگندگی کے سب سے بڑے اسباب تھے!

مارکس ایک غیر معمولی ارادی قوت کا آدمی تھا۔ اس کے جذبات کی ساری شدت خارجی اعمال میں اظہار کے لئے بیتاب رہتی تھی۔ اپنے ذہن اور اپنی رائے کا پرتو خارج میں ڈالنے کی خواہش اسکی زندگی کی خصوصیت امتیازی ہے۔ اس نے اپنی طالب علمی کے ختم پر سند کے لئے جو مقالہ لکھا اس کے آخر میں اس نے ایک "نفسیاتی قانون" یوں بیان کیا ہے: "جب فکر انسانی خود اپنی پابندیوں سے آزاد ہو جاتی ہے تو وہ ارادہ کی شکل میں اس خارجی حقیقت دنیاوی سے برسرپیکار ہو جاتی ہے۔" خود مارکس کی زندگی میں یہ حقیقت خارجی تامتر جماعتی زندگی سے عبارت تھی۔ یعنی یہ ان مصنوعی لوگوں میں سے تھا جن کے نزدیک جماعتی زندگی زندگی کی قدر اعلیٰ ہے، مارکس نے خود لکھا ہے "ابتک فلسفی دنیا کی تعبیر کرتے تھے، اب ضرورت ہے اسے بدلنے کی!" ارادہ کی یہ قوت جماعتی زندگی سے یہ تعلق، اور غیر معمولی ذہنی تفوق کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مارکس اپنے ساتھیوں پر حکومت کرنا چاہتا تھا۔ ایک جرمن مصنف نے مارکس کی نفسی کیفیت کی تحلیل میں بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ حکومت کی خواہش اس کی ساری زندگی پر حاوی تھی۔ اور تمام تفوق طلب خطرتوں کی طرح اس کی خصوصیات بھی "دشمنوں سے نفرت اور انتقام کی خواہش، رقیبوں اور مقابلوں سے حسد و رشک، متبعین پر اقتدار کی آرزو، اور بالعموم انسانوں کی تحقیر تھیں"۔ ۱۸۵۳ء میں برلن کی پولیس نے اس کے متعلق جو رپورٹ لکھی تھی اس میں کے چند جملے اس صفت کی طرف اشارہ کرتے ہیں: "اپنے سیاسی رقیبوں اور مخالفوں سے انتقام کی خواہش اس میں قوی ہے اور یہ کبھی انہیں معاف نہیں کرتا۔ جب تک انہیں زمین پر نہ لے آئے یہ چین سے بیٹھتا نہیں۔ اس کی خصوصیات امتیازی بے حد حوصلہ اور بے نہایت آرزوئے حکومت ہیں۔ باوجود اشتراکی مساوات کے جس کا یہ راگ گاتا ہے یہ اپنی جماعت کا بلاشرکت حاکم ہے۔ یہ سچ ہے کہ کام بھی یہ خود ہی سب کرتا ہے لیکن پھر حکومت بھی صرف اسی کی ہے۔ اور یہ اپنے خلاف ذراسی بات

نہیں برداشت کرسکتا۔"

خاندانی عدم توازن، شخصی کشاکش ذہنی، قوت ارادی کی شدت، حکومت کی آرزو ان سب کے ساتھ جس چیز نے مارکس کی زندگی کو تلخ بنایا وہ اس کی ناکامی تھی۔ کوئی کام نہ تھا جو اس نے اٹھایا ہو اور وہ ناکام نہ ہو۔ گھر میں افلاس و فلاکت، کیس کم گر و رکھنا کبھی انگلس کو روپے کے لئے لکھنا، جو اخبار نکالنا اس کا بند ہو جانا، اس کی زندگی کے سب سے بڑا عملی کارنامہ بین الاقوامی حزب العمال کا کچھ دنوں گھس گھس کر جینا پھر چند ہی سال میں ختم ہو جانا، اسکی آخری کوشش یعنی علمی کام کا بھی اس کے سامنے بے نتیجہ رہنا۔ سب اسی ناکامی کی مثالیں ہیں۔

مارکس کی یہ ناکامیاں بڑی حد تک خود اس کی سیرت کی کمیوں کا نتیجہ تھیں۔ مثلاً عمل کی خواہش کے ساتھ اس میں وہ صفات نہ تھے جو عملی آدمیوں میں ہوتے ہیں۔ حقیقت سے دور یہ اپنی خیالی دنیا میں رہتا اور اسکے معیار اس دنیا پر عائد کرنا چاہتا تھا جو ان سے بے نیاز ہے۔ اشخاص کو سمجھنا اور ان کی صحیح قدر جاننا، وقت کی بات پہچاننا، لوگوں سے کام لے سکنا، یہ سب صفتیں اس میں نہ تھیں۔ لیکن اتنا قابل اتنا ذہین، ایسا قوی آدمی کیسے سمجھ لیتا کہ اپنی ناکامی کا ذمہ دار وہ خود ہے، یہ ہمیشہ خارجی اسباب کو اپنی ناکامی کی وجہ گردانتا رہتا اسی لئے اس میں ہر نئی ناکامی کے ساتھ ساتھ نئی اور شدید تر تلخی بھی پیدا ہوتی گئی۔ یہ ہر شخص اور ہر چیز سے نفرت کرنے لگا، ہر بڑے کی حقارت ہر مشہور شخص کی عیب بینی اسکا شیوہ ہو گیا۔ معاصرین میں اس کے دوست دشمن سب متفق ہیں کہ اس کے دل میں سخت تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ جن لوگوں کے ساتھ اس نے پہلے کام کیا تھا اور جو اس کے بڑے دوست تھے ان سے اکثر ان بن ہو گئی۔ اور جہاں ذرا بگڑی اور اس نے نہایت شدت سے انکی مخالفت اور برائی شروع کی اس نفرت کے ساتھ جب اس کی شبہ کرنے کی عادت کو ملا لو جو شروع ہی سے مارکس میں موجود تھی تو مارکس کی نکتہ چینی کی عادت اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔ مارکس کی

تصانیف کو دیکھو یہ سب کی سب کسی نہ کسی چیز کی تنقید ہیں۔ ہیگل کے فلسفۂ قانون کی تنقید، تنقیدی تنقید کی تنقید! معاشیات کی تنقید، یا شخصی نکتہ چینی و عیب جوئی، پرودھان کے خلاف، واگٹ کے خلاف، ڈیورنگ کے خلاف، باکونین کے خلاف، پھر تنقید بھی کس بلا کی تنقید اور نکتہ چینی بھی کس غضب کی نکتہ چینی۔ غرض مارکس میں بھی تمام وہ صفات بدرجہ اتم موجود تھیں جو ہم نے شروع مضمون میں اشتراکی مفکرین کے ساتھ منسوب کی تھیں۔ یہ اس گروہ کا ایک فرد تھا، اوروں سے زیادہ ذہین، زیادہ محنتی، زیادہ قابل لیکن ساتھ ہی زیادہ پراگندہ خاطر، زیادہ مصنوعی، زیادہ غیر عملی اور اپنی زندگی میں زیادہ ناکام!

گزشتہ بالا ملاحظات سے اگر مفکرین اشتراک اور انکے سردار مارکس کی ذہنی کیفیت کے سمجھنے میں کچھ بھی مدد ملے تو ان کی تعلیم یعنی مذہب اشتراک جدید کے فہم میں بھی کچھ سہولت ہو گی۔

روس کی ایک اسلامی جمہوریت

جمہوریۂ آذربیجان

ڈاکٹر ب الجوزی پروفیسر عربی باکو یونیورسٹی نے روس کی اسلامی جمہوریت آذربیجان پر مصر کے ایک مشہور پرچہ میں یہ مضمون لکھا تھا۔ ناظرین جامعہ کے لئے اس کا ملخص پیش کیا جاتا ہے۔

حدود اربعہ اور مختصر تاریخ جمہوریۂ آذربیجان کے حدود اربعہ حسب ذیل ہیں:۔ شمال میں جبال داغستان، مشرق میں بحر خزر یا بحر کاسپین۔ مغرب میں کرج اور ارمن جمہوریتیں۔ جنوب میں بلاد عجم یا عجمی آذربیجان۔ صحرا، موغان اور جبال طالیش۔

جمہوریۂ آذربیجان روسی انقلاب اور اعلان آزادی (۱۹۲۰ء) سے پہلے دو بڑی ولایتوں (ولایت باکو اور غنجا) سے مرکب تھی۔ اب اسمیں تیرہ اضلاع ہیں ان میں بعض قدیم ہیں جن کا ذکر یعقوبی یاقوت الحموی بلاذری اور دوسرے عرب فارسی اور ارمن مورخین اور جغرافیہ نویسوں نے بھی کیا ہے۔ اور کچھ روسی عہد یا اس سے کچھ دنوں پہلے قائم ہوئے ہیں۔ عرب مورخین نے جن اضلاع کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ غنجا (جنزہ) شمخور (شمکور) شماخا کوبا قراباخ (قراباغ) وغیرہ اس کی ساحت ۸۶۹۵۱ مربع کیلومتر ہے باشندوں کی تعداد آخری مردم شماری (۱۹۲۶ء) کے لحاظ سے دو ملین اور ۲۱۴۵۷۰ ہے اور اب یقیناً ڈھائی ملین تک پہنچ گئی ہوگی۔ ان میں

۱۴۶۹۶۵۶ ترکی آذری عنصر ہے۔

۲۸۴۳۹۱ ارمن ہیں

۱۷۰۰۰۰ ایرانی (فارسی کردتات وغیرہ)

۳۲۱۰۰۰ روسی ہیں

۸۰۰۰۰ داغستانی قبائل کے لوگ ہیں جرکس اوارہ وغیرہ)

۵۰۰۰۰ روسی جرمن یہودی اور دوسرے طبقوں کے لوگ ہیں

ترکوں کی آبادی ۶۴ فی صدی ہے اور بعض ایرانی اور داغستانی قبائل کی آمیزش کی وجہ سے وہ برابر ترقی پذیر ہیں، دوسری جانب یہودی ارمنی اور روسی آبادی بھی برابر بڑھ رہی ہے اس لئے کہ کوئلہ کی کانیں، مچھلی کی تجارت اور میووں کی افراط سرمایہ داروں کی توجہ کو اس ملک کی جانب مبذول کر رہی ہیں۔

یہ وسیع ممالک عربی فتوحات سے پیشتر اکاسرۂ عجم کی حکومت میں تھے۔ اس زمانے میں بھی یہاں کوئی ایک قوم آباد نہ تھی۔ جنوب اور جنوب مشرق میں زیادہ تر ایرانی قبائل آباد تھے شمال اور شمال مشرق میں ارمن اور افغان اور شمال مغرب میں یہود اور داغستانی قبائل اقامت گزیں تھے۔ حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان کے زمانے میں جس وقت عربوں نے اس علاقے کو مفتوحہ ممالک میں شامل کیا تو انکے قافلے کے قافلے یہاں آ آ کر آباد ہونے لگے۔ انہوں نے یہاں کے بہترین سرسبز علاقوں کو اپنے لئے پسند کیا اور تھوڑے عرصہ میں بے شمار شہر قصبے اور گاؤں قائم اور آباد ہو گئے۔

ان علاقوں پر جب اچھی طرح تسلط اور اقتدار قائم ہو گیا اور زیادہ آبادی کی گنجائش نہ رہی تو انہوں نے پہاڑی علاقے کی جانب توجہ کی اور وہاں کے باشندوں کو دبانا شروع کیا بالآخر شدید معرکہ آرائیوں اور جدال و قتال کے بعد خلفائے بنو امیہ خصوصاً ہشام بن عبدالملک کے زمانے میں اسے بھی انہوں نے مفتوحہ ممالک میں شامل کر لیا۔ عباسی خلافت تک یہ علاقہ عربوں کے زیر اقتدار اور حکومت سے منسلک رہا لیکن جب عباسی خلافت میں ضعف آیا تو دوسرے دور دراز ممالک کی طرح اسکا تعلق بھی مرکز خلافت سے منقطع ہو گیا اور مختلف رؤسا سلاطین کی

چھوٹی چھوٹی مستقل حکومتیں قائم ہوگئیں ان میں سے بعض ریاستیں عربوں کی بھی تھیں لیکن اکثر خود ملک کے اصلی باشندے تھے۔ ان چھوٹی چھوٹی امارتوں میں مختلف اسباب کی بنا پر اختلافات اور جنگ وجدال کی صورت قائم رہی، نویں صدی ہجری سے لیکر دسویں صدی تک ان باہمی لڑائیوں کا سلسلہ برابر قائم رہا جن کی وجہ سے ان میں برابر ضعف وانحطاط پیدا ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ اب ان میں اتنی سکت بھی باقی نہیں رہی کہ ترکوں کے پیہم حملوں کا جواب دے سکیں جو وسط ایشیا سے اٹھ کر خراسان اور آذربیجان کے راستے سے اُن کے دولتمند ملک پر کر رہے تھے۔ ان ترکی حملہ آوروں نے وسط ایشیا اور افغانستان وغیرہ کی حکومتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی یہاں بھی انہوں نے ان چھوٹی چھوٹی امارتوں کا تختہ الٹ دیا انہوں نے اس علاقے کو صرف فتح ہی نہیں کیا بلکہ انکے قبائل یہاں آ آکر بسنے بھی لگے اور اسکا سلسلہ پندرہویں صدی (ع) تک قائم رہا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کا رہا سہا اقتدار بھی ختم ہوگیا۔ اور جو کچھ عربی فوج یا قبائل باقی رہ گئے تھے وہ بھی منتشر ہوگئے۔ لیکن پھر بھی بہت تھوڑی سی تعداد بعض علاقوں میں انکی باقی رہ گئی تھی اور انہوں نے عربی رسم و رواج اور عربی زبان کی محافظت میں پوری کوشش کی لیکن سترہویں صدی (ع) میں انہوں نے اپنی زبان بھی ضائع کردی اور اس کے بجائے ان میں ترکی (اذری) یا داغستانی زبان رواج پاگئی لیکن اپنے رسم و رواج اور رہنے سہنے کے طریقوں کو انہوں نے اب بھی نہیں چھوڑا اور اس وقت تک وہ اپنی قدیم معاشرت پر مستقل مزاجی کے ساتھ قائم ہیں۔ یہ اب صرف بادیہ موغان ضلع کوبا اور داغستان کے بعض دیہاتوں میں آباد ہیں۔ عربوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں بڑے بڑے شہر بسائے تھے۔ مثلاً بروعہ، دبیل، مراغہ اور دربند وغیرہ یہ شہر کثرت آبادی، تہذیب و تمدن صنعت و تجارت میں دور و نزدیک اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ لیکن زمانے کی نیرنگیوں نے اُنکے نشانات تک مٹا ڈالے ہیں۔ مثلاً بروعہ یاقوت کے بیان کے مطابق عربوں کے زمانے میں شروان کا دارالسلطنت اور بہت بڑا اور شاندار شہر تھا لیکن اب

اسکی حیثیت محض ایک چھوٹے سے گاؤں کی رہ گئی ہے اسی طرح بیلقان، شروان اور قبلہ کے ناموں تک سے آج ہم واقف نہیں اور اگر عرب مورخین انکا تذکرہ نہ کرتے تو شاید ہمیں انکے وجود میں بھی شک ہوتا۔

عربوں کا اقتدار مٹنے کے بعد یہ ملک مختلف حملہ آوروں کا آماجگاہ رہا۔ ترکوں کے بعد مغلوں اور مغلوں کے بعد ترکمانی (وحشی) قبائل کی توجہات کا مرکز رہا۔ اس طوائف الملوکی اور متواتر حملوں کے نتائج ملک کے لئے بہت مضر ثابت ہوئے۔ عربوں نے اپنی کوششوں سے اسے ہر حیثیت سے ایک ترقی یافتہ ملک بنا دیا تھا۔ ہر طرف فارغ البالی امن و آسایش کا دور دورہ تھا لیکن انکا تسلط مٹتے ہی ملک پھر اپنی اصلی حالت پر لوٹ آیا۔ تا آنکہ ایران میں صفدی خاندان نے عروج کیا اس نے اس ملک کو بھی اپنے مملوکہ علاقے میں شامل کرلیا اور یہ اب ایرانی حکومت کا جزو ہوگیا۔ اس وقت یہاں شیعی مذہب اور ایرانی تہذیب کا غلبہ ہوگیا حتی کہ ترکی زبان پر بھی اسکا اثر پڑا۔ صفدی خاندان کے سلاطین نے اس ملک کی ترقی کے لئے جو کوششیں کیں، ہمسایہ وحشی قبائل کے حملوں کی جس کامیابی سے مدافعت کی اس کے آثار اب تک ملک میں موجود ہیں لیکن اس خاندان کے زوال کے بعد ملک کی پھر وہی حالت ہوگئی اور پہلے کی طرح پھر چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئیں اور وہ امراء اور رؤسا جن کی سرکوبی میں صفدی خاندان پورے طور پر کامیاب نہیں ہوا تھا پھر سر اٹھانے لگے اور اپنی مستقل حکومتیں قائم کرلیں۔ ان ریاستوں میں آپس میں سخت اختلاف تھا اور ہمیشہ لڑائی جھگڑا رہتا تھا۔ اسی آپس کے تصادم اور نااتفاقی کے سبب حکومت انکے قریبی پڑوسیوں (ترک اور عجم) کے قبضہ میں چلی گئی اور برابر مختلف ہاتھوں میں منتقل ہوتی رہی، چنانچہ ۱۵۷۸ء میں جب ایرانی حکومت میں ضعف آیا تو ترکوں نے اس پر اپنا قبضہ کرلیا لیکن ۱۶۰۷ء میں عباس اول نے اسے پھر واپس لے لیا اور اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ انیسویں صدی[۶] تک اسی خاندان کا قبضہ رہا اور بالآخر انیسویں صدی میں روسیوں نے اس پر قبضہ کرلیا

اور یہ ملک انکی عظیم الشان سلطنت کا ایک جزو بن گیا۔

روسی حکومت

روسی حکومت نے اس ملک کے معاملات میں اس وقت سے دخل دینا شروع کیا جبکہ وہ اسطرخاں (شہر کا نام) پر قابض ہوگئی۔ پہلے اس نے سیاح اور تجارتی اور سیاسی مہمیں بھیجنا شروع کیں تاکہ وہ وہاں کے کمزور خانوں اور ملوک عجم سے تجارتی اور سیاسی معاہدہ کی طرح ڈالیں۔ اس لئے کہ اس زمانے میں ترکوں کے حملے برابر ان ملکوں پر ہو رہے تھے، اور ان کمزور خانوں اور سلاطین کو روس کی امداد کی بے حد ضرورت تھی۔ روسیوں کا اصل مقصد اپنی تجارت کی توسیع تھی وہ بلاد عجم اور ہندوستان میں اپنی مصنوعات کے لئے ایک نیا بازار پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن اٹھارہویں صدی کے شروع تک اس ملک کے حکام سے اُنکے تجارتی اور سیاسی تعلقات بہت کمزور تھے دونوں کے درمیان کوئی ایسا محفوظ و مامون راستہ نہیں تھا کہ تجارتی مال و اسباب بغیر کسی خطرے کے گذر سکے کہ اسطرخان سے بحر خزر کے بندرگاہوں تک تجارتی سامان لیجانے کے لئے کوئی تجارتی بیڑہ موجود نہیں تھا اس لئے مجبوراً خشکی کا راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا اس لئے اسباب اور اسکے محافظ ہمیشہ معرض خطر میں رہتے تھے۔ بطرس اکبر چاہتا تھا کہ روس عجم اور ہندوستان کے درمیان تجارتی راستوں پر قبضہ کرکے چنانچہ ۱۷۲۲ء میں اس نے اسطرخان میں ایک بحری بیڑہ بھی تیار کیا تھا لیکن اس پر سوار ہوکر وہ دربند بھی نہیں پہنچا تھا کہ روس کے داخلی حادثات کی وجہ سے اسے واپس ہونا پڑا ۱۷۲۳ء میں دوسری دفعہ اس نے تیاری کی اور اس مرتبہ باکو اور سالیان پر قبضہ کرلیا اس کے بعد روس اور ترکوں کے درمیان ۱۷۲۴ء میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے عجمی بندرگاہوں کا اکثر حصہ اس کے قبضہ میں آگیا لیکن ۱۷۳۲ء میں اس نے اعلان کیا کہ وہ اپنے مقبوضہ علاقے سے دست بردار ہونے کو تیار ہے نیز اس نے باکو اور دربند سے قبضہ اٹھالینے کا بھی وعدہ کیا بشرطیکہ ترکی حکومت ماورائے قفقاز کے علاقے سے دست بردار ہوجائے۔ لیکن جب ترکی حکومت نے اس سے انکار

کیا تو نادر شاہ جدید شاہ ایران نے اعلان جنگ کر دیا اور ترکوں کو اس علاقے سے زبردستی نکال باہر کیا اس لئے روسی حکومت نے بھی باکو اور دربند کو خالی کر دیا نادر شاہ نے ان دونوں کو اپنی وسیع مملکت میں شامل کر لیا اور ۱۷۴۷ء تک یہ علاقہ اس کے قبضہ میں رہا۔ بالآخر جس زمانے میں وہ شروان میں مصروف جنگ تھا کہ قتل کر دیا گیا۔ اس کے مرنے کے بعد ملک میں پھر بدنظمی اور انتشار پیدا ہو گیا اور حکومت پھر مختلف امرا میں منقسم ہو گئی تا آنکہ روس نے ۱۸۰۵ - ۱۸۲۲ء میں تمام ملک پر قبضہ کر لیا اور وہ روس کے وسیع علاقے کا ایک جزو ہو گیا۔

روسی قبضہ کے بعد | روس کی سابق حکومت کے افعال اسکی داخلی سیاست اور مشرقی ممالک اور مشرقی اقوام سے اس کے تعلقات کو کیسی ہی بُری نظر سے دیکھا جائے اور اسکی انتظامی غلطیاں اور خارجی سیاست کیسی ہی قابل اعتراض کیوں نہ ہوں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ روس کے عہد حکومت میں مذکورہ ممالک اور قومیں خصوصاً جو اس کی حکومت کے تحت میں آگئیں انہوں نے تھوڑے سے عرصے میں ہر حیثیت سے اتنی ترقی کر لی کہ ہمسایہ ممالک انہیں رشک و حسد کی نظر سے دیکھنے لگے۔ روسی قبضہ سے پہلے ان قوموں اور ماورائے قفقاز کے علاقوں کی تمدنی اور اقتصادی حالت بالکل ایسی ہی تھی جیسی آج کل جزیرۃ العرب کی ہے لیکن نصف صدی بھی نہیں گذرنے پائی تھی کہ روس کے دولتمند ترین علاقوں میں انکا شمار ہونے لگا تمدنی حیثیت سے بھی وہ روس کے اندرونی ملک سے کسی طرح کم نہ تھے بلکہ ہماری ذاتی تحقیق کے مطابق کئی حیثیتوں سے وہ اس سے بڑھے ہوئے تھے ہماری تحریر سے یہ ہرگز نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ ترقی محض اجنبی حکومت کی برکت ہے بلکہ مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ دوسرے مشرقی ممالک کے مقابلہ میں نیز سابق روسی سلطنت کی تھوڑی سی مدت حکومت میں آذربیجان نے حیرت انگیز ترقی کر لی جیسا کہ آئندہ اعداد و شمار سے آپ پر واضح ہو جائے گا۔

روسی قبضہ کے وقت آذربیجان کی آبادی صرف ۵ لاکھ ۵۰ ہزار تھی لیکن ۱۹۲۶ء میں

دو ملین اور ۱،۵۷۲۱۳ تک پہنچ گئی اور ڈھائی ملین سے بھی زیادہ ہوگئی باکو (جو اس ملک کا دارالسلطنت تھا) کی آبادی ۱۸۰۲ء میں ڈھائی ہزار تھی۔ ۱۹۱۷ء میں دو لاکھ کتیس ہزار تک پہنچ گئی اور اب نصف ملین اور ۱۰۷ ہزار ہے۔ ان آخری اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عرصے میں باکو کے باشندوں کی تعداد دو سو گنا بڑھی ہے اور برابر حیرت انگیز طریقہ پر بڑھ رہی ہے یہ زیادتی کثرت تناسل یا قلت اموات کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اندرونی ممالک کے لوگوں کے منتقل ہونے کی وجہ سے جو یا تو یہاں کی قابل زراعت زمین میں کاشتکاری کی غرض سے آئے ہیں یا مختلف کانوں میں کام کرنے کے لئے جو چاروں طرف سے دارالسلطنت باکو کو گھیرے ہوئے ہیں اور دریا بحر خزر اور نہر کورا کے ساحلوں پر ماہی گیری کے لئے۔ اس لئے کہ یہاں ہر قسم کی بہتر سے بہتر اور قابل تجارت مچھلیاں بافراط پائی جاتی ہیں۔

روسی قبضہ کے وقت آذربیجان کی مزروعہ یا قابل زراعت زمین کل ملک کا صرف ۱/۴ یعنی صرف دو ملین روسی ایکڑ تھی۔ سنہ ۱ء میں ساڑھے پانچ ملین تک پہنچ گئی اور اب تقریباً ۶۶۳۸۹۰۰ ایکڑ ہے اور ہر سال مزید اضافہ ہو رہا ہے اس وقت بنجر زمین صرف ایک ملین اور ۹۳۲۰۰۰ ایکڑ باقی رہ گئی ہے اور غالباً تھوڑے ہی عرصہ میں بجز پتھریلی اور شور زمینوں کے ملک میں کوئی علاقہ ایسا نہ رہے گا جو ناقابل کاشت ہو یا جس پر کاشت نہ ہوتی ہو اس لئے کہ مرکزی اور مقامی دونوں حکومتیں بنجر علاقے کو قابل زراعت بنانے کی پوری کوشش کر رہی ہیں۔ علاوہ بریں ہر سال وہ اپنے میزانیہ میں نہروں کی درستی و مرمت کے لئے کئی ملین روبل رکھتی ہیں۔ آذربیجان میں روئی کی کاشت میں بھی برابر ترقی ہے نہروں کی درستی کے بعد لاکھوں ایکڑ زمین روئی کی کاشت کے قابل ہو جائیگی اور تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کو باہر سے روئی منگانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اب بھی مصر یا امریکہ وغیرہ سے بہت کم روئی آتی ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں صرف روئی کی تجارت کا منافع ۴½ ملین پونڈ[سلہ] تھا۔

سلہ ایک روسی سکہ مساوی ۱۰۰ درہم

ملک کی اقتصادیات کے لئے روئی سے بھی زیادہ اہم پٹرول ہے۔ پٹرول زیادہ تر آذربیجان کے علاقے سے نکلتا ہے اور یہ ملک کی ثروت کا اہم ترین ذریعہ ہے اس کی جو مقدار سالانہ دوسرے ملکوں کو جاتی ہے اسکی قیمت تقریباً ۱۰ ملین پونڈ ہے اور خود ملک کے کارخانوں وغیرہ میں جس قدر صرف ہوتا ہے اس کی قیمت کا اندازہ بیس ملین پونڈ کیا گیا ہے۔

پٹرول کو لوگ اس ملک میں ہزارہا سال سے جانتے ہیں۔ عرب سیاحوں میں المقدسی وغیرہ نے اپنے سفرناموں میں اسکا تذکرہ کیا ہے۔ اکثر اوقات اس میں سے شعلے نکلتے رہتے تھے۔ اس لئے آگ کے پوجنے والے ہندوستان اور عجم سے آآ کر اس کی زیارت کرتے تھے۔ اور اسکے زیر سایہ رہنا باعث برکت سمجھتے تھے۔ اُن معبدوں کے آثار اب تک موجود ہیں جن میں ملتان و شمالی ہند کے رہنے والے آکر ٹھہرتے تھے اور عبادت کرتے تھے۔ باکو کے علاقے میں سراخانہ ایک موضع ہے اس میں ابتک ایک معبد موجود ہے جس کی دیواروں سے فوارے کی طرح پٹرول اچھل اچھل کر نکلتا ہے اس معبد میں کئی کتابے بھی لگے ہیں ان میں بعض جدید فارسی میں ہیں بعض ہندی میں اور ایک سنسکرت حروف میں ان کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ معبد ۱۸۶۱ء تک آباد تھا اب باکو کا محکمۂ آثار قدیمہ اس کی حفاظت کر رہا ہے ورنہ پٹرولیم کمپنی اس کی زمین پر قبضہ کر لیتی اور معبد کا نہ معلوم کیا حشر ہوتا۔ یہ امر تعجب انگیز ہے کہ باوجودیکہ روسی حکومت کو آذربیجان میں پٹرول کے چشموں کا علم تھا لیکن ۱۸۷۲ء تک اس نے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس وقت عام لوگوں اور کارخانہ کے مالکوں کو اس طرف توجہ ہوئی اور وہ لکڑی اور پتھر کے کوئلے کے بجائے اسکا استعمال کرنے لگے، ملک اور بیرون ملک میں جب اسکا استعمال عام ہوگیا تو ملک اور بیرون ملک کے سرمایہ دار پٹرول کا علاقہ خریدنے اور پٹرول نکالنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے چنانچہ جنگ عظیم سے قبل جو پٹرول یہاں سے نکلا اسکی تعداد ۴ کروڑ پوڈ سالانہ ہے آج بھی وہ اسی مقدار میں نکلتا ہے حالانکہ روسی انقلاب کے زمانے میں پٹرول کے بہت سے چشمے برباد ہوگئے، صرف باکو کے علاقے سے ۴۰۰ ملین پوڈ

پٹرول نکلتا ہے جس کی قیمت ۴۰ ملین پونڈ ہے پہلے آمدنی کی یہ کثیر تعداد اجنبی سرمایہ داروں کے قبضہ میں جاتی تھی مگراب سوویٹ حکومت نے اسے اپنے قبضے میں کرلیا ہے اور اس کی آمدنی ملک کی ضروریات اور مزدوروں کی حالت درست کرنے پر صرف کیجاتی ہے انکے لئے مکانات تعلیم گاہیں شفاخانے وغیرہ تعمیر کئے جاتے ہیں۔ انکے علاوہ آذربیجان میں آمدنی کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں جن میں سے ایک اہم ذریعہ مچھلی کی شکارگاہیں ہیں جو ساحل بحر اور نہر کورا پر پھیلی ہوئی ہیں مچھلی یہاں بکثرت ہوتی ہے اور مچھلیوں کی بعض قسمیں ایسی عمدہ ہیں کہ دوسرے مقامات پر بمشکل پائی جاتی ہیں، بعض ایسی ہیں جو تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ اسکے بعد میووں کا نمبر ہے اور میووں میں بھی سیب کی پیداوار خاص طور پر قابل ذکر ہے گذشتہ سال خود ملک میں ۵ ملین صندوقوں کی کھپت ہوئی ہے اور یہ سب کی سب صرف ایک ضلع کوبا کی پیداوار ہے پھر انگور بھی باافراط اور بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔

کوئی شک نہیں کہ ملک کی آمدنی کے اہم ترین ذرائع یعنی پٹرول، روئی اور مچھلی مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہیں لیکن آذربیجان کی حکومت بھی ان سے کافی فائدہ اٹھاتی ہے اس لئے کہ مرکزی حکومت کئی ملین صرف ان مزدوروں کی مختلف ضروریات پر صرف کردیتی ہے جو اس ادارے میں کام کرتے ہیں علاوہ اس کے ہر لود پٹرول پر وہ حکومت آذربیجاں کو ایک مقررہ رقم دیتی ہے جس کی تعداد اس سال ۵ ملین روبل تک پہنچ گئی جس میں سے نصف تعلیم اور نصف زمین اور راستوں کی درستی پر خرچ کرے گی۔ اس کے علاوہ اس کے پاس آمدنی کے اور بھی بہت ذرائع ہیں جن کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ جمہوریہ آذربیجان اپنے باشندوں کی تعداد اور مساحت کے اعتبار سے روس کی تمام دوسری جمہوریتوں کے مقابلے میں دولتمند ہے گذشتہ سال اسکا میزانیہ ۱۳۰ ملین روبل تھا یعنی ۱۳ ملین مصری پونڈ۔ کاشتکاری اور حکومت کے کارخانوں کی آمدنی گذشتہ سال ۸۶۱ ملین روبل تھی اور ۱۹۲۵ء میں ۱۵۴ ملین تھی صرف باکو کی سالانہ آمد ۲۰ ملین روبل ہے یعنی دو ملین پونڈ۔ یہ آمدنی میونسپلٹی اپنے خاص مدارس

پر صرف کرتی ہے مثلاً جامعہ باکو اور مدرسہ صنعت وغیرہ ۔ مدارس زراعت صنعت موسیقی وغیرہ ۔

اس مادی کامیابی سے بھی کہیں زیادہ شاندار وہ ادبی اور روحی کامیابی ہے جو اس جمہوریت نے بیسویں صدی کے ربع اول خصوصاً آخری پانچ سالوں میں حاصل کی ہے ۔ اگر مضمون کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو بہت سے امور کا مفصل تذکرہ کیا جاتا جس سے یہ حقیقت اور بھی واضح ہوجاتی لیکن اس موقع پر علمی تحریکوں بالخصوص مدارس کی ترقی کا اختصار کے ساتھ تذکرہ کیا جاتا ہے ۔ ذیل میں ایک خاکہ دیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ ۱۹۱۷ء میں مدارس کی تعداد کس قدر تھی اور ۱۹۲۸ء تک ان میں کس قدر اضافہ ہوا۔

مدارس کی تعداد	۱۹۱۷ء میں	۱۹۲۸ء میں
دیہاتی مدارس	۶۵۰	۱۱۹۷
مدرسۃ المعلمین	۱	۱۴
ثانوی مدارس	۲۷	۱۳۲
اعلیٰ مدارس (کالج)	۰	۳

مدارس عالیہ سے مراد باکو یا آذربیجان یونیورسٹی ہے ۔ اس یونیورسٹی میں اس وقت ۳۰ ہزار طلبہ اور طالبات زیر تعلیم ہیں ۔ ان میں سے ایک تہائی ترک ہیں اور باقی یہود ارمن اور روسی وغیرہ ۔ یونیورسٹی کے قیام کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے ۔ ۱۹۱۹ء میں سابق حکومت نے اسکی بنیاد ڈالی تھی ۔ اب اس میں پانچ شعبے ہیں (۱) طب (۲) تاریخ آداب (لٹریچر) اور تعلیم (۳) طبیعیات (۴) قانون (۵) الشرقیات ۔ یہ آخری شعبہ آئندہ سیشن میں تاریخ و آداب کے شعبہ میں ضم کردیا جائے گا ۔ دوسرا اعلیٰ مدرسہ صنعتی کالج ہے ۔ اسمیں بھی پانچ شعبے ہیں اور طلبہ اور طالبات کی تعداد دو ہزار ہے ۔ اس کے بعد موسیقی کالج ہے ۔ اس میں بھی طلبہ اور طالبات کی تعداد سات سو ہے ۔

ثانوی یا سکنڈری مدارس کی تعداد برابر روز افزوں ہے لیکن ان مدارس کے مقصد اور

نصب العین میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔ حکومت کا منشا ہے کہ ان کی حیثیت بالکل مستقل کردیجائے طالب علم جب اس مدارس میں تعلیم ختم کر چکے تو وہ اعلیٰ تعلیم سے مستغنی ہو اور کسی صنعت کسی فن اور کسی علم میں اسے مہارت ہو تاکہ وہ اپنے لئے کوئی کام پیدا کر سکے یا کسی عہدے کے لئے موزوں ہو جو اس کے مستقبل کی خوشگواری کا ضامن ہو۔ غرضکہ ثانوی مدرسوں میں طلبہ کو اعلیٰ مدرسوں یا کالجوں کے لئے تیار نہیں کیا جاتا بلکہ اصلی غرض یہ ہے کہ طلبہ ان مدارس سے فارغ ہو کر عملی زندگی میں داخل ہو جائیں اس طرح کہ صنعت یا فن یا علم میں انہیں کمال حاصل ہو۔ اسی لئے تمام ثانوی مدارس کو جن میں حسب معمول تعلیم ہوتی تھی صنعتی۔ فنی (آرٹ) یا تعلیمی مدارس میں تبدیل کیا جا رہا ہے اس وقت تک اس قسم کے جو مدارس قائم ہو چکے ہیں اُنکے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں :-

نام مدرسہ	تعداد	نام مدرسہ	تعداد
۱۔ تعلیمی مدارس	۱۱	۷۔ اقتصادی اور تجارتی مدارس	۲
۲۔ صنعتی "	۴	۸۔ موسیقی	۳
۳۔ زراعتی "	۶	۹۔ طبی	۳
۴۔ شبینہ " (مزدوروں کیلئے)	۱	۱۰۔ تعلیم التشخیص	۱
۵۔ فنی " (مصوری وغیرہ)	۲	۱۱۔ مدرسۃ النقل	۱
۶۔ مخلوط " (صنعتی اور زراعتی)	۳		

انکے علاوہ مزدوروں اور حرفت پیشہ لوگوں کے لئے اور بھی شبینہ مدارس ہیں جن میں سے بعض وقتی ہیں اور بعض ہمیشہ کھلے رہتے ہیں ایسے مدرسوں کی تعداد ۴۲ ہے اور ان میں حکومت ہر سال بلکہ ہر مہینہ مدرسہ کھولتی رہتی ہے ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء میں ان مدارس میں طلبہ کی تعداد ۱۷،۰۹۹ تھی اور معلمین کی ۶۰۵۔ جمہوریت کی مردم شماری کے اعتبار سے اس وقت حکومت کے مدرسوں میں (تمام مدارس حکومت کے ہیں بجز چند بچوں کے مدرسوں کے

جو چنداں قابل ذکر نہیں) پڑھنے والوں کی تعداد چودہ میں ایک ہے۔ جمہوریت کی نوعمری اور جنگ عظیم سے قبل کی تعلیمی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ بہت غنیمت ہے۔ حکومت جبری تعلیم کی ترویج کے لئے اپنے پورے وسائل صرف کر رہی ہے۔ اخراجات کے معاملے میں بھی وہ بخل سے کام نہیں لیتی۔ اس لئے کہ وہ جانتی ہے کہ ملک کی زندگی صرف تعلیم اور علوم وفنون کی بیش از بیش اشاعت پر ہے۔ اس ملک کی آبادی اور مساحت شام کے برابر ہے لیکن اس کے تعلیمی اخراجات سُنکر آپ کو حیرت ہوگی صرف اس سال (غالباً ۱۹۲۹ء) اس نے تعلیم پر ۲۹ ملین روبل صرف کئے جو تقریباً ۲½ ملین مصری پونڈ کے مساوی ہیں تعلیمی اخراجات کے لئے ملک کے جن اداروں سے جس قدر رقم حاصل کی ہے اس کی تفصیل ذیل میں دیجاتی ہے۔

۷۱۰۰۰۰	روبل	خاص حکومت کے میزانیہ سے
۶۳۴۴۰۰۰	"	بلدیہ باکو کے میزانیہ سے
۷۲۷۰۰۰	"	اضلاع کے میزانیہ سے
۵۷۶۰۰۰	"	بحرِ خزر کی جہازراں کمپنی سے
۱۷۰۰۰۰۰	"	پٹرول کمپنی سے
۲۶۵۰۰۰	"	ریلوے کمپنی سے
۶۰۰۰۰۰	"	
۱۰۰۰۰۰۰	"	

اگر اس ۱۶۰۲۲۰۰۰ کے دوسرے ذرائع آمدنی کو بھی ملا لیا جائے تو کل آمدنی ۲۷ ملین اور ۴۰۳۰۰۰ روبل ہوتی ہے اور اسے ملک کے تمام باشندوں پر تقسیم کیا جائے تو ہر حصہ میں ۱۰ روبل آتے ہیں یعنی ایک مصری پونڈ اور ایسی زبردست رقم ہے جس کی نظیر روس کی دوسری جمہوریتوں میں تو کیا یورپ کے اکثر ممالک میں بھی نہیں ملے گی اور اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس ملک میں تعلیمی تحریک کس تیزی کے ساتھ ترقی کی جانب مائل ہے۔ تیز ملک

کی اجتماعی اور انفرادی زندگی پر اسکا کس قدر زبردست اثر پڑتا ہوگا طلبہ کی تعداد ہر سال بلکہ ہر مہینے بڑھ رہی ہے اسی نسبت سے ملک علمی ادبی صنعتی اور فنی انجمنوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ترکی رسائل واخبارات کی تعداد بھی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

ملک میں ایک بہت بڑی علمی انجمن قائم ہے جو عنقریب اکاڈمی کی حیثیت حاصل کرلے گی اسی طرح تاریخ۔ اقتصادیات ترکی لٹریچر اور موسیقی وغیرہ سے متعلق بہت شاندار اور کامیاب انجمنیں ہیں۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ترقی کی اس دوادوش میں صرف مرد ہی شریک نہیں ہیں بلکہ عورتیں بھی برابر کا حصہ لے رہی ہیں۔ اعلیٰ مدارس میں اس وقت لڑکیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہے صرف طبی شاخ میں دو سو سے زائد لڑکیاں تعلیم پارہی ہیں سرکاری محکموں میں بھی انکی تعداد روزافزوں ہے۔ ترکی عورت آج بالکل آزاد ہے اور تمام کاموں میں مرد کے پہلو بہ پہلو شریک ہے۔

اس مبارک جد وجہد کا نتیجہ یہ ہے کہ تقریبًا تمام مدارس میں تعلیم مفت ہے حکومت اور بعض ادارے اعلیٰ مدارس میں طلبہ کی لاکھوں روپیہ سے مساعدت کرتے ہیں ان طلبہ میں سے ہر ایک نہ صرف مفت تعلیم حاصل کرتا ہے بلکہ حکومت کی جانب سے ۳ سے ۷ پونڈ تک ماہوار وظیفہ بھی دیا جاتا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ذریعۂ تعلیم دیہاتی نیز ثانوی مدارس میں مقامی زبان ہے۔ جنگ عظیم سے قبل ذریعۂ تعلیم روسی زبان تھی لیکن اب حکومت کا ارادہ ہے کہ اعلیٰ مدارس میں بھی ذریعۂ تعلیم مقامی زبان ہو۔ اس وقت تک وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئی ہے اس لئے کہ ماہر ترک اساتذہ کی ہنوز قلت ہے۔ دوسری دقت یہ ہے کہ اذری زبان علمی حیثیت سے بہت کم مایہ زبان ہے اگر عربی اور فارسی اصطلاحات سے مدد نہ لیجاتی تو ثانوی مدارس میں بھی اس کے ذریعہ تعلیم دینا ناممکن ہوتا پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ بیس سال تک یہ مشکل مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔ زبان کی اس دقت کو دور کرنے کے لئے پہلا قدم بڑھادیا گیا ہے چونکہ عربی

رسم الخط ترکی زبان کی اصوات کو ادا کرنے سے قاصر تھے اس لئے اس سال سے اس کے بجائے لاطینی رسم الخط کے استعمال کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ترکی نے بھی اس معاملے میں اسکی تقلید کی ہے۔ روس کی تمام اسلامی جمہوریتیں اسی تجویز پر کاربند ہو رہی ہیں اور غالباً ایران اور افغانستان بھی عنقریب اسی پر عمل کریں گے۔ ترکی اذری (آذربیجان) قوم تہذیب و تمدن کے میدان میں اس وقت یورپین اقوام کا مقابلہ کر رہی ہے اور عنقریب وہ دن آنے والا ہے کہ تمام مشرقی قوموں سے سبقت لے جائے گی۔ حتیٰ کہ عربوں سے بھی جس سے اس نے کسب نور اور جس کے تہذیب و تمدن سے درس شائستگی حاصل کیا تھا اور جس کی علمی اصطلاحات ترکی زبان کے لئے بہترین معاون ثابت ہو رہی ہیں۔

(ملخص الرابطۃ الشرقیہ)

کومبھ میلے کی سیر

الہ آباد ہندوؤں کا ایک بہت متبرک شہر مانا جاتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ یہاں پر "گنگا مائی و جمنا مائی" کا سنگم ہوتا ہے لہٰذا جس جگہ پر دو دریا ملتے ہیں وہ بہت مقدس مانی جاتی ہے اور اس جگہ پر نہانے سے گناہوں کی آلائش دور ہو جاتی ہے۔

یوں تو گنگا اشنان کرنے والے سینکڑوں مرد عورت، بوڑھے، بچے جاتری روز ہی اس نعمت سے مستفیض ہوتے ہیں لیکن سال میں کچھ دن ایسے ہیں کہ اس میں نہانا بہت ہی مقدس سمجھا جاتا ہے جنوری کے مہینہ میں یہاں ہر سال نہان ہوتا ہے اس کو ماگھ کا نہان کہتے ہیں اور اس میں دور دراز سے لاکھوں کی تعداد میں جاتری آتے ہیں اور سنگم میں نہاتے ہیں لیکن ایک بہت بڑا میلہ ہر بارہ سال کے بعد ہوتا ہے اس کو کومبھ کا نہان کہتے ہیں چنانچہ اس سال ۱۴ جنوری ۱۹۳۰ء سے لیکر ۱۴ فروری ۱۹۳۰ء تک یہ نہان کا میلہ رہا اس میلہ کی اتنی دھوم اور شہرت تھی کہ ہندوستان کے بہت ہی دور افتادہ مقامات سے لوگ جوق در جوق الہ آباد آئے ریلوں کی میلہ اسپیشل ان جاتریوں کے لئے مختلف مقامات سے سیکڑوں کی تعداد میں چھوڑی گئیں اس کے علاوہ ہزاروں موٹر لاریوں میں پنجاب اور کشمیر سے الہ آباد آئے۔ بہت ایسے تھے جو کئی ہفتہ کی پیدل مسافت طے کر کے نہان کے شوق میں میلہ میں پہنچے۔ چنانچہ حال ہی کے ٹائمس آف انڈیا کے پرچے میں ایک سادھو کی تصویر دکھائی گئی ہے جو زمین پر لڑھکتا ہوا کوچین سے یہاں پہنچا ہے شاید اس ریاضت میں کچھ زیادہ ثواب ملتا ہو۔ کچھ سال سے گنگا اور جمنا کا اتصال قلعہ کے پاس شاہی زمانے کے بند کے پاس ہوتا تھا اور یہ جگہ بہت تنگ ہوتی تھی۔ نتیجہ اسکا یہ ہوتا تھا کہ لاکھوں آدمی جب اس جگہ جمع ہو کر دھکا پیل کر کے نہانے کی کوشش کرتے تھے تو بہت سے بچے اور عورتیں کچل جاتے تھے مگر کچھ سال سے گنگا نے اپنا رُخ بدل دیا ہے اور جمنا سے قلعہ سے قریب دو میل کے فاصلہ

پڑتی ہے اور یہ دو میل کا ٹکڑا سوکھا چھوٹا ہوا ہے اس لئے ایک بہت بڑا وسیع میدان زائرین
اور تماشائیوں کے لئے چھوٹ گیا ہے۔ اس سال گورنمنٹ اور الہ آباد میونسپلٹی نے بھی بہت
فراخدلی سے روپیہ انتظام کے لئے صرف کیا تھا گورنمنٹ نے قریب ۵ لاکھ اور میونسپلٹی نے بھی
بہت کچھ صرف کیا۔ کئی سو ڈاکٹر مختلف ریلوے جنکشنوں پر اور میلے کے میدان میں مقرر تھے کیونکہ پچھلے
تجربات کی بنا پر اسکا بہت اندیشہ تھا کہ کہیں اس موقعہ پر ہیضہ یا کوئی اور وبا نہ پھیل جائے اور ایک
نئی بات اس سال یہ بھی تھی کہ بجائے مٹی کے تیل کی لالٹینوں کے میلہ میں بجلی کی روشنی
لگائی گئی تھی اور کثرت سے پانی کے نل لگائے گئے تھے۔ جس سے پانی کی کوئی دقت نہیں
ہوئی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ نل کا ٹھیکہ میرے دوست حافظ غضنفراللہ صاحب کے پاس تھا جن کا
انتظام نہایت قابل اطمینان تھا میرے دوست اس معاملے میں بہت تجربہ کار ہیں کیونکہ علاوہ
الہ آباد لکھنؤ کے اور دیگر شہروں کے واٹر ورکس بنانیکے خود میلے کے واٹر ورکس کے ٹھیکہ کا کام
زاید از بارہ سال سے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ اس سال چار خاص
نہان کے دن تھے ایک تو شروع یعنی ۱۴ جنوری کا دوسرا ۲۹ جنوری کا اور تیسرا ۱۴ فروری
بسنت کا اور پھر آخری ۱۴ فروری کا یہاں ایک میرے دوست مسٹر شفیع اللہ خاں ہیں جو
ایک کامیاب وکیل ہیں اور جو میلہ دیکھنے کے اس درجہ دھتی اور شائق ہیں کہ سب کام ایک
طرف اور میلہ دیکھنا ایک طرف مگر خیریت یہ ہوئی کہ ان متذکرہ بالا چاروں دنوں میں تمام دفاتر
اور کچہریوں میں تعطیل تھی ورنہ کیا عجب تھا کہ یہ حضرت میلے کے دیکھنے کے جنون میں کچہری ہی کی
چھٹی کر دیتے۔ چونکہ یہ پہلا موقعہ میرا اس نہان دیکھنے کا تھا میں اپنے دوست کے ساتھ ۱۴ جنوری
کو گیا۔ ہم لوگوں کے ساتھ ایک اور دوست بھی ہو گئے مگر میں اور مسٹر شفیع اللہ خاں تو سوٹ بوٹ
میں تھے اور دوسرے صاحب شیروانی پاجامہ اور رامپوری ٹوپی میں تھے۔ یہاں پر اس کا ذکر
کر دینا مناسب ہوگا کہ میلہ میں علاوہ پولیس کے انتظام کے سیوا سمتی اور دیگر ہند و جماعتوں
مثلاً مہابیر دل وغیرہ کے بھی والنٹیر موجود تھے چنانچہ ہم تینوں کئی گھنٹے تک میلے میں گھومتے

رہے اس کے بعد ایک سیوا سمتی کے والنٹیر آئے اور ہم لوگوں سے جو سوٹ بوٹ میں تھے کہنے لگے
کہ صاحب آپ لوگوں سے تو ہم کچھ نہیں کہتے البتہ آپ کے ساتھ جو اور صاحب ہیں وہ میلہ میں
نہیں پھر سکتے۔ جب اُن سے وجہ دریافت کی تو کہنے لگے مسلمانوں کو میلے میں پھرنے کی اجازت
نہیں ہے ہم نے کہا کہ کس کی اجازت نہیں ہے کہنے لگے کلکٹر صاحب کا حکم ہے ہم نے کہا
دکھاؤ کہاں ہے تو کہنے لگے میرے پاس نہیں ہے بلکہ خیمہ میں ہے غرض جب ہم لوگوں نے
نہیں مانا تو پھر وہ ایک کانسٹبل سے کچھ کہنے لگے ہم نے اُس کانسٹبل کو بلایا اور اُس سے
پوچھا کہ کیا کوئی حکم ایسا ہے جس میں مسلمانوں کو میلہ میں پھرنے کی ممانعت ہے تو اس نے کہا
کہ ہمیں نہیں معلوم یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ والنٹیر چپکے سے کھسک گئے پھر اور تحقیق سے
معلوم ہوا کہ ایسا کوئی حکم نہیں ہے اور نہ ایسا کوئی قانونی حکم دیا جا سکتا ہے۔ اس واقعہ سے
ہمیں اپنے برادران وطن کی تنگ نظری کو دیکھکر افسوس اور حیرت ہوئی کہ اگر کوئی غیر ہندو
انگریزی ہیٹ میں چلا جائے تو کچھ نہیں لیکن اگر کوئی غریب مسلمان ٹرکش یا اور کوئی ٹوپی پہن کر
جائے تو اس کو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غلامی کی ذہنیت کی اس سے بڑھکر اور کیا
مثال ہو سکتی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سیوا سمتی کے والنٹیرس نے اکثر مسلمانوں کو کلکٹر کے
حکم کی دھمکی دے کر میلہ سے باہر جانے پر مجبور کیا وہ غریب سیدھے سادے مسلمان یہ سمجھے
کہ واقعی کوئی ایسا حکم کلکٹر کا ہوگا اور میلے سے باہر چلے گئے۔

اب ذرا میلہ کا حال سنئے۔ یوروپین تہذیب پر انگشت نمائی کرنے والے اور اُنکی پوشاک
پر اعتراض کے شائقین آئیں اور اس میلے میں ذرا اپنی تہذیب کا نمونہ دیکھیں۔ جیسا پبلک نظارہ
یہاں پر پیش کیا گیا ویسا تو یورپ کے کونوں کی خاک چھاننے پر بھی پبلک میں نہیں مل سکتا۔
ہزارہا برہنہ سادھو جن کے بدن پر ایک چیتھڑا بھی نہیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک
دھونی رمائے بیٹھے ہیں اور اُن میں سے اکثر بالکل جوان ہیں لاکھوں عورتیں اور لڑکیاں
نہ صرف ادہر سے گذرتی ہیں بلکہ بہت اُنکے پاؤں چھوتی ہیں اور نذریں پیش کرتی ہیں وہ سادھو

صاحب انکو ایک چٹکی راکھ کی دیتے ہیں جو یہ عورتیں نہایت خوشی سے ایک متبرک چیز سمجھ کر
لے لیتی ہیں۔

الہ آباد میں ہندوؤں کے دیگر مقدس متبرک مقامات میں سادھوؤں کے اکھاڑے
یا جمعیتیں (Societies) ہیں جو اکثر رجسٹرڈ ہیں اور لین دین اور دیگر کاروبار کرتی
ہیں۔ یہ اکھاڑے بہت مالدار ہیں انکے پاس ہاتھی ہیں موٹریں ہیں اونٹ ہیں اور ہر ایک کے
لئے زرق برق کا سامان موجود ہے۔ ان کے مہنت اور دیگر پیرووں کے پاس مرصع کام
کے لباس ہیں اور نہایت جگمگاتے زرین کام کے بڑے بڑے چھتر ہیں جس کو ان کے پیرو
جلوس میں ان حضرات پر لگاتے ہیں۔ بند سے اترتے ہی بائیں جانب ان اکھاڑوں کے
بڑے بڑے احاطے تھے اور ان میں انکے ڈیرے و شامیانے لگے ہوئے تھے جہاں پر
دن میں اکثر اوقات بھجن وغیرہ ہوتے تھے اکھاڑوں کے ختم ہونے کے بعد پیتل کے ظروف
اور ہندی کتابوں کی دوکانیں تھیں اُن کے بعد برہنہ سادھوؤں کے جن کا ذکر اوپر کر چکا ہوں
اڈے تھے۔ یہ لوگ بھبوت ملے باقی چھتریوں کے نیچے یا اوپر کپڑوں کے نیچے بیٹھے ہوئے
تھے پاس جلانے کی لکڑیاں رکھی تھیں انکو جلا کر رات بسر کرتے تھے۔ ہر ایک کے پاس مالا تھی
جو تلسی کے پیڑ کی کہی جاتی تھی اس کو یہ جپا کرتے تھے۔

شروع میلے کے دن میں اپنے میلے کے شیدا دوست کے ساتھ کوئی دس بجے دن
کے پہنچا اُس دن موٹر لاریاں تانگے وغیرہ بند سے بہت دور روک دیئے گئے تھے برخلاف
اور دنوں کے جب یہ سواریاں بند تک جا سکتی تھیں اور موٹر اور تانگے ایک مقررہ فیس دے کر
یا پاس سے بند کے نیچے بھی جا سکتے تھے مگر میلے کے دن ہم لوگوں کی موٹر بہت دور روک
دی گئی اور ہم لوگوں کو پیدل چلنا پڑا اُس دن مجمع بھی خاصا تھا پیدل چلنے والوں کی کثرت
سے خاک بھی اچھی اُڑ رہی تھی چنانچہ ہم لوگ بھی پیدل چلکر میلے کے رقبے میں داخل ہوئے وہاں
جاکر دیکھا کہ بند سے کچھ نیچے ہی سے بانس گاڑ کر رسیاں باندھ دی گئی تھیں اور ایک راستہ
قریب سنگم تک کا بنا دیا گیا تھا۔ ان رسیوں کے اندر کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ یہ راستہ

مختلف اکھاڑوں کے جلوس کے لئے مخصوص تھا اور جا بجا پولیس اور سیوا سمتی کے والنٹیر کھڑے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا اس دن قریب چار یا پانچ چھ بجے صبح سے مختلف اکھاڑوں کے جلوس نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ ہر ایک اکھاڑے کا وقت مقرر کر دیا گیا تھا وہ اپنے وقت پر ہاتھی اونٹ موٹر وغیرہ کے جلوس کے ساتھ نکلتا تھا اس کے ساتھ پولیس کے افسران اور کچھ مجسٹریٹ ہوتے تھے۔ جب ایک اکھاڑہ نہا کر واپس ہوتا تو دوسرا جاتا تھا یہ انتظام اس وجہ سے کیا گیا تھا کہ بعض وقت ان اکھاڑوں میں آپس میں بحث ہو جاتی تھی اور ہر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتا تھا اس میں نقص امن کا اندیشہ رہتا تھا اس لئے ہر ایک کا وقت مقرر کر دیا گیا تھا ان رسیوں کی حدود سے ملی ہوئی عورتوں، لڑکیوں اور کہیں کہیں مردوں کی قطار دو رویہ بیٹھی تھی ہر اکھاڑے کے جلوس کے آگے بقول اخبار پانیر الہ آباد کے "سادھو ہوتے تھے جنکا تقدس اتنا زیادہ تھا کہ انکو کسی قسم کے کپڑوں کی ضرورت نہیں تھی" انکے پیچھے کچھ پٹے باز ہوتے تھے جو تلوار اور لکڑی کے کھیل کرتے جاتے تھے پھر انکے پیچھے مرصع ہاتھیوں کے ہودوں میں مہنتھ جن کے اوپر زرق برق کے چھاتے لگے ہوتے تھے وہ نکلتے تھے اور ان کے آگے سنکھ بھی بجتا جاتا تھا اور بعض بعض اکھاڑوں کے جلوس میں موٹریں بھی ہوتی تھیں۔ یہ سادہ لوح عورتیں لڑکیاں اور مرد جو دو رویہ رسی سے لگے ہوئے بیٹھے تھے جیسے ہی کوئی اکھاڑہ پاس سے گذرتا تھا ایکدم جھپٹ جھپٹ کر انکے پاؤں سے روندی ہوئی مٹی کے لینے کی کوشش کرتے تھے ان کے نزدیک وہ مٹی بھی جو انکے پاؤں کے نیچے آگئی تھی متبرک ہو گئی تھی یہاں پر بھی برملا یہ برہنہ سادھو ان عورتوں کے غول کے سامنے سے گذرتے تھے۔ مگر یہ حیا سوز نظارہ مذہب کے نام سے روا تھا۔ غرض یہ اکھاڑے یکے بعد دیگرے اپنی اپنی باری سے سنگم جاتے تھے اور اشنان کر کے اپنے جائے قیام کو واپس ہوتے تھے اس کا سلسلہ قریب ایک بجے دن تک رہا۔ اس وقت نہان کا زور شور ختم ہوا۔ میں اور میرے دوست شام تک وہیں رہے اور کئی تہیں گرد کی کپڑوں اور منہ پر بیٹھ گئی گھر لوٹ

کر نہانے جب جا کر یہ کثافت دور ہوئی۔ یہ تو پہلے دن کی داستان ہوئی۔

اب ۲۹ر کا یعنی اصل کومبہ میلے کا حال سنئے چونکہ ہم لوگوں کو معلوم تھا کہ اس دن مجمع بہت زیادہ ہوگا اس لئے سویرے سے چلنے کا قصد کیا اس سال ایسٹ انڈین ریلوے نے ایک اسٹیشن سنگم کے قریب اشنان کرنے والوں کی سہولت کے لئے بنوا دیا تھا اور الٰہ آباد جنکشن سے سنگم تک میلہ اسپیشل جاتی تھی چنانچہ ہم لوگوں نے اس دفعہ ریل سے میلے جانے کا ارادہ کیا اور ٹکٹ خرید کر اندر پہنچے وہاں کیا دیکھتے ہیں ہر گاڑی میں مسافر کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں اور تل رکھنے کو جگہ نہیں ہے مجبوراً پلیٹ فارم سے باہر آئے اور موٹر لاری سے جانے کا ارادہ کیا۔ لاری والوں کی اس دن بن آئی تھی۔ انہوں نے معمول سے چھ گنے دام مانگے کچھ بات چیت کے بعد چار گنے پر لیجانے کو راضی ہوئے اب ہم لوگ لاری میں بیٹھ کر روانہ ہوئے جوں جوں میلے کے قریب پہنچتے جاتے تھے آدمیوں، موٹروں، لاریوں، یکوں، تانگوں کا ہجوم بڑھتا جاتا تھا۔ میلے سے قریب پون میل سیکڑوں بیل گاڑیاں بھی کھڑی ہوئی تھیں جن میں دیہات سے لوگ بہ کثرت اس دن صبح یا رات کو آگئے تھے جدھر نظر جاتی تھی آدمیوں کے غول کے غول دکھائی دیتے تھے۔ سواریوں کی یہ کثرت تھی کہ ہماری لاری بہت دور کھڑی ہوگئی اور اس کے آگے اور پیچھے لاریوں موٹروں وغیرہ کی ایک لمبی لائن کھڑی ہوگئی کچھ دیر انتظار کیا کہ اب آگے کا راستہ صاف ہو تو چلے مگر دس بیس یا پچاس ہوں تو کچھ امید ہو جب دیکھا کہ جلدی راستہ صاف ہونے کی کوئی امید نہیں ہے تو لاری میں سے اتر گئے اور پیدل چلنا شروع کیا۔ آدمیوں کا ہجوم جیسے جیسے بند تک بڑھتے گئے زیادہ ہوتا گیا۔ اس دن نہان اور سویرے سے شروع ہوگیا تھا اور ایک بہت بڑی تعداد لوگوں کی نہا کر لوٹ رہی تھی۔ ان لوگوں کا ایک سلسلہ تھا جو ختم ہونے میں نہیں آتا تھا جب بند کے قریب پہنچے ہیں تو ہر طرف سے آدمیوں کے ہجوم میں گھر گئے خیر اسی رو کے ساتھ جو نہان کو جا رہی تھی ہم لوگ بھی ہو گئے پچھلے تجربے کی بنا پر ہماری کل پارٹی اس مرتبہ بیٹ اور سوٹ میں

تھی چنانچہ اس دن کسی نے بھی نہیں ٹوکا کیونکہ یورپین پوشاک کا پاسپورٹ موجود تھا بند کے اوپر جب ہم لوگ پہنچے اور وہاں سے میلے کے میدان کو دیکھا ہے تو حیرت ہو گئی اس قدر آدمیوں کا جم غفیر تھا کہ اس سے پہلے میں نے باوجود اپنی حال ہی کی یورپ کے بہت بڑے بڑے شہروں کے سیاحت کے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جدہر نظر جاتی تھی میلوں تک انسانوں کا سمندر لہریں مارتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ہر طرف لاتعداد انسانی سر ہی سر نظر آتے تھے۔ حیرت اور تعجب سے اس نظارے کو تھوڑی دیر تک دیکھا اس کے بعد ہی پیچھے کی ایک زبردست رو نے آگے بڑھنے پر مجبور کیا۔ اسی طرح بند کے نیچے کوئی آدھ میل تک گئے اس کے بعد ہجوم اور خاک کی کثرت سے دم گھٹنے لگا۔ آدمیوں کی کثرت سے آسماں پر خاک کا ایک بادل چھایا ہوا تھا۔ اس کشمکش سے تنگ آکر اس بات کی کوشش کی کہ چلو کہیں سے کشتی لیکر دریا پر چلیں مگر کشتی تک پہنچنا اتنا ہی زبردست مرحلہ تھا جتنا کہ اس مجمع میں پیدل چلنا ناچار اس سے بھی مایوسی ہوئی اور پھر بادل ناخواستہ واپس لوٹنا پڑا اس دن اندازہ کیا جاتا ہے کہ کم از کم ۳۰ لاکھ سے اوپر مجمع ہوگا!

اگر وہ لوگ جو اس زمانے میں بے دینی اور لامذہبیت کی بڑھتی ہوئی رو کو دیکھکر یہ خیال کرتے ہیں کہ مذہب اب کچھ دن کا مہمان ہے ۲۹ رجنوری کے ہجوم کو دیکھتے تو ان کو اس بات کو ماننا پڑتا کہ مذہب اب بھی ایک زبردست قوت ہے اور یہ قوت اتنی جلدی نہیں توڑی جا سکتی جیسا یہ خیال کرتے ہیں۔ وہ کیا قوت تھی جو ان لکھوکھا آدمیوں کو ہندوستان کے مختلف گوشوں سے کھینچ لائی اور ایک جگہ جمع کر دیا۔ اس میں سے ایک بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو یہ جانتے ہی نہیں کہ پیٹ بھر کھانا کیسا ہوتا ہے اور پورا تن ڈھکنا کسے کہتے ہیں۔ اس سے زبردست اور پر اثر نظارہ دنیا کے سامنے حج کے دنوں میں پیش ہوتا ہے جب دنیا کے ہر حصہ سے لاکھوں کی تعداد میں مسلمان عرب کے ریگستان کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں اور خانہ کعبہ میں اپنے خالق اکبر کے سامنے جھک جاتے

ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ آج مذہب کی اصلی روح ہندو اور مسلمانوں کے بڑے حصہ میں مفقود ہے اور وہ آج ملک کی بہبودی۔ رواداری ۔قومی ہمدردی کے بجائے مذہب کا نام لے کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے ہیں۔ کاش یہ دونوں قومیں اپنے اپنے مذہب کی اصلیت پر غور کریں تو ان کو معلوم ہوگا کہ وہ مذہب سے کتنی دور جا پڑی ہیں اور مذہب کے پردے میں ملک کے مفاد کو کس بے دردی سے نقصان پہنچا رہی ہیں ہندوستان اس وقت اپنی تاریخ کے ایک بہت پرخطر دور سے گذر رہا ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں قومیں بجائے ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے متحد ہو کر اپنے وطن کی بہبودی کی فکر کریں۔

گرمیوں کی ایک رات

منشی برکت علی عشاء کی نماز پڑھ کر چہل قدمی کرتے ہوئے امین آباد پارک تک چلے آئے گرمیوں کی رات ہوا بند تھی۔ شربت کی چھوٹی چھوٹی دوکانوں کے پاس لوگ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ لونڈے چیخ چیخ کر اخبار بیچ رہے تھے۔ بیلے کے ہار والے ہر بھلے مانس کے پیچھے ہار لیکر لپکتے۔ چوراہے پر تانگہ اور یکہ والوں کی لگاتار پکار جاری تھی۔

"چوک! ایک سواری چوک! میاں چوک پہنچا دوں!"

"اے حضور کوئی تانگہ وانگہ چاہیئے!"

"ہار بیلے کے! گجرے موتئے کے!"

"کیا ملائی کی برف ہے!"

منشی جی نے ایک ہار خریدا، شربت پیا اور پان کھا کر پارک کے اندر داخل ہوئے۔ بنچوں پر بالکل جگہ نہ تھی۔ لوگ نیچے گھاس پر لیٹے ہوئے تھے۔ چند بے سرے گانے کے شوقین ادھر اُدھر شور مچا رہے تھے۔ بعض آدمی چپ بیٹھے اپنی دھوتیاں کھسکا کر بڑے اطمینان سے اپنی ٹانگیں اور رانیں کھجانے میں مشغول تھے۔ اسی دوران میں وہ مچھروں پر بھی جھپٹ جھپٹ کر حملے کرتے جاتے تھے۔ منشی جی چونکہ پائجامہ پوش آدمی انہیں اس بدتمیزی پر بہت غصہ آیا۔ اپنے جی میں انہوں نے کہا کہ ان کمبختوں کو کبھی تمیز نہ آئے گی۔ اتنے میں ایک بنچ پر سے کسی نے انہیں پکارا۔

"منشی برکت علی!"

منشی جی مڑے

"اخاہ لالہ جی آپ ہیں۔ کہئے مزاج تو اچھے ہیں!"

منشی جی جس دفتر میں نوکر تھے لالہ جی اُس کے ہیڈ کلرک تھے۔ منشی جی انکے ماتحت تھے۔

لالہ جی تے جوتے اتار دئے تھے، اور بنچ کے بیچوں بیچ میں پیر اٹھا کر اپنا بھاری بھرکم جسم لئے بیٹھے تھے۔ وہ اپنی توند پر زمی سے ہاتھ پھیرتے جاتے اور اپنے ساتھیوں سے، جو بنچ کے دونوں کونوں پر ادب سے بیٹھے ہوئے تھے، چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ منشی جی کو جاتے دیکھ کر انہوں نے انہیں بھی پکار لیا۔ منشی جی لالہ صاحب کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

لالہ جی ہنس کے بولے: ”کہو منشی برکت علی یہ بار وار خریدے ہیں، کیا ارادے کیا ہیں!“ اور یہ کہکر زور سے قہقہہ لگا کر اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف داد طلب کرنے کو دیکھا۔ انہوں نے بھی لالہ جی کا منشا دیکھکر ہنسا شروع کیا۔

منشی جی بھی روکھی پھیکی ہنسی ہنسے: ”جی ارادے کیا ہیں ہم تو آپ جانئے غریب آدمی ٹھہرے۔ گرمی کے مارے دم نہیں لیا جاتا۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ یہ ہار لے لیا شاید دو گھڑی آنکھ لگ جائے“

لالہ جی نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہنسے: ”شوقین آدمی ہو مفلسی کیوں نہ ہو!“ اور یہ کہہ کر پھر اپنے ساتھیوں سے گفتگو میں مشغول ہو گئے۔

منشی جی نے موقعہ غنیمت جانکر کہا ”اچھا لالہ جی چلتے ہیں، آداب عرض ہے“ اور یہ کہکر آگے بڑھے۔ دل ہی دل میں کہتے تھے کہ دن بھر کی گھس گھس کے بعد یہ لالہ کمبخت سر پڑا۔ پوچھتا ہے ارادے کیا ہیں! ہم کوئی رئیس اور تعلقہ دار ہیں کہیں سے کہ رات کو بیٹھ کر مجرا سنیں اور کوٹھوں کی سیر کریں جیب میں کبھی چونی سے زیادہ ہو بھی سہی، بیوی، بچے، سات روپیہ مہینہ، اوپر سے آمدنی کا کچھ ٹھیک نہیں، آج نہ جانے لیا تھا جو ایک روپیہ مل گیا۔ یہ دیہاتی اہل معاملہ کمبخت روز بروز چالاک ہوتے جاتے ہیں۔ گھنٹوں کی جھک جھک کے بعد جیب سے ٹکا نکالتے ہیں۔ اور پھر سمجھتے ہیں کہ غلام خرید لیا، سیدھے بات نہیں کرتے کمینہ نیچے درجے کے لوگ انکا سر پھر گیا ہے۔ آفت ہم بیچارے شریف سفید پوشوں کی ہے۔ ایک طرف تو نیچے درجے کے لوگوں کے مزاج نہیں ملتے۔ دوسری طرف بڑے صاحب اور

سرکاری سختی بڑھتی جاتی ہے۔ ابھی دو مہینے کا ذکر ہے۔ بنارس کے ضلع میں دو محرر بیچارے رشوت ستانی کے جرم میں برخاست کر دئے گئے۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے غریب بیچارہ پھنستا ہے بڑے افسر کا بہت ہوا تو ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ ہو گیا۔

منشی جی صاحب! کسی نے بازو سے پکارا۔ جمن چپراسی کی آواز

منشی جی نے کہا؛ "اخاہ تم ہو جمن!"

مگر منشی جی چلتے رہے۔ رکے نہیں پارک سے مڑ کر نظیر آباد میں میں پہنچ گئے۔ جمن ساتھ ساتھ ہو لیا۔ دبلے پتلے، پستہ قد، مخمل کی کشتی نما ٹوپی پہنے، ہاز ہاتھ میں لئے آگے آگے منشی جی اور اُن سے قدم دو قدم پیچھے بڑا صافہ باندھے، چکن پہنے قوی ہیکل لمبا چوڑا چپراسی جمن۔

منشی جی نے سوچنا شروع کیا کہ آخر اس وقت جمن کے میرے ساتھ ساتھ چلنے میں کیا مقصد کیا ہے۔

"کہو بھئی جمن، کیا حال ہے۔ ابھی پارک میں ہڈ کلارک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی وہ بھی گرمی شکایت کرتے تھے۔"

اجی منشی جی کیا عرض کروں۔ ایک گرمی صرف تھوڑی ہے جو مارے ڈالتی ہے۔ ساڑھے چار پانچ بجے دفتر سے چھٹی ملی۔ اس کے بعد سیدھے وہاں سے بڑے صاحب کے ہاں گھر پر حاضری دینی پڑی۔ اب جا کر وہاں سے چھٹکارا ہوا تو گھر جا رہا ہوں۔ آپ جانئے کہ دس بجے صبح سے رات کے آٹھ بجے تک دوڑ دھوپ رہتی ہے۔ کچہری کے بعد تین دفعہ دوڑ دوڑ کر بازار جانا پڑا۔ برف۔ ترکاری، پھل سب خرید کے لاؤ اور اوپر سے ڈانٹ الگ پڑتی ہے، آج داموں میں ٹکا زیادہ کیوں ہے اور یہ پھل سڑے کیوں ہیں۔ آج جو آم خرید کے لے گیا تھا وہ بیگم صاحب کے پسند نہیں آئے۔ واپسی کا حکم ہوا۔ میں نے کہا، حضور: اب رات کو بھلا یہ واپس کیسے ہوں گے تو جواب ملا ہم کچھ نہیں جانتے کوڑا تھوڑی

خریدنا ہے۔ سو حضور یہ روپیہ کے آم گلے پڑے۔ آم والے کے ہاں گیا تو ایک تو تو میں میں کرنی پڑی۔ روپیہ کے آم بارہ آنے میں واپس ہوئے چونی کی چوٹ پڑی۔ مہینہ کا ختم، اور گھر میں حضور منشی جی قسم لے لیجئے جو سوکھی روٹی بھی کھانے کو ہو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں اور کونسا منہ لیکر جورو کے سامنے جاؤں۔"

منشی جی گھبرائے۔ آخر جمن کا منشا اس ساری داستان کے بیان کرنے سے کیا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ غریب تکلیف اٹھاتے ہیں اور بھوکے مرتے ہیں۔ مگر منشی جی کا اس میں کیا قصور؟ ان کی زندگی خود کون بہت آرام سے کٹتی ہے۔ منشی جی کا ہاتھ بے ارادے اپنی جیب کی طرف گیا۔ وہ روپیہ جو آج انہیں اوپر سے ملا تھا صحیح سلامت جیب میں موجود تھا۔

"ٹھیک کہتے ہو میاں جمن، آج کل کے زمانے میں غریبوں کی مرن ہے جسے دیکھو یہی رونا روتا ہے، کچھ گھر میں کھانے کو نہیں۔ سچ پوچھو تو سارے آثار بتاتے ہیں کہ قیامت قریب ہے۔ دنیا بھر کے جعلئے فریبی تو چین سے مزے اڑاتے ہیں اور جو بیچارے اللہ کے نیک بندے ہیں انہیں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کرنی ہوتی ہے۔"

جمن چپ چاپ منشی جی کی باتیں سنتا انکے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ منشی جی یہ سب کہتے تو جاتے تھے مگر ان کی گھبراہٹ بھی بڑھتی جاتی تھی۔ معلوم نہیں ان کی باتوں کا جمن پر کیا اثر ہو رہا تھا۔

"کل جمعہ کی نماز کے بعد مولانا صاحب نے آثار قیامت پر وعظ فرمایا۔ میاں جمن سچ کہتا ہوں، جس جس نے سنا اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بھائی دراصل یہ ہم سب کی سیاہ کاریوں کا نتیجہ ہے۔ خدا کی طرف سے جو کچھ عذاب ہم پر نازل ہو وہ کم ہے، کونسی برائی ہے جو ہم میں نہیں؟ اس سے کم قصور پر اللہ نے بنی اسرائیل پر جو مصیبتیں نازل کیں ان کا خیال کر کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر وہ تو تم جانتے ہی ہوگے۔"

جمن بولا "ہم غریب آدمی منشی جی، بھلا یہ سب علم کی باتیں کیا جانیں۔ قیامت کے بارے

میں تو یں نے سنا ہے مگر حضور آخر یہ بنی اسرائیل بیچارے کون تھے ؟ "

اس سوال کو سن کر منشی جی کو ذرا سکون ہوا ۔ خیر، غریب اور فاقے سے گذر کر اب قیامت اور بنی اسرائیل تک گفتگو کا سلسلہ پہنچ گیا تھا ۔ منشی جی خود کافی طور پر اس قبیلے کی تاریخ سے واقف نہ تھے مگر ان مضمون پر گھنٹوں باتیں کر سکتے تھے ۔

" ایں ! واہ میاں جمن واہ ، تم اپنے کو مسلمان کہتے ہو اور یہ نہیں جانتے کہ بنی اسرائیل کس چڑیا کا نام ہے ۔ میاں سارا کلام پاک بنی اسرائیل کے ذکر سے تو بھرا پڑا ہے حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا نام بھی تم نے سنا ہے ؟ "

" جی کیا فرمایا آپ نے ؟ کلیم اللہ ؟ "

" ارے بھئی حضرت موسیٰ ۔ مو . . . . سا ۔ "

" موسا . . . . وہی تو نہیں جن پر بجلی گری تھی ؟ "

منشی جی زور سے ٹھٹھا مار کر ہنسے ۔ اب انہیں بالکل اطمینان ہو گیا ۔ چلتے چلتے وہ قیصر باغ کے چوراہے تک بھی آپہنچے تھے ۔ یہاں پر تو ضرور ہی اس بھوکے چپراسی کا ساتھ چھوٹے گا ۔ رات کو اطمینان سے جب کوئی کھانا کھا کر، نماز پڑھ کر، دم بھر کی دلبستگی کے لئے چہل قدمی کو نکلے ، تو ایک غریب بھوکے انسان کا ساتھ ساتھ ہو جانا جس سے پہلے کی واقفیت بھی ہو، کوئی خوشگوار بات نہیں ۔ مگر منشی جی آخر کرتے کیا ؟ جمن کو کتے کی طرح دھتکار تو سکتے نہ تھے ۔ کیونکہ ایک تو کچہری میں روز کا سامنا ۔ دوسرے دھیجے درجے کا آدمی ٹھہرا ، کیا ٹھیک ، کوئی بدتمیزی کر بیٹھے تو سر بازار خواہ مخواہ کو اپنی بنی بنائی عزت میں بٹہ لگے بہتر یہی تھا کہ اب اس چوراہے پر پہنچ کر دوسری راہ لیجائے اور یوں اس سے جھٹکا را ہو

" خیر، بنی اسرائیل اور موسیٰ کا ذکر میں تم سے پھر کبھی پوری طرح کروں گا ۔ اس وقت تو ذرا مجھے ادھر کام سے جانا ہے . . . سلام میاں جمن "

یہ کہکر منشی جی قیصر باغ کے سینما کی طرف بڑھے ۔ منشی جی کو یوں تیز قدم جاتے دیکھکر

پہلے تو جمن ایک لمحہ کے لئے اپنی جگہ پر کھڑا کا کھڑا رہ گیا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ آخر کرے تو کیا کرے۔ اس کی پیشانی پر پسینے نے قطرے چمک رہے تھے۔ اسکی آنکھیں ایک بے معنی طور پر ادہر اُدھر مڑتیں۔ تیز بجلی کی روشنی، فوارہ، سینما کے اشتہار، ہوٹل، دوکانیں، موٹر، تانگے، یکے اور سب کے اوپر تاریک آسمان اور جھلملاتے ہوئے ستارے غرض خدا کی ساری بستی۔

دوسرے لمحہ میں جمن منشی جی کی طرف لپکا۔ وہ اب کھڑے سینما کے اشتہار دیکھ رہے تھے اور بیحد خوش تھے کہ جمن سے جان چھوٹی۔

جمن نے انکے قریب پہنچ کر کہا "منشی جی"

منشی جی کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ ساری مذہبی گفتگو، ساری قیامت کی باتیں سب بیکار گئیں۔ منشی جی نے جمن کو کچھ جواب نہیں دیا۔

جمن نے کہا "منشی جی اگر آپ اس وقت مجھے ایک روپیہ قرض دے سکتے تو میں ہمیشہ . . . . "

منشی جی مڑے "میاں جمن میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت تنگی میں ہو۔ مگر تم تو خود جانتے ہو کہ میرا اپنا کیا حال ہے۔ روپیہ تو روپیہ ایک پیسہ تک میں تمہیں نہیں دے سکتا۔ اگر میرے پاس ہوتا تو بھلا تم سے چھپانا تھوڑا ہی تھا۔ تمہارے کہنے کی بھی ضرورت نہ ہوتی پہلے ہی جو کچھ ہوتا تمہیں دے دیتا۔"

باوجود اس کے جمن نے اصرار شروع کیا "منشی جی قسم لے لیجئے میں ضرور آپ کو تنخواہ ملتے ہی واپس کر دوں گا۔ سچ کہتا ہوں حضور اس وقت کوئی میری مدد کرنے والا نہیں . . . . . . "

منشی جی اس جھک جھک کے بہت گھبراتے تھے۔ انکار چاہے وہ سچا ہی کیوں نہ ہو تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تو وہ شروع سے چاہتے تھے کہ یہاں تک نوبت ہی نہ آئے۔

اتنے میں سنیما ختم ہوا اور تماشائی اندر سے نکلے۔

"ارے میاں برکت، بھئی تم کہاں ہو!" کسی نے پہلو پکارا۔ منشی جی جمن کی طرف سے ادہر مڑے۔ ایک صاحب موٹے تازے، تیس پینتیس برس کے۔ انگرکھا اور دوپلی ٹوپی پہنے، پان کھائے، سگریٹ پیتے ہوئے منشی جی کے سامنے کھڑے تھے۔ منشی جی نے کہا:

"اخاہ تم ہو! برسوں کے بعد ملاقات ہوئی۔ تم نے لکھنؤ تو چھوڑ ہی دیا، مگر بھائی کیا معلوم آتے بھی ہوگے تو ہم غریبوں سے کیوں ملنے لگے!"

یہ منشی جی کے پرانے کالج کے ساتھی تھے۔ روپے، پیسے والے رئیس آدمی وہ بولے:

"خیر یہ سب باتیں تو چھوڑو۔ میں دو دن کے لئے یہاں آیا ہوں۔ ذرا لکھنؤ میں تفریح کے لئے۔ چلو اس وقت میرے ساتھ چلو تمہیں وہ مجرا سنواؤں کہ عمر بھر یاد کرو۔ میری موٹر موجود ہے۔ اب زیادہ مت سوچو، بس چلے چلو۔ سنا ہے تم نے کبھی نور جہاں کا گانا؟ اہا ہا ہا کیا گاتی ہے کیا بتاتی ہے، کیا ناچتی ہے۔ وہ ادا وہ بھبن، اس کی کمر کی لچک، اس کے پاؤں کے گھنگھرو کی جھنکار! میرے مکان پر، کھلے صحن میں، تاروں کی چھاؤں میں محفل ہوگی بھیروی سنکر جلسہ برخاست ہوگا۔ بس اب زیادہ نہ سوچو، چلے ہی چلو۔ کل اتوار ہے.... بیوی! بیگم صاحب کی جوتیوں کا ڈر ہے۔ اگر ایسا ہی عورت کی غلامی کرنا تھی تو شادی کیوں کی چلو بھی میاں! لطف رہے گا۔ روٹھی بیگم کو منانے میں بھی تو مزہ ہے...."

پرانا دوست، موٹر کی سواری، گانا ناچ، جنت نگاہ، فردوس گوش، منشی جی لپک کے موٹر میں سوار ہو لئے۔ جمن کی طرف انکا خیال بھی نہ گیا۔ جب موٹر چلنے لگی تو انہوں نے دیکھا کہ وہ ہاں اسی طرح چپ کھڑا ہے۔

نغمۂ چین

ہم ذیل میں چند چینی نظموں کا ترجمہ درج کرتے ہیں۔ امید ہے ناظرین ’جامعہ‘ کے لئے باعث دلچسپی ہوگا۔

چینیوں کی عشقیہ شاعری انکی متاع ذہنی کا نہایت اہم جزو ہے۔ چینی لوگ اپنے پچھلے شاعروں کے عشقیہ کلام سے عام طور پر واقف ہوتے ہیں۔ آج بھی لی۔ تائی۔ پو کے اشعار جو ہزار سال سے اوپر ہوئے لکھے گئے تھے ہر طبقے کے لوگوں میں پڑھے اور گائے جاتے ہیں۔ آپ چین میں بدمست عشاق کی زبان سے بھی انہیں سن سکتے ہیں اور شام کو اپنے کھیت پر کسان بھی اب تک انہیں گاتا ہے۔

چین کے سب بڑے بڑے شاعر عشقیہ شاعری کرتے تھے۔ ڈراما یا بیانیہ نظمیں چینیوں کی نظر میں دوسرے درجے کی چیز ہیں۔

چینی شاعری کے سب سے قدیم نمونے کوئی ۳ ہزار سال پرانے ہیں اور اس طرح چینی شاعری ہندوستانی اور عربی شاعری کے ساتھ ساتھ دنیا کی سب سے قدیم شاعری کہی جاسکتی ہے۔ قوم میں اسکا عام رواج ابتک اس لئے ہے کہ اس طویل زمانے میں چین میں تقریباً کوئی تغیر نہیں ہوا۔

چینی شاعری کے عروج کا زمانہ وہ ہے جسے اس وقت کے حکمراں خاندان کے نام پر عہد تھانگ کہتے ہیں یعنی ولادت مسیح کے بعد کی ساتویں سے نویں صدی تک کا زمانہ۔

اس عہد کے دو سب سے مشہور شاعر لی۔ تائی۔ پو اور تھو۔ فو ہیں۔ لی عرصہ تک شاہ منگ ہوانگ۔ تی کے دربار میں رہا۔ بادشاہ نے ہر طرح اسکا اعزاز و احترام کیا لیکن اسکی طبیعت بے چین تھی۔ نچلا بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ دربار کو چھوڑ چل کھڑا ہوا اور سارے ملک میں پھر پھر کر لوگوں کو اپنے اشعار سے مسحور کرتا رہا۔ ۶۱ سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ چینیوں نے

اس کی موت کا ایک افسانہ بنا لیا ہے جس سے تقریباً ہر چینی واقف ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ لی ایک دفعہ کشتی میں بیٹھا تھا۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ اور یہ اپنے شعر گا رہا تھا کہ یکایک ایک عجیب سی موسیقی سنائی دی جس کا تعلق اس دنیا سے نہ تھا۔ اس موسیقی کو سنکر پانی سے پریوں کی ایک فوج نکل آئی اور آسمان سے دو فرشتے اترے۔ ان دونوں نے لی کو ساتھ چلنے کی دعوت دی اور یہ ایک پری کے کندھے پر بیٹھکر دونوں فرشتوں کے پیچھے پیچھے چلا۔ اور افق تک پہنچ کر سنہری فضا میں غائب ہو گیا۔

تھو فو جو لی کے بعد اس عہد کا سب سے مشہور شاعر ہے، لی سے کوئی ۱۲ سال چھوٹا تھا۔ یہ دونوں بڑے دوست تھے۔ پہلے اسکا تعلق بھی دربار سے تھا لیکن پھر اسے جلا وطن کر دیا گیا۔ جلا وطنی میں اس نے درد اور شوق سے بھری ہوئی نظمیں لکھی ہیں۔ ۵۹ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

پچھلے ہزار سال میں بھی چینی شاعروں نے خوب خوب چیزیں لکھی ہیں، لیکن آٹھوں صدی کی سی خوبی پھر پیدا نہیں ہوئی۔ پندرھویں اور سترھویں صدی میں بھی چین میں بڑا ادبی چرچا رہا۔ لیکن زیادہ تر کام نثر میں ہوا۔ آخری زمانے میں چینی شاعروں پر علمی رنگ زیادہ غالب ہو گیا لیکن اب بھی عشقیہ شاعری کے اچھے نمونے کچھ بہت کمیاب نہیں ہیں۔

تقدیر آدم

(کانگ۔ فو۔ سے)

(۵۱۱ تا ۸۰۷ ق م)

خزاں کی خنکی کے بعد موسم گرما کی حدت آتی ہے،
برف سے ڈھکے ہوئے میدانوں پر بہار کے پھول سیج سجاتے ہیں۔

سورج جب صبح سو کر اٹھتا ہے تو سرخرو۔
جب شام کو سونے جاتا ہے تو سرخرو،
چھوٹے چھوٹے چشمے سمندر سے جا ملتے ہیں،
زمانہ ہر گھڑی اپنی تجدید میں مصروف ہے،
ہر روز نئی دھوپ نکلتی ہے یا ہر آن دریا کا پانی بدلتا ہے۔
مگر آدمی! اسے بس ایک مرتبہ زندگی عطا ہوتی ہے۔
نہ یہ مڑ کر دیکھتا ہے نہ لوٹ کر آتا ہے۔
اسکی ہستی ایک حباب ہے۔ ٹوٹا اور ختم ہو گیا۔
اسکی زندگی کا حاصل؟ لاچار و بے بس مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈھیر جس پر گھاس اُگتی ہے!

دیوتاؤں کا رقص

(لی - تائی - پو)
(سنہ ۷۰۲ تا ۷۶۳ء)

دل میں درد کا ایک طوفان اٹھا،
میں نے اپنی زمردیں بانسری سے انسانوں کو ایک گیت سنایا!
وہ ہنسے اور کسی نے میرے دکھ کو نہ سمجھا۔
درد کی شدت سے میں نے اپنی زمردیں بانسری کا رُخ آسمان کی طرف کر دیا۔
اور اپنے گیت کا تحفہ دیوتاؤں کو پیش کر دیا۔
دیوتا مست ہو گئے اور روشنی سے دمکتے ہوئے بادلوں پر میرا گیت سن سنکر ناچنے لگے۔
اب کیا ہے، اب میں آدمیوں کا دل بہلانے کے لئے بھی اپنا گیت سناتا ہوں۔

اور جب میں اپنی زمردیں بانسری سے گاتا ہوں تو یہ میرا گیت سمجھتے بھی ہیں۔

پردیس میں

(لی۔تائی۔پو)

میں پردیس میں تھا۔
میرے خیمے کے سامنے چاند نے چمکتی ہوئی سفید چاندنی بچھا دی تھی۔

سمجھا کہ شاید صبح کا سفیدہ ہے، جس کی چمک دیکھ رہا ہوں۔
غور سے دیکھا، نہیں یہ تو چاند ہے، چاند، میرا چاند
میں نے آنکھیں نیچی کریں
دور سے کسی نے؛ میرے وطن، نے مجھسے اشاروں میں کچھ کہدیا۔

آتشزدہ مکان

(تو۔فو)

(سنہ ۷۱۴ء تا ۷۷۴ء)

میرا پیارا مکان جس میں میں پیدا ہوا تھا، شعلوں کے نذر ہو چکا،
جہاں یہ مکان تھا، آج کچھ راکھ ہے کچھ کوئلے۔
غمگین تھکا ماندہ، میں ایک سنہری کشتی میں بیٹھ گیا،
کہ شاید دنیا کی رنگینی دیکھکر اپنا غم غلط کرسکوں۔

رات کا وقت تھا۔ میں نے اپنی بانسری پر ایک گیت گایا ایسا کہ چاند تک پہنچ جائے۔
ایک شوق و تمنا سے لبریز گیت،
آہ۔ میرا گیت سنکر چاند بھی غمگین ہو گیا
اور اس نے بھی اپنے بوڑھے چہرہ کو ایک بڑے سے بادل سے ڈھانپ لیا۔
ناچار، میں پہاڑوں کے پاس گیا۔
انکے پاس بھی میرے درد کا درماں نہ تھا
میں نے اپنی ساری داستان ان سے کہی، مگر۔ بیکار
اب تو میں سمجھا کہ میری خوشی، میرا چین،
میرے بچپن کی ساری یاد، راکھ کے اس انبار میں مدفون ہے جہاں پہلے کبھی میرا مکان تھا!
میں نے موت کی دعا مانگی۔ میرا چہرہ زرد تھا،
سمندر کے کنارے میں اپنے کو موجوں کے سپرد کرنے کے لئے تیار تھا کہ میرے پاس سے ایک ننھی سی کشتی گذری!
پہلے تو میں سمجھا کہ یہ کشتی نہیں، پانی میں چاند کا عکس ہے، لیکن نہیں، یہ ایک ننھی سی سفید کشتی ہی تھی۔
جسے ایک عورت چلا رہی تھی!
اے تو، اے تو، کیا قسمت تھی کہ اس وقت میری آنکھ نے تجھے دیکھا اس وقت، اپنی زندگی کے سب سے پر درد و پر یاس گھڑی میں۔
اب میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں، کہ میرے درد کا درماں کہاں ملے گا۔
اب میرا ایک مقصد ہے: تجھے پانا
اے میری بچانیوالی، مجھے پناہ دینے والی،

اب میں تیرے دل میں اپنا مکان بناؤں گا!

مایوسی

(لی - ای - ہان)

(بارہویں صدی عیسوی)

مصیبت، آنسو التجائیں اور دعائیں -
ہمیشہ وہی مصیبت، ہمیشہ وہی آنسو، وہی التجائیں
اے بدنصیب آخر تیرا کیا حشر ہوگا ؟
گرمی کی خوشگوار راتوں کا احساس بھی نہیں ہوتا
کہ ملک پر پھر سردی کی فرمانروائی ہوجاتی ہے -
اور صبح کی ہوائیں درشتی اور تندی آجاتی ہے -
دیکھو دیکھو وہ جنگلی راج ہنس پھر آئے،
ادہر میرا دل درد سے لبریز ہے -
جنگل کے پرندو، میں نے کتنی دفعہ تمہیں آتے بھی دیکھا ہے، جاتے بھی ؟
دیکھو تو ہر طرف گرسنتھمم کی کیا فراوانی ہے!
لیکن یہ پھول احرماں نصیب اور پژمردہ
کیا کسی کا جی نہیں چاہتا کہ اسے بھی آکر چن لے ؟
مدام اپنی کھڑکی کے پاس بیٹھا رہتا ہوں اور سوچتا رہتا ہوں
کیا دن ابتک ختم نہیں ہوا ؟
پانی کی ہلکی پھوار پڑتی ہے اور کلیوں کو غمناک بناتی ہے -

شفق ہلکے ہلکے دبے پاؤں نیچے اترتی ہے
شام ہوتی ہے رات دنیا پر چھا جاتی ہے۔
لیکن میرے اندر سب کچھ اسی طرح رہتا ہے جیسے تھا!
مصیبت، آنسو، التجائیں اور دعائیں!
کوئی ہے جو میرے زخمی دل سے اس کانٹے کو کھینچ لے؟
ورنہ پھر مایوسی کا تسلط ہے اور موت!

تنقید و تبصرہ

اسلامی قانون فوجداری - حجم ۴۰۴ صفحے۔ کتابت و طباعت اچھی۔ کاغذ چکنا۔
ملنے کا پتہ - دارالمصنفین اعظم گڈھ

۱۲۱۲ھ میں مولٰنا سلامت علی خاں عرف خداقت خاں جو شہر محمد آباد میں عدالت مرافعہ ثانیہ میں احکام شرعیہ لکھنے پر مامور تھے۔ فقہ حنفی کی مختلف کتابوں سے اسلامی تعزیرات کے مسائل ایک مجموعے میں ترتیب کے ساتھ جمع کر کے اسکا نام کتاب الاختیار رکھا تھا۔ اب اس کو سیر احمد شریف صاحب وکیل درجہ اول حیدرآباد دکن کے ایما سے مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے سلیس اردو میں ترجمہ کر دیا اور دارالمصنفین نے اپنے مطبع سے شائع کیا۔

آئینۂ اُردو - حجم ۱۶۰ صفحے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط۔ قیمت ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ کتب خانہ تجارتی۔ اسٹار بک ڈپو نمبر ۴ لوئر سرکلر روڈ۔ کلکتہ

یہ کتاب مولوی محمد شفیع اللہ صاحب صفی آروی ہیڈ مولوی ضلع اسکول گیا نے تالیف کی ہے جس میں اُردو رسم الخط کے قواعد اور املا کے ضوابط۔ الفاظ مستعملہ کی تذکیر و تانیث مع سند۔ مترادفات کی تشریح۔ عبارت نگاری کے اصول اور دیگر بہت سے فوائد درج کئے ہیں۔ اور جو کچھ لکھا ہے۔ تحقیق و کاوش کے ساتھ لکھا ہے۔ مولف کی محنت اور کتاب کی خوبی قدر کے قابل ہے۔

میرے خیال میں اُردو کے ہر ناظم و ناثر کے لئے یہ کتاب مفید ہے۔ اور اس زبان میں اس کی حیثیت اسی نوعیت کی ہے جس نوعیت کی عربی میں ادب الکاتب والشاعر کی ہے۔

رسالہ چمنستان - یہ ماہانہ ادبی رسالہ محمد افضل خاں اور سید ظفر ہاشمی صاحبان کی ادارت میں امرتسر

سے نکلتا ہے۔ حجم ۵۰ صفحے کا ہوتا ہے۔ اس کا جنوری نمبر خصوصیت کے ساتھ سالنامہ نمبر کے نام سے بہت ضخیم نکالا گیا ہے جو ادبیات نظم و نثر کا نہایت دلچسپ مجموعہ ہے۔ اڈیٹروں کی محنت اگر اسی طرح قائم رہے تو یقیناً یہ رسالہ بہت کارآمد ہو جائے گا۔ قیمت سالانہ ۶ عہ/

عزیز۔ یہ رسالہ تعلیمی اور اخلاقی ہے۔ اور گورکھپور کے دو مشہور رئیسوں سید جواد علی شاہ (ایاں صاحب) اور خان بہادر مسٹر محمد اسمٰعیل صاحب بیرسٹر ایم۔ ایل۔ سی کی سرپرستی اور ہیڈ ماسٹر صاحب جامع اسلامیہ ہائی اسکول گورکھپور اور مسٹر شاکر علی بیرسٹر کی نگرانی میں مولوی بدیع الزمان صاحب اعظمی کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اسکول کے طلبہ کے لئے حسب ضرورت اور حسب حال مختلف قسم کے اخلاقی اور علمی مضامین نیز نصائح اور معلومات سلیس زبان میں لکھی جاتی ہیں۔

رسالہ کا حجم ۲۴ صفحے ہے اور ماہوار ہے۔ قیمت سالانہ عہ

اگرچہ ہم گورکھپور جیسے مقام سے اس رسالہ کو غنیمت سمجھتے ہیں لیکن یہ مشورہ ضرور دیں گے کہ بچوں کے دوسرے رسالوں کی طرح جو ملک میں نکل رہے ہیں مثلاً ہونہار۔ یا نونہال وغیرہ اگر اس میں بھی تصاویر کا سامان کیا جائے تو یہ بچوں کے لئے زیادہ دلچسپ اور زیادہ مفید ہوگا۔

خضر راہ۔ یہ دار العلوم ندوۃ العلما کا ماہوار علمی اور ادبی رسالہ ہے جس کے دسمبر نمبر کی بابت ہم سے درخواہش کی گئی ہے کہ ہم رائے ظاہر کریں۔

دار العلوم ندوہ اسلامی اور مشرقی علوم کا مرکز ہے۔ ہم اس کے ارگن سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اسلامی روایات اور مشرقی عالمانہ شان کو قائم رکھے گا۔ خضر راہ ہر چند اچھا رسالہ ہے اور محنت اور کوشش سے تیار کیا جاتا ہے اور ایک حد تک مفید مضامین شائع کرتا ہے لیکن اس میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس کی ہم اس دار العلوم سے امید رکھتے ہیں۔

شذرات کا انداز بیان بھی کچھ ہم کو پسند نہ آیا۔ یہ "جذباتی طنزیہ" "طرز تحریر مدیر" "ج"

دریا بادی کے لئے چھوڑ دینا چاہئے اور طلبائے علوم اسلامیہ و مشرقیہ کا قلم اس سے زیادہ معقول اور متین ہونا چاہئے۔

نسوانی دنیا۔ عورتوں کے لئے ایک دیدہ زیب نیم تمدنی و مذہبی اور نیم علمی و اصلاحی ماہوار رسالہ زیر ادارت شوکت علی صاحب فہمی خواجہ بک ڈپو دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا ہے جس کی قیمت سالانہ عار ہے۔ رسالہ کی چھپائی اچھی ہے اور تصویریں بھی دیجاتی ہیں۔

شوکت علی صاحب فہمی ایک خوش رفتار قلم اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں جس کی جولانیاں دلکش ہوتی ہیں امید ہے کہ نہ صرف اپنی قلمی قوت بلکہ اپنی دماغی اور قلبی قوتوں کو بھی وہ نسوانی دنیا کی ترقی اور اصلاح میں صرف کریں گے۔ کیونکہ مسلمان عورتوں کے عقائد اور خیالات کی خرابیوں اور انکی فضول رسموں اور جہالتوں سے قوم قعر مذلت میں گرتی جارہی ہے۔

قول حق۔ مصنفہ اکبر شاہ خانصاحب۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط۔ تقطیع ۲۰ × ۲۶ صفحات ۲۷ قیمت فی نسخہ ۶ع۔ ملنے کا پتہ منیجر صاحب عبرت نجیب آباد۔ ضلع بجنور (یوپی)

ہمارے دوست اکبر شاہ خانصاحب (میں نے مولوی یا مولنا کا لفظ قصداً انکے نام کے ساتھ نہیں لکھا کیونکہ ان کو ان الفاظ سے نفرت ہے) ان مخلصین اور مفکرین ارباب قلم میں سے ہیں جو تعمق کے ساتھ امت اسلامیہ کی حالت پر غور کرتے ہیں اور جو کچھ سمجھتے ہیں اس کو اخلاص۔ دردمندی دیانت داری اور جرأت کے ساتھ لکھدیتے ہیں۔ اس سے پہلے انہوں نے قومی لیڈروں کے متعلق "اکابر قوم" کے نام سے ایک رسالہ اسی طرح کا شائع کیا تھا۔ اب یہ کتاب "قول حق" کے نام سے لکھی ہے جس میں انہوں نے امت کی تفریق اور تباہی کے اسباب۔ انکی تاریخ اور انکے ازالہ کی تدبیریں بتائی ہیں۔ اور بالخصوص مسلمانان ہند کے اسباب تنزل سے بحث کی ہے اور جو مذہبی اور دینی خرابیاں ان میں پیدا ہوگئی ہیں انکو ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعد اصلاح

دینی و دنیاوی کے لئے قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پیش کی ہیں۔ اور تدبر فی القرآن اور کتاب وسنت پر عمل کرنیکی دعوت دی ہے۔

مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس قدر اخلاص اور دردمندی سے لکھا ہے کہ دل پر اسکا اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ سراسر حقیقت ہے اور یہی وجہ ہوگی کہ اسکا نام انہوں نے قول حق رکھا۔ میرے خیال میں انکی یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر پڑھا لکھا مسلمان اس کو پڑھے اور اس پر عمل پیرا ہو۔ یہ سمجھنے کے لئے آسان۔ تفرقہ مٹانے والی اور حقیقت اور وحدتِ امت کی طرف لیجانے والی ہے۔

رسالہ ادب ۔ یہ ماہانہ رسالہ اُردو ادب کی خدمت کے لئے سید اعظم حسین صاحب کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اسکا حجم ۲۰×۲۶ تقطیع پر چار جزو ہوتا ہے اور قیمت چار روپیہ سالانہ ہے۔

اردو کے متعدد ادبی رسائل ملک میں جابجا شائع ہو رہے ہیں لیکن اس رسالہ سے ہم خصوصیت کے ساتھ بہت کچھ توقع رکھتے ہیں کیونکہ یہ اُردو کے ایک عظیم الشان مرکز یعنی لکھنؤ سے نکلتا ہے۔ جہاں اُردو نے تربیت پائی ہے۔

اسکا چوتھا نمبر جنوری ۳۰ء کا ہمارے سامنے ہے جس کی ظاہری اور معنوی خوبیاں دونوں قابل تحسین ہیں۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ آئندہ یہ رسالہ ترقی کریگا۔

ہمارے نزدیک محض نثر و نظم شائع کر لینا کوئی بڑی خدمت اُردو زبان کی نہیں ہے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ علوم ادبیہ بحث و تحیص کے بعد مرتب کئے جائیں۔ اگر اس رسالہ کی ادارت کے پیش نظر یہ امر رہے تو کچھ تعجب نہیں کہ وہ اس میں کامیاب ہو سکے۔

ملنے کا پتہ: دفتر ادب۔ متصل چورایہ کیلی گنج لکھنؤ

ہونہار ۔ جامعہ ملیہ کے فارغ طلبہ نے پچھلے ۹ سال میں قوم کی اور کوئی خدمت کی ہو یا نہ کی ہو۔ اردو صحافت میں انہوں نے یقیناً قابل قدر حصہ لیا ہے آج کوئی آٹھ روزانہ اور ہفتہ وار اردو اخبار بالکل جامعہ کے سابق طالبعلموں کے ہاتھ میں ہیں لیکن یہ اخبارات عموماً سیاسی ہیں۔ جامعہ والے اپنے کام کو محض وقتی سیاست تک محدود نہیں رکھنا چاہتے بلکہ ان تعمیری کوششوں میں حصہ لینے کو اور بھی ضروری سمجھتے ہیں، جنکا اثر آج کل میں نہیں بلکہ ایک عرصہ بعد ظاہر ہوتا ہے لیکن دیرپا بھی ہوتا ہے۔

ان تعمیری کوششوں میں بچوں کی تعلیم و تربیت سب سے اہم کام ہے، بچوں کی تعلیم کے لئے مدارس کے علاوہ بلکہ بعض حیثیت سے نئے مدرسے قائم کرنے سے زیادہ ضروری بچوں کے لئے مفید کتابوں اور رسالوں کا شائع کرنا ہے جس میں ابتک اردو زبان افسوس کہ بہت کم مایہ ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ جامعہ کے سابق طالب علم فیاض حسین صاحب نسیم نے بچوں کے لئے ایک باتصویر ماہوار رسالہ ہونہار نامی نکالا ہے۔ اس کے ۳ نمبر ہمارے سامنے ہیں اور انکو دیکھکر کہا جا سکتا ہے کہ یہ رسالہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا اور بچوں بچیوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔ اسکے مضامین کی عبارت سہل وسلیس ہوتی ہے اور بچے اسے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ لکھائی چھپائی بھی دیدہ زیب ہے اور سرورق نہایت خوشنما۔ تصویروں کا بھی انتظام ہے۔ اور آئندہ بہتر تصاویر کے طبع ہونیکی توقع ہے۔ جن لوگوں کے بچے اردو پڑھنا سیکھ چکے ہیں انہیں یہ پرچہ ضرور منگا کر بچوں کو دینا چاہئے سال بھر کے لئے ہے کا یہ صرف بچوں کے سرپرستوں کے لئے اس رقم کا بہت اچھا صرف ہوگا۔ ملنے کا پتہ: رسالہ ہونہار، صدر بازار، دہلی

شذرات

ناظرین جامعہ کو اس سے پہلے اخبارات کے ذریعہ یہ خبر معلوم ہو چکی ہوگی کہ اعلیحضرت نظام دکن خلد اللہ ملکہ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے لئے پچاس ہزار یکمشت اور ایکہزار روپیہ ماہوار کی مستقل امداد عطا فرمائی ہے۔ اس سے کچھ ہی پہلے ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال نے ایک ہزار روپیہ ماہوار مقرر فرمایا اور عمارات کے لئے ڈیڑھ لاکھ کا وعدہ فرمایا ہے۔ ملک کے تمام اخبارات نے بلا قید مسلک ان خبروں پر جو اظہار تشکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں روشن خیال والیان ملک کو نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندوستان کی قومی زندگی میں کیا اہتم بالشان مرتبہ حاصل ہے۔ اس وقت جب کہ امارت وافلاس کی تفریق پر زور دیکر دلوں میں نفرت کے بیج بونا ایک گروہ کے نزدیک مذہبی فرض کی حیثیت اختیار کر رہا ہے ان دو ہستیوں نے اپنی زندگی اور اپنے عمل سے برابر ثابت کیا ہے کہ امارت جماعت کی امانت ہے اور اس حقیقت کو روشن کردیا ہے کہ سروری در دین ما خدمتگری است۔

جامعہ والے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان والیان ملک لیکن خادمان ملت سے انکی دستگیری کرائی اور ایسے وقت میں جب خدا پر بھروسہ اور اپنے کام کی اچھائی پر اعتماد کے علاوہ انکے پاس کچھ نہ تھا اس نے ان دو چشمہائے فیض کا رُخ جن سے ہمارے ملک کے لاتعداد ادارے فیضیاب ہو رہے ہیں، جامعہ کی طرف بھی پھیر دیا۔ ان گرانقدر عطیات سے پہلے جامعہ والے کن کن مشکلات میں اپنے کام کو چلا رہے تھے۔ اسکا علم بہت کم لوگوں کو ہے اس لئے ہمارے جذبہ شکر کی شدت کا اندازہ بھی دشوار ہوگا لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اظہار شکر کی صحیح شکل یہ ہے کہ ہم اس "یسر" کی حالت میں بھی ان مقاصد کو نہ بھولیں جن کی خاطر "عسر" کو برداشت کیا تھا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان مقاصد کی خاطر محنت وریاضت کی توفیق عطا فرمائے اور ہم سے جو امیدیں ہمارے محسنوں اور ہمدردوں نے قائم کی ہیں ہم انکے اہل ثابت ہوں۔

فان مع العسر یسرًا ، ان مع العسر یسرًا
فاذا فرغت فانصب ، والیٰ ربک فارغب

مارچ ۱۹۳۰ء ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اس لئے نہیں کہ اس مہینہ میں جو سیاسی تحریک مہاتما گاندھی اور انکے ساتھیوں نے احمد آباد سے شروع کی ہے اس کے جلد کامیاب ہونے کی کوئی توقع ہے بلکہ اس لئے کہ کامیابی و ناکامی کو خدا پر چھوڑ کر ایک کرم یوگی نے سیاست ہند میں پھر ایک بار اس راہ پر گامزنی شروع کی جسے وہ اپنے ملک اور اپنے ملک کے واسطہ سے انگلستان اور ساری دنیا کے لئے نجات و فلاح کی راہ جانتا ہے۔ آج سے دس سال قبل بھی اس نے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کے مقتدر رہنما علی برادران نے اس راہ پر قدم اٹھایا تھا لیکن اس وقت ہندوستان کے سامنے معاملہ اس وضاحت سے نہیں آسکا تھا جیسا اس مرتبہ ممکن ہے۔ ملک میں مختلف گروہوں کو مختلف شکایتیں تھیں، مسلمانوں سے ترکی کے معاملے میں بدعہدی کی گئی تھی، جنگ کے زمانے میں ملک سے جو وعدے ہوئے تھے انکی تعبیر جلیانوالہ باغ میں ملی تھی، ملک کی سیاسی جماعتیں جن میں تعلیمیافتہ ہندوستانیوں کا تفوق ہے حقوق سیاسی کے مطالبے یعنی کونسلوں میں زیادہ نیابت، ملازمتوں میں زیادہ جگہوں کے لئے کوشاں تھیں، ان سب کو سابرمتی کے ایک سادھو نے اپنے ساتھ لے لیا تھا اور عدم تشدد کی شرط لگا کر سب کے دکھوں کی دارو تلاش کرنے نکلا تھا۔ اس تلاش میں بھی اس نے عدم تشدد کو شرط اول قرار دیا اور پھر غریب کسانوں کی خاطر کھدر کو اپنے سیاسی لائحہ عمل کا لازمی جزو بنا کر سیاست ہند کو بالکل نئی راہ پر ڈالنا چاہا تھا اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا تھا۔ لیکن تحریک میں عام افسردگی اور سیاسی فضا میں اس پژمردگی کے بعد جو عدم تشدد کے اصول پر دیانت داری سے قائم نہ رہنے کے باعث ہوئی اور پھر تنگ دل ساتھیوں کی غلطیوں سے اور کوتاہ بین دوستوں کی زود رنجیوں سے اس حد کو پہنچی کہ ملک کا ہر سچا بہی خواہ اس پر خون کے آنسو روتا تھا اس سادھو نے پھر سیاست کے میدان میں قدم رکھا تو اس مرتبہ ان دو چیزوں کو (جو حقیقتاً سیاست ہند میں

اس کا مخصوص اضافہ ہے) بالکل واضح کردیا۔ ان میں سے ایک جیز مقصد سے متعلق ہے دوسری طریقہ کار سے۔ اب ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں یہ ممکن نہ ہوگا کہ چند تعلیم یافتہ لوگ اپنے کروڑوں ہم قوموں کے مفاد کو نظر انداز کرکے بس اپنی جیبیں بھرنے کو سیاست ملکی کی واحد غرض سمجھیں۔ ہندوستان میں سوراج کے معنی ان کروڑوں کسانوں اور مزدوروں کی حق یابی ہوں گے جو اب تک بے زبان تھے اور جن کا نام لے لیکر ہمارے تعلیم یافتہ ہندوستانی ایک سفید دفتریت کے بجائے سیاہ یا گندمی دفتریت قائم کرنا چاہتے تھے۔

طریق کار میں عین اس وقت کہ تشدد کی قوتیں زور پکڑ رہی تھیں اور بہت ممکن تھا کہ ان قوتوں کی ناعاقبت اندیشیاں اور عجلت پسندیاں ملک کو ایک غیر متعین عرصہ تک کے لئے بے نتیجہ کشت وخون اور دلوں کو بے سود نفرت وحقارت کا آماجگاہ بنادیتیں اس نبض شناس سادھو نے پھر عدم تشدد اور پر امن سعی کے لئے وہ راہ نکالی جو صرف اسی وقت ملک کو محرور المزاج تشدد پسندوں کے تجربے سے محفوظ نہ کرے گی بلکہ آئندہ کے لئے بھی مسائل کے تصفیہ کا ایک موثر طریقہ بتلا کر ملک کو شدید خانہ جنگیوں سے بچا سکے گی۔

ہر ملک کے نوجوان آزادی کی جنگ میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ ہندوستانی نوجوان بھی اس جدید تحریک میں شرکت کے لئے بیتاب ہوں۔ پچھلے دنوں اس قسم کی متعدد خبریں شائع ہوچکی ہیں کہ سرکاری کالجوں کے طالبعلموں نے کہیں قومی جھنڈا لگا کر کہیں تقریروں اور نعروں سے اس تحریک کے ساتھ اپنی ہمدردی کے ثبوت کی کوشش کی اور نادان معلموں نے ان نوجوانوں کے دلوں کو امتحانوں، سندوں، ملازمتوں کا واسطہ دے کر روکا۔ کاش یہ معلم سمجھتے کہ انکے سپرد ان نوجوانوں کی روحوں کی پرورش کا کام ہے نہ انکے قتل کا! تعلیم و سیاست کے تعلق پر بے ربط اور اکثر بے معنی خیالات کا اظہار اس سنگین جرم کی نوعیت میں ذرا تغیر نہیں پیدا کرسکتا جو نفسیات شباب سے ناواقف معلم سے ایسے موقعوں پر سرزد ہوتے

ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر عملی سیاست میں شرکت سے مصالح شخصی کی بنا پر نوجوانوں کو روکا بھی جائے تو ہر سچے
معلم کا یہ فرض تو ضرور ہے کہ وہ موجودہ تحریک کے مذکورہ بالا دو عناصر خصوصی کو ہر ہندوستانی طالبعلم
کے ذہنی متاع کا جزو بنانے میں مدد دے۔ جدید تعلیم نے ہندوستان کو تقریباً دو مختلف قوموں میں تقسیم
کر دیا ہے۔ ایک قوم میں ہندوستان کے کروڑوں محنت کش ہیں اور دوسری قوم میں تھوڑے سے
سفید پوش جوانکے نام سے اپنی روزمی اپنی عزت اور اپنی نمود کا سامان کرنا چاہتے ہیں۔ ہر فرض شناس
ہندوستانی معلم کو چاہئے کہ وہ ان نوجوانوں کو جن کی ذہنی و اخلاقی تربیت اس کے سپرد ہے اس
شرمناک خواہش سے دور رکھے کہ وہ اپنے غریب ہموطنوں کے مفاد کو پس پشت ڈالکر اپنی اغراض
کو پورا کرنا چاہے۔ اسلئے کہ اسکا لازمی نتیجہ جلد یا بدیر وہ ہوتا ہے جو روس میں اس ملک کے تعلیمیافتہ
طبقہ کا ہوا۔ خدا ہندوستان کو اس دن سے بچائے۔ جب صدیوں کے اس جماعتی قرض کو بھیلیوں
میں چکانے کے لئے اس تعلیمیافتہ طبقے کے ساتھ ہماری ذہنی زندگی کے قیمتی عناصر بھی تباہ و
برباد کئے جائیں۔

دوسری چیز جس کا راسخ عقیدہ معلمین کو اپنے علبہ کے دلوں میں بٹھانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ
ہندوستان کے مخصوص حالات میں تمام مسائل سیاسی و جماعتی کا حل پرامن طریقوں سے ہونا چاہئے۔
علاوہ ان بے شمار فوائد کے جو اس وقت اور آئندہ ہمارے ملک کو اس سے حاصل ہونگے۔ اس کا
کامیاب تجربہ ساری دنیا کے لئے ایک بڑی برکت ثابت ہوگا۔ اس طریقہ کار کے لئے میدان
عمل فراہم نہ کرنا اور اس تجربہ کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنا بلاقصد ان تشدد پسند جماعتوں کے
اثر کو بڑھانا ہے جن کا اثر افسوس ہے کہ ہمارے ملک کے نوجوانوں میں تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

نوجوانوں کے معاملہ میں معلمین کی ذمہ داری جتنی بڑی ہے اس سے بھی زیادہ اس وقت
مسلمانان ہند کے معاملہ میں انکے سیاسی رہنماؤں کی ہے۔ مسلمانوں میں آزادی کی محبت سرشت
ہے۔ انکی مذہبی روایات میں غلامی و محکومی کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں۔ لیکن دنیا میں ایک سی

دن کبھی کسی کے نہیں رہتے۔ یہ قوم جو آزاد تھی اور دنیا کو غلط توہمات اور غلط اداروں سے آزاد کرنے کو اپنی غایت وجود جانتی تھی آج محکوم ہے مگر پچھلی آزادی کی تحریک میں اس نے جس جگری سے حصہ لیا، اس نے امید دلائی تھی کہ اس کا سینہ ابھی تک حریت نوازی کے جذبات سے معمور ہے۔ اس تحریک کے دب جانے کے بعد ملک میں اور بیرون ملک کچھ ایسے حالات رونما ہوئے کہ اس نے تحریک آزادی سے بے تعلقی سی کر لی۔ ادہر ترکوں نے خلافت کو ختم کیا اور اس کی وجہ سے جو عام سیاسی دلچسپی مسلمانوں کو پیدا ہوئی تھی وہ ختم ہوئی ادہر کچھ تنگ نظر اور تنگ دل ہندوؤں نے اپنی مخصوص اغراض کے حصول کے لئے ان سے علیحدگی اختیار کی اور ملک کی سیاسی فضا کو شبہ اور رقابت کے جذبات سے آلودہ کر دیا۔ مسلمانوں کو خیال ہوا کہ اس قسم کی اکثریت کے ساتھ نبھاؤ مشکل ہے۔ اپنی تعداد کی کمی، علم کی کمی، دولت کی کمی کے باعث انہوں نے اس مشکل کا مبالغہ آمیز تصور بھی اپنے ذہن میں قائم کر لیا۔ خود غرض لوگوں نے جو ان میں ہندوؤں سے بے اعتباری کو حکومت انگریزی کی مضبوطی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اس تصور کو اور قوی کیا۔ اس شبہ اور بے اعتباری کی فضا میں حقوق سیاسی کے تعین کی نامبارک کوشش شروع ہوئی اور نہرو رپورٹ پر بحث و نکتہ چینی میں بظاہر مسلمان ہندوؤں سے بالکل الگ ہو گئے۔ ان دو جماعتوں کی باہم مخالفت کو رفع کرنے کی طرح طرح کوششیں ہوئیں لیکن ہندوؤں کی ایک جماعت اپنی کوتاہ اندیشی سے مسلمان اقلیت کو کسی طرح اپنی نیک نیتی کا یقین نہ دلا سکی۔ ادہر مسلمانوں کے رہنماؤں نے ایک فرضی دستور العمل میں اپنے حقوق کے تسلیم کئے جانے کو نادانی اور بیکاری کے باعث ایسی اہمیت دی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انکے رہنماؤں میں سیاسیات کے حقایق کا صحیح حس نہیں اور وہ اپنے گنتی کے تعلیمیافتہ لوگوں کی نوکریوں اور کرسی نشینیوں کو اپنی پوری قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔

بہر حال اسی شبہ اور اختلاف کی فضا میں یہ نئی سیاسی تحریک شروع ہوئی۔ اور غالباً ہمارا اندازہ غلط نہیں کہ اگر تشدد پسند جماعت کے ہاتھ میں ملک کی سیاست نہایت تیزی سے جاتی نہ دکھائی دیتی تو مہاتما گاندھی اس ہندو مسلم اختلاف کی وجہ سے ابھی اس قسم کی تحریک کا ارادہ

نہ کرتے۔ لیکن اب یہ تحریک شروع ہو چکی۔ مسلمانوں کے بعض ذمہ دار لوگوں نے اپنی پوری کو اس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ بھی دیدیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ مشورہ غلط ہے اور اگر ہم مسلمانوں کے مزاج ملی اور انکی روایات جماعتی کو صحیح سمجھے ہیں تو ہمارا یقین ہے کہ اس مشورہ پر عمل بھی نہ کیا جائے گا۔ اور یہ مشورہ ہماری سیاست کی ان لاتعداد بے احتیاطیوں میں شمار کیا جائے گا جنہوں نے بےموقع تیزی سے ہمارے مفاد ملی کو نقصان پہنچائے ہیں۔

مسلمان اس حقیقت سے واقف ہیں کہ انہیں اگر اس ملک میں رہنا ہے تو ہندوؤں سے نبھاؤ کرنا ہوگا۔ بیشک عزت کا نبھاؤ کہ اپنی ملی خصوصیات کو ترک کر کے نبھاؤ جماعتی موت کے مرادف ہوگا۔ اس نبھاؤ میں انہیں اپنے حقوق منوانے ہوں گے۔ مسلمانوں نے دنیا میں آکر اپنے حقوق منوائے ہیں اس لئے وہ جانتے ہیں کہ سیاست میں خیرات نہیں بٹتی بلکہ جو کچھ حاصل ہوتا ہے بازو کے کس بل، دماغ کی صحت، اور اخلاق کی استواری سے حاصل ہوتا ہے۔ اسے اس دھوکہ میں نہ آنا چاہیئے کہ اگر اس نے روٹھ کر یا چلا کر، یا خوشامد کر کے کسی دستور سیاسی میں اپنے حقوق لکھوائے اور ان حقوق کے حاصل کرنے کی قوت اپنے اندر نہ پیدا کی تو اس دستور کے الفاظ کسی مقدس الہام کی طرح سب کے لئے واجب العمل ہونگے۔ اگر مسلمانوں میں یہ قوت نہیں کہ ہر وقت ان حقوق کو منوا سکیں اور اپنے عمل سے ہر وقت اپنے کو ان حقوق سے زیادہ کا اہل ثابت کرتے رہیں تو ان دفعات تحفظ حقوق کی قیمت اس کاغذ کے پرزے سے زیادہ نہ ہوگی جس پر وہ لکھے جائیں گے۔ حیات قومی میں حقوق کے دفعات قوم کے خون اور اسکے پسینہ سے لکھے جاتے ہیں تب تو پائدار ہوتی ہے۔

اگر مسلمان اس حقیقت کو نہیں بھولے تو انکے لئے ہندوستان میں تین راہیں کھلی ہیں۔ اگر انہیں یقین ہو گیا ہے کہ ہندوؤں سے کسی طرح انکا نبھاؤ اور سمجھوتہ ممکن نہیں تو انہیں (۱) یا تو ملک میں ایک خالص اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش کرنی چاہیئے (۲) یا پھر ملک میں جمہوری اداروں کے قیام کی یکسر مخالفت کرنی چاہیئے اور انگریزوں کا ساتھ خود انگریزوں سے زیادہ دینا چاہیئے۔ یعنی اگر انہی مصالح سے ہندوؤں کے مقابلہ میں کمزوری دکھائے تو انہیں انگریز سے برسر پیکار ہونا چاہیئے۔

اگر وہ ملک چھوڑ کر جانا چاہے تو نہیں اسے روکنا چاہئے۔ (۳) یا اپنی قوت کو بڑھا کر ہندوؤں کے ساتھ باعزت اشتراک عمل کو ممکن بنانا چاہئے۔

مسلمان رہنمایان سیاسی میں اسلامی حکومت کے قیام کے نام سے ہر شخص کانوں پر ہاتھ دھر چکا ہو۔ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ یہ کوشش نہ ممکن ہو نہ مفید۔ اس وقت کوئی ذمہ دار رہنما جمہوری اداروں کے قیام کا بھی مخالف نظر نہیں آتا۔ اس لئے اگر یہ دونوں صورتیں مسلمانوں نے اپنے لئے پسند نہیں کیں تو سوائے تیسری صورت کے اور کوئی راہ ہمیں انکی سیاست کے لئے نظر نہیں آتی یعنی ہندوؤں سے اشتراک عمل۔ باعزت و مساویانہ اشتراک عمل، جو صرف اسی وقت ممکن ہو کہ یہ اپنے کو مضبوط بنائیں اور حیات قومی کے لئے مفید و ناگزیر۔

اس مقصد کے لئے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ حصول آزادی کی کوشش سے یکسر علٰحدگی کیسے ممد معاون ہو سکتی ہو۔ قوت جہد و عمل سے نشو و نما پاتی ہو، کھڑے کھڑے تماشہ دیکھنے سے نہیں بڑھتی جو ہندو آج اتنے مضبوط ہیں کہ مسلمان ان سے ملکر اپنی حیات جماعتی کو خطرہ میں سمجھتے ہیں وہ اس جہاد حریت کے بعد اگر وہ اسمیں ناکام بھی رہیں، تو اس سے کہیں زیادہ مضبوط ہو جائیں گے۔ اور جو مسلمان آج اپنی کمزوری کا اتنا یقین رکھتے ہیں کہ اپنی قوت کے بھروسہ پر اپنے کو تحریری ضمانتوں سے بے نیاز نہیں سمجھ سکتے وہ اگر کھڑے کھڑے منہ تکیں گے تو اس سے زیادہ کمزور ہونگے۔ اور اعتباری قوت کا یہ تفاوت جس قدر بڑھیگا باعزت اشتراک عمل کے امکانات کم ہونگے اور بے عزت مجبوری کے زیادہ! خدا ہماری قوم کو صراط مستقیم دکھائے اور اس کو عزت دے کر ملک کی عزت کو چار چاند لگائے۔ اسکا گمراہ ہو کر پس جانا خود اس کے لئے مصیبت نہ ہوگا بلکہ ہمارے ملک کی زندگی جس میں یہ وسعت نظر، ہمت شجاعت، رواداری کا حامل ہو اسکی تباہی سے تباہ ہو جائے گی۔ کہ یہی صدیوں تک اس کا دل زندہ رہا ہے

ہمیں یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے ۔۔۔ کہ زندگانی عبارت ہو ترے جینے سو

مطبوعات

ہندوستانی اکاڈمی صوبہ متحدہ

۱- ازمنہ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات | از علامہ عبداللہ یوسف علی ایم اے۔ ایل ایل۔ ایم

سی۔ بی۔ ای۔ مجلد قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ غیر مجلد ایک روپیہ

۲- اردو زبان اور ادب - از سید ضامن علی۔ قیمت ایک روپیہ

۳- مغلوں سے پہلے عرب اور ہندوستان کے تعلقات | از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی

قیمت صرف چار روپیے (للعہ)

زیر طبع

۱- مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر۔ از مولانا محمد امین صاحب عباسی

۲- قرون وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن۔ از رائے بہادر مہامہوپادھیایہ پنڈت گوری شنکر ہیراچند اوجھا

۳- ہندی شاعری - از ڈاکٹر اعظم کریوی

۴- ناتن - (جرمن ڈراما) ترجمہ مولانا محمد نعیم الرحمٰن صاحب ایم اے۔ ایم آر۔ اے ایس

۵- ترقی زراعت - از خانصاحب مولوی محمد عبدالقیوم ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت الہ آباد

ملنے کا پتہ: جنرل سکرٹری ہندوستانی اکیڈمی (یو۔ پی) الہ آباد

رجسٹرڈ
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
جلد ۱۴
بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء
نمبر ۴
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927

زیرِ ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری　　ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۴	بابتہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

مسیح الملک مرحوم کا سفرنامہ یورپ

مسیح الملک مرحوم و مغفور کی وفات کے بعد ہی میں نے کوشش کی تھی کہ ان کے کاغذات و مسودات کو محفوظ کر دیا جائے اور جہانتک میری دسترس تھی میں نے جستجو کی ، لیکن یہ ایک تعجب انگیز اور تکلیف دہ حقیقت ہے کہ سوائے چند منتشر پرچوں اور دس بیس خطوط کے مرحوم کے سامان میں اور نیز دفتر میں کاغذات کا کوئی ایسا ذخیرہ نہ ملا جو اُنکے کسی سوانح نگار کے کام آسکتا ۔ مسیح الملک مغفور اپنی زندگی میں ذاتی طور پر ہمیشہ بے سروسامان رہے ، دولت اور عزت کی بہت بلند سطح پر پہنچنے کے بعد آپکی زندگی میں معمولی ضروریات کا سامان بھی اسقدر کم تھا کہ جب کوئی لمبا سفر درپیش ہوتا تھا تو اکثر دھوبی کے یہاں سے دُھلے ہوئے کپڑے منگائے جانے کی فکر کیجاتی تھی ، گاڑھے کے چند کرتے اور پاجامے اور چند اچکنیں ایک پرانے سوٹ کیس میں ، یہ سب سامان تھا جو اُنکے لئے کافی ہوا کرتا تھا اور اپنے اس توشہ خانہ کی بھی انکو کبھی خبر نہ ہوتی تھی کہ کتنے کپڑے پھٹ گئے اور کتنے باقی ہیں ۔ خاص خاص نیازمندان چیزوں پر نظر رکھتے تھے اور جب کبھی اس "توشہ خانہ" کی خراب حالی کا ان میں سے کسی کو علم ہوجاتا تھا تو پانچ چار کرتے پاجامے تیار ہو جاتے تھے ، مجھے یاد ہے ایک دفعہ غریب خانہ پر تشریف لے گئے تو تین برس کا ایک پرانا جوتہ پانوں میں تھا جو غالباً سوداگر کی دوکان سے آنے کے بعد کبھی معمولی کپڑے سے بھی صاف نہیں کیا گیا تھا ، پالش یا روغن کا تو ذکر ہی کیا ! چمڑا گھس کر آدھا رہ گیا تھا ، ٹانکے گھس کر کھل گئے تھے لیکن وہی جوتہ ہزہائنس نواب صاحب رامپور کے ایرانی قالینوں پر بھی بے تکلف جاتا تھا اور بڑے بڑے عالی مقام مرضیوں

مسیح الملک مرحوم کے سفر نامہ کا ایک صفحہ

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ جیسے ہی انگریز عہدہ دار جب جہاز پر سوار ہوتے ہیں تو ان کی وہ
کمزوریاں جو ہندوستان میں دیکھی جاتی ہیں بہت کم ہو جاتی ہیں اور یہ بڑی حد تک صحیح بھی ہے لیکن اسکے
ساتھ ہی تصویر کے دوسرے رخ کو بھی دیکھنا چاہیے اور بتانا چاہیے کہ جہاز پر سوار ہونے کے بعد خود
خود ہندوستانیوں کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اور وطن سے باہر نکلتے ہوئے جہازی زندگی کا ان پر کیا اثر ہوتا ہے
میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ "کراؤڈ مائنڈ" (مجموعہ) ایک مسلم اور مانی ہوئی طاقت ہے۔ اور یہاں ایک چھوٹا سا
نمونہ جہاز کی زندگی بھی ہے جہاں ایک طرف انگریز غرور کی فضا سے دور ہونے کی وجہ سے کچھ بہتر حالت میں
دکھائی دیتے ہیں وہاں غلام قوم کے افراد بھی ذلت اور نکبت کی فضا کو ترک کرنے کی وجہ سے نسبتاً آزادی کی
ہوا میں سانس لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی مسافروں کی جہازی زندگی میں جو کچھ کمزوریاں
معلوم ہوتی ہیں اور جو سفر کے آخری لمحوں تک نہیں سے اکثر دنوں کی داستان رہتی ہیں وہ ان کی کورانہ
تقلید ہے جس کا آغاز وہ جہاز کی زندگی سے عام طور پر کرتے ہیں۔ ان کی رفتار، گفتار اور ان کی کردار
میں نمایاں تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ گو وہ خیال کرتے ہوں مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی غلامی کے اثرات
میں سے یورپین تہذیب اور شائستگی کی تقلید بھی ایک ایسا اثر ہے جو اس قوم سے دور رکھا جانا چاہیے
جو کسی آئندہ زمانہ میں اپنی قومیت کو اپنی روایات، اپنی شائستگی اور اپنی تہذیب کے برقرار رکھنے
کی وجہ سے محفوظ رکھنا اور ایک ایشیائی قوم کی حیثیت سے ترقی کرنا چاہتی ہے۔

یہ تقلید گو ہندوستان کے ہر ایک فرد کے لئے باعث شرم ہو سکتی ہے لیکن اس جہاز کی بعض ہندوستانی
خواتین کی حرکات و سکنات ہم سب کو زیادہ دکھا رہی ہیں جس کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ ہم بدقسمتی
سے اپنی تعلیم و تربیت کے خود مالک نہیں ہیں۔ اور جس راستہ پر ہم اپنی قومی تعلیم و تربیت کو لانا چاہتے ہیں
نہیں لا سکتے۔ یہ سب چیزیں ہندوستانیوں کو اسی وقت میسر ہو سکتی ہیں جبکہ وہ اپنے ملک کے انتظام
کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے سکیں اور اس کے سایہ میں ملکی اور قومی نقطہ نگاہ سے تعلیم اور تربیت
کا بندوبست کر سکیں۔ موجودہ حالت میں جب گورنمنٹ نے ہماری قومی مساعی کی باگ اپنے
ہاتھوں میں لے رکھی ہے ہمیں یوں سمجھنا چاہیے کہ ہم اپنے ملک کی کوئی چھوٹی سی خدمت بھی مشکل سے انجام دے سکتے ہیں۔

Murari Art Press, Delhi.

کی آراستہ کھوٹیوں پر بھی۔ مجھسے جوتے کی یہ حالت نہ دیکھی گئی تو بازار سے ایک نیا جوتہ منگواکر میں نے دروازے پر رکھوادیا اور پرانے جوڑے کو وہاں سے اٹھوالیا جب موٹر میں سوار ہونے کے لئے اُٹھے تو اتفاقاً جوتہ پر نظر پڑگئی یا شاید پاؤں نے نئے اور پرانے جوتے کے فرق کو محسوس کیا، پانوں آگے بڑھاکر نئے جوتے کو دیکھا پھر میری طرف دیکھا مسکرائے، اور خاموش ہوگئے! میلی اچکن پرانی ٹوپی بوسیدہ جوتے، مسلمانوں کے سب سے بڑے لیڈر اور بہترین انسان کی یہ شان اور یہ وضع تھی، دولت اور شہرت سے انکا نفس مستغنی تھا اور جسم وجان کی آرایش سے وہ ہمیشہ بے پروا رہتے تھے جس انسان کی بے نفسی کا یہ عالم ہو وہ دنیا میں اپنی بڑائی اور عالی مقامی کی کاغذی سندیں کیوں چھوڑ کر جائے! اس گذری ہوئی زندگی کا ایک افسانہ انکے نیازمندوں کی زبانوں پر ہے۔ کتابوں اور اخبارات کے صفحات پر وہ اصلی تصویریں نہیں مل سکتیں جس کو ہماری آنکھوں نے ایک دفعہ دیکھ لیا اور پھر کبھی نہ دیکھیں گی۔

۱۹۲۵ء میں جب صحت کی خاطر مرحوم کو سفر یورپ اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا، تو خوش قسمتی سے میں بھی اس زمانے میں فرانس میں مقیم تھا اور عرصہ تک اس سفر میں مرحوم کے ساتھ رہا۔ اس زمانہ میں انکے کچھ کاغذات میں نے ایک بکس میں محفوظ کردئے تھے، وہی ایک چھوٹا سا بکس انتقال کے بعد میرے ہاتھ آیا۔ اور وہی انکے سوانح نگار کا سارا کاغذی سرمایہ ہے۔ ان کاغذات میں ایک نامکمل مسودہ حالات سفر کا بھی ہے جس کو انہوں نے سفرنامے کے رنگ میں لکھنا شروع کیا تھا، لیکن غالباً ہندوستان واپس آکر اس کو مکمل کرنے کا وقت نہ ملا۔ اور وہ اوراق منتشر حالت میں مجھ تک پہنچے۔ اس مسودہ کے چند صفحات جو آج شائع ہوتے ہیں "جامعہ" کے ناظرین کے لئے محض ایک تبرک ہے جس میں کہیں کہیں

مسیح الملک مغفور کے خیالات کی ایک جھلک بھی نظر افروز ہوگی ۔

عبدالغفار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علےٰ رسولہ الکریم

تمہید | میں اس سے پہلے ۱۹۰۳ء میں ہندوستان سے باہر عراق کی سیاحت کی غرض سے گیا تھا اور کچھ یادداشت سفر بھی لکھیں تھیں لیکن وقت نہ ملنے کی وجہ سے میں اُسے مکمل نہ کرسکا اور اس وجہ سے سفر عراق کے نتائج جو میرے دماغ میں تھے اُنہیں اوراق تک لانیکی نوبت نہ آئی ۔

دوسرا سفر میں نے ۱۹۱۱ء میں یورپ کا کیا اس سفر میں انگلینڈ، فرانس، جرمنی آسٹریا اور ٹرکی کی سیاحت کی لیکن یہ سیاحت اُسی قسم کی تھی جیسی کہ آجکل امریکن مسافر کیا کرتے ہیں اسکے علاوہ میں نے دوران سفر میں کوئی یادداشت بھی نہیں لکھی تھی اس لئے یہ سفر بھی نتائج کے لحاظ سے عقیم رہا جس کا وہ مستحق بھی تھا ۔

اب ۱۹۲۵ء میں پھر میں ہندوستان سے باہر جارہا ہوں اور یہ ارادہ کرتا ہوں کہ حالات سفر برابر لکھتا رہوں گا کہ واپسی پر احباب کے سامنے ایک حقیر ہدیہ پیش کرسکوں ۔

یہ تیسرا سفر دماغ اور اعصاب کو جن کی حالت برسوں کی متواتر تکان کی وجہ سے واقعی طور پر قابل رحم ہوگئی تھی آرام و سکون پہنچانے اور اس وجہ سے جو صدمہ عام صحت کو پہنچ گیا تھا اُسے دور کرنے کی غرض سے ناگزیر طور پر اختیار کیا گیا ہے ۔

میرے محترم بھائی ڈاکٹر انصاری صاحب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ اگر تم آرام کرنے کے خیال سے سفر کرنا چاہتے ہو تو میں تمہارے ہمسفر برابر رہوں گا ۔ انکی اس برادرانہ محبت و ہمدردی نے جس کا میں شکر گذار ہوں بالآخر مجھے اس سفر پر آمادہ کر دیا ۔

میرے ارادۂ سفر کی وجہ سے میرے عزیز دوست قمر شاہ خانصاحب بیرسٹر ایٹ لا بھی

جو رامپور کے ایک معزز اور شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور آج کل جوڈیشل سکرٹری کی خدمات کو ریاست مذکور میں انجام دیتے ہیں آمادۂ سفر ہو گئے لیکن وقت پر بعض موانع کی وجہ سے وہ اپنی آمادگی پر قائم نہ رہے اور اس طرح سے افسوس ہے کہ ہمارے مثلث کا یہ زاویہ قائم نہ رہ سکا۔ مگر اسے زیادہ عرصہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ برادر مکرم نواب سر امیر الدین خانصاحب بہادر کی آمادگی سفر نے اس نقصان کی تلافی کر دی جو عزیز قمر شاہ خانصاحب کے ترک ارادہ کی وجہ سے اس مثلث کو پہنچا تھا۔

نواب صاحب کے ہمراہ حکیم محمد نبی صاحب سند یافتہ طبیہ کالج دہلی بھی بطور ایک سکرٹری کے تھے جن کی وجہ سے انہیں اور مجھے دونوں کو آرام مل رہا ہے۔

بہرحال ہم تین دوستوں کا مختصر گروہ بمبئی میں پہنچ گیا اور ۱۰ اپریل ۱۹۲۵ء کو "رزنک" جہاز پر دوپہر کے بعد سوار ہو گیا۔

بمبئی سے مارسیلز تک جہازی سفر

جس جہاز پر ہم سوار تھے اور جس کا نام رزنک ہے اسکا وزن دس ہزار ٹن ہے گو یہ جہاز بڑا نہیں ہے لیکن نیا بنا ہوا اور صاف ہے۔ ہندوستان سے مارسیلز کا سفر اس کا پہلا سفر ہے۔

اس جہاز کے پہلے اور دوسرے درجہ کے تمام مسافروں کی مجموعی تعداد ۱۸۳ ہے جس میں چھوٹی عمر کے لڑکے اور لڑکیاں شامل نہیں ہیں۔ اس جہاز کی رفتار فی گھنٹہ سولہ سترہ ناٹ کی ہے جو بحری میل ہے اور جو ہندوستان کے میل سے کسی قدر کم ہے

"رزنک" کے ممتاز مسافروں میں سے ہز اکسلنسی لارڈ ریڈنگ، مہاراجہ صاحب گوالیار اور سرہارکورٹ بٹلر گورنر برما ہیں۔ انکے علاوہ اور بہت سے ہندوستانی احباب بھی ہیں جنکا ذکر اس حصہ سفر میں کسی نہ کسی جگہ آجائے گا۔ لیکن غلطی ہو گی اگر ان احباب کی فہرست میں سے ایک دوست کو نمایاں جگہ نہ دیجائے۔ جو قابل اور بالیاقت ہونے کے علاوہ خاص خصائل کے مالک بھی ہیں۔ بہت کم آدمی انہیں انکے قیافہ سے سمجھ سکتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں سیدھے ہیں لیکن

جب کوئی بات تحقیق کی غرض سے انہیں سپرد کیجائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ سوراج کے زمانہ میں غالباً یہی شخصیت سی۔ آئی۔ ڈی کے محکمہ میں سب سے اوپر آنے والی ہے۔ انہیں بات کرنے کی بہت کم عادت ہے اور بظاہر بہت شرمیلے ہیں لیکن ضرورت کے وقت اپنے کھانے کی میز سے تیسری یا چوتھی میز کے کسی مرد یا عورت سے بے تکلف باتیں کرلیا کرتے ہیں۔ انکا مقولہ ہے کہ بات کرنے کے لئے کسی تعارف یا شناسائی کی ضرورت نہیں ہے۔

جہاز کی زندگی جب کوئی شخص جہاز پر سوار ہوتا ہے تو وہ اپنے گرد و پیش کو بہت ہی تنگ دائرہ میں دیکھتا ہے اور اس وجہ سے اس کی مصروفیتیں بہت ہی محدود ہوجاتی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ واقعی طور پر چونکہ اُس کے پاس کوئی خاص کام باقی نہیں رہتا اسلئے وہ اس مختصر دنیا میں بھی اپنے لئے مناسب اشغال پیدا کرلیتا ہے۔

صبح کی بیداری پر پہلا کام بستروں پر چائے نوشی ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد غسلخانوں پر حملہ شروع ہوجاتا ہے اس سے اور تبدیل لباس سے جب فراغت حاصل ہوتی ہے تو صبح کی حاضری کی گھنٹی جو ڈھنڈورے کی طرح جہاز کے ہر درجے میں ایک آدمی بجاتا ہوا تیزی کے ساتھ نکل جاتا ہے اُسے کھانے کے کمرہ میں پہنچا دیتی ہے اس حاضری سے جب نجات ملتی ہے تو "ڈک" کی چہل پہل کا آغاز ہوتا ہے۔ رات کی نیند کی مزاج پرسیاں شروع ہوتی ہیں موسم کی گرمی یا خشکی پر گفتگو ہوتی ہے۔ سمندر کی لطیف ہوا پر تبادل افکار ہوتا ہے۔ اور وہ لوگ جو ڈاکٹر انصاری اور میری طرح بدقسمتی سے خوش قسمت یا خوش قسمتی سے بدقسمت نہیں ہیں۔ تنہا گردش کرتے ہوئے یا کرسیوں پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

عام طور پر "ڈک" کی مشغولیتوں کو اگر تقسیم کیا جائے تو ذیل کے نمبروں میں انہیں محدود کرکے بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) گشت

(۲) کتاب بینی

(۳) نیند اور خرّاٹے

(۴) رقص و سرود

(۵) جہاز کی رفتار پر شرط بازی

اگرچہ گشت کا سلسلہ دن بھر کم و بیش جاری رہتا ہے لیکن اس کی اہمیت اور دلچسپی رات کے کھانے کے بعد بڑھ جاتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جہاز کی اُن گھڑیوں کا آغاز جو دن بھر کی سست زندگی میں کسی قدر چستی پیدا کر دیتی ہیں رات کے کھانے کے بعد سے ہوتا ہے۔ اور اُس وقت تک خوشدلی باقی رہتی ہے جب تک کہ مسافر اپنے اپنے بستروں پر نہیں جاتے ہیں۔

عام طور پر ہندوستان میں کہا جاتا ہے کہ اس کے انگریز عہدہ دار جب جہاز پر سوار ہوتے ہیں تو اُنکی وہ انسانی کمزوریاں جو ہندوستان میں دیکھی جاتی ہیں بہت کم ہو جاتی ہیں اور یہ بڑی حد تک صحیح بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی تصویر کے دوسرے رُخ کو بھی دیکھنا چاہئے اور بتانا چاہئے کہ جہاز پر سوار ہونے کے بعد خود ہندوستانیوں کی کیا حالت ہوتی ہے اور وطن سے باہر نکلتے ہوئے جہازی زندگی کا اُنپر کیا اثر ہوتا ہے۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ "کمپرومائز" (سمجھوتہ) ایک مسلم اور مانی ہوئی طاقت ہے۔ اور اس کا ایک چھوٹا سا مظہر جہاز کی زندگی بھی ہے جہاں ایک طرف انگریز غرور کی فضا سے دور ہونے کی وجہ سے کچھ بہتر حالت میں دکھائی دیتے ہیں وہاں غلام قوم کے افراد بھی ذلت اور نکبت کی فضا کو ترک کرنے کی وجہ سے نسبتہً آزادی کی ہوا میں سانس لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی بھائیوں کی جہازی زندگی میں جو مجھے کمزوریاں معلوم ہوتی تھیں اور جو سفر کے آخری لمحوں تک ان میں سے اکثروں کی دمساز رہتی ہیں وہ اُنکی کورانہ تقلید ہے جس کا آغاز وہ جہاز کی زندگی سے عام طور پر کرتے ہیں، اُن کی رفتار، گفتار اور اُنکی کردار میں نمایاں تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ گو وہ خیال کرتے ہوں مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی غلامی کے اثرات ہیں سے یورپین تہذیب اور شائستگی کی تقلید بھی ایک ایسا اثر ہے جو اُس قوم سے دور رہنا چاہئے جو کسی آئندہ زمانہ میں اپنی قومیت کو اپنی روایات

اپنی شائستگی اور اپنی تہذیب کے برقرار رکھنے کی وجہ سے محفوظ رکھنا اور ایک ایشیائی قوم کی حیثیت سے ترقی کرنا چاہتی ہے۔

یہ تقلید گو ہندوستان کے ہر ایک فرد کے لئے باعث شرم ہو سکتی ہے لیکن اس جہاز کی بعض ہندوستانی خواتین کی حرکات و سکنات ہم سب کے دلوں کو زیادہ دکھا رہی تھیں جس کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ ہم بدقسمتی سے اپنی تعلیم و تربیت کے خود مالک نہیں ہیں۔ اور جس راستہ پر ہم اپنی قومی تعلیم و تربیت کو لانا چاہتے ہیں، نہیں لا سکتے۔ یہ سب چیزیں ہندوستانیوں کو اسی وقت میسر آ سکتی ہیں جبکہ وہ اپنے ملک کے انتظام کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے سکیں اور اس کے سایہ میں ملکی اور قومی نقطۂ نگاہ سے تعلیم اور تربیت کا بندوبست کر سکیں۔ موجودہ حالت میں جب گورنمنٹ نے ہماری ضرورتوں کی مناجری اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے ہمیں یوں سمجھنا چاہئے کہ ہم اپنے ملک کی کوئی چھوٹی سی خدمت بھی مشکل سے انجام دے سکتے ہیں۔

ہمارا جہاز گو عدن ٹھہرنے والا نہیں تھا لیکن یہ سنا گیا کہ ہز اکسلنسی لارڈ ریڈنگ کے نام بعض ضروری چٹھیاں عدن پہنچی ہوئی ہیں اس لئے "رزمک" کوئی پون گھنٹے کے لئے بندرگاہ سے آدھ میل کے فاصلہ پر ٹھہرا اور پھر سوئز کی طرف روانہ ہو گیا۔

۱۷ اپریل کو ہم نے عرب و افریقہ کے ساحلی خشک پہاڑوں کو دیکھا اور دن بھر دیکھتے رہے اس نظارہ نے میرے دل پر خاص اثر کیا۔ گذشتہ زمانے میں یہ دونوں جانب کی وسیع سرزمین اسلامی آزاد سلطنتوں یا ریاستوں کے تصرف میں تھیں لیکن اب وہ محکوم قوموں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ ہمارے سیدھے ہاتھ پر جو ملک ہے (عرب و فلسطین و شام) وہ ایک زمانہ میں انبیا علیہ السلام کا گہوارہ تھا۔ اس کے ہر ایک ذرہ سے روحانی انوار اور حقیقی آزادی کے اطوار نمایاں تھے لیکن آج وہ یا تو شقاق و نفاق کا مرکز ہے اور یا محکومی و غلامی کی بدترین زندگی کا نمونہ۔ ان گہرے اور غم آلود خیالات کے ساتھ یہ دن ختم ہوا اور رات کے پردہ نے ان پُر حسرت مناظر کو ہماری آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔

ہمارا جہاز رات کو تین بجے سوئز پر لنگر انداز ہوا لیکن جب ہم صبح کو اٹھے تو پھر سوئز میں آہستہ آہستہ آٹھ دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا تھا۔ اول تو ہمیں کوئی آبادی نظر نہیں آئی البتہ وہ ریلوے جو قاہرہ سے پورٹ سعید گئی ہے اور اُس کے تاروں کے کھمبے ہمارے بائیں ہاتھ پر برابر دکھائی دیتے تھے۔ ایک عرصہ کے بعد پھر کہیں کہیں سوئز کی چوکیاں دکھائی دیں اور جس قدر ہم پورٹ سعید کی طرف بڑھتے گئے اُسی قدر آبادی کے آثار بھی بتدریج نمایاں ہوتے گئے۔ راستہ میں اسماعیلیہ سے بھی گذرے جہاں دو چار کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں اور گذشتہ جنگ کے زمانے میں جہاں سے ترکی فوج کا ایک حصہ عارضی پل کے ذریعہ سے نہر کو عبور کر کے ہماری بائیں جانب کی مصری حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہم القنطرہ سے گذرے جو گذشتہ جنگ کے زمانے میں انگریزی افواج کا جنگی مرکز تھا گو یہ اب ویران نظر آتا ہے لیکن اُس وقت جو عارضی مکانات بنائے گئے تھے اُنکا ایک معقول حصہ اب بھی یہاں موجود ہے۔ اور اس لائن کا ابتدائی اسٹیشن بھی اسی القنطرہ میں ہے جو فلسطین کو جاتی ہے اس اسٹیشن پر عربی جلی حروف میں جو جہاز سے بھی نظر آتے ہیں " سکہ حدید سینا الحربیۃ " لکھا ہوا ہے۔

ہم سہ پہر کو چار بجے پورٹ سعید پہنچے ہمارا جہاز شہر سے کسی قدر فاصلہ پر لنگر انداز ہوا چونکہ شیخ محمد ماضی ابو العزائم صاحب صدر لجنۃ التحضیریۃ العلیا لمجلس الخلافۃ کے دو عنایت نامے میرے پاس دہلی میں مسئلہ خلافت کے متعلق آئے تھے اور میں اُنکے جواب نہیں لکھ سکا تھا اس لئے بمبئی سے چلتے وقت میں نے اُنکے نام قاہرہ میں تار دیدیا تھا جس میں نے اُنکے خطوط کی رسید دی تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ میں پورٹ سعید سے زرنگ پر گذر رہا ہوں اس لئے اور نیز اس وجہ سے کہ بھائی شوکت علی صاحب نے جیسا کہ ہمیں پورٹ سعید پہنچکر معلوم ہوا تھا قاہرہ میں ایک تار اس مضمون کا دیدیا تھا کہ ہم دونوں (یعنی ڈاکٹر انصاری اور میں) زرنگ کے ذریعہ گذر رہے ہیں المقطم، الاخبار اور دیگر مقامی اخباروں میں ہمارے پورٹ سعید سے گذرنے کی خبر شائع ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ ابو العزائم صاحب اور رشید مصری و ہندی بھائی جن کے نام آئندہ لکھوں گا، قاہرہ سے زحمت

گوارا کر کے اس ماہ رمضان میں پورٹ سعید پہنچ گئے۔

ہم جہاز سے اُترنے اور پورٹ سعید جانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ ایک کشتی میں ہمارے چند مصری بھائی ہم سے ملنے اور ہمیں شہر میں لیجانیکی غرض سے آئے۔ ان بھائیوں میں سے چند کے نام ذیل میں لکھ دینے مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) عبدالحمید سعید بے ایک ترکی مصری خاندان کے معزز رکن جن کے دل میں خاص طور پر اسلامی درد ہے اور جنکی خدمات اسلام کے لئے درجۂ امتیاز رکھتی ہیں جو مصر کی مشہور سیاسی جماعت حزب الوطنی کی جانب سے آئے تھے۔

(۲) سید حسنی مار دینی دمشقی (جو ازہر کے تعلیم یافتہ ہیں اور خلافت کیلئے کام کر رہے ہیں اور اسی سلسلہ میں ہندوستان بھی آچکے ہیں۔

(۳) سید محمود سلامہ

(۴) سید محمود ماضی
(۵) سید احمد ماضی
} یہ دونوں شیخ ابو العزائم کے صاحبزادے ہیں۔

(۶) کامل بک عثمان، وکیل المرکزیہ

(۷) ابراہیم محمد طوبجی تاجر المنیا

یہ سب صاحب سوائے عبدالحمید سعید بے کے شیخ ابو العزائم کی طرف سے اس غرض سے تشریف لائے تھے کہ ہمیں پورٹ سعید لیجائیں جہاں شیخ موصوف اور دوسرے مصری بھائی ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انکے علاوہ ابو النصر سید احمد صاحب بھوپالی (جو کہ ریاست بھوپال کی جانب سے یہاں کی یونیورسٹی میں پڑھ رہے ہیں) اور سید عبدالکریم صاحب حیدر آبادی (جو کہ ریاست حیدر آباد کی جانب سے دار العلوم میں زیر تعلیم ہیں) بھی ہم لوگوں سے ملنے کے لئے زرنگ تشریف لائے۔

چونکہ جہاز کی روانگی کے ٹھیک وقت کا بھی اس وقت تک علم نہیں ہوا تھا اور اور جس وقت علم ہوا تو وقت زیادہ باقی نہیں رہا تھا اس لئے ڈاکٹر انصاری صاحب اور میں نے عذر کیا

اور سب وقت کی تنگی کی وجہ سے پورٹ سعید پر نہ اترنے کی معافی چاہی اور شیخ ابو العزائم صاحب کی خدمت میں بھی زبانی پیام معذرت کہلا بھیجا ۔

تھوڑے عرصہ کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ شیخ صاحب خود جہاز پر معہ اپنے چند ہمراہیوں کے تشریف لے آئے ہیں اسلئے ہم اُن سے ملنے کیلئے گئے اور انکی تکلیف فرمائی کا مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا ۔ شیخ صاحب ایک بزرگ عالم ہونیکے علاوہ خلافت اور اسلامی معاملات کے ساتھ خاص دلچسپی رکھتے ہیں ۔ انکی ملاقات کا ہم لوگوں کے دلوں پر اچھا اثر ہوا لیکن افطار کا وقت قریب آگیا تھا اس لئے مغرب سے کچھ پہلے واپس تشریف لے گئے ۔

ہمیں یہ معلوم ہو کر افسوس ہوا کہ مصری خلافت کے متعلق دو گروہ ہیں ایک گروہ جس میں علمائے ازہر بھی شامل ہیں خلافت کی خدمت ملک فواد (سلطان مصر) کو سپرد کرنا چاہتا ہے اور دوسرا گروہ اس سے اختلاف رکھتا ہے ۔ اس مسئلہ کے علاوہ خلافت کے سلسلہ میں اور بھی چند مسائل ہیں جن میں دونوں گروہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ہیں ۔

معتزلہ

اسلام ایک ایسا سیدھا سادہ دین ہے جس کو ایک عامی سے عامی شخص بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے، بخاری میں ہے کہ ایک صحابی کو مسلمان غلام آزاد کرنا تھا وہ آنحضرت صلعم کی خدمت میں ایک حبشیہ کو جو حد درجہ احمق تھی لے آئے، اور آپسے دریافت کیا کہ کیا یہ مسلمان ہے، آپ نے اس سے پوچھا کہ خدا کہاں ہے، اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا دی آپ نے فرمایا لیجاؤ یہ مسلمان ہے بشروع شروع میں جبتک صحابہ زندہ تھے اسلام ہنی اسی سادگی پر باقی رہا وہ ما فوق الفہم اسرار جن کے سمجھنے کی حیات انسانی کو حاجت نہیں اور نہ عملی زندگی کے لئے انکا علم ضروری تھا۔ اس کو اسی طرح سربستہ چھوڑ کر آگے بڑہ جاتے تھے، وہ اس آیت کے مصداق تھے جو قرآن کی ابتدائی سورۃ میں بیان کیا گیا ہے

آمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمؤمنون کل آمن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ لانفرق بین احدٍ من رسلہ (بقرہ)	پیغمبر پر جو کچھ بھی اس کے خدا کی طرف سے اترا اس پر وہ اور تمام مومنین ایمان لائے، خدا پر اس کے تمام فرشتوں پر، اسکی تمام کتابوں پر اور کل کے کل پیغمبروں پر وہ ایمان اور یقین رکھتے ہیں، اس کے پیغمبروں میں سے کسی ایک کی تفریق نہیں کرتے۔
یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالآخرۃ ہم یومنون (بقرہ)	جو کچھ تجھ پر اور تیرے پیشروں پر اترا اسپر وہ (برگزیدہ لوگ) ایمان لائے ہیں اور آخرت پر بھی انکا ایمان ہے۔

اور حقیقتاً انکا یہ عمل منشاء ایزدی کے بالکل مطابق تھا چنانچہ ایک جگہ پر ارشاد ہوتا ہے۔

ہو الذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ہن ام الکتاب واخر متشابہات	خدا نے تجھکو یہ کتاب دی جس میں کچھ آئیں واضح اور صاف ہیں اور وہ اصل کتاب ہیں بعض تشابہ ہیں جو کج دل

فاما الذین فی قلوبہم زیغ فیتبعون ماتشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ کل من عند ربنا وما یذکر الا اولوا الالباب

ہیں وہ فتنہ انگیزی اور اس کے مطلب کو حل کرنے کے لئے متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں۔ حالانکہ جو معنی کہ اس کے حقیقی ہیں وہ بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ کہ علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے یہ سب خدا کی جانب سے ہیں۔ اور عقلمندوں کے سوا کوئی عبرت نہیں پکڑتا۔

آیت بالا سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ قرآن کی صحیح تعلیم یہی ہے کہ لوگ خواہ مخواہ ان باتوں کے پیچھے نہ پڑیں جن کا علم انکو کسی حالت میں مفید نہیں وہاں یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ عرب کے بعض افراد باوجود اپنی فطری سادگی اور میلان طبع کے قرآن کی بعض آیتوں میں رد و قدح جھوٹی تاویلیں اور بلا ضرورت بہت سی باتیں من گھڑت بیان کیا کرتے تھے، احادیث کی روشنی میں بھی ہم اس حقیقت کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک روز آنحضرت نے مذکورہ بالا آیت ہو الذی الخ تلاوت فرمائی اور پھر کہا اذا رایتہم الذین یتبعون ماتشابہ منہ فاولئک الذین سمی اللہ فحذرہم، جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہات کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں تو جان لو کہ یہ وہی ہیں جن کا خدا نے نام لیا ہے تو تم ہمیشہ ان لوگوں سے بچتے رہو۔ اس کے علاوہ عربوں کی شاعری میں بھی اگر ہم ایسے لوگوں کا کھوج کریں تو یقین ہے کہ آسانی سے پا سکیں گے۔

مصنف ملل و نحل کا خیال ہے کہ یہ منافق لوگ تھے جنہوں نے خواہ مخواہ اپنی خاص غرض کو پوشیدہ رکھکر آیات متشابہات کی تاویلیں کیں اور اس طرح فتنہ کا ایک دروازہ کھولدیا چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

یہ تمام شبہات[1] جو آخر زمانے میں پیدا ہوئے کفار اور منافقین کے پیدا کردہ ہیں جنہوں

(۱) الملل والنحل للشہرستانی صفحہ ۱۷، ۱۸، ۱۹

نے ابتدائی زمانہ اسلام میں اسکی تخم ریزی کی۔ یہ لوگ پیغمبر کے بتائے ہوئے راستہ پر نہ چلے بلکہ غیر ضروری باتوں میں خیال آرائی کی، جس چیز کے غور و خوض سے منع کیا گیا اسی کے متعلق خواہ مخواہ سوالات کئے، غلط اور باطل باتوں میں مجادلہ اور مباحثہ کیا چنانچہ حدیث ذی خویصرہ التیمی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت (صلعم) سے کہا کہ اے محمد عدل کر تو عدل نہیں کرتا۔ آنحضرت (صلعم) نے فرمایا کہ اگر میں عدل نہیں کرتا تو کون کرے گا۔ اس پر بھی وہ لعین باز نہ آیا اور کہا کہ کیا تو اسی تقسیم سے اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے، یہ صریح نبی پر خروج نہیں تو اور کیا ہے اگر وہ شخص جو سچے امام پر اعتراض کرتا ہے خارجی ہو جاتا ہے پھر تو بدرجہ اولیٰ وہ شخص جو سچے رسول پر اعتراض کرے خارجی ہوگا تو کیا یہ نص اور امر الٰہی کے مقابلہ میں اپنی ذاتی عقل کا قیاس نہیں ہے؟ اس بنا پر آنحضرت نے فرمایا کہ عنقریب اس سے ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو دین سے کوسوں دور ہوگی جیسے کہ تیر کمان سے، اور یہی حال ان منافقین کا تھا جنہوں نے غزوہ اُحد میں کہا تھا کہ ہل لنا من الامر شئی، یعنی کیا کچھ ہمارا بھی اختیار ہے؟ اور نیز یہ بھی کہا تھا کہ اگر ایسا ہوتا تو ما قتلنا ہہنا یعنی ہم یہاں قتل نہ ہوتے، کیا یہ صریحاً قدر نہیں ہے، ایک دوسرا گروہ مشرکین کا تھا جو یہ کہتے تھے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم بجز اس کے کسی کی عبادت نہ کرتے، لو شاء اللہ ما عبدنا من دونہ من شئی، اور ایک جماعت ایسی بھی تھی جو کہتی تھی کہ کیا ہم اس کو کھلائیں جس کو خدا خود کھلانا نہیں چاہتا انطعم من لو یشاء اللہ اطعمہ، کیا یہ صریحاً جبر نہیں اور اسی طرح اس جماعت کا بھی خیال کر جس نے اللہ کے جلال اور اس تصرف افعال میں بحث کی، یہانتک کہ انکو اس آیت سے روکا گیا، ویرسل الصواعق فیصیب بہا من یشاء وہم یجادلون فی اللہ وہو شدید المحال، یہ واقعات سب اس زمانے کے ہیں جب آنحضرت زندہ اور صحیح و سالم تھے، اور یہ سب کچھ منافقین

نے کیا جو ظاہر میں اسلام کا اظہار کرتے لیکن باطن میں وہ منافق تھے۔

اسمیں شک نہیں کہ ابتدا سے ایک جماعت ایسی تھی جس کا مقصد یہی تھا کہ اسلام کی تعلیمات کو خلط ملط کرے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ مومنین کے دل میں اس قسم کے خیالات کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے۔ وہ بھی ان آیتوں سے جو بظاہر ایک دوسرے کی مخالف تھیں کھٹکے لیکن انکے قلب کی روشنی اور حضور کے فیض صحبت نے ان کے عقیدہ میں کسی قسم کا فتور نہ آنے دیا۔ چنانچہ حدیث[1] میں آیا ہے کہ ایک آیت میں دو صحابہ کو آپ نے لڑتے ہوئے سنا تو آپ حجرے سے باہر آگئے چہرے پر غصہ کے آثار تھے فرمایا کہ تم سے پہلی قومیں کتاب میں اختلاف کی وجہ سے ہلاک و برباد ہوئیں، اس کے علاوہ ترمذی میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور ابن ماجہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ باہر تشریف لائے کچھ صحابہ آپس میں بیٹھے ہوئے بحث و مباحثہ کر رہے تھے، آپ نے پوچھا کہ کس مسئلہ پر گفتگو ہے کہا گیا کہ مسئلہ تقدیر پر، یہ سنتے ہی آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا، راوی کا بیان ہے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی نے روئے مبارک پر انار کے دانے نچوڑ دئے ہیں، آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو اسی کا حکم دیا گیا ہے؟ کیا تم اسی لئے پیدا کئے گئے ہو؟ کیا میں یہی پیغام لیکر آیا ہوں؟ کیا تمہاری پیدائش کا یہی مقصد ہے؟ قرآن کی ایک آیت کو دوسری آیت پر پٹکتے ہو، تم سے پہلے بہت سی قومیں اسی بنا پر ہلاک ہوئیں۔ میں تاکید سے کہتا ہوں کہ اس میں جھگڑا مت کرو۔

بہرحال عقائد میں اختلاف گو منافقین کی طرف سے پیدا کرنیکی کوشش کی گئی اور صحابہ بھی کبھی کبھی خصوصی مسائل میں چونکنا ہوئے لیکن آنحضرت جب تک زندہ رہے اختلاف رونما نہ ہوسکا، عہد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں کبھی کبھی اس قسم کا خطرہ پیش بھی آیا تو خلفاء اولین

---

(۱) مسلم جلد دوم صفحہ ۳۳۹

کے اثر و اقتدار نے انکو ابھرنے نہ دیا اس کے علاوہ فتوحات اور اشاعت اسلام نے اس طرف توجہ کا موقعہ بھی کم دیا، البتہ بنو امیہ[1] اور عباسیہ کے زمانے میں جب فتوحات اسلامی کا سیلاب طرف اور اطراف سے گزر کر دور دراز مقام تک پہنچ گیا تھا مختلف قومیں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں تو اپنی اپنی فطرت کے مطابق اسلامی عقائد میں نکتہ چینی شروع کیں اور وہ تمام خیالات جو انکے قدیم مذہب میں تھے، قرآن کی آیتوں سے منطبق کرنا چاہا کسی نے ان الفاظ سے جو ہاتھ، پیر، آنکھ ناک کے ہم معنی تھے مجازی معنی لئے کسی نے اس کے حقیقی معنی مراد لیکر خدا کو ایک بزرگ اور مقدس انسانی پتلا تصور کیا جو عرش پر بیٹھکر دنیا وی خداوندوں کی طرح حکومت کرتا ہو، اس کے علاوہ وہ اور بہت سے دوسرے مسائل جو کبھی دبا دئے گئے تھے ابھر آئے۔ الغرض اسی قسم کی اور بہت سی باتیں پیدا ہوگئیں جو علوم و فنون کی اشاعت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئیں۔

ایک طرف یہ تھا تو دوسری طرف امامت و خلافت کی بحث نے اختلاف عقائد اور مذاہب کا ایک وسیع دروازہ کھولا اور وہ اس طرح پر کہ جب آنحضرت صلعم کا انتقال ہوگیا تو جہاں اور بہت سے سوالات[2] پیدا ہوئے، مثلاً نبی صلعم آسمان کی طرف اٹھائے گئے ہیں، جو لوگ یہ کہتے کہ عام انسانوں کی طرح فوت ہوئے وہ غلط کہتے ہیں، دفن کا کونسا مقام ہوگا، نبی کی اولاد وارث نبی بن سکتی ہے یا نہیں، سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوا کہ آنحضرت کا خلیفہ کون بنے اور وہ کس خاندان کا ہو، لیکن بحمد اللہ یہ تمام اختلافات صحابہ رضوان اللہ علیہم نے دانائی اور ہوشیاری سے مٹا دئے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت تک کوئی خاص اختلاف رونما نہ ہوسکا البتہ حضرت عثمان رض کے ملکی اور سیاسی طرز عمل سے تین جماعتیں پیدا ہوئیں، ایک علویہ تھی جن کا خیال تھا کہ خلافت اور امامت کا حق صرف حضرت علی رض اور انکے خاندان تک

---

(۱) تفصیلی بحث کے لئے مولانا شبلی کا الکلام دیکھو

(۲) الملل والنحل للشہرستانی صفحہ ۱۹ و ۲۰

محدود ہے ، دوسری عثمانی تھی جو حضرت عثمان رضی اللہ کے حامی تھے ، اور ایک تیسری جماعت خوارج کی تھی جو دونوں کے مخالف تھی ۔ عثمانیہ تو تھوڑے دنوں کے بعد ختم ہو گئے لیکن علویہ اور خوارج نہ مٹ سکے ۔ یہ جماعتیں ہمیشہ اپنے کو برسر حق اور دوسرے کو کافر کہتیں اور اس معاملے میں ان سب کی دلیل قرآن کی یہ آیت "من قتل مومنا متعمدا فجزاہ جہنم خالدا فیہا" تھی ، بہرحال یہ حال ایک عرصہ تک قائم رہا کہ بنو امیہ برسر اقتدار رہے ۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ظلم اور سفاکی کا بازار اکثر گرم رہتا ، اس لئے بہت سی طبیعتیں بنی امیہ سے متنفر ہو رہی تھیں ، انکا روحانی اثر ختم ہو رہا تھا کہ ملکی ضرورت سے بنو امیہ کی ایک طرفدار جماعت پیدا ہوئی ، اور یہ جہمیہ تھے ، جنہوں نے کہا کہ یہ زیادتیاں محض اس لئے ہیں کہ خدا کو ایسا کرانا منظور ہے ہمارے اعمال کی یہ سزا ہے ورنہ خدا چاہتا تو کیا روک نہ سکتا تھا ، انسان مجبور محض ہے وہ اپنے اعمال کا بالکل مختار نہیں اب جہمیہ کے مخالف ایک دوسرا انتہا پسند گروہ قدریہ[1] کا پیدا ہوا اس نے قرآن کی بعض آیتوں کی بنا پر یہ دعوی کیا کہ انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے خدا نے اس کو اس کے افعال پر قدرت دے رکھی ہے ، اس خیال کے پھیلانے میں بہت سے لوگ جان سے مارے گئے ۔ معبد[2] معبد کے بعد غیلان دمشقی اور پھر کچھ دنوں کے بعد جہم بن صفوان ، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے سختی اور ظلم کے بعد اس مسلہ کو عام کرنا دین و مذہب کا ایک بڑا رکن بنا لیا ۔ بہرحال یہی قدریہ آگے بڑھکر معتزلہ کے لقب سے پکارے گئے ۔

اسلام میں فرقہ سازیاں یہیں ختم نہیں ہوتیں بلکہ دن بدن اسمیں اضافہ اور زیادتی ہوتی رہی ، بنو عباسیہ کے زمانے میں جب بہت سے علوم و فنون عربی زبان میں منتقل کئے گئے یونانی فلسفہ کا چرچا ہر علمی اور مذہبی سوسائٹی میں ہونے لگا علاوہ ازیں ہر شخص کو رائے اور مذہب

---

(۲) ملل ونحل للشہرستانی میں پوری تفصیل ہے ۔

کی عام آزادی دیدی گئی تو بیسیوں فرقے اور پیدا ہو گئے ۔ مولنا شبلی لکھتے ہیں کہ
ملکی[1] ضرورت نے اگرچہ صرف جبر و قدر کے مسلہ پر توجہ دلائی تھی لیکن جب ایک دفعہ
کسی وجہ سے خیالات میں حرکت پیدا ہوئی تو بڑھتی ہی گئی یہاں تک کہ بنو امیہ کا دور ختم
نہیں ہو چکا تھا کہ خلق قرآن تنزیہ و تشبیہ، صفات باری وغیرہ کی بحثیں چھڑ گئیں اور
جس کے منہ سے جو بات نکلی ایک مذہب بن گئی

بانی معتزلہ

اوپر کہیں ذکر کیا جا چکا ہے کہ قدریہ بنو امیہ کے ابتدائی زمانے میں پیدا ہوا تھا لیکن پھر بعد
میں بعض ایسے حالات اور واقعات پیش آئے کہ اسی خاندان کے دور آخر میں انکی وہ پہلی
شان نہ رہ سکی لیکن باوجود اس کے خیالات کا بیج جب ایک دفعہ بو یا جا چکا تھا تو بالکل جڑ
سے اکھاڑ پھینکنا مشکل تھا، اس لئے ٹھیک اس وقت (دوسری صدی ہجری) جب کوفہ اور
بصرہ علوم و فنون کے مرکز بن رہے تھے، ہر طرح کے لوگ اور ہر فن کے امام وہاں موجود تھے،
علما، تو علما عوام کو بھی حق رائے آزادی کے ساتھ حاصل تھا، اور پھر اس کے علاوہ یہ دونوں
شہر ایسی جگہ پر واقع تھے، جہاں کہ فارس کی وہ موجیں جو شیعہ اور خوارج کی پیدا کردہ ہوتیں
بآسانی آتی جاتی تھیں، ان تمام اسباب کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ آگ جو بنو امیہ کے ابتدائی دور
میں کبھی جلی تھی اور دمشق میں بجھنے والی تھی اس کی ایک معمولی چنگاری یہاں ان رنگین طبیعتوں
کو بھڑکانے کے لئے کافی تھی چنانچہ سب سے پہلے بصرہ میں واصل بن عطا نے اس آگ کو روشن
کیا اور یہی وہ شخص ہے جس نے مذہب اعتزال کی بنا ڈالی ۔

وجہ تسمیہ یہ جماعت خود اپنے کو اہل توحید اور عدل کے نام سے موسوم کرتی لیکن عوام اس کو

---

(۱) الکلام جلد اول صفحہ ۱۹

قدریہ کہتے، اس لئے کہ انکا عقیدہ یہ تھا کہ انسان اپنے اعمال پر قادر ہے جیسا کہ انکے پیشروں معبد جہنی اور غیلان وغیرہ کا مسلک تھا۔ ان لوگوں کو معتزلہ کہے جانے کی بہت سی وجہیں بیان کی گئی ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب واصل بن عطا نے اپنے شیخ حسن بصری سے اس ایک خاص مسئلہ میں اختلاف کیا کہ جو شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے اس کو کیا کہا جائے، شیخ کی رائے یہ تھی کہ وہ کافر ہے، واصل بن عطا نے ان سے اختلاف کیا اور کہا کہ ایسا شخص نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ ان دونوں کے درمیانی منزل میں ہے، یہ کہتے ہوئے جماعت سے اٹھ آئے، شیخ موصوف نے کہا لقد اعتزل عنا اسی مناسبت[1] سے یہ اور انکی جماعت معتزلہ کے لقب سے پکاری گئی لیکن بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ واصل[2] نے اس مسئلہ میں ائمہ سے اعتزال (علیحدگی) اختیار کیا جن کا یہ عقیدہ ہے کہ مرتکب گناہ کبیرہ مومن ہے لیکن فاسق کہا جائیگا، ایک تیسری جماعت بھی ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ اکثر اس مذہب کے شیوخ نے دنیا سے اعتزال (علیحدگی) اختیار کی اس بنا پر انکا نام معتزلہ رکھا گیا

معتزلہ کا مختلف فرقوں میں منقسم ہونا

ڈھائی سو سال کی مدت میں یہ جماعت بتدریج بائیس[3] شاخوں میں منقسم ہوگئی، بغدادی نے اس میں سے دو حائطیہ اور حماریہ کو غلاۃ میں شمار کیا ہے لیکن شہرستانی اور مقریزی نے معتزلہ میں انکو رکھا ہے۔ معتزلہ کے ان تمام فرقوں کے تدریجی حالات اور انکے مخصوص خیالات سے ناظرین کو روشناس کرنیکے لئے میں بہتر طریقہ یہ سمجھتا ہوں کہ انکو انکے حالات کے

---

(۱) ملل ونحل شہرستانی

(۲) الفرق بین الفرق

(۳) تعلیق، استاذ فیلیب حتی علی مختصر الفرق بین الفرق

لحاظ سے تین بڑے بڑے تاریخی دور میں تقسیم کروں لیکن اس سے پہلے انکے عام عقائد کا مطالعہ جس پر کہ سبھی کا اتفاق ہے ضروری ہے۔

عام عقائد[له]

(۱) خدا سے صفات ازلی کا انکار یعنی جس کے معنی صاف لفظوں میں یہ ہیں کہ اللہ بذاتہ زندہ ہے قادر ہے صاحب ارادہ ہے حیات، قدرت اور علم وارادہ کی وجہ سے نہیں، زمان، مکان، جسم وجوہر کے قیود سے آزاد ہے، اسی عقیدہ کی بنا پر وہ اپنے کو اہل توحید کہتے تھے، اس لئے کہ وہ تمام صفات کا انکار محض اس لئے کرتے تھے کہ شرک باری تعالیٰ نہ لازم آئے، غالباً یہ افلاطون اور غیر دڈوٹس کے عقیدہ سے متاثر ہو کر یہ عقیدہ ان میں قائم ہوا یہ دونوں اس بات کے قائل تھے کہ خدا نہ کسی خاص صفت کے ساتھ موصوف کیا جا سکتا ہے اور نہ ادراک کیا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ

(۲) دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خود مختار ہے، خدا انسانوں کے افعال اور اعمال کا خالق نہیں، وہ خود اپنے اچھے برے کے آپ ذمہ دار ہیں اس لئے کہ خدا عادل ہے، انکے اس قول کی بنیاد قرآن کی بعض آیتیں ہیں مثلاً کل نفس بما کسبت رہنیۃ (مدثر) من عمل صالحاً فلنفسہ ومن اساء فعلیہا وما ربک بظلام للعبید (حم سجدہ) قد جاء بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسہ ومن عمی فعلیہا وما انا علیکم بحفیظ (انعام) اس عقیدہ کی بنیاد پر اپنے کو وہ اہل عدل کہتے تھے

(۳) فاسق کے متعلق انکا یہ عقیدہ ہے کہ وہ نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ ان دونوں کے بیچوں بیچ والی منزل میں ہے۔

له الفرق بین الفرق، شہرستانی علی ہامش الملل والنحل لابن حزم اور تاریخ تمدن عربی نکلسن دیکھو۔

(۴) اس بات پر انکا اجماع ہے کہ کلام الٰہی حادث ہے قدیم نہیں (انا جعلناہ قرآناً عربیاً) جعلنا کے معنی خلقنا کے ہیں۔

(۵) جمہور مسلمانوں کے خلاف انکا یہ عقیدہ ہے کہ خدا کو ان آنکھوں سے دیکھنا ممکن نہیں نہ وہ خود اپنے کو دیکھ سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا اس کو دیکھ سکتا ہے اور اس کے علاوہ (۶) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مومن پر فرض ہے۔

پہلا دور

یہ دور دوسری صدی ہجری کے ساتھ ساتھ شروع اور ختم ہوتا ہے گو اس زمانے میں اس کو وہ اثر واقتدار حاصل نہیں ہوا تھا جو آئندہ چلکر ہونیوالا تھا مگر پھر بھی واصل بن عطا اور عمر بن عبید (جن کا تذکرہ ابھی کرنا ہی) کی کوششوں سے اعتزال نے خواص میں کچھ کچھ مقبولیت حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس دور کا سب سے پہلا اور مشہور عام فرقہ واصلیہ ہے جو بانی فرقہ معتزلہ واصل کے نام سے منسوب ہے، اور دوسرا فرقہ عمریہ جس کی نسبت عمر بن عبید کی طرف کی گئی ہے لیکن عام طور پر مورخین ان دونوں فرقوں کو ایک شمار کرتے ہیں اس لیے کہ جسوقت واصل بن عطا اپنے اُستاد سے اس مسئلہ خاص میں جس کا تذکرہ اوپر کیا جاچکا ہے اختلاف کر کے استاد کے حلقہ درس سے اُٹھ آئے عمر بن عبید کو یہ یقین تھا کہ واصل سے بحث و مباحثہ کر کے استاد کے حلقہ درس میں دوبارہ شامل کر دیں گے لیکن صاحب موصوف نے ان سے مناظرہ کیا تو بجائے اس کے کہ انکو اپنی رائے سے متفق کرتے خود انکے جال میں گرفتار ہوگئے، واصل نے اپنی بہن سے انکا نکاح کر دیا اور اس طرح تعلقات کی مضبوطی کے ساتھ ساتھ دونوں اپنے خاص معتقدات کی اشاعت میں مشغول ہوگئے واصل کا شمار اپنے زمانے کے مشہور متکلمین میں تھا اور نہ صرف یہی بلکہ لغت وادب کے ماہر تھے، انکے ایک ہمعصر نے انکی مدح میں یہ شعر کہا۔

لکل خطیب یغلب الحق باطلہ　　　علیھم بابدال الحروف وقامع

ابن خلکان کی روایت کے مطابق واصل ایک بڑا مصنف بھی تھا چنانچہ اسکی لکھی ہوئی کتابیں حسب ذیل ہیں: کتاب فی اصناف المرجیہ، کتاب فی التوبہ۔ کتاب المنزلہ بین المنزلین۔ کتاب معانی القرآن، کتاب السبیل الی معرفت الحق، کتاب الخطب فی التوحید والعدل۔ کتاب بینہ وبین عمر بن عبید، کتاب فی الدعوة، کتاب طبقات اہل العلم والجہل،

واصل کی پیدائش مدینہ میں ۸۰ھ میں ہوئی بصرہ میں ۱۳۱ھ کو انتقال ہوا واصل اور عمر یہ دونوں ہوالی عرب سے تھے، واصل نے معتزلہ کے عام معتقدات کے ماورا جس چیز کا اضافہ کیا تھا وہ اصحاب[1] جمل اور خوارج کے بارے میں تھا جمہور مسلمان حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور طلحہ نہ علی رضی اللہ عنہا کو کافر سمجھتے ہیں لیکن واصل کا عقیدہ اس کے بالکل برعکس یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ بعد قضیہ تحکیم ایک حیثیت سے کافر اور عائشہ رضی اللہ عنہا وطلحہ رضی اللہ بھی دوسری حیثیت سے کافر ہے۔

دوسرا دور

تیسری صدی ہجری معتزلہ کا دوسرا دور بعض حالات اور واقعات کی بنا پر خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے یہی وہ زمانہ ہے جب جوق جوق بہت سے علما[2] اور وزرا اس جماعت کے رکن بنے، اعتزال نے حکومت پر جگہ حاصل کی، امام احمد[3] بن حنبل کو اور دوسرے[4] بزرگوں کو

---

(۱) مختصر الفرق بین الفرق

(۲) وہ علماء جو اپنے زمانہ کے ممتاز اور با اثر لوگوں میں تھے اور مذہب اعتزال اختیار کر لیا تھا ان کے اسماء گرامی یہ ہیں، احمد بن داؤد، جاحظ، ابن عباد

(۳) قاضی احمد بن داؤد نے جو کہ معتزلین کا سردار تھا مامون الرشید کے کان میں مسئلہ خلق قرآن کو پھونک دیا اور اس عقیدہ فاسد نے مامون کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اس مسئلہ کی اشاعت کی کوشش کرے (بقیہ صفحہ پر)

سخت سے سخت مصیبتیں خلیفہ مامون الرشید اور معتصم کے ہاتھوں اٹھانی پڑیں اس زمانہ کا نقشہ مولانا ابو الکلام نے تذکرہ میں یوں کھینچا ہے:

تیسری صدی کے اوائل میں جب فتنۂ اعتزال وتعمق فی الدین اور بدعۃ مضلۂ تکلم بالفلسفہ وانحراف از اعتصام بالسنہ نے سر اٹھایا، اور صرف ایک ہی نہیں بلکہ لگاتار تین عظیم الشان

(بقیہ حاشیہ صفحہ)

سنہ ۲۱۸ھ میں اسحٰق بن ابراہیم خزاعی کو بغداد میں لکھا کہ علمائے بغداد کو خلق قرآن کی طرف جبراً متوجہ کرے بعض روپوش ہو گئے اور بعضوں نے توریہ کیا، اور انکے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے حسب منشاء قبول کیا، امام احمد بن حنبل انکار کے جرم میں خلیفہ کی خدمت میں بھیجے گئے جس وقت امام موصوف رقہ میں پہنچے مامون کے مرنیکی خبر طوس میں آئی، اثنائے راہ سے بغداد کو واپس گئے، لیکن مامون نے مرتے وقت اپنے جانشین سے یہ وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد مسئلہ خلق قرآن میں وہ بھی ایسی ہی کوشش کرے چنانچہ جب معتصم خلیفہ ہوا تو اس نے بہت بیدردی سے امام موصوف کو قید کیا، چار چار بوجھل بیڑیاں پیروں میں ڈالی گئیں پہنیں. اسی حالت میں بغداد سے طرطوس لے چلے اور حکم دیا گیا کہ بلا کسی مدد اور سہارے کے خود ہی اونٹ پر چڑھیں اور اتریں امام موصوف بوجھل بیڑیوں کی وجہ سے ہل نہیں سکتے تھے۔ اُٹھتے تھے اور گر پڑتے تھے۔ عین رمضان المبارک کے آخر عشرہ میں بھوکے پیاسے جلتی دھوپ میں بٹھا دئے گئے اور لگاتار کوڑے اس طرح مارے گئے کہ ہر جلاد دو ضربیں پوری قوت سے لگا کر پیچھے ہٹ جاتا اور پھر دوسرا تازہ دم جلاد اسکی جگہ لیتا لیکن اس کے باوجود وہی رٹ القرآن کلام اللہ غیر مخلوق کی جاری تھی آخر باوجود سیکڑوں معتصم کی ترغیبات کے وہ اپنے عقیدے سے باز نہ آئے بلکہ اور سخت ہوتے گئے اور بالآخر رقہ میں ۲۸ روز قید رہکر اسی مصیبت میں امام موصوف کا انتقال ہوا (ابن خلکان، تذکرہ ابو الکلام، المامون رسالہ ابن تیمیہ وغیرہ دیکھو)

(۴) عبداللہ بن عمر القواریری اور حسن بن حماد وغیرہ دوسرے علما بھی قید ہوئے لیکن تاب تشدید نہ لاکر اقرار کر کے چھوٹ گئے۔

فرمارواؤں یعنی ماموں، معتصم، واثق باللہ کی شمشیر استبداد اور قہر حکومت نے اس فتنہ کا ساتھ دیا حتی کہ بقول علی مدینی کے فتنۂ ارتداد و منع زکوٰۃ (بعہد حضرت ابو بکر) کے بعد یہ دوسرا فتنۂ عظیم تھا جو اسلام کو پیش آیا۔

بغدادی نے اس زمانے میں جتنے فرقے معتزلہ کے پیدا ہو گئے تھے گیارہ بتایا ہے لیکن شہرستانی وغیرہ نے حائریہ، حایطیہ، مریسیہ کو شمار کر کے ۱۴ بتائے ہیں۔ ہذیلیہ، نظامیہ اسواریہ، معمریہ، بشریہ، ہشامیہ، مرداریہ، جعفریہ، اسکافیہ، ثمامیہ، جاحظیہ۔

ہذیلیہ۔ یہ فرقہ[1] ہذیل علاف مولیٰ عبدالقیس کی جانب منسوب ہے، شیخ موصوف بصرہ کی معتزلہ جماعت کے سردار تھے، بہت بڑے عالم تھے اپنے مذہب کے ثبوت میں بعض خاص مقالات لکھے ہیں بعض چھوٹے چھوٹے فرقے معتزلہ کے مثلاً نظامیہ، بشریہ، ہشامیہ جن کا تذکرہ آگے آئے گا اور بعد میں پیدا ہوئے بعض خیالات میں شیخ موصوف کے خوشہ چیں ہیں۔

ابو ہذیل[2] ۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۲۶ھ میں فوت ہوئے، وہ خاص خیال جس کی وجہ سے یہ ایک الگ اور مستقل جماعت بن گئی وہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کے فنا ہو جانے کے بعد از سر نو اس کے بنانے پر قادر نہیں ہے۔

نظامیہ۔ یہ اپنے بانی ابراہیم بن سیار نظام کی جانب منسوب ہے یہ مدینہ میں ۱۶۰ھ میں پیدا ہوئے اور عراق میں ۲۳۱ھ کو وفات ہوئی، انکا بھی شمار معتزلہ کے اہم لوگوں میں تھا فن بیان اور بلاغت کے امام تھے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ جاحظ جو مشہور امام فن بلاغت کا گزرا ہے صاحب موصوف کا شاگرد اور انہیں کا تربیت یافتہ تھا۔ وہ خاص مسائل جن میں انہوں نے عام جماعت سے اختلاف کیا وہ یہ ہیں (۱) جو صلاحیت جس چیز میں موجود ہوتی ہے اس کے

---

(۱) مختصر الفرق بین الفرق

(۲) ابن خلکان جلد اول صفحہ ۶۸۴

خلاف اگر خدا چاہے کہ اس کی اس خاصیت کے ماورا نتیجہ ظہور میں آئے تو یہ ناممکن ہے۔ بالفاظ دیگر جیسا کہ ہذیلیہ (نعوذ باللہ) خدا کے عجز کے قائل تھے یہ بھی ہیں (۲) کسی چیز کی کبھی (الی غیر النہایت) انتہائی تقسیم نہیں ہوسکتی۔ (۳) یہ لوگ اعجاز قرآن کے قائل نہ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر لعن وطعن کرتے اس لئے کہ انہوں نے نبی صلعم کی وفات میں شبہ کیا، یوم حدیبیہ کے موقعہ پر شک کیا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو میراث سے محروم کیا۔

اسواریہ۔ یہ فرقہ گو نظامیہ کی ایک شاخ تھی بہت کم ایسی باتیں ہیں جس میں ان سے اختلاف کیا۔

معمریہ۔ یہ جماعت معمر بن عباد سلمی کی متبع تھی جن کا زمانہ وفات ۲۲۰ھ ہے۔ زمانہ پیدائش میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ انکا خاص عقیدہ یہ تھا کہ خدا نے بجز مادے کے کچھ پیدا نہیں کیا جو تغیرات کہ مخلوقات عالم میں روز دیکھتے ہیں وہ انہیں مادے کے خواص ہیں جن کا ظہور ان کی طبیعت اور خاصیت کے لحاظ سے ہوا کرتا ہے۔ خدا کو (نعوذ باللہ) اسمیں مطلق دخل نہیں ہے۔

بشریہ۔ اسکا بانی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بشر بن معتمر ہیں انکے معتقدات تقریباً وہی ہیں جو ہذیل علاف کے تھے انکا مخصوص عقیدہ یہ ہے کہ کل کے کل افعال متولدہ ہیں انکا فاعل کوئی نہیں اور یہ عقیدہ بہت زیادہ معمر بن سلمی اور ثمامیہ بن اشرس جن کا تذکرہ آگے آتا ہے کے زیادہ مشابہ ہے۔ ایک خاص عقیدہ عام معتزلہ کے عقیدہ کے خلاف یہ ہے کہ خدا صاحب ارادہ ہے اس معنی کر کے کہ ارادہ اسکی صفت ازلی ہے۔

ہشامیہ۔ انکا سردار ہشام بن عمرو الغوطی ہیں انہوں نے قرآن کی اکثر آیتوں کی تاویلیں بہت غلط طریقہ سے کیں ہیں۔ یہ بھی علاف کی طرح خدا کے عجز کے قائل تھے۔

اسکافیہ جعفریہ۔ ان دونوں کا عقیدہ عام سے بالکل الگ یہ تھا کہ گناہ کبیرہ سے محفوظ محض گناہ صغائر کی وجہ سے عذاب میں مبتلا نہ ہوگا۔

ثمامیہ۔ معتزلہ کے اہم ترین فرقوں میں اس فرقہ کا شمار کیا جاتا ہے، اسکا شیخ ثمامہ بن اشرس

الخیری ہیں، یہ شخص مامون الرشید کا ہم عصر تھا۔ اس جماعت کا خیال یہ ہے کہ عالم کی پیدائش خدا کی مشیت سے نہیں ہوئی، بلکہ مادہ پہلے سے موجود تھا جس نے رفتہ رفتہ موجودہ شکل اختیار کی، عالم ازلی ہے جیسا خدا خود ازلی ہے عقل اچھائیوں برائیوں کی پرکھنے والی ہے، اس لئے شریعت خواہ آئے نہ آئے ہر حالت میں اللہ کی معرفت انسان کو واجب ہے۔

جاحظیہ۔ ثمامیہ کے بعد اس جماعت کا نمبر ہے اس کی نسبت جاحظ جو عربی کا مشہور کاتب ہے اس کی طرف منسوب ہے، جاحظ نے نظام کی تلقین سے مذہب اعتزال اختیار کیا، معتزلہ جن وجوہ اور بنا پر مورد الزام ٹھہرائے جاتے ہیں اس نے اپنے زور قلم سے بہت حد تک ان الزامات کو دور کرنے کی کوشش کی اور کم ازکم اپنے زمانہ میں تو کسی قدر کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ اس کا عقیدہ[1] یہ تھا کہ کسی کو دائمی عذاب نہ دیا جائے گا بلکہ گنہگار شخص سختیوں اور مصائب کے جھیلنے کے بعد پاک وصاف ہو جائیگا۔

ان فرقوں کے علاوہ دو فرقے اور ہیں حایطیہ اور حماریہ جس کو بغدادی نے غلاۃ میں شمار کیا ہے لیکن اور دوسرے مصنفین نے جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں معتزلہ میں گنا ہے۔ حایطیہ کا خاص عقیدہ یہ ہے کہ خدا ایک نہیں بلکہ دو ہیں دوسرے حضرت عیسیٰ ہیں، اور حماریہ تناسخ کے قائل ہیں بغدادی نے انکے عقیدوں کی بنا پر یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ قطعاً معتزلہ نہیں ہو سکتے اس لئے کہ توحید جو معتزلہ کا بنیادی اصول ہے اسی چیز کا یہاں انکار ہے۔

اوپر جتنے فرقوں کے نام ابھی گنائے گئے ہیں سب اسی دور کی پیداوار ہیں جن میں سے بہت سے فرقے ہم عصر ہیں، اور اکثر بہت کم عرصہ تک زندہ رہے، البتہ پانچ جو بڑے فرقے تھے ہذیلیہ، نظامیہ، عمریہ، بشریہ اور جاحظیہ انکا اثر زیادہ دن تک قائم رہا۔ ان پانچوں میں بھی نظامیہ اور جاحظیہ کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

تیسرا دور

مامون، معتصم اور واثق باللہ کے دور حکومت تک معتزلہ کا بہت زیادہ اثر رہا لیکن اس کے

(۱) الفکر العربی و مقالہ فی التاریخ

بعد واثق اور متوکل نے ساتھ نہ دیا۔ متوکل نے تو اس درجہ انپر سختیاں کیں کہ وہ بے دست و پا ہو کر منتشر ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک جاحظ نے اپنے زور قلم سے اس کی ساکھ باقی رکھنے کی کوشش کی مگر کچھ زیادہ عرصہ تک نبھ نہ سکی اور رفتہ رفتہ زوال شروع ہو گیا اور یہی حالت اس کی اس تیسرے دور میں پیش آئی، مگر اب بھی شمامیہ، خیاطیہ[1]، اور کعبیہ، جشمیہ وغیرہ نامی جماعتیں پیدا ہوئیں لیکن جیسا کہ ظاہر کر چکا ہوں کہ حالات نا مساعد تھے اس لئے اب یہ فرقے کچھ ترقی نہ کر سکے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ معتزلہ ہمیشہ کے لئے مٹ گئے۔ انکی اس آزاد خیالی کو دیکھکر بعض وہ فرقے جو زمانہ ما بعد یا انکے زمانہ میں پیدا ہوئے مستفید ہوئے۔ انشا اللہ آئندہ اگر توفیق ہوئی تو ہمارے آئندہ مضمون میں جو قرامطہ یا باطنیہ پر ہوگا، آپ دیکھیں گے کہ ان پر انکا کچھ اثر تھا یا نہیں۔

---

(۱) خیاطیہ جس کی جانب یہ فرقہ منسوب ہے، انکی لکھی ہوئی ایک قدیم کتاب کا علم ابھی حال ہی میں ہوا ہے۔ اس کتاب کا نام کتاب الانتصار ہے۔ اسمیں صراحت کے ساتھ اس جماعت کے عقائد وغیرہ بیان کئے گئے ہیں اس کتاب کو اپسالا یونیورسٹی (سویڈن) کے ایک استاد ڈاکٹر نیبرگ نے اسکو قاہرہ کے کتب خانہ سلطانی کے ایک نادر الوجود نسخہ سے لیکر ایک مفصل عربی دیباچہ کے ساتھ ۱۹۲۵ء میں شائع کیا ہے (معارف جلد ۱۰ ماہ اگست ۱۹۲۶ء) مضمون لکھتے وقت معارف کے ذریعہ اس کتاب کا علم ہوا مگر دستیاب نہ ہو سکنے کے باعث اس سے استفادہ کا موقعہ نہ ملا۔ بہر حال اس مفید کتاب کے علاوہ جن جن کتابوں کی مدد سے یہ لکھا گیا ہے اسکا بیچ بیچ میں حوالہ دیدیا گیا ہے۔

مالیات ہند

ہندوستان کے آئندہ دستور اساسی کے مرتب کرنے میں دیگر فرقہ وارانہ اور سیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ بعض ایسے اہم مسائل بھی درپیش ہیں جن کو حل کئے بغیر کوئی دستور اساسی کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا ہے۔ چنانچہ سائمن کمیشن نے مسٹر ڈبلو۔ ٹی لیٹن جو مالیاتی مسائل کے ماہر سمجھے جاتے ہیں خاص اسی غرض سے مقرر کیا تھا کہ صوبجات اور مرکزی حکومت کے فرائض کا لحاظ رکھکر ان کیلئے ذرائع آمدنی کی تقسیم کے متعلق علحدہ تحقیقات کریں اور اپنی تجاویز پیش کریں جو سائمن کمیشن کی رپورٹ میں شامل کرلیجائے گی۔ گذشتہ معاشی کانفرنس منعقدہ الہ آباد میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث رہا اور مختلف الخیال ماہرین فن نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اظہار خیال کیا جس سے مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

۱۸۵۸ء سے ۱۹۱۹ء تک برطانوی ہند کے تمام محاصل حکومت ہند وصول کرتی تھی اور وہی اس کو صرف کرنے کی ذمہ دار تھی۔ صوبجات کو ان کی ضرورت کے مطابق مرکزی حکومت کی طرف سے گویا روپیہ تقسیم ہوتا تھا۔ محاصل میں اضافہ یا تخفیف کا اختیار صرف مرکزی حکومت کو تھا۔ لیکن ۱۹۱۹ء کی اصلاحات میں صوبجاتی حکومتوں کو ایک طرف تو اکثر معاملات میں مرکزی حکومت کے اثر سے بالکل آزاد اور خود مختار کردیا گیا اور دوسری طرف صوبجاتی حکومت کی مجالس قانون ساز میں انتخابی عنصر کو بڑھاکر قوم کے سامنے ایک حد تک جوابدہ بنایا گیا۔ اس لئے ناگزیر تھا کہ صوبجاتی حکومتوں کے مدات محاصل کو مرکزی حکومت کے مدات محاصل سے علحدہ کیا جائے۔ اور صوبجاتی حکومتوں کو اپنے محاصل وصول کرنے اور صرف کرنے نیز ان میں اضافہ کرنے اور تخفیف کرنے کے اختیارات تفویض کردئے جائیں تاکہ فرائض اور خدمات صوبجات پر عائد کئے گئے ہیں ان کو وہ بحسن وخوبی مرکزی حکومت کی "بالادستی" سے آزاد ہوکر انجام دے سکیں۔

اصلاحات سے قبل حکومت ہند کے ذرائع آمدنی میں سے خاص خاص قابل ذکر مدات مالگذاری، آبکاری، انکم ٹکس، کروڑگیری، افیون اور نمک کا محصول اور سرکاری ریلوں کا منافع شمار کیجاتی تھیں۔ ان میں سے مالگذاری اور انکم ٹکس کی آمدنی مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں کے درمیان تقسیم ہوجاتی تھی، آبکاری کی آمدنی بعض صوبوں کو پوری کی پوری ملجاتی تھی اور بعض صوبوں میں مرکزی حکومت کا حصہ بھی ہوتا تھا۔

اصلاحات کے بعد تقسیم آمدنی کا یہ اصول ترک کر دیا گیا اور بعض ذرائع آمدنی کلیتہً صوبجاتی حکومتوں کے انتظام میں دیدئے گئے اور بعض کلیتہً مرکزی حکومت کی تحویل میں دئے گئے چنانچہ مالگذاری اور آبکاری کی آمدنی صوبجات کے حصہ میں آئی اور باقی محصول کروڑگیری، انکم ٹکس محصول افیون اور نمک اور ریلوں کا منافع مرکزی حکومت کے قبضہ میں رہا۔

لیکن گذشتہ سال دس برس کے تجربہ کے بعد اب اس میں کوئی شک باقی نہیں رہا ہے کہ جس طرح صوبجاتی حکومت میں دوعملی کا طریقہ اصولی اور دونوں حیثیتوں سے ناقص اور ناقابل عمل تھا۔ اسی طرح نئے دستور کو چلانے کے لئے ذرائع آمدنی کی جو تقسیم کی گئی تھی وہ بھی بہت ناقص تھی۔ صوبجات ذمہ دار قرار دئے گئے ہیں قومی تعمیر اور مفاد عامہ کے تمام امور کہ جس میں شعبہ جات تعلیم، صنعت وحرفت، زراعت، صحت عامہ، ہسپتال وغیرہ سب شامل ہیں۔ ان شعبہ جات کی ترقی پر قوم و ملک کی ترقی اور فلاح کا دار و مدار ہے اور ظاہر ہے کہ جس قدر روپیہ ان پر لگایا جائے وہ کم ہے لیکن صوبجات کی آمدنی کے جو سب سے بڑے دو ذریعے ہیں یعنی مالگذاری اور آبکاری وہ اول تو اضافہ پذیر نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ رائے عامہ اخلاقاً اور اصولاً ان دونو ذرائع سے اضافہ آمدنی کے خلاف ہے۔

ملک کی موجودہ غربت اور افلاس اور خصوصاً زراعت پیشہ طبقہ کی پست حالت سے دنیا واقف ہے اور جن لوگوں نے معاشی حالات کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ زراعت پیشہ طبقہ کی افسوسناک حالت بہت حد تک مالگذاری کے موجودہ نظام اور بندوبست کی مرہون منت ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ جس وقت سے قوم کو اپنے میزانیہ پر رائے زنی کا حق دیا گیا اس وقت سے برابر مالگذاری کی تخفیف اور نظام بندوبست میں تبدیلی اور ترمیم پر ہر صوبہ میں زور دیا جا رہا ہے۔ آبکاری کا محصول بھی ہندوستان کے ایسے ملک میں جہاں مذہب پرست ہندو اور مسلمان بستے ہیں کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا اور اب تو کچھ عرصہ سے ہر صوبہ میں حکومت کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ انسداد شراب نوشی کو مقصد قرار دے کر ملک کو اس لعنت سے اس طرح پاک کر دیا جائے کہ ہمارے میزانیہ سے محصول آبکاری کی مد بالکل غائب ہو جائے۔ غرض جب ان بڑی مدات آمدنی کی مخالفت میں قوم کی رائے عامہ کا یہ حال ہوا اور دوسری طرف یہ مطالبہ بھی ہو کہ ان شعبہ جات پر سوگنا اور ہزار گنا زیادہ روپیہ صرف کیا جائے جن کا تعلق براہ راست قوم کی ترقی اور خوشحالی سے ہے تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کوئی صوبجاتی حکومت اپنے فرائض اور خدمات کو قوم کی منشار کے مطابق انجام نہیں دے سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ صوبہ کی حکومتیں گو انسداد شراب نوشی کے اصول کو تسلیم کر چکی ہیں مگر محصول آبکاری کے اعداد و شمار کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ مالگذاری میں بھی بجائے تخفیف کے ہر بندوبست میں اضافہ ہی کیا جاتا ہے۔ لیکن گذشتہ جو کچھ بد دلی میں پیش آیا اس سے حکومت اور ملک کو زراعت پیشہ طبقہ کی معاشی حالت کا اندازہ ہو گیا ہے اور صوبجاتی حکومتوں کو اپنی اُن یادداشتوں میں جو سائمن کمیشن کے سامنے پیش کی گئی ہیں یہ اقرار کرنا پڑا کہ ان مذکورہ مدوں میں اضافہ آمدنی کی بالکل گنجایش باقی نہیں رہی ہے۔

اب مرکزی حکومت کے ذرائع آمدنی کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہو گا کہ انکم ٹکس اور کرور گیری دونوں مدیں ایسی ہیں کہ ملک کی خوشحالی، تجارت کے فروغ، صنعت و حرفت اور زراعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں روز افزوں اضافہ کی گنجایش ہے۔ اور حقیقتاً کسی ملک کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ یہی دو مدیں ہوا کرتی ہیں، لیکن اگر آمدنی کے ذرائع کے مقابلہ میں ان خدمات اور فرائض کو دیکھا جائے جو حکومت ہند کو انجام دینا پڑتی ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ذرائع آمدنی کی تقسیم

میں صوبجات کے ساتھ بڑی ناانصافی کی گئی ہے، اس وقت اس میں شک نہیں کہ مرکزی حکومت فوجی مصارف کے بارے اس قدر لدی ہوئی ہے کہ کل آمدنی تقریباً نصف حصہ اس "سفید ہاتھی" کو کھلانے، اور اس کے رکھ رکھاؤ پر صرف ہو جاتا ہے، جس سے ہندوستان کو سو میں سے ایک حصہ فائدہ بھی بمشکل پہنچتا ہے، اور اگر ہندوستان کے لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں تو ایشیا، اور افریقہ کی قومیں اس کی شہادت دیں گی کہ ہندوستان کی فوج اور سپاہ ہندوستان کی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان کو انگلستان کے قبضہ میں رکھنے کے لئے اور ایشیا، اور افریقہ میں برطانوی شہنشاہیت کے قیام اور استحکام کے لئے تیار کی گئی ہے۔ قوم کی آواز حکومت کے ایوانوں میں ہزار بار اس فوجی پالیسی کے خلاف اٹھ چکی ہے لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ہندوستان کی غیر ذمہ دار حکومت تاج انگلستان کے زیر نگیں رہ کر برطانوی مفاد کے مقابلہ میں ہندوستان کے مفاد کا خیال کرے! بہر حال اگر آئندہ کبھی قوم کو اپنے معاملات میں دخل ہوا سب سے پہلی چیز جس میں قطع و برید کی جائے گی وہ حکومت ہند کے فوجی مصارف کی مد ہے۔ اس وقت بھی قوم کی مسلسل احتجاجات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ حکومت نے اپنے فوجی مصارف کو بتدریج کم کرنیکا وعدہ کیا ہے اور اسی سے ہوا کا رُخ معلوم ہوتا ہے اس لئے اگر اس مد میں معقول تخفیف کی ضرورت تسلیم کرلیجائے تو پھر حکومت ہند کے موجودہ ذرائع آمدنی سے جو رقم وصول ہوگی وہ اس مصارف سے صوبجات کے مقابلہ میں نسبتاً بہت زیادہ ہوگی۔ دراں حالیکہ صرف کی مدات میں علاوہ فوج کے کوئی ایسی مد نہیں ہے جس سے قوم کی تعمیر اور فلاح کا براہ راست تعلق ہو۔

اب مندرجہ بالا حالات کو پیش نظر رکھکر صوبجات کی مالیاتی مشکلات کو دور کرنے کی دو ہی تدبیریں ہوسکتی ہیں یا تو محصول میں اور زیادہ اضافہ کیا جائے اور خون کے چند قطرے جو کسانوں کے جسم میں رہ گئے ہیں ان کو بھی چوس لیا جائے اور اسی کے ساتھ ساتھ شراب نوشی اور دیگر منشیات کو رواج دیا جائے تاکہ ایک طرف تو شراب کے نشہ میں چور ہو کر نہ ان کو بھوک کی

شدت معلوم ہو نہ جسم کی برہنگی کا احساس رہے اور دوسری طرف بلا دقت محصول میں بھی اضافہ ہوتا رہے۔ دوسری تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ ذرائع آمدنی کی موجودہ تقسیم میں تبدیلی کی جائے۔

پہلی تجویز سے غالباً کوئی شخص اصولاً یا اخلاقاً اتفاق نہیں کر سکتا اور اگر حکومت اصول واخلاق کو پس پشت ڈالکر انہیں دو مدوں سے اپنی تمام ضروریات کے لئے آمدنی فراہم کرنا چاہے تب بھی عملاً اب یہ ممکن نظر نہیں آتا۔ البتہ دوسری تجویز قابل غور ہے اور یہ ممکن ہے کہ صوبجات کو بھی کوئی ایسا ذریعہ آمدنی دیا جائے جو اول تو اضافہ پذیر ہو دوسرے یہ کہ رائے عامہ اصولاً اور اخلاقاً اس کے خلاف نہ ہو۔ اس وقت تمام مدات آمدنی میں صرف دو ہی مدات ایسی ہیں جن کو اصطلاحاً اضافہ پذیر کہا سکتا ہے۔ یعنی کرور گیری اور انکم ٹکس۔ کرور گیری کا محصول علاوہ ساحلی صوبوں کے دوسرے تمام صوبوں کے حصہ میں نہیں آسکتا۔ اور اگر ایسا ممکن بھی ہوتا تب بھی اصولاً ایسا کرنا مناسب نہیں تھا اس لئے کہ پھر کرور گیری کے محصول میں یکسانیت باقی نہیں رہ سکتی۔ دوسری مد انکم ٹکس کی ہے۔ اس کے متعلق البتہ تمام صوبجات شروع سے مطالبہ کر رہے ہیں۔ خصوصاً بمبئی اور بنگال کے صوبے اس وجہ سے کہ ان دونوں صوبوں میں آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ایک مد ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ صوبجات کا یہ مطالبہ ہر لحاظ سے صحیح اور جائز ہے۔ چنانچہ مسٹن کمیٹی نے بھی دبی زبان سے یہ تسلیم کیا تھا کہ "صوبجات کو ایک عرصہ تک انکم ٹکس کی آمدنی میں شریک نہ کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ درست۔"

لیکن اگر صوبجات کی مالیاتی دشواریوں کو دور کرنے کے لئے انکم ٹکس کی آمدنی کلیتہً صوبجات کی تحویل میں دیدی جائے تو بعض عملی دشواریاں اس انتظام میں ایسی پیدا ہوں گی جن کو بحالات موجودہ نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس تبدیلی سے مرکزی حکومت

کے موجودہ مصارف جو بیشتر فوجی مصارف پر مشتمل ہیں کسی طرح پورا نہ ہوسکیں گے اور آئندہ بھی حکومت ہند برطانوی بحری اور ہوائی بیڑہ کی حفاظت میں رہنے کی بجائے خود اپنا ہوائی اور بحری بیڑہ تیار کرنا چاہے تو مرکزی حکومت کے لئے بھی معقول آمدنی کا انتظام ہونا چاہئے۔ اس دشواری کا حل سردست تو یہ ہے کہ انکم ٹکس کو صوبجاتی مد قرار دیا جائے اور آبکاری کو مرکزی مد۔ اس انتظام میں مرکزی حکومت کو بجائے فوری نقصان کے تین کرور روپیہ سالانہ کا فائدہ ہوگا۔ اس وجہ سے اس وقت انکم ٹکس کی کل آمدنی سے محکمۂ آبکاری کی آمدنی بقدر تین کرور روپیہ کے زیادہ ہوتی ہے۔ اکثر صوبجات کو وقتی طور پر اس انتظام سے نقصان ہوگا لیکن آئندہ کی توقعات پر غالبًا وہ تمام صوبہ اس نقصان کو برداشت کرنا پسند کرینگے۔

محصول آبکاری پر جو اعتراض اخلاقی حیثیت سے اس وقت ہے وہ بہر حال قائم رہیگا اور حکومت ہند کو جلد یا بدیر انسداد شراب نوشی کو اپنا مقصد بنانا پڑے گا اور اس مد کی آمدنی میں تخفیف گوارا کرنا پڑے گی لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ اگر آبکاری کی آمدنی میں تخفیف کے لئے قوم کا مطالبہ کچھ کم زور دار نہیں ہے اور حکومت کو اس معاملے میں بھی ایک دن سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ اس طرح حکومت ہند کو مستقبل قریب میں اسکا کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہئے کہ میزانیہ کے دونوں سرے اس تجویز کو قبول کر کے نہیں ملائے جاسکے

ایک اور دشواری بھی انکم ٹکس کو صوبجاتی مد قرار دینے میں پیش آئے گی اور وہ یہ ہے کہ بہت سی صورتیں ایسی بھی ہوسکتی ہیں کہ کسی شخص یا ایک کمپنی کی تجارت کئی صوبوں اور ریاستوں میں پھیلی ہوئی ہے اور جو آمدنی ہوتی ہے وہ تنہا ایک صوبہ سے نہیں بلکہ مختلف صوبوں کی بدولت ایسی صورت میں انکم ٹکس کس صوبہ کو ملے گا؟ یہ سوال اور بھی پیچیدہ ہوجاتا ہے، جب یہ دیکھا جائے کہ مرکزی حکومت کے قائم کردہ ذرائع آمد و رفت سے سب سے زیادہ فائدہ بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں اور بڑے بڑے تجار اٹھاتے ہیں۔ پھر مرکزی حکومت اگر اپنی خدمات کا معاوضہ طلب کرے تو کیا بیجا ہے

اس دشواری کا حل یہی ہو سکتا ہے کہ شخصی آمدنی کا ٹکس تو صوبجاتی حکومت کو دیا جائے اور کمپنی یا شرکتوں کی آمدنی کا محصول مرکزی حکومت کو دیا جائے۔ زرعی صوبے اب بھی بمقابلہ صنعتی صوبوں کے نقصان میں رہیں گے۔ لیکن زرعی صوبے ہمیشہ زراعت ہی کی ایک صنعت پر قانع نہیں رہینگے اس لئے ابتدائی دور کا یہ نقصان آئندہ کی توقعات کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ دوسرے ممالک جہاں اتحادی نظام ریاست رائج ہے مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ، کناڈا، اور اسٹریلیا ان ممالک میں بھی یہی طریق عمل ہے اور اس وجہ سے اور بھی ذرائع آمدنی کی تقسیم جو سطور بالا میں تجویز کی گئی اصولی اور عملی دونوں حیثیتوں سے مناسب اور معقول معلوم ہوتی ہے۔

مسئلہ تاوانِ جنگ

جنگِ عظیم کے ختم ہونیکے بعد سے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ اخبارات میں تاوانِ جنگ کے مسئلہ کے متعلق بے شمار خبریں اور لاتعداد مضامین چھپتے رہے ہیں، پچھلے دنوں بھی جب ہیگ میں تاوانِ جنگ کے مسئلہ کا تصفیہ کرنے کے لئے دولِ عظمیٰ کی ایک کانفرنس ہورہی تھی اخباروں کے کالم اس کی خبروں سے پر ہوتے تھے۔ لیکن ہمارا گمان ہے کہ رسالہ جامعہ کے ناظرین کی واقفیت کے لئے ہم ذیل میں مسئلہ تاوانِ جنگ کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ امید کہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

جنگ کی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں کہ فاتح مفتوح سے تاوان وصول کرتا ہے۔ جب جنگِ عظیم شروع ہوئی تو جرمنی کی طرف سے برابر اعلان ہوتے کہ وہ ختمِ جنگ پر اپنے مخالفوں سے جی بھر کے تاوان وصول کریگا۔ لیکن جب جنگ نے طول کھینچا اور جرمنی کی کامیابی اتنی یقینی نہ رہی تو اعلان ہوا کہ اس جنگ کا نتیجہ کچھ ہو نہ کسی کا ملک چھینا جائے گا نہ کسی سے تاوان لیا جائے گا۔ اُدھر انگلستان اور فرانس نے جنگ کے شروع میں تاوان اور ملک گیری کا ذکر ہی نہ کیا وہ حریت و جمہوریت کے اصولوں کی خاطر میدانِ جنگ میں اترے تھے، ایسی پست باتوں کا کیا ذکر کرتے لیکن جب کامیابی کی امید نہیں چلی تو انہوں نے کہنا شروع کیا کہ جنگ سے جو جو نقصانات ہوئے ہیں ان سب کا معاوضہ جرمنی سے وصول کیا جائے گا۔

جنگ ختم ہوئی تو جرمنی کو تاوانِ جنگ کی ادائیگی کا اقرار کرنا پڑا۔ مسٹر لائڈ جارج انگریزی وزیر اعظم اور موسیو کلیمانسو وزیر فرانس نے جو مطالبہ کیا اس کے اعداد ایسے تھے کہ جیسے نجوم میں تاروں کے فاصلہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اور صلح کانفرنس میں ۶ مہینہ تک یہ لوگ اپنے نقصانات کی نہ فہرست مرتب کرسکے نہ اس کی رقم کا تخمینہ کرسکے اور جرمنی سے کہا گیا کہ تم ان

نقصانات کی تلافی کا اقرار کر لو۔ رقم تمہیں یکم مئی ۱۹۲۱ء کو بتا دی جائے گی لیکن اس وقت تک
تم ۲۰ ارب مارک سالانہ دیتے رہو (ایک مارک تقریباً ۱۲ کے برابر ہوتا ہے) اور روپیہ نہ ہو تو
مال و اسباب کی شکل میں ادا کرو۔ چنانچہ جرمنی نے ریلیں، جانور، جہاز ،اس رقم کو پورا
کرنے کے لئے دئے۔ اور جب پہلی مئی ۱۹۲۱ء آئی تو جرمنوں نے بتلایا کہ وہ اس مدت میں
تقریباً ۴۰ ارب کا سامان دے چکے اور اس سے دو سال کا جو مطالبہ تھا وہ پورا ہو چکا۔
لیکن فرانس کے اثر سے تاوان کے کمیشن نے فیصلہ کیا کہ جرمنی نے ۲۰ ارب میں سے کل
۶ ارب دئے ہیں، غیر جانبدار امریکن ماہرین کی رائے میں بھی جرمنوں نے کم سے کم ۲۰ ارب
مارک ادا کر دئے تھے۔ مئی ۱۹۲۱ء میں بالآخر فرانس اور انگلستان وغیرہ نے اپنے نقصانات
کا اندازہ لگا کر جرمنی کو بتلایا کہ تمہیں کل ایک کھرب ۳۲ ارب مارک بطور تاوان دینے ہیں۔ اور
اس کے علاوہ بلجیم کو ۴ ارب مارک دینے ہونگے۔ جرمنی بہت چیخا چلایا کہ اتنی رقم ادا کرنا اس کے
لئے ممکن نہیں۔ لیکن زبردست مارے اور رونے نہ دے لاچار جرمنی کو اس ناممکن رقم
کے ادا کرنے کا اقرار کرنا پڑا۔ لیکن اس وقت چونکہ جرمنی کوئی معتد بہ رقم نہیں دے سکتا تھا
اسلئے قرار یہ پایا کہ جرمنی اسی وقت ۵۰ ارب کا قرضہ ۶ فیصدی شرح سود پر لے اور بعد کو بقیہ
۸۲ ارب کا بھی اسی طرح انتظام کیا جائے۔ اور فی حال جرمنی ۵۰ ارب پر سالانہ ۳ ارب
مارک بطور سود ادا کرتا رہے۔ اور اگر اس رقم کی ادائیگی ناممکن ہو تو کم سے کم ۲ ارب
سود تو ضرور سال کے سال دے دیا کرے۔ یوں وہ ایک کھرب ۳۲ ارب کا قرضہ واجب الادا
تو برقرار رہے اور جرمنی سالانہ کم سے کم ۲ ارب بطور سود ادا کرتا رہے۔

کوئی ڈیڑھ برس تک تو جرمنی نے یہ رقم ادا کرنے کی کوشش کی اور اسے حتی الوسع
اجناس کی شکل میں ادا کرتا رہا۔ لیکن بالآخر اس نے کندھا ڈالدیا۔ ادھر فرانس والے اپنے تباہ
شدہ علاقوں کی درستی پر اربوں روپیہ صرف کر رہے تھے اور جرمنی سے روپیہ ملتا نہ تھا۔ جو
کچھ ملتا اس میں بلجیم کا حق سب سے اول رکھا گیا تھا۔ چنانچہ فرانسیسی بگڑ گئے اور انہوں نے

جرمنی کے صنعتی علاقے رہور پر قبضہ کر لیا تاکہ اس طرح جرمنوں سے رقم وصول کریں۔ مگر اس کا اثر الٹا ہوا۔ رہور کے کان کنوں نے ہڑتال کر دی، جرمنی میں اس فعل سے فرانس کے خلاف سخت نفرت پھیل گئی اور جرمنی کے سکہ کی رہی سہی بین الاقوامی قیمت بھی ختم ہو گئی۔

لیکن فرانس کے اس قبضہ سے جہاں بہت سی برائیاں پیدا ہوئیں وہاں ایک یہ اچھی بات ضرور ہوئی کہ حالات ناقابل عمل ہونے کا یقین سب کو ہو گیا اور داز کمیشن نے صورت حال کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اس کمیشن نے ۱۹۲۴ء میں جرمنی کے سکہ کو اس طرح درست کیا کہ پرانے کاغذ کے نوٹوں کو بالکل تلف کرا دیا اور اس کے بجائے دوسرے نوٹ تیار کرائے جن کی تعداد محدود تھی اور جن کی ادائگی کے لئے کافی سونا محفوظ کر لیا گیا تھا۔ تاوان کے متعلق اس کمیشن نے یہ طے کیا کہ پہلے سال جرمنی ایک ارب مارک ادا کرے، اور اسمیں رفتہ رفتہ اضافہ کرکے ۵ سال بعد ۱۹۲۵ء میں ۲½ ارب۔ اس کے بعد جوں جوں جرمنی کی مالی اور معاشی حالت بہتر ہوتی جائے اس رقم میں اضافہ ہوتا رہے۔ اس نے یہ بھی طے کیا کہ فرانس رہور سے اپنی فوجیں ہٹالے

ڈاز کمیشن کے فیصلے، سابقہ بے عنوانیوں کے مقابلے میں بہت معقول تھے۔ لیکن اب تجارتی زینگ کے نام سے اس کو بھی بدل دیا گیا ہے۔ اس نئی قرارداد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ایک کھرب ۳۲ ارب کی ناقابل ادائیگی رقم اور اس پر ایک غیر معین مدت تک سود کے بار کو جرمنی کے سر سے ہٹا دیا ہے اور اس کے بجائے یہ طے کر دیا ہے کہ ستمبر ۱۹۲۹ء سے مارچ ۱۹۸۸ء تک یعنی ۵۸½ سال تک جرمنی ایک مقررہ رقم ادا کرتا رہے یعنی ۳۷ سال تک اوسطاً ۲ ارب مارک اور اس کے بعد ۲۲ برس تک تقریباً ۱½ ارب سالانہ۔ اس روپیہ کے لین دین کے لئے سوئٹزرلینڈ کے شہر بازل میں ایک بین الاقوامی بنک قائم ہوگا جس کے مہتمم ان دول متعلقہ کے نمائندے ہونگے۔ امید ہے کہ یہ بنک اس قدر فائدہ کمائے گا کہ آخری ۲۲ سال کی رقم تاوان کا بڑا حصہ اس کے منافع سے ادا ہو سکیگا۔ اس نئی تجویز کی رو سے جرمنی جو رقم ادا کرے گا اس سے سب وہ قرضہ ادا ہو جائینگے جو جنگ کے لئے دول فاتح نے امریکہ سے

لئے تھے اور اس کے بعد انہیں اپنے نقصانات کی تلافی کے لئے بھی رقم بچ رہے گی۔ برطانیہ کو البتہ جرمنی سے اس سے بہت کم ملیگا جتنا اسے امریکہ کو دینا ہو لیکن اسے فرانس اٹلی اور اپنے دوسرے قرضداروں سے اتنا ملجائے گا کہ اس تاوان کی رقم کو شامل کر کے وہ امریکہ کا قرضہ اتار سکے گا

قرضوں کی ادائیگی کی صورت مختصر یوں ہو گی کہ جرمنی ۱۹۳۰ء میں فرانس کو ۲۱۴ ملین ڈالر دے گا۔ برطانیہ کو ۳۶۶ ملین اور مجموعی طور پر سب قرضخواہوں کو ۴۰۰ ملین ڈالر۔ ادہر امریکہ کو فرانس ۵۳ ملین ڈالر دیگا، انگلستان ۱۶۰ ملین اور سب قرضدار مجموعی طور پر ۲۱۴ ملین ڈالر۔ ان رقموں میں ہر سال مناسب تغیر ہوتا رہے گا اور ۱۹۶۶ء میں جرمنی فرانس کو ۳۰۹ ڈالر دیگا۔ برطانیہ کو ۹۸ ملین اور سب کو ملا کر ۵۰۰ ملین۔ اُدہر امریکہ فرانس ۱۲۵ ملین ڈالر واپس کرے گا، برطانیہ ۱۸۳ ملین اور سب قرضدار مل کر ۳۷۹ ملین ڈالر۔

۱۹۶۷ء میں جرمنی فرانس کو ۱۸۹ ملین ڈالر دیگا، برطانیہ کو ۸۵ ملین اور سب کو ملا کر ۳۸۳ ملین، اُدہر امریکہ کو فرانس ۱۲۵ ملین ڈالر واپس کرے گا، برطانیہ ۱۸۱ ملین اور سب قرضدار ملکر ۳۸۰ ملین۔

۱۹۸۰ء میں جرمنی فرانس کو ۱۰۹ ملین ڈالر دیگا، برطانیہ کو ۵۸ ملین اور سب قرضخواہوں کو ملا کر ۲۰۳ ملین، امریکہ کو اس وقت کوئی رقم نہیں ملے گی۔ آخری ۳ سال میں سلطنت برطانوی کو اپنے سابقہ حلیفوں سے رقمیں ملیں گی جنہیں وہ بین الاقوامی بنک میں داخل کردیگی۔

ہمارا خیال ہے ینگ کی تجاویز جنہیں دول متعلقہ نے منظور کرلیا ہے اگرچہ گذشتہ تمام تجاویز سے زیادہ معقول اور قابل عمل ہیں تاہم ۱۰-۱۵ سال کے اندر انہیں بھی بدلنے کی ضرورت ہو گی۔ اس میں شک نہیں کہ جرمنی نے ۱۹۲۴ء کے بعد سے حیرت انگیز صنعتی ترقی کی ہے اور باوجود ان نقصانات کے جو صلحنامہ ورسائی سے اسے پہنچ چکے ہیں اس نے اکثر اعتبار سے اپنی جنگ سے قبل والی مرفہ الحالی حاصل کر لی ہے لیکن اس مطالبہ تاوان جنگ کی ادائیگی

کے لئے ضرورت ہے کہ اسکی برآمد اجناس سالانہ درآمد سے بقدر تقریباً ۳ ارب مارک کے زیادہ ہو، کہ وہ ۲ ارب سالانہ بطور تاوان اور ایک ارب بطور سود قرضہ خارجی کے ادا کر سکے - جنگ سے پہلے معمولاً جرمنی کی درآمد برآمد سے زیادہ تھی۔ ۱۹۲۹ء میں بیشک درآمد سے برآمد کچھ زیادہ رہی لیکن ۳ ارب کا اضافہ قرین قیاس نہیں خصوصاً اس لئے کہ اس کے حریفوں نے اس کے مال کی درآمد پر رکاوٹیں عائد کر رکھی ہیں۔

پھر دور اندیش اور پیش بیں معاشی سمجھ رہے ہیں کہ تاوان کی یہ بڑی بڑی رقمیں وصول کرنا کہیں آگے جاکر نقصان نہ پہنچائے۔ کہ اس کی وجہ سے جرمنی اپنی تجارت برآمد کو بڑھانے پر مجبور ہوگا۔ اس طرح اپنی صنعت کی کارکردگی میں ترقی دے گا اور پھر صنعت و تجارت میں اسکا مقابلہ مشکل ہو جائیگا۔

موجودہ رفتار سے تقریباً ۱۵ سال کے اندر امریکہ اپنے اندرونی قرضہ جنگ کو پورا پورا ادا کر چکا ہوگا۔ اس وقت جو رقمیں اسے اپنے قرضداروں سے ملیں گی وہ خالص بچت ہونگی غالباً اس وقت جرمنی اور دیگر دول کی طرف سے مسئلہ تاوان پر نظر ثانی کی تجاویز پیش ہونگی اور جرمنی کا بار پھر ایک مرتبہ ہلکا کر دیا جائے گا۔ اور ساتھ ساتھ امریکہ اپنے قرضداروں کے ساتھ رعایت منظور کرے گا۔

کتب لغت عربی

اسلامی فتوحات کے ساتھ ساتھ جب عربی زبان بھی دیگر ممالک میں پھیلی اور غیر عرب اقوام دین اسلام میں داخل ہونے لگیں اسوقت عجمیوں کو قرآن سمجھنے کے لئے عربی زبان سیکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس لئے ایک جماعت صحرائے عرب کی در بدر خاک چھانکر اس زبان کے الفاظ کو قبائل کی بول چال، محاوروں ضرب الامثال اور اشعار سے چن چن کر کتابوں میں مدون کرنے لگی۔
اس جماعت کا مقدم ترین امام خلیل بن احمد عروضی ہے۔

کتاب العین سب سے پہلا لغت عربی میں یہی مدون ہوا جس کو امام اللغویین ابو عبدالرحمن خلیل بن احمد فراہیدی ۱۰۰۔۱۷۰ھ نے مرتب کیا اس میں اس نے کوشش یہ کی کہ عربی زبان کے جملہ مادوں کو لکھے خواہ موضوع ہوں یا مہمل اس وجہ سے یہ کتاب بڑی ہوگئی اور وہ اس کو مکمل نہ کرسکا۔ اس کے بعد لیث بن مظفر نے جو بنی امیہ کے مشہور صوبہ دار خراسان نصر بن سیار کا پوتا تھا اس کی تکمیل کی

خلیل نے جب اس کتاب کی ترتیب کی بابت سوچا تو اس نے دیکھا کہ پہلا حرف الف ساکن ہے جس سے ابتدا نہیں ہوسکتی اسلئے عین سے اس کو شروع کیا کہ حرف حلقی میں انتہائے حلق سے نکلتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ کتاب کتاب العین کے نام سے مشہور ہوئی۔
کچھ زمانے کے بعد ابوطالب مفضل بن سلمہ بن عاصم کوفی نے کتاب العین پر تنقید لکھی اور اس میں جو غلطیاں اسکو نظر آئیں انکو دکھایا، اور اسکا نام استدراک رکھا۔ ابو العباس مبرد ۲۱۰۔۲۸۵ھ نے استدراک کا جواب لکھا اور یہ بتایا کہ مفضل نے جو غلطیاں ظاہر کی ہیں حقیقت میں اکثر خود اسکی غلطیاں ہیں۔

مفضل نے البارع نام سے ایک لغت بھی مدون کیا جو علماء میں مقبول ہوا مفضل کے بعد قاضی محمد بن الحسن ابوبکر زبیدی متوفی ۳۷۹ھ نے مختصر العین کے نام سے ایک کتاب لکھی اور خلیل کی غلطیاں نکالیں جس کے بعد امام ابوغالب تمام نے جو ابن التیانی کی کنیت سے مشہور ہے، کتاب العین کے صحیح لغات چھانٹ کر مع شواہد و زیادات کے فتح العین کے نام سے مرتب کیا۔

اس کی دوسری کتاب موعب کے نام سے ہے جو لغت کی عمدہ کتب میں سے خیال کیجاتی تھی مگر اب ناپید ہے۔ یہ کتاب بترتیب حروف تہجی لکھی گئی تھی۔

اسی زمانے میں لغت کی ایک عمدہ کتاب بارع کے نام سے ابوعلی بغدادی نے لکھی تھی۔ وہ بھی زمانے کی دستبرد سے فنا ہوگئی اور اب دنیا میں کہیں اسکا پتہ نہیں۔

کتاب النوادر امام خلیل کے شاگرد ابوالحسن علی بن حمزہ کسائی نے جو شاہزادہ امین عباسی کا اتالیق تھا نادر لغات جمع کئے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی۔ کسائی کا زمانہ ۱۱۲-۱۸۹ھ ہے۔

کتاب النوادر والغریب ۔ کسائی کے بعد اسی نہج پر ابوعمر اسحاق شیبانی متوفی ۲۰۶ھ نے بہت بڑی کتاب لکھی۔ اس نے عمر بھی ۱۱۰ برس کی پائی اور زندگی بھر اس کام میں لگا رہا۔

کتاب النوادر واللغات ۔ امام فراء ابوزکریا یحییٰ بن زیاد ۱۴۴-۲۰۷ھ نے جو کسائی کا شاگرد اور خلیفہ مامون عباسی کے بچوں کا استاد تھا یہ کتاب زیادہ واضح ترتیب کے ساتھ مدون کی۔

کتاب النوادر ۔ فراء کے بعد تقریباً وہی لغات ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ ۱۱۲-۲۱۰ھ نے لکھے۔

الاخبناس والنوادر واللغات ۔ ابوزید سعید بن اوس انصاری ۱۱۹-۲۱۵ھ جو اصمعی اور ابوعبیدہ کا ہم عصر مگر علم میں ان سے ممتاز تھا یہ لغت مدون کیا۔ علما اسکو معتمد سمجھتے تھے۔

اس کے بعد اجناس کی جداگانہ کتب مرتب کرنے کا مذاق پھیل گیا۔ چنانچہ ابوسعید عبدالملک باہلی نے جو اصمعی کے نام سے ادبار عرب میں غیر فانی شہرت رکھتا ہے اور جو اخبار

بڑا عالم اور ہارون کے دربار کا ایک معزز رکن ہو حسب ذیل کتابیں مرتب کیں۔
کتاب الاجناس ۔ کتاب النوادر ۔ کتاب الانوار ۔ کتاب النبات ۔ کتاب الخیل ۔ اور کتاب الامثال
اصمعی کے بعد انساب الخیل ۔ اور انساب الاعراب پر ابو عبید قاسم بن سلام ۱۶۲-۲۲۴ھ نے جو
ائمہ حدیث میں شمار کئے گئے ہیں عمدہ کتابیں لکھیں ۔ انہوں نے اوروں کی غلطیاں بھی ایک
رسالہ میں جمع کیں اور اسکا نام استدراک رکھا اس کے ساتھ کتاب الغریب بھی مرتب کی ۔
لیکن نوادر اور اشعار عرب کا سب سے بڑا عالم ابو عبد اللہ محمد بن زیاد کوفی ۱۵۰-۲۳۱ھ مانا جاتا ہے
یہ ابن سکیت اور ثعلب کا استاد ہے ۔ اس نے بھی کتاب النوادر ۔ کتاب الانوار ۔ کتاب صفۃ الخیل
کتاب النخل والزرع اور کتاب النبات وغیرہ لکھیں ۔

کتاب الفصیح ۔ ابو العباس احمد بن یحیٰی معروف بہ امام ثعلب ۲۰۰-۲۹۱ھ کو لغات کا یہ تشتت پسند نہ آیا
اس لئے اس نے ہر قسم کے فصیح الفاظ کو خواہ وہ نوادر ہوں یا صفات سے تعلق رکھتے ہوں
بہ ترتیب ایک سلک میں منسلک کر دیا ۔ اس کی کتاب نے بڑی مقبولیت حاصل کی ۔ چھوٹی
تھی اور نہایت مفید ۔ کوفہ میں اس کے بعد اس کے درجہ کا کوئی دوسرا لغوی نہ پیدا ہو سکا

مجرد ۔ ثعلب کی کتاب کے نمونہ پر ابو الحسن النہائی کراع متوفی سنہ ۳۱۰ھ نے اپنی کتاب مجرد کے
نام سے لکھی ۔ اس میں چونکہ کوئی خاص اضافہ نہیں تھا اس لئے یہ ثعلب کی کتاب سے لوگوں
کو بے نیاز نہ کر سکی ۔

مقصد ۔ کراع کے بیٹے سویدنے اپنے باپ کے طرز پر لکھی ۔

یواقیت ۔ ابو عمر زاہد مطرز جو ثعلب کا غلام تھا لیکن اس کی شاگردی کی بدولت لغت کا امام ہو گیا
تھا ۔ یہ کتاب اپنے آقا کے انداز پر لکھی اور ترتیب اچھی رکھی ۔ اس کی وفات ۳۴۵ھ میں ہوئی

دیوان الادب ۔ اسحاق بن ابراہیم فارابی متوفی سنہ ۳۵۰ھ نے ان الفاظ کو جمع کیا جو
ادبا میں مستعمل تھے ۔

کتاب الجمہرہ ۔ امام ابو بکر محمد بن حسن بن درید ۲۲۳-۳۲۱ھ جن کے بعد علما بصرہ میں سے کوئی

انکے درجہ کا نہ تھا کتاب العین کے انداز پر چار جلدوں میں یہ لغت مرتب کیا۔ کامل مگر متوسط۔ اس نے لوگوں کو جملہ کتب لغت سے بے نیاز کر دیا۔ ابوالقاسم اسمٰعیل بن عباد نے جسکا لقب صاحب ہے اور جو دیالمہ کے مشہور وزرا میں سے تھا اسکا خلاصہ کر کے جوہرہ نام رکھا۔ اور ایک دوسرا لغت بھی محیط کے نام سے ترتیب دیا۔

اس زمانہ کے بعد سے جو کتابیں لغت عربی میں لکھی گئی ہیں انکی ایک مختصر فہرست ذیل میں درج کرتے ہیں مگر یہ صرف مشہور کتابوں کی فہرست ہے مکمل نہیں ہے۔

کتاب الافعال ۔ ابن قوطیہ متوفی ۳۶۷ھ **کتاب الافعال** ۔ ابن طریف

تذکرہ ۔ ابوعلی حسن بن احمد فارسی متوفی ۳۷۷ھ

کتاب التہذیب (۱۶ جلدوں میں ہے) ابومنصور محمد بن احمد ازہری ہروی ۲۸۲-۳۷۰ھ امام نفطویہ کا شاگرد

مجمل ۔ ابوالحسین احمد بن فارس ۳۲۹-۳۹۰ھ

صحاح ۔ ابونصر اسمٰعیل بن حماد جوہری ۳۳۲-۳۹۳ھ۔ فصیح الفاظ کا سب سے بڑا ذخیرہ یہ کتاب زبیدی کی کتاب مختصر العین اور ابوالحسین کی مجمل کے بعد لکھی گئی ہے کیونکہ اسمیں ان دونوں کی عبارتیں منقول ہوئی ہیں۔ اسکی ترتیب حروف معجم پر ہے اور علما میں سب سے زیادہ آجتک اسکا اعتماد ہے۔ ابومحمد عبداللہ متوفی ۵۸۲ھ نے اس پر حاشیہ لکھا جو صرف شین تک تھا شیخ عبداللہ بن محمد نے اس کو پورا کیا۔ پھر امام رضی الدین صغانی ۵۷۷-۶۵۰ھ نے ان صحیح لغات کو جو رہ گئے تھے اس میں بڑھایا اور اس کا نام تکملۃ الصحاح رکھا۔ امام محمد بن ابوبکر رازی متوفی ۶۶۰ھ نے اسمیں سے ان الفاظ کو جو قرآن و حدیث کے سمجھنے میں کام آتے ہیں چنکر جمع کر لیا اور اس کا نام مختار الصحاح رکھا لیکن اسکی ترتیب صحیح نہ تھی اس وجہ سے علامہ محمود آفندی نے نئے سرے سے اس کو مرتب کیا۔

المحکم والمحیط الاعظم ۔ امام ابوالحسین علی بن سیدہ اندلسی نے جو نابینا تھے آٹھ جلدوں میں لکھوائی۔

مخصص ۔ " " "

تہذیب الابنیۃ والافعال ۔ ابوالقاسم بن قطاع ۴۳۳-۵۱۵ھ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور اسنے

موضوع پر بے نظیر ہے۔ نایاب تھی مگر ایک نسخہ اس کا ہندوستان میں مل گیا جس کی نقل جامعہ ملیہ کے کتب خانہ نے بھی بصرف کثیر حاصل کر لی۔

مغرب ۔ ابوالفتح ناصر بن عبداللہ متوفی سنہ ۶۱۶ھ

تہذیب التہذیب ۔ ابوالثناء توخی متوفی سنہ ۷۲۳ھ یہ کتاب ۵ جلدوں میں ہے صحاح تہذیب اور محکم تینوں کا مجموعہ ہے

علامہ جار اللہ زمخشری ۴۶۷-۵۳۸ھ کی خدمات بھی اس فن کی فراموش کرنے کے قابل نہیں ہیں انہوں نے اساس ۔ فائق ۔ مقدمۃ الادب اور مستقصے الامثال چار کتابیں لکھیں ہیں۔

جامع ۔ ابن قزاز

مفردات ۔ ابوالقاسم حسین بن محمد راغب اصفہانی

نہایہ ۔ مجدالدین معروف با بن اثیر جزری

مجمع البحار الانوار ۔ شیخ محمد طاہر ۔ یہ کتاب لغات حدیث میں ہے اور اس کا مصنف ہندوستانی ہے ۔ اچھی اور مقبول کتاب ہے۔

القاموس المحیط ۔ عربی کا سب سے مشہور لغت ہے ۔ فیروزآبادی متوفی سنہ ۸۱۶ھ

ابوالفیض سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی متوفی سنہ ۱۲۰۵ھ نے قاموس کی شرح لکھی جسکا نام تاج العروس رکھا۔

قاموس نے لغت میں اس قدر اہمیت حاصل کی کہ بجائے خود بہت سی تصانیف کا مرجع بن گئی ۔ اور علما ، ادب نے اس پر سب سے زیادہ اعتماد کیا۔

قاموس کے بعد جو لغات لکھے گئے وہ بہت ہیں مگر تمامتر اس سے یا اس سے پہلی کتابوں سے ماخوذ ہیں ۔ تاریخ لغت ۔ فلسفہ لغت اور فقہ لغت میں بھی بہت کتابیں لکھی گئی ہیں جو نہایت مفید اور محققانہ ہیں ۔ انکا کسی دوسرے موقع پر ہم ذکر کریں گے ۔ انشاء اللہ۔

---

*

باغبان

واجد حسین صاحب اُن لوگوں میں سے تھے جن کی ہمت اور جفاکشی دنیا کی تمام مشکلوں کو آسان کر دیتی ہے۔ گو وہ خاندان کے شریف تھے لیکن باپ دادا کی فضول خرچی نے ساری شرافت خاک میں ملا دی تھی اور انکے بہت سے عزیز اس وقت بھی نسب نامے پر فخر کرتے اور جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ واجد حسین صاحب کا بچپن آبا و اجداد کی دولت کی داستانیں اور اس دنیا کی حکایتیں سننے میں گذرا جو بنئے کو برکت دیتی ہے اور شرفا کی جائدادیں نیلام کرا دیتی ہے۔ جتنی نصیحتیں ان کے کان میں پڑیں سب اسی کی تعلیم دیتی تھیں کہ حوصلہ کرنا عبث ہے، اور اس دولت سے جو چند روز کی مہمان ہو وہ مفلسی بدرجہا بہتر ہے جو قناعت اور توکل سکھائے لیکن عقلمندوں کی قابلیت کے باوجود وہ اپنے حوصلے پست نہ کر سکے، اپنا وطن چھوڑ کر وہ شہر ۔۔۔ احاطہ بمبئی میں جا بسے محنت کی کمایا، اور جب ۴۵ سال کی عمر میں انکا انتقال ہوا تو وہ اپنی بیوی اور بچوں کے لئے اتنا روپیہ چھوڑ گئے کہ وہ شہر کے رئیسوں میں شمار ہوتی تھیں، دولت کے علاوہ وہ ایک خاص قسم کے خیالات بھی ورثے میں چھوڑ گئے تھے جنہیں ترک کرنا انکی بیوہ زیب النسا بیگم اتنا ہی برا سمجھتی جتنا کہ دوسری شادی کر لینا۔ واجد حسین صاحب کا خیال تھا کہ عورتوں کو پردے میں رکھنا ایسا جرم ہے کہ اگر اسکی سزا میں کوئی قوم غلامی اور فاقہ کشی کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیجائے تو بھی سمجھنا چاہیئے کہ وہ سستی چھوٹی۔ انہوں نے رفتہ رفتہ اپنی بیوی کو آزاد اور خود مختار بنایا اور مرتے دم وصیت کر گئے کہ انکی بچیوں کی روحانی نشو و نما بیجا پابندیوں سے نہ روکی جائے اور انہیں تعلیم سے اس قابل بنا دیا جائے کہ دنیا میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں، اور کسی کی دستگیری کی محتاج نہ ہوں۔

واجد حسین صاحب کے انتقال کے وقت انکی بڑی بیٹی نیاز آٹھ سال کی تھی، اور چھوٹی ارجمند چھ سال کی دونوں اسکول میں داخل ہو چکی تھیں اور جب واجد حسین صاحب انہیں نہا دھو کر اور

صاف صاف کپڑے پہن کر اسکول جاتے دیکھتے تو انکا دل خوشی سے متوالا ہو جاتا اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ زیب النساء بیگم کو یہ کیفیت یاد تھی، انہوں نے شوہر کی وصیت پر وفاداری سے عمل کیا اور بچیوں کی تعلیم اور تربیت انکی سب سے گہری آرزو بن گئی۔ جب دونوں لڑکیاں بڑی ہوئیں اور اسکول سے فارغ ہو کر کالج میں داخل ہوئیں تو ہر جگہ یہ مشہور تھا کہ انکی لیاقت اور سلیقے کا شہر میں جواب نہیں۔ بعضے کہتے تھے وہ لڑکیاں نہیں پھول ہیں، جنہیں باغبان کی محنت اور محبت نے باغ کی زینت بنا دیا ہے، بعضے کہتے تھے وہ پھول نہیں لڑکیاں ہیں جن میں تعلیم اور تربیت نے وہ حسن اور دلربائی پیدا کر دی ہے جو پھولوں میں ہوا کرتی ہے۔

تعریف لوگ دونوں بہنوں کی کیا کرتے تھے، لیکن انمیں مشابہت بہت کم تھی۔ نیاز گوری تھی اور ذرا لمبی، ارجمند سانولی اور میانہ قد کی۔ نیاز کے ناک نقشے میں کوئی خاص خوبی نہ تھی بلکہ مبصر عورتیں یہ بھی کہتی تھیں کہ اسکے منہ کا دہانہ ذرا بڑا ہو گیا ہے، ناک ذرا چھوٹی رہ گئی ہے، مگر یہ نقص صرف انہیں کو نظر آ سکتے تھے جن کی نگاہ میں نیاز کی شوخ، چمکیلی آنکھیں چکا چوند نہ پیدا کر دیتیں، جنہیں اس کی ابروؤں کے خم میں مصوری کا انتہائی کمال دکھائی نہ دیتا، ایسے لوگ بہت کم تھے، اور وہ بھی نیاز کی ان خامیوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ نیاز کے حسن کا انحصار صرف آنکھوں اور ابروؤں پر نہیں تھا اسکی گرم گفتار، اسکی ہنسی اور سب سے زیادہ اسکی پردرد سریلی آواز جو کبھی غزل گا کر سننے والے کو رند بنا دیتی تھی، کبھی دوہے گا کر بیراگی، ایسے تیر تھے جن کا نشانہ خطا نہیں کر سکتا تھا، ارجمند ان خوبیوں سے محروم تھی لیکن اسکی آنکھیں آبدار اور نرگسی تھیں، ناک اونچی اور نازک، منہ پھول جیسا، بال لمبے اور گھونگھر والے اور گھنے، جسم نہایت سڈول جس کی ہر جنبش میں ایک ادا تھی، عورتیں تک تسلیم کرتی تھیں کہ حسن کی کوئی صفت نہیں جو اس میں موجود نہیں ہے مگر افسوس ہے یہ حسن، جس پر کسی زمانے میں جاگیریں اور جائدادیں اور اہل نظر کی زندگیاں نثار ہوتی تھیں اب اس قدر دانی کے لائق نہیں سمجھا جاتا، اب لوگ ایسی حسین عورتوں سے شادی کر کے توفیق کے مطابق انہیں کپڑوں اور زیوروں سے سنوارتے ہیں، اور انکے حسن کا کرشمہ صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے ان کے شوہروں پر رشک

کرتے ہیں۔

نیاز اور ارجمند میں صورت سے زیادہ سیرت کا فرق تھا، نیاز بھولی تھی، مگر تنک مزاج، دل کی اتنی اچھی کہ جس شخص سے سابقہ پڑتا اس کی نسبت بہت سی خوبیاں فرض کر لیتی، اور جب معلوم ہو جاتا کہ اسمیں یہ خوبیاں نہیں ہیں تو اس طرح خفا ہوتی گویا اسے جان بوجھ کر دھوکہ دیا گیا ہے، اسکی طبیعت بغض اور کینے سے پاک تھی، لیکن جیسی وہ تعریف کرنے میں جوشیلی تھی ویسی ہی مذمت کرنے میں تیز جو اسے پسند آتا اسے دیوتا بنا دیتی، جو نظر سے گر جاتا اسکے ساتھ اس طرح پیش آتی گویا وہ ایک مجرم ہے۔ جس کی سزا اس کی مجبوریوں کا خیال کر کے معاف کر دی گئی ہے، اسے یقین تھا کہ موسیقی کا ہر دل پر اثر ہوتا ہے، ہر انسان کو ازل سے اس فن کے سمجھنے کی قابلیت ملی ہے، اور ہر شخص کو حسب استعداد اس کی قدر دانی کرنے پر آمادہ ہونا چاہئیے، اسکا عقیدہ تھا کہ ہر ذی روح ہستی کو انتہائی کمال حاصل کرنے کی آرزو ہمیشہ بیتاب رکھتی ہے، اور جو کوئی جو کچھ کرے اسکا اصل مقصد اپنا اور دوسروں کا روحانی فروغ ہونا چاہئیے ظاہر ہے نیاز مردم شناس نہیں تھی، اس کا دوست بننا معمولی آدمیوں کے لئے بڑی ذمہ داری کا کام تھا۔ تجربہ ہر ہوشیار انسان کو سکھا دیتا ہے کہ اسے بچپن کی سادگی اور سادہ دلی بچپن کی اور یادگاروں کے ساتھ بھول جانا چاہئیے، لیکن جس کا دل پاک اور صاف ہوا سے یہ سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ دنیا میں بھلائی کے ساتھ برائی کیوں تسلیم کرنا ہوتی ہے، خصوصاً خود انسان کی فطرت میں ان دونوں عناصر کی ایسی آمیزش کیونکر ہو جاتی ہے کہ ہم انہیں جدا نہیں کر سکتے اور خالص خوبیوں کے مجسمے تلاش کرنا کس لئے بیکار ہے۔ نیاز کے خیر خواہوں نے، نیاز کی ماں نے، نیاز کے اپنے تجربے نے سلامت روی کے بنیادی اصول اس کے ذہن نشین کرنے کی لاکھ کوشش کی، مگر وہ نہ ماننا تھا نہ مانی۔

ارجمند کو ایسی ہدایت کی مطلق ضرورت نہ تھی، اسکی طبیعت بچپن سے شکی تھی، ایسی شکی کہ ماں اور بہن کی محبت پر اسے اعتبار نہ تھا۔ بچپن ہی سے وہ گھنی اور ضدی تھی، بچپن ہی اس نے دل کی بات دل میں رکھنا، بغض اور کینے اور حسد کا بوجھ سنبھالنا سیکھا، عمر اور تجربے نے اسے اور چالاک

کر دیا ۔ اور اسکی مدہ بھری مسکراہٹ اور رسیلی آنکھوں نے جن لوگوں کو لبھا لیا تھا ان میں بہت کم تھے جو باوجود ثبوت کے یہ ماننے پر تیار ہو جاتے کہ اس کے خمیر میں خالص نسوانی خوبیوں کے علاوہ اور کچھ بھی شامل ہے، ارجمند ایسی سیانی اپنی ہوس کی شدت سے ہو گئی تھی، یہ ہوس کہ دنیا کی کوئی نعمت ہاتھ سے نہ جائے، نہ شہرت نہ دولت نہ سکون اور اطمینان، اسے رفتہ رفتہ معلوم ہو گیا کہ حسن اور چالاکی کے سوا اس کے پاس اپنی ہوس پوری کرنے کے اور ذریعے نہیں ہیں، اور اس نے ان ہتھیاروں کے استعمال میں مہارت حاصل کر لی ۔ لیکن اسکا طور طریقہ اتنا صحیح تھا کہ بڑے بڑے نکتہ چیں بھی اس پر کسی قسم کا الزام نہ لگا سکتے ۔

نیاز کی سیرت اسکی کشادہ پیشانی پر لکھی ہوئی تھی، اس کی جانچ پڑتال کے لئے کوئی بصری یا کوشش درکار نہ تھی، زیب النسا بیگم اسے ہر مناسب موقع پر ٹوکتی تھیں، اسے بیجا حسن ظن کے خطروں سے آگاہ کرتیں، بیجا بدگمانی سمجھا بجھا کر رفع کرتیں، ہر وقت رواداری کے گن گاتیں اور اس کے دل پر جو چوٹیں لگتیں انکا محبت سے علاج کرتیں ۔ لیکن نیاز کی طبیعت میں ہمواری کسی طرح پیدا نہ ہو سکی ۔ اسے ماں سے بہت محبت تھی، ماں سے کوئی بات چھپانا اس کے نزدیک چوری سے بھی برا تھا، مگر یہ خوف کہ ماں کا کہنا ماننے سے اس کی ہمت پست ہو جائے گی ۔ رفتہ رفتہ اس کے مضبوط عقیدوں میں شامل ہو گیا، یہ عقیدہ بھی کوئی راز نہ تھا، وہ اکثر ماں سے کہتی رہتی تھی کہ اسے اپنی ہمت اور حوصلے ان تمام نعمتوں سے زیادہ عزیز ہیں جو سلامت روی مہیا کر سکتی ہے اور اس لئے وہ ہر معاملے میں انکی رائے نہیں مان سکتی، زیب النسا بیگم کا اصل مطلب کہ عقل سلیم کے بغیر ہمت اور حوصلے محض تنگ راہیں ہیں جن سے آدمی ٹھوکر کھاتا ہے نیاز کے کبھی سمجھ میں نہ آیا پھر بھی زیب النسا بیگم کو نیاز کی طرف سے زیادہ اندیشہ نہیں تھا، نیاز کی عداوت اور دوستی، اسکا اچانک بگڑ بیٹھنا اور پشیمان ہونا، ہر ایک کو اپنا بچپن یاد دلا دیتا تھا، اور تجربے نے انسان کو کیسا ہی سخت گیر کیوں نہ بنا دیا ہو، بچوں کو دیکھ کر اس کا دل آپ ہی آپ نرم ہو جاتا ہے، ارجمند کی طبیعت زیب النسا بیگم کے لئے بہت دنوں تک ایک معمہ رہی، اور جب وہ اسکا کسی قدر اندازہ

لگا سکیں تو بہت گھبرائیں۔ نیاز کی خود سری اور خفگی میں بھی ایک وفاداری اور سچی محبت تھی جو انہیں ارجمند کی اطاعت گذاری میں نہیں محسوس ہوتی تھی۔ ارجمند کی ہر بات میں سیان پن ہوتا تھا، ہر بات میں ایک مخفی مطلب، نہ وہ نیاز کی طرح خفا ہوتی، نہ روٹھتی، نہ جی کھول کر ہنستی، نہ جی بھر کر روتی تھی۔ وہ ہر چیز میں دونوں بیٹیوں کو برابر کا حصہ دینا چاہتی تھیں، لیکن تقسیم کرنے کے بعد معلوم ہوجاتا تھا کہ ارجمند کو زیادہ مل گیا ہے، نیاز کو کم، چاہے روپیہ ہو، چاہے زیور ہو، چاہے کپڑے، نیاز بہت سی فرمائشیں کرتی تھی جن کا صاف جواب دیدیا جاتا، لیکن کیا مجال تھی ارجمند جو مانگے وہ نہ ملے، جو چاہے وہ نہ ہو، اس وجہ سے نہیں کہ ماں کو اسکا زیادہ خیال تھا۔ بلکہ محض اس لئے کہ مانگنے اور حاصل کرنے کی ترکیبیں جانتی تھی، اور انکے استعمال کرنے میں مشاق تھی، جیسے جیسے لڑکیوں کی عمر بڑھتی گئی، زیب النسا بیگم کو یقین ہوتا گیا کہ انکی طبیعتیں بدلنا یا ان کی حسب منشا اصلاح کرنا انکے بس کی بات نہیں۔ انہوں نے سوچ لیا کہ وہ دونوں انکے باغ کے پھول ہیں جن کی نگہداشت رکھنا انکا فرض ہے، مگر ان کے رنگ بدلنا نہ انکے امکان میں ہے نہ سچ پوچھئے تو ان کا کام ہے۔ ایک باتوکل باغبان کی طرح وہ سب کچھ خدا کی مرضی پر چھوڑ بیٹھیں، مگر دل میں کھٹکا ضرور رہا کہ دیکھئے ہوائیں کیسی چلتی ہیں۔

نیاز اور ارجمند جب کالج میں داخل ہوئیں تو ان کا گھر خوش مذاق اور شائستہ طالبعلموں کا مرجع بن گیا، نیاز کے دل میں بہت سے حوصلے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ ہندوستان کی شریف عورتیں ہمت کرکے گھریلو زندگی کے تنگ حدود سے باہر نکلیں، قومی زندگی کو سدھاریں اور سنواریں، تھیٹروں میں ایکٹ کریں، جلسوں میں گائیں۔ ملک میں فنون لطیفہ کا معیار بلند کریں اور عصمت کا دامن چھوڑے بغیر اس قابل ہوں تو اپنی روٹی بھی کمایا کریں۔ یہ حوصلے صرف اس وقت بارآور ہوسکتے تھے جب کوئی جرأت کرکے پہلا قدم اٹھائے اور پیش قدمی کے نتائج بھگتے۔ نیاز یہ ذمہ لینے پر تیار تھی اور جتنی زیادہ ماں اور جان پہچان کے لوگ اس کی مخالفت کرتے

اتنی ہی اس کے جوش کی آگ اور بھڑک اٹھتی اپنی ماں اور نسوانی "عزت آبرو" کے تمام بزدل یا قدامت پسند حامیوں کو اس نے اپنے حوصلوں کا دشمن فرض کرلیا، اور اگر اسے "عزت آبرو" کے معیاروں پر حملہ کرنیکا موقع ملتا تو وہ کبھی نہ چوکتی۔ اس قسم کی بغاوت نوجوانوں میں بہت مرغوب ہوتی ہے، نیاز کالج میں بہت جلد ہر دلعزیز ہوگئی، اسے بہت سے ایسے نوجوان مل گئے جنہیں اس کے حوصلوں سے ہمدردی تھی، کچھ ایسے بھی ملے جو عملی امداد دینے پر راضی تھے۔ نیاز نے بھی احسان کے بدلے احسان کیا۔ وہ طالب علموں کے تمام جلسوں میں شریک ہوتی تھی، تقریریں کرتی تھی، اور جب کوئی مہم درپیش ہوتی تو کسی محنت اور جفاکشی کے کام سے دریغ نہ کرتی۔ اس کے عوض میں طالب علم اس کے ڈراماؤں میں ایکٹ کرنے پر آسانی سے تیار ہوجاتے، اگر وہ کوئی قومی گیت یا ترانہ سنگت میں گوانا چاہتی تو خوش آواز طالب علموں کی کمی نہ ہوتی، جو مصروف رہنا چاہے اس کے لئے بہت سے کام نکل آتے ہیں۔ نیاز کی طالب علمی کا زمانہ اس کے مشاغل میں دیکھتے دیکھتے گذر گیا۔

جب تعلیم ختم ہوئی اور دنیا کے امتحان گاہ میں قدم رکھنے کا وقت آیا تو یکبارگی نیاز کی آنکھیں کھل گئیں وہ نوجوان کسی زمانے میں اس کے مقاصد کے فدائی معلوم ہوتے تھے اپنے ولولے بھول گئے۔ کسی نے نوکری کرلی، کوئی تجارت میں لگ گیا، کوئی شادی کرکے گرہستی بن بیٹھا۔ نیاز کے یہاں اب بھی بہت سے آیا جایا کرتے تھے لیکن سب کی فکریں انکی پیشانیوں پر ایسی صاف ہوتی تھیں کہ ان سے کسی قسم کی امیدیں رکھنا صریحی ظلم ہوتا۔ نیاز یہ رنگ دیکھکر نوجوانوں کی قوم کی قوم سے خفا ہوگئی، اور ماں کے سمجھانے پر بھی اس خفگی کے اظہار میں ذرا بھی تکلف نہیں برتا۔ اسکے طعنے تشنے کا خوف ایسا تھا کہ سب اس کے یہاں آنے سے ڈرنے لگے اور سواد وچار کے جنہیں محبت اور وفاداری کھینچ لاتی تھی، نیاز کے یہاں طالب علموں کی آمدرفت بتدریج بند ہوگئی، نیاز نے اپنی طرف یہ تہیہ کرلیا کہ وہ دنیا سے کنارہ کش ہوجائے گی، اور کچھ دنوں اس نے اس ارادے پر عمل بھی کیا۔ لیکن زیب النسا بیگم کو یہ کب گوارا ہوسکتا تھا کہ اس کی عمر کے بہترین سال گوشہ نشینی میں گذر جائیں۔ شہر کے اکثر خوشحال خاندانوں سے انکے پہلے سے مراسم تھے، جب نیاز نے

بی۔اے پاس کرلیا تو انہوں نے کثرت سے دعوت دینا شروع کر دیا۔ اور انکے یہاں دوسرے تیسرے مہمان آنے لگے۔ نیاز دنیا داروں کو بہت ترچھی نگاہوں سے دیکھتی تھی، اس کے خیال میں وہ سب کے سب اپنی روٹی کمانے میں ایسے مشغول تھے اور دل کے ایسے ٹھنڈے کہ اسکی ہاں میں ہاں ملانا بھی انکو بڑی ذمہ داری کا کام معلوم ہوتا تھا اور اسوجہ سے وہ ماں کی دعوتوں میں صرف برائے نام شریک ہوتی تھی، اور مہمان نوازی کا سارا بار ارجمند اور زیب النسا بیگم پر پڑتا تھا لیکن جب اسے طالب علم دوستوں سے قطعی مایوسی ہوگئی تو کچھ دنوں بعد وہ انہیں لوگوں میں اپنے ہمدرد تلاش کرنے پر مجبور ہوئی۔ زیب النسا بیگم نے ایک دن کہیں کہہ دیا کہ اسے اب دوستی کے بجائے شادی بیاہ کی فکر کرنا چاہیئے تو وہ بہت بگڑی اور کئی روز تک روٹھی رہی۔ لیکن اسے یقین ہوگیا تھا کہ ایسا دوست جو اسی کے سے حوصلے رکھتا ہو، اور ایک اعلیٰ نصب العین کی خدمت کو گھر گرہستی اور اولاد پر ترجیح دیتا ہو اسے ملنے کا نہیں، اس نے شادی کی رسم کی مخالفت کرنا چھوڑ دی، اور امید اس کے دل کو ایک ایسے شوہر کی تصویر دکھا کر بہلانے لگی جو اسکی آرزوؤں پر فدا ہو اور اپنی محبت سے اس کی ہمت افزائی کرے۔ مگر یہ اسکا پختہ ارادہ تھا کہ مردوں کو جانچنے میں وہ سب سے زیادہ اسکا خیال رکھے گی کہ انہیں اس کے حوصلوں سے کتنی ہمدردی ہے، اور اگر اسے ہمدرد نہ ملا تو شادی بھی نہ کرے گی۔

اتفاق سے اسی زمانے میں نادر حسین، ایک بیرسٹر کا زیب النسا بیگم سے تعارف کرایا گیا وہ انگلستان سے نیا نیا واپس آیا تھا، اور ہندوستانی زندگی کی پابندیوں اور مجبوریوں سے وہ ابھی تک اچھی طرح واقف نہیں ہوا تھا۔ ایک مرتبہ کھانے کے بعد نیاز کا گانا سنکر اس نے کہا:

"نیاز بہن، آپ کی آواز تو اتنی نفیس ہے کہ میرے خیال میں اگر آپ یورپ کی طرح گانے کے جلسے کرائیں تو بہت کامیابی ہوگی۔ ہندوستان میں خواہ مخواہ موسیقی کا فن بدنام ہوگیا ہے یورپ میں گانا بہت سی شریف عورتوں کا ذریعۂ معاش ہے، اور لوگ انہیں برا کہنے کے بجائے اور الٹی انکی عزت کرتے ہیں، بس آپ ہمت کیجئے اور فن موسیقی کو بدنامی سے بچائیے"

نیازا چھل پڑی۔ آخر کار وہ شخص مل ہی گیا جس کی اسے تلاش تھی! اس نے نادر حسین کی صورت اور سیرت، مالی حالت اور دنیاوی حوصلوں پر غور کرنا فضول سمجھا۔ اس جانچ پڑتال کی کیا ضرورت تھی جب اسے نیاز کے خیالات سے ہمدردی تھی؟ نادر حسین کی دعوت پر دعوت ہونے لگی، اور نیاز اسکی آؤ بھگت اس جوش سے کرتی تھی کہ وہ خوشی سے پھولے نہ سماتا۔ ہر ملاقات پر دونوں بیٹھ کر مشورے کرتے، گانے کے جلسوں کے پروگرام بنتے، آمدنی اور خرچ کا حساب کتاب ہوتا، لیکن امید اور جوش کی یہ آب وتاب صرف چند روز رہی۔ خاندان والوں نے نادر حسین کو وکالت کرنے پر مجبور کیا، وہ آدمی ہوشیار تھا، اور تھوڑے عرصہ میں اس کے پاس مقدمے اس کثرت سے آنے لگے کہ وہ کامیاب وکیلوں اور بیرسٹروں کی طرح روپیہ کمانے کے سوا اور کسی مصرف کا نہیں رہا۔ اسے نیازا ور نیاز کے حوصلوں سے وہی دلچسپی رہی جو پہلے تھی لیکن وقت کی تنگی کا یہ عالم تھا کہ وہ اکثر دعوتوں میں شریک ہونے سے معذرت چاہنے لگا۔ اور جب کبھی آتا تو اپنی مصروفیت کا دکھڑا روتا۔ نیاز پر یہ بہت گراں گذرا، وہ چاہتی تھی کہ نادر حسین کے پاس دوسرے تیسرے دن مشورے کے لئے آئے کیونکہ وہ ایک عظیم الشان جلسے کی تدبیریں سوچ رہی تھی جو اس کے تمام مخالفین کا منہ بند کردے اور اپنی تدبیروں کی سرگرمی میں یہ بھول گئی کہ نادر حسین کے اپنے دنیاوی اغراض بھی ہیں۔ جب نادر حسین نے مجبوراً ہچکچا ہچکچا کر اعتراف کیا کہ وہ اپنے کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے فی الحال جلسے کو کامیاب بنانے کے لئے دوڑ دھوپ نہیں کرسکتا تو نیاز کے دل میں مایوسی اور بدگمانیوں نے ہجوم کیا اور اس نے سمجھ لیا کہ نادر حسین نے اسے دھوکہ دیا ہے۔ جس وقت نادر حسین نے قطعی طور پر مدد دینے سے انکار کیا سب کھانے پر بیٹھے ہوئے تھے، نیاز کی آنکھوں سے غم اور غصہ کی بجلیاں گرنے لگیں۔ عذر کچھ اور کیا گیا تھا، اس نے اپنی طرف سے الزام کچھ اور لگایا:

"نادر بھائی، آپ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ کو لوگوں نے ڈرا دیا ہے۔ وقت آپ کے پاس بہت کافی ہے لیکن آپ میری مدد اصل میں کرنا نہیں چاہتے"۔

نادر حسین کو چند لوگوں کے اعتراضات بھی یاد آگئے ، اور اس نے کچھ کمزور لہجے میں جواب دیا،
"جی ہاں، لوگوں کے سمجھانے سے اس معاملے میں میری رائے بھی ذرا بدل گئی ہے"
"تو بس ، میری آپ کی دوستی ختم ہوگئی ، کاش مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ آپ پر بھروسہ نہ کرنا چاہئے"

ارجمند چلائی "ارے باجی ، آپ یہ کیسی باتیں کرتی ہیں!" ، زیب النسا بیگم نے نیاز کو خوب للکارا۔ نیاز منہ پھیرے بیٹھی رہی اور نادر حسین سے بات تک نہ کی ، کھانے کے تھوڑی دیر بعد وہ اپنا سا منہ لیکر چلا گیا۔

نیاز کے اوپر اس "دغابازی" کا اتنا اثر ہوا کہ وہ کچھ دنوں بیمار رہی اور اچھے ہونے کے بعد بھی اس کے خیالات کا رنگ ماتمی رہا۔ نادر حسین سے اس کی صلح کرا دی گئی لیکن اس کی آنکھیں بتا دیتی تھیں کہ گو وہ دوستانہ برتاؤ کرنے پر راضی ہے ، مگر اب اس کے دل میں نادر حسین کی کوئی وقعت نہیں رہی ہے اسکا جی پھر چاہنے لگا کہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ دعوتوں کے دن وہ اکثر طبیعت کی ناسازی کا بہانا کرلیتی یا اگر مجبوراً شریک ہونا پڑتا تو خاموش بیٹھی رہتی ، کچھ گانے کی فرمائش کیجاتی تو کہدیتی کہ گلے میں درد ہے۔

کالج کے دوستوں میں سے اب صرف عبداللہ کبھی کبھی ملاقات کو چلا آتا تھا ، اس کی عمر قریب تیس سال کے تھی ، اس کے غیر معمولی لمبے ڈیل ، چوڑے سینے اور دہرے بدن نے اسے طالب علموں کی صحبت کے لئے کچھ ناموزوں بنا دیا تھا اور چونکہ ان اوصاف کے علاوہ اسکے لمبی گھنی داڑھی بھی تھی اس لئے اسے "مولوی" کا خطاب ملا تھا۔ طالب علم اسے بہت چھیڑا کرتے تھے ، زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ موقع بے موقع مسخرے پن کی باتیں کیا کرتا تھا ، اور انگریزی بہت غلط بولتا تھا۔ نیاز بھی دوسروں کے ساتھ اسکی ہنسی اڑایا کرتی تھی لیکن اسے تجربے سے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ عبداللہ دیکھنے میں چاہے جیسا ہو ، دراصل وہ نہایت درجہ محبت کیش ، وفادار اور جفاکش آدمی ہے اور اس کے ایثار کی بظاہر کوئی انتہا نہیں نیاز اس کا

ادب کرنے لگی، اور ممکن ہے دونوں میں گہری دوستی ہو جاتی، مگر ایک بدطینت طالب علم نے نیاز سے کہدیا کہ عبداللہ کا کچھ عرصہ پہلے ایک بھنگن سے ناجائز تعلق تھا۔ نیاز نے دریافت کیا تو سب نے اس واقع کی تصدیق کی، اور عبداللہ نیاز کی نظروں میں بالکل گر گیا۔ اسکا یہاں تک ارادہ ہوا کہ عبداللہ کو گھر میں قدم رکھنے کی ممانعت کر دے۔ مگر زیب النسا بیگم نے اسے روک دیا، وہ خود عبداللہ کی خوبیاں معلوم کر چکی تھی، اور جانتی تھیں ایسے آدمی وقت پر بہت کام آتے ہیں۔ اس لئے عبداللہ سے ہمیشہ اچھی طرح پیش آتی تھیں، اور جس طرح ہو سکا ظاہر کرتی رہیں کہ ان کے دل میں اس کی بہت عزت ہے، جب وہ کالج سے فارغ ہوا تو انہوں نے کہہ سن کر اسے ایک دفتر میں نوکر رکھا دیا۔ اور اس کے علاوہ دو تین خاندانوں میں بچوں کے پڑھانے کے لئے بھی مقرر کرا دیا۔ عبداللہ کو معلوم ہو گیا کہ نیاز اور ارجمند نے اس سے کیوں ملنا چھوڑ دیا ہے۔ اس نے انکے رویہ کی کوئی شکایت نہیں کی، نہ کبھی اپنی صفائی پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی، ہفتہ عشرے میں وہ زیب النسا بیگم سے ملاقات کرنے آتا تو نیاز اور ارجمند کی خیر و عافیت پوچھ لیتا تھا۔ اس کے سوا اسے انکے مشاغل سے اور کوئی سروکار نہیں رہتا تھا۔

نادر حسین سے جس روز نیاز خفا ہوئی اس کے دو چار دن بعد ہی عبداللہ سہ پہر کے وقت زیب النسا بیگم سے ملنے آیا۔ وہ ارجمند کو ساتھ لیکر کسی دعوت میں گئی ہوئی تھیں۔ نیاز کو ہلکی سی حرارت تھی اس لئے وہ گھر پر رہ گئی تھی۔ خادمہ نے عبداللہ کو یہ سب بتا دیا۔ وہ حال دریافت کر کے فوراً چلا جاتا۔ کیونکہ اسے کوئی امید نہیں تھی کہ نیاز اس سے ملے گی، مگر وہ کئی میل پیدل چل کر آیا تھا، اور ذرا ستانے کی غرض سے تھوڑی دیر ٹھہر گیا۔ خادمہ سمجھی وہ نیاز کے انتظار میں بیٹھا ہے، اور اس نے نیاز کو جا کر اسکی اطلاع کر دی۔ نیاز پلنگ پر لیٹی تھی، یہ خبر سنکر وہ کچھ دیر سوچتی رہی کہ جائے یا نہ جائے، اور پھر جلدی سے اٹھی، کپڑے بدلے اور گول کمرے میں پہنچی تو عبداللہ جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ پیچھے سے نیاز کی آواز آئی:

"السلام علیکم، مولوی صاحب کہئے کیسے تشریف لائے؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ صرف آپ لوگوں کی خدمت میں سلام عرض کرنے حاضر ہوا تھا۔"
عبداللہ نے بڑھکر مصافحہ کیا، اور پھر ادب سے ذرا دور ہٹ کر بیٹھ گیا۔
"ابھی خادمہ سے معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ بہت افسوس ہوا، آپ تو ایک زمانے میں ماشاءاللہ انتہائی تندرستی کا نمونہ تھیں، یہ بخار کب سے آنے لگا؟"
نیاز نے منہ بنا کر جواب دیا۔
"مولوی صاحب، یہ وہ بخار نہیں ہے جو مچھر کے کاٹنے یا معدے کی خرابی سے ہوتا ہو۔ کبھی کبھی ایک انسان دوسرے کے ایسا ڈنک مارتا ہے کہ وہ برسوں تڑپتا رہتا ہے، میرا بخار اس قسم کا ہے۔"
عبداللہ کو یاد تھا کہ وہ ابھی تک راندۂ درگاہ ہے، اور اسکی بے تکلفی پر گستاخی کا شبہ ہوگا۔ لیکن جو سوال زبان پر لانے کی اسے ہمت نہ تھی وہ اس کی آنکھوں نے پوچھ لیا۔ نیاز اس کی آنکھوں میں ہمدردی، محبت اور وفاداری کا جلوہ دیکھ کر اپنی پرانی نفرت بھول گئی اور بے تکلفی سے کہنے لگی:
"جی ہاں میری قسمت میں غالباً لکھا ہے کہ جس شخص سے میں ہمدردی اور دوستی کی امید کروں وہ مجھے آخر میں دھوکا دے۔ پہلے کالج کے دوستوں سے مجھے امیدیں تھیں وہ سب مجھے بھول گئے، ابھی ایک بیرسٹر صاحب نے خود ہی وعدے کئے اور خود ہی دغا دے گئے۔"
دونوں کچھ دیر خاموش رہے، عبداللہ کو یکبارگی وہ دن یاد آگئے جب نیاز کی شوخ آنکھیں اور معصوم ہنسی اسے یہاں کی تمام دعوتوں پر کھینچ لاتی تھی، وہ طالب علموں کے فقرے اور گستاخیاں برداشت کرتا تھا۔ نیاز کی بے پروائی اور دوسروں کی حقارت بھری نظر دل کے جواب میں خدمت اور ایثار کے تحفے دیتا تھا، اور اس کی محبت مسخرے پن کا بھیس بنا کر آتی تھی کہ کوئی اسے پہچان نہ سکے۔ اسکا جی چاہتا تھا کہ خاموش بیٹھا سوچتا رہے، نیاز بھی اپنی ناکامی کے تصور میں محو تھی، جب خادمہ ٹھنڈے شربت کے گلاس لائی تو دونوں چونک اٹھے۔

عبداللہ نے دو چار گھونٹ شربت پی کر کہا:

"میرے خیال میں آپ بیکار اس ذرا سے معاملے کو اہمیت دیتی ہیں۔ اگر آپ کی خدمت کے لئے ایک بیرسٹر نالائق ثابت ہوا تو اس پر افسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ کو خدمت اور ایثار کرنے والے خدا کے فضل سے بہت مل جائیں گے۔"

"آپ کا خیال یہ ہے" نیاز نے مایوسی سے مسکرا کر جواب دیا، "اور میں سمجھتی ہوں کہ مجھے الو کی طرح کسی قبرستان میں پناہ لینا چاہیے جہاں نہ کوئی امیدیں دلا کر پھسلا سکے۔ نہ دھوکا دیکر دل کو صدمہ پہنچا سکے۔"

"آخر کیوں؟ آپ ایسے لوگوں سے امیدیں کیوں کیجئے جن پر آپ کو بھروسا نہ ہو؟"

"تو آپ سمجھتے ہیں یہ پہلے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کون آدمی کیسا ہے؟"

"جی ہاں کیوں نہیں؛ بڑی حد تک آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ بنیا اسی شخص کو قرض دیتا ہے جو کچھ رہن یا گروی رکھا سکے۔ اگر کوئی شخص کسی پر اعتماد کرتا ہے تو اسی صورت میں جب اسے اپنے یا دوسروں کے تجربے سے معلوم ہو جائے کہ وہ اسکا مستحق ہے۔ میں ایک دفتر میں نوکر ہوں، اگر میں کسی سے تجارت کے لئے روپیہ مانگنے جاؤں اور اسے معلوم ہو جائے کہ میں تجارت کے ساتھ نوکری بھی کرنا چاہتا ہوں تو وہ مجھے روپیہ نہ دیگا، خواہ وہ مجھے کتنا ہی ایماندار سمجھتا ہو، میں ان بیرسٹر صاحب کے حالات سے واقف نہیں جن کا آپ نے ذکر کیا ہے لیکن غالبًا وہ روپیہ کمانے میں مصروف ہیں، اور اسے آپ کی خدمت سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں، آپ کے کام صرف وہی شخص آسکتا ہے جس کے اپنی کوئی ذاتی غرض نہ ہو۔"

"جی ہاں، یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں" نیاز کچھ سوچکر بولی "مگر ساتھ ہی آپ اگر یہ بھی بتا دیتے کہ ایسے آدمی کہاں ملتے ہیں تو واقعی مجھ پر بڑا احسان ہوتا" نیاز کے الفاظ میں کچھ طنز تھا لہجے میں خلوص، عبداللہ سوا مسکرانے کے اور کچھ جواب نہ دے سکا۔ پھر نیاز ایکبار پوچھ اٹھی:

"اچھا آپ کے ذاتی اغراض کیا ہیں؟ اگر آپ سے میں مدد چاہوں تو آپ دینے پر تیار

ہوں گے ؟ ،،

عبداللہ گھبرایا، گھبرا کر مسکرایا، جھوٹ بولنے کے لئے مناسب الفاظ تلاش کرنا چاہے کہ سچی بات زبان سے نکل گئی :

" میں تو دل وجان سے ادنٰے سے ادنٰے خدمت کے لئے سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہوں، مگر میری حیثیت کیا ہو کہ آپ کی مدد کرنے کا وعدہ کروں مجھے کوئی جانتا نہیں میرا کوئی اثر نہیں، اور آپ جانتی ہیں میں بدنام بھی کافی ہوں "

نیاز کے دل پر اس آخری جملے سے بڑی چوٹ لگی، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، عبداللہ یہ دیکھکر بہت پچھتایا، مگر بات منہ سے نکل چکی تھی، نیاز نے اس کے دل کا زخم دیکھ لیا تھا، وہ سمجھتا تھا کہ نیاز خفا ہوگی یا روئے گی، مگر کسی امید نے یکبارگی نیاز کے حوصلوں کو پھر جگا دیا تھا، اور وہ کسی نشے سے مست معلوم ہوتی تھی۔

" مولوی صاحب، آپ غریب ہیں اور بدنام ہیں، اگر آپ میری وجہ سے ذرا اور غریب یا بدنام ہو گئے تو آپ کا زیادہ نقصان نہ ہوگا۔ بس اب آپ ہی میرے یار و مددگار و غمگسار بنئے . . . . . ،،

زیب النسا بیگم اور ارجمند نے دعوت سے واپس آکر دیکھا کہ نیاز بڑے جوش سے تقریر کر رہی ہے، اس کے منہ پر ہنسی ہے اور آنکھوں میں چمک، اس کے مقابل کچھ دور عبداللہ سر جھکائے بیٹھا ہے، زیب النسا بیگم نے نیاز کی نبض دیکھی تو معلوم ہوا اسے بہت تیز بخار ہے۔

نیاز کا خیال تھا کہ اس کی خفگی کے بعد نادر حسین شرمندہ ہو کر اس کے یہاں رفتہ رفتہ آنا جانا بند کر دیگا، اسے یہ دیکھکر بہت حیرت ہوئی کہ گاہے ماہے آنے کی بجائے وہ پابندی سے ہفتے میں دو بار آنے لگا، اگر اسکی طبعیت نادر حسین سے بالکل ہٹ نہ گئی ہوتی تو وہ اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی اور اسے آسانی سے معلوم ہو جاتا کہ دراصل ارجمند سے

ملنے آتا ہے، یوں بھی وہ زیادہ عرصہ تک مغالطے میں نہیں رہی، نادر حسین نے زیب النسا بیگم کی موجودگی میں ارجمند کو دو چار تحفے دیئے، اور ایک دن نیاز کو ارجمند کی انگلی پر انگوٹھی دکھائی دی اب سارا معاملہ صاف ہو گیا۔

ارجمند کی طبیعت میں وہ بے تکلفی نہیں تھی جس نے اسکول اور کالج میں نیاز کی واقفیت کا دائرہ اس قدر وسیع کر دیا تھا، ارجمند اپنی اس خصوصیت سے بہت نالاں تھی، کیونکہ اس کی وجہ سے اسے ہر جگہ، ہر مجمع میں نیاز کی ماتحتی اختیار کرنی پڑتی تھی، اسے نہ گانے کا شوق تھا نہ ڈراما کا، نہ طالب علموں کی صحبت سے کوئی دلچسپی، مگر محض اس خوف سے کہ کہیں ساری شہرت اور ہر دلعزیزی نیاز کے حصہ میں نہ چلی جائے، وہ ہر چیز میں شریک ہوتی تھی، اور نیاز کے مقابلے میں ذہانت اور جوش کی جو اس میں کمی تھی اسے اپنے حسن اور مدھ بھری مسکراہٹ اور ہوشیاری کو کام میں لا کر پورا کرتی تھی، اس کے منہ سے نیاز کے خلاف کبھی کوئی لفظ نہیں نکلا لیکن دیکھنے والا دیکھ سکتا تھا کہ وہ نیاز سے بازی لیجانے کی جی توڑ کوشش کر رہی ہے، جب زیب النسا بیگم نے دعوتیں دینا شروع کیا تو اسے اپنے داؤں پیچ دکھانے کا بہتر موقع ملا۔ نیاز کی طبیعت ان خوشحال مردوں اور عورتوں کو کبھی نہیں پسند آسکتی تھی جو اپنی زندگی آسودگی سے بسر کرنا چاہتی تھیں جیسے خرانٹ مینڈک ان بچوں کی شرارت نہیں پسند کر سکتا جو اس کی گڑھیا میں گھس کر سبز کائی کی چادر پھاڑ ڈالتے ہیں اور پانی میں ایسی اُدھم مچاتے ہیں کہ اسے اپنے مسکن سے جان لیکر بھاگنا پڑتا ہے۔ لیکن ہنر کہاں چھپ سکتا ہے، وہی لوگ جو نیاز کی طبیعت سے گھبراتے تھے۔ اس سے بڑی لجاجت سے گانے کی فرمائشیں کیا کرتے تھے اور جب وہ گاتی تھی تو ایسے متاثر ہوتے کہ ارجمند کے تکلفات اور میٹھی نگاہوں اور مدھ بھری مسکراہٹ کی جادوگری اسکے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ ارجمند کا یہ دیکھکر بہت جی جلتا تھا، اس لئے جب کبھی نیاز دعوت میں شریک نہ ہوتی تو اسے بیحد خوشی ہوتی، اگر کبھی نیاز بے وقت روٹھ کر مہمانوں کی طرف پیٹھ پھیر لیتی تو اسکا دل باغ باغ ہو جاتا، مگر حاسد کی قسمت میں کڑھنا کچھ لکھا ہی ہوتا ہے

ارجمند کے حسن کے سب گرویدہ تھے، اس کے مزاج اور اخلاق کی سب تعریف کرتے تھے لیکن جس لہجے میں نیاز کے گن گائے جاتے تھے وہ کچھ اور ہی تھا۔

جان پہچان کے نوجوانوں میں بہت سے ارجمند کی نظر سے گذرے۔ جن کے پاس اتنا روپیہ جن کے مستقبل میں اتنی چمک تھی کہ وہ ان سے شادی کرنے پر راضی ہوجائے، اس کا خیال تھا کہ اسکی اپنی جھجک انہیں دور رکھتی ہے۔ دراصل اس کا حسن اور وہ توجہ جو وہ اپنی آرائش کیطرف کرتی تھی انہیں بھڑکا دیتی تھی اور اسکی آنکھوں میں ایک خود غرضی کی جھلک بھی تھی جو سمجھدار نوجوانوں کو سلطنتوں کا حسن کے فریب میں آکر برباد ہونا، جائدادوں کا نیلام ہونا اور بھلے آدمیوں کا تباہ ہونا یاد دلا دیتی تھی۔ نیاز خوبصورت نہیں تھی، اسے لباس اور زیور کا کوئی شوق نہ تھا، وہ نازک مزاج بھی تھی، مگر اس کی سادگی، بے تکلفی، سریلی پر درد آواز اور جوش بھری آنکھیں ہر شخص کو اپنی طرف کھینچتی تھیں، اور ارجمند کو دنیاداروں کے حلقے میں بھی مجبوراً دلربائی کی مسند نیاز کے لئے خالی کرنا پڑا۔

نادر حسین بھی ان لوگوں میں تھا جنہیں ارجمند نے اپنے لئے موزوں قرار دیا تھا۔ شروع میں وہ اس طرح نیاز کے قبضے میں تھا کہ ارجمند ڈورے ڈالنے کی ہمت نہ کرسکی، اور اس کے علاوہ وہ اسوقت تک محض ایک خوشحال آدمی کا لڑکا تھا اور اس نے اپنی کمائی سے خاندانی دولت میں کوئی اضافہ نہیں کیا تھا لیکن ارجمند کی نظر اس پر رہی، اور جب اس نے دیکھا کہ وہ وکالت میں مصروف ہے، خوب کمارہا ہے اور آئندہ اور بھی کمائے گا تو اس میں مالدار بیرسٹر کی بیوی بننے کی ہوس نے زور باندھا، اسکی خوش قسمتی تھی کہ نیاز اسی زمانے میں نادر حسین سے خفا ہوگئی۔ اس نے موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا، اور جس شام کو نیاز کی دوستی ختم ہوئی اس نے اپنی دوستی کی بنیاد ڈال دی۔ اسے نادر حسین سے مطلق محبت نہیں تھی، لیکن عاشقانہ گفتگو کی اصطلاحیں سب کے کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہیں، اور ارجمند اپنے دل کی کیفیت چھپانا جانتی تھی اس نے جو انداز اختیار کیا اس سے نادر حسین کو یقین ہوگیا کہ اسے بہت اچھا مال دستیاب ہو رہا ہے

اور اسے نہ کسی رقیب کا مقابلہ کرنا ہوگا نہ کسی چور کا اندیشہ رہے گا، ارجمند کی آنکھیں اسے کبھی کبھی ڈرا ضرور دیتی تھیں، اس کے دل میں کچھ کھٹکا سا تھا جسے اسکی عقل سمجھا نہ سکی، مگر دوسرے زیادہ قوی جذبات اس کی طبیعت پر حاوی ہو گئے، اس کے اندیشے دور کے بادلوں کی گرج بن گئے جن کے برسنے کا خوف رفتہ رفتہ جاتا رہا۔

ارجمند اور نادر حسین میں جو تعلقات قائم ہو گئے تھے ان سے نیاز کو کوئی شکایت نہیں تھی، نادر حسین سے وہ مایوس ہو چکی تھی، ارجمند سے اسے ہمدردی یا مدد کی کوئی امید نہیں تھی اس کا دل کینے سے بالکل پاک تھا، اور اس لئے وہ دونوں اپنی زندگیوں کے بارے میں جو کچھ طے کرتے اسے وہ خلوص سے تسلیم کرنے پر تیار تھی، اسے اس زمانے میں ایک دوست بھی مل گیا تھا جس کی وہ دل سے عزت کرتی تھی، جو اس کے تصور میں ان تمام خوبیوں کا مجسمہ بن گیا تھا جو کسی انسان میں پائی جا سکتی تھیں۔ خود عبداللہ اس اتفاقی ملاقات کے بعد جب نیاز نے انتہائی سادہ دلی اور جوش سے اسے اپنا دوست اور مددگار بنا لیا تھا بہت پریشان رہا، وہ اس ذمہ داری سے نہیں گھبراتا تھا جو نیاز نے اس پر ڈالدی تھی اسے اسکا یقین نہیں تھا کہ نیاز وہ صدمے برداشت کر سکے گی جو دنیا انقلاب کے ہراولوں کو ہمیشہ پہنچاتی ہے۔ نیاز سے اسے جو محبت تھی اس کا یہی تقاضا تھا کہ کسی طرح نیاز اپنے حوصلوں کو عملی صورت دینے سے روکی جائے، اس لئے اس نے نیاز کو بدنامی سے، لوگوں کی تحقیر سے، بے غرتی سے بہت ڈرایا، مگر یہ سب تدبیریں بیکار ثابت ہوئیں۔ نیاز سب کچھ سن کر آخر میں پوچھتی تھی:

"میں نے مانا آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ ہوگا، مگر کیا آپ اسکی وجہ سے میرا ساتھ چھوڑ دینگے؟"

اور عبداللہ اپنی زبان کو جھوٹ بولنے پر آمادہ نہیں کر پاتا تھا۔ بطور آخری کوشش کے اس نے سارا معاملہ زیب النسا بیگم کے سامنے پیش کر دیا۔ زیب النسا بیگم دل میں تو ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ نیاز مفت میں مصیبتیں اٹھائے، لیکن وہ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتی تھیں کہ محض انکی مخالفت اسکے حوصلوں کی کمر توڑ دے۔ انہیں امید تھی کہ نیاز کو بہت جلد ایک ہمدرد شوہر

ل جائیگا، اور اگر وہ اپنے حوصلے پورے نہ کر سکی تو شوہر اور اولاد کی محبت ناکامی کی یاد بھلا دے گی۔
نادر حسین اور نیاز کی دوستی کا رنگ پہلے ایسا تھا کہ وہ سمجھیں نیاز اس سے شادی کرے گی، انکے ایک دوسرے سے خفا ہونے کا رنج سب سے زیادہ انہیں کو ہوا، اور ارجمند نے جس خود غرضی سے ان دونوں کو پھر میل ملاپ کرنے کا موقع نہیں دیا وہ انہیں بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ نیاز کا مایوس ہو کر اپنے آپ کو یا اپنی نیک نامی کو صدمہ پہنچانا کوئی ناممکن بات نہ تھی۔ اس لئے وہ نیاز کی ہر بیت پر غور کرتی جاتی تھیں، مگر اس کے معاملات میں دخل دینا انکے اصول کے خلاف تھا۔ عبداللہ نے جب ان کو بتایا کہ نیاز اس سے کیا چاہتی ہے تو انہوں نے پہلے اسی کے ذریعے سے نیاز کو سمجھانا چاہا، اور پھر ایک بار اس کی موجودگی میں انہوں نے نیاز سے کہا:

"بیٹی تم نے اپنا دل تو مضبوط کر لیا ہے، مگر یہ بھی تو سوچو میرے کمزور دل پر کیا گذرے گی جو تمہاری طبیعت کی ذراسی ناسازی تک نہیں برداشت کر سکتا تم اگر بدنام ہوئیں تو مجھے قبر میں بھی چین نصیب نہ ہوگا۔ اور پھر یہ بھی تو سوچو تم نے اپنے حوصلے پورے کرنے کا سامان کتنا کیا ہے۔ ایک بیچارہ عبداللہ جو اپنی روٹی کمانے کے لے سارا دن محنت کرتا ہے تمہارے واسطے کیا کیا کریگا؟ تمہیں بہت سے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا چاہئے، تمہارے ساتھ دو چار شریف اور خوشحال لڑکیاں شریک ہونا چاہئیں جس سے لوگوں پر کچھ رعب جمے، سب تمہاری کوششوں کو ایک آوارہ لڑکی کا بکھیڑا نہ سمجھ لیں جو گھر میں بھلے مانسوں کی طرح رہنے کی بجائے جلسوں میں گاتی پھرتی ہے۔ اگر دس آدمی تمہارے اوپر انگلیاں اٹھائیں تو دو چار ایسے ہونا چاہئیں جو تمہاری طرف سے کچھ کہنے پر تیار ہوں اور تمہیں مردوں سے کیا کام، تم کو تو عورتوں پر اثر ڈالنا چاہئے، اگر تم نے اپنے عقیدوں کی پیروی کر کے بدنامی اٹھائی اور دنیا کی نظروں میں ذلیل ہوئیں تو شریف لڑکیاں ڈر جائیں گی، کوئی تمہاری تقلید نہ کرے گی۔ اور تمہاری محنت اور جفاکشی اور رسوائی سے کسی خدا کی بندی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ میں نے آجتک تمہاری مخالفت نہیں کی ہے، لیکن سچ پوچھو تو تم نے ذرا بھی دوراندیشی سے کام نہیں لیا۔ سب سے لڑتی جھگڑتی ہو، اور تمہاری بدمزاجی سے سب نالاں ہیں۔ ٹھیک طریقہ تو

یہ ہے کہ تم اپنے جان پہچان کے لوگوں کو خوش کرو، سب کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کرو پھر وہ آپ ہی تمہاری) مدد کریں گے، تمہیں کامیابی کی دعائیں دیں گے۔ اور تمہارے بعد اگر کوئی غریب اور شریف لڑکی گانے کا پیشہ اختیار کرے گی تو اسے معلوم ہوگا کہ واقعی کوئی خدا کی بندی اس کی مشکلیں آسان کرگئی ہے، میں برسوں سے اس فکر میں ہوں کہ تم نام پیدا کرو، مگر بیٹی تمہاری سمجھ کچھ ایسی الٹی ہے کہ تم مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہو اور جن لوگوں سے میں تمہاری تعریف کرانا چاہتی ہوں انہیں کے منہ سے تم مجھے شکایتیں سنواتی ہو۔"

زیب النساء بیگم کی تقریر میں بے ترتیبی بہت تھی، مگر وہ کارگر ہوئی، نیاز اس وقت کچھ نہیں بولی شام کو جو مہمان آئے ان سے خوب میٹھی میٹھی باتیں کیں اور انہیں جی بھر کر گانا سنایا، مگر اسکی سادہ دلی کا اندازہ ابھی تک زیب النساء بیگم کو نہیں ہوا تھا، رات کو گیارہ بجے کے قریب وہ سونے کے لئے لیٹیں تو نیاز کمرے میں آئی انکے گلے سے لپٹ گئی اور چپکے چپکے رونے لگی، انہوں نے پیار کیا، سر سہلایا، رونے کی وجہ پوچھتی رہیں، مگر نیاز کے منہ سے آواز ہی نہ نکلی، آخر کار اس نے تکیہ میں منہ چھپا کر کہا:

"اماں ہم مولوی صاحب سے شادی کرینگے"

یہ سنتے ہی معلوم ہوتا تھا کسی نے زیب النساء کا گلا گھونٹ دیا۔ انکے دل کا دھڑکنا بند ہوگیا۔ آنکھیں حلقوں سے نکلی پڑتی تھیں، حواس گم تھے، تھوڑی دیر بعد جب صدمہ کا اثر کچھ کم ہوا تو انہوں نے نیاز کی بانہہ اپنے گلے سے ہٹائی اور کچھ مایوسی، کچھ غصے کے لہجے میں بولیں،

" نیاز کیا بالکل ہی دیوانی ہوگئی ہے؟ اچھے بھلے نوجوانوں سے جو تجھے کھلا پلا سکتے ہیں ذرا ذرا سی بات پر روٹھ جاتی ہے، کبھی کہتی ہے گانے والی کا پیشہ اختیار کرے گی، کبھی ایک غریب آدمی سے شادی کرکے اس کی جان مصیبت میں ڈالنے پر تل جاتی ہے، اری ذرا ہوش حواس درست کر، تجھے ہو کیا گیا ہے؟"

نیاز نے تکیہ میں اور منہ چھپا کر جواب دیا:

"اماں ہم کو امیر آدمی نہیں چاہیئے، ہمارے حوصلے صرف غریب آدمی پورے کرسکتا ہے"
"ہاں غریب اور کیا غریب! بیچارے پر کسی نے الزام لگا دیا کہ بھنگن سے تعلق رہ چکا ہے
تو ایسی بگڑی کہ کتے کی طرح دھتکارنے پر تیار ہوگئی، اب خدا جانے کیسے اس سے شادی کرنا چاہتی
ہے، تو تو اپنی زندگی بگاڑ کر چھوڑے گی، تجھے میں کیا سمجھاؤں، مجھے اس بیچارے پر ترس آتا ہے
اس میں کہاں بوتا ہے کہ تیرے ناز نخرے برداشت کرے، تو اس سے دو چار دن میں خفا ہوکر
کہدے گی کہ جائے ہماری دوستی ختم ہوگئی اور اپنے گھر بھاگ آئے گی، اس بیچارے پر مفت
میں ایک شریف زادی کے بہکانے کا الزام لگے گا۔ لوگ کہیں گے اس نے تجھے دھوکہ دے کر
تیری زندگی برباد کی . . . . تو تو ایسی خود غرض نہیں ہے، ذرا دوسرے کی نیک نامی کا خیال کر"
نیاز نے تکیہ پر سے سر نہیں اٹھایا، وہیں روتے روتے سوگئی، سویرے جب اس کی آنکھ
کھلی تو زیب النسا بیگم اسے بڑی محبت سے پیار کر رہی تھیں۔

اس دن سے زیب النسا بیگم سے زیادہ نیاز کے حوصلوں کا ہمدرد اور خیر خواہ کوئی نہ تھا
نیاز منہ ہاتھ دھوکر ناشتے کے لئے آئی تو انہوں نے کہا:
"دیکھ لڑکی تو سمجھتی ہے میں سٹھیا گئی ہوں، اب میں تجھے بتاؤں گی کہ سمجھدار آدمی اپنا مطلب
کیسے حاصل کرتے ہیں۔ ناشتے کے بعد تجھے بٹھا کر ڈیڑھ سو دعوت نامے لکھاؤں گی، دعوت نامے لکھ کر
تجھے جتنی غزلیں اور گیت یاد ہیں سب سنوں گی، اور جو مجھے پسند آئے ان کی روزانہ دعوت کے دن
تک مشق کراؤں گی، جب تو دعوت میں سب کو غزلیں سنا کر خوش کر چکے گی تو تیری ہمدردی میں
ایک تقریر کروں گی اور پھر دیکھیں گے گانے کا عام جلسہ کرنے کا کون مخالف ہوتا ہے۔ جب تونے
ایک جلسہ کامیاب کر دیا اور تمام اخباروں نے تیری تعریف کر دی تو پھر کیا باقی رہے گا۔ تیرا جی چاہے
باپ کی کمائی پر بسر کر، جی چاہے اپنی روٹی کما۔ تو ایسی ضدی اور بیوقوف نہ ہوتی تو یہ سب کب کا
ہوگیا ہوتا"

نیاز کی طبیعت میں شک بالکل نہیں تھا، ماں کی باتیں سنکر خوشی سے پھول گئی، اور جلدی جلدی ناشتہ کرکے دعوت نامے شروع کئے۔

"دیکھو نیاز،، زیب النسا بیگم نے اچانک کہا "عبداللہ کو ضرور بلانا"

نیاز نے ماں کی طرف غور سے دیکھا۔ دیکھتے دیکھتے اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور وہ ماں سے جاکر بڑی محبت سے لپٹ گئی۔ انہوں نے شادی کی مخالفت کی تھی تو کیا ہوا، نیاز کو یقین ہوگیا کہ انہیں اس سے اور عبداللہ سے سچی محبت ہے۔ بڑی دعوت کے دن تک نیاز کے دل میں یہ یقین پختہ ہوتا گیا، اور ماں کا اصل منشا بھی اس کی سمجھ میں آگیا، اس نے عبداللہ سے شادی کرنے کا خیال تو چھوڑ دیا مگر وہ الفت جس نے یہ خیال پیدا کیا تھا اس کے جذبات کا جوہر بن گئی، ایک زیور جس نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا، ایک خوشبو جس میں اسکا جسم ہر وقت بسا رہتا تھا۔ جب دعوت کا دن آیا تو نیاز ایک نئی زندگی شروع کرنے پر تیار تھی۔

زیب النسا بیگم نے مہمان بہت چن چن کر بلائے تھے، صرف ایسے نہیں جو محض امیر تھے یا ایسے جو ہر تجویز کی تائید کرنے پر راضی ہوں، اور تائید کے سوا اور کسی قسم کی مدد دینے میں سستی یا غفلت کریں، نیاز کی آواز بھی خوب رنگ پر تھی، غزلوں اور گیتوں کے بیچ بیچ میں زیب النسا بیگم نے مہمانوں کو اس کے ارادے سمجھائے۔ جو اختلاف رائے انکی تقریریں نہیں مٹا سکیں وہ نیاز کے نغموں نے خاموش کر دیا، اور جب مجلس برخاست ہوئی تو سب نے نیاز کی ہمت افزائی کی اور حتی الامکان مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا۔

مہمانوں کے ہجوم میں نیاز ایک نوجوان کی طرف زیادہ توجہ نہیں کر سکی جسے نادر حسین ساتھ لایا تھا، اسکا نام ہدایت اللہ تھا اور وہ اسی صوبے کے ایک بڑے شہر کا رہنے والا تھا۔ انگلستان میں نادر حسین اور وہ قریب ایک سال کے ساتھ رہے تھے اور دونوں میں بہت دوستی ہوگئی تھی وہاں سے واپس ہونے پر وہ اس کوشش میں مبتلا رہا کہ اپنی محنت سے کمائے کھائے اور آبائی جائداد کی آمدنی کا سہارا نہ لے، نادر حسین کی طرح وہ بھی بیرسٹر تھا، مگر کچھ دنوں وکلا کی صحبت

اور مقدمہ بازی کی فضا میں رہنے کے بعد اس نے طے کیا کہ اس پیشے کی کمائی مفت خوری سے بھی بدتر ہے، اور اسے چھوڑ کر تجارت کے ارادے سے دو چار دوکانیں اور کارخانے قائم کئے، مگر اسے معلوم ہو گیا کہ لوگ اسے طرح طرح کے سبز باغ دکھاتے ہیں، دوکان یا کارخانے کا معائنہ کرا کے یا سنجیدہ چہرہ بنا کر اسے یقین دلا دیتے ہیں کہ اسے عنقریب دس بارہ فیصدی کا منافع ہونے والا ہے مگر اسے کسی قسم کا فائدہ نہیں ہوتا۔ وہ ہوشیار آدمی تھا اور صرف چند ہزار کا نقصان اٹھانے کے بعد اس نے یہ "پیشہ" بھی ترک کر دیا۔ پھر قبل اس کے کہ وہ اور کوئی شغلہ تجویز کرے، دولت اور فراغت نے اس پر جادو کر دیا، اور اپنے اچھے ارادے بھول کر وہ آوارہ میموں اور طوائفوں کے پھندے میں پڑ گیا۔ اس راستے پر اسکی روک ٹوک کرنیوالا بھی کوئی نہیں تھا والدین نے اس کے ولایت جانے سے پہلے جائداد کے لالچ میں اس کی ایک مدقوق لڑکی سے شادی کر دی تھی جو بہت جلد مر گئی، اور اس سے جو ایک بچی ہوئی وہ صرف چند دن کی مہماں رہی، ہدایت اللہ جب ولایت سے واپس آیا تو اس کے پاس بہت سی دولت تھی جسے خرچ کرنے کے علاوہ اس کی زندگی کا بظاہر اور کوئی مصرف نہ تھا، پھر میمیں اور طوائفیں اپنے نصیب کو کیوں دعائیں نہ دیتیں۔

نادر حسین کی جب منگنی ٹھہر گئی تو اس نے ہدایت اللہ کو ارجمند سے ملنے کے لئے بلایا، ہدایت اللہ پر اسی زمانے میں عیاشی کی ایک موج گذر چکی تھی اس زندگی سے اس کی طبیعت سیر ہو گئی تھی اور ایک میم جس کی آشنائی اس کے خیال میں محبت کے درجے تک پہنچ گئی تھی اسے چھوڑ کر کسی راجہ کے پاس چلی گئی تھی۔ ہدایت اللہ نے کچھ اس غرض سے کہ کرنٹی کا ماجرا بھول جائے کچھ عیاشی کا خمار اتارنے کے لئے نادر حسین کی دعوت منظور کر لی۔ اتفاق سے وہ ایسے وقت پہنچا کہ زیب النسا بیگم کی بڑی تقریب میں بھی شریک ہو سکا، ارجمند سے مل کر وہ بہت خوش ہوا لیکن ارجمند جیسی لڑکیاں اس نے بہت دیکھی تھیں، کبھی شریف خاندانوں میں، کبھی آوارہ عورتوں کے حلقوں میں نیاز کی سی صورت اور سیرت سے اسے ابھی تک سابقہ نہیں پڑا تھا، اور اس کی ذہنیت پر عیاشی

کا رنگ اس طرح لگ گیا تھا کہ وہ ایسی عورتوں کے وجود ہی کا قائل نہیں رہا تھا، نیاز کو دیکھ کر اس کے دل میں نئے ولولے پیدا ہوئے۔ اسے اپنی گذشتہ زندگی یاد کر کے شرم آنے لگی، اور اس کے دل میں ایک امید جاگ اٹھی کہ شاید نیاز کا اثر اس کی بری عادتیں چھڑا کے اسے ہوس کے گرداب سے نکال لے اور پھر ایک مہذب انسان بنا دے اس لئے نادر حسین کے ذریعہ سے اس نے دوسرے دن چائے پر اپنی دعوت کرالی اور دل کا پیمانہ امیدوں سے لبریز کر کے گھر واپس ہوا۔

اس کی نیاز سے دوسرے دن ملاقات ہوئی۔ تیسرے دن وہ بن بلائے پہنچ گیا اور چوتھے دن بھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ رویہ درست نہیں ہے، اس سے خواہ مخواہ بدگمانی ہوتی ہے۔ مگر اسے خوف تھا کہ اگر نیاز کی دوستی کا سہارا نہ ملا تو پرانی صحبت میں جا کر وہ پھر عیاشی میں مبتلا ہو جائیگا اپنی کشمکش سے نجات پانے کے لئے اس نے چوتھی ملاقات پر نیاز کو اپنی ساری سرگذشت سنادی اپنی مجبوریاں سمجھادیں، اور نیاز جیسی پاک دل عورت کا اس کے اخلاق پر جو اثر پڑ سکتا تھا وہ بھی بتلادیا۔ ہدایت اللہ نے عیاشی سیکھ لی تھی، مگر عیاری اور مکاری سے ابھی تک بالکل بیگانہ تھا، اور نیاز سے باتیں کرتے وقت اس کے چہرے اور لہجے سے اتنا خلوص ظاہر ہوتا تھا کہ اگر نیاز نے اپنے عام قاعدے پر عمل کیا ہوتا تو وہ ہدایت اللہ کو ایک فرشتہ سمجھ لیتی جو دنیا کے فریب میں آگیا ہے اور اس کے ہمراہ فلک پیمائی کرنے کے خواب دیکھنے لگتی، مگر پچھلے دنوں وہ اپنی ماں کی تجربہ کاری کی بہت قائل ہو گئی تھی، اور اسے اپنی غلطیوں کا بھی کچھ احساس ہو گیا تھا، اس موقع پر اس نے اپنے جوش کی لگام تھامی، ہمدردی اور افسوس کا اظہار کیا، لیکن کسی قسم کا قطعی وعدہ کر کے اپنے آپ کو پابند نہیں کر لیا۔ زیب النساء بیگم کو معلوم تھا کہ ازدواجی زندگی میں بیوی اگر چاہے تو کتنا اثر ڈال سکتی ہے، اور اس لئے جب نیاز نے انہیں ہدایت اللہ کا سارا قصہ سنایا تو انہوں نے اسے ایک ناقابلِ رحم مجرم قرار دے کر نیاز کو اس سے دور دور رہنے کی تاکید نہیں کی، ہدایت اللہ کی صورت میں شائستگی اور شرافت کے آثار ابھی اس قدر باقی تھے کہ اس کے سدھرنے کی امید کیجا سکے، اور اگر انکو یقین ہو جاتا کہ اس نے اپنا چال چلن درست کر لیا ہے تو وہ نیاز کی اس سے شادی کرینگی

بھی مخالفت نہ کرتیں، اس لئے انہوں نے ہدایت اللہ کو تین چار روز بعد چائے پر بلایا اور باتوں باتوں میں اسے مشورہ دیا کہ انکے شہر میں مکان لیکر دو چار مہینے رہے۔ یوں وہ اپنی صحبت سے پیچھا چھڑا سکے گا، اور وہ سب بھی اس سے اکثر مل سکیں گے۔

ہدایت اللہ نے اس تجویز پر عمل کیا، اور شہر میں مکان لیکر رہنے لگا، اسکا زیب النسا بیگم کے یہاں کثرت سے آنا جانا ہوتا تھا، زیادہ تر اس وجہ سے کہ وقت کاٹنے کے لئے وہ نیاز کے گانے کا جلسہ کرانیکے دھندے میں پڑ گیا، شہر میں سکونت اختیار کرنے کے ایک مہینہ بعد ہی اس نے بڑے اہتمام سے جلسہ کرا بھی دیا، جلسے میں بہت لوگ آئے ٹکٹ بہت بکے، نیاز کی تین سو روپے نقد آمدنی ہوگئی اور اخباروں میں اسکی خوب تعریف بھی چھپی، نیاز اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوئی اور ہدایت اللہ کے سلیقے اور حسن انتظام اور پاک نیتی پر اسے اتنا اعتماد ہوگیا کہ جب اس نے کوشش جاری رکھنے کی صلاح دی تو وہ فوراً راضی ہوگئی اور ہدایت اللہ نے اپنے شہر میں بھی اسی اہتمام اور کامیابی سے جلسہ کرا دیا۔ نیاز کے حوصلے پورے ہو رہے تھے، اور ہدایت اللہ سے اسکی وہ گہری دوستی ہوگئی جس کی دونوں کو اتنی تمنا تھی، اس عرصہ میں زیب النساء بیگم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ہدایت اللہ پھر شریف اور خوش اخلاق لوگوں کی زندگی بسر کرنے لگا ہے، اس نے بدچلنی کے داغ اپنی طبیعت اور اپنے دل سے بالکل مٹا دئے ہیں، اور اب اس کے خلوص اور نیت میں شک کرنا بیجا ہوگا۔ ایک اور خوشی کی بات یہ بھی تھی کہ اس نے نیاز کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا، اور اس سے امید کیجا سکتی تھی کہ بغیر نیاز کا دل دکھائے وہ اسے سادہ دلی کی حماقتوں سے بچاتا رہے گا۔

لیکن زیب النسا بیگم کو مسرت کے زیادہ دن نصیب نہیں ہوئے، ارجمند کی شادی تین مہینے بعد ہونے والی تھی، ایک روز نادر حسین نے ان سے شکایت کی کہ ارجمند نے تاریخ ملتوی کرنے کو کہا ہے اور یہ نہیں بتایا کیوں، زیب النسا بیگم نے بھی ارجمند سے پوچھا، مگر کچھ صاف صاف معلوم نہ ہوسکا۔ ارجمند ایسی بیوقوف نہیں تھی جو اپنے ارادوں کا اعلان کرتی۔ ادھر ہدایت اللہ نیاز

کے جلسے کی فکر میں تھا ، ادھر اُس نے ماں سے چھپا کر نادر حسین کے ساتھ سنیما اور اس کے بعد ناچ دیکھنا شروع کیا اور پھر کسی میم کے یہاں خود ناچنا بھی سیکھ لیا ، ہدایت اللہ جب نیاز کے جلسوں سے فارغ ہوا تو ارجمند اسے بھی نادر حسین کے ذریعے سے بلا کر ساتھ لیجانے لگی ۔ نادر حسین اپنی جھجک اس قدر دور نہ کر سکا کہ خود ارجمند کے ساتھ ناچے اس لئے ارجمند اور ہدایت اللہ ناچتے اور وہ بیٹھا دیکھا کرتا تھا ۔ نادر حسین کا قد ہدایت اللہ سے کہیں چھوٹا تھا ، اسکا جسم سڈول ، مگر دبلا ، اور اسے انداز گفتگو کے وہ راز بھی نہیں معلوم تھے جو دلچسپی اور لگاؤ پیدا کرتے ہیں ۔ ہدایت اللہ میں یہ سب صفتیں تھیں ، اور انکے علاوہ نادر حسین سے مالدار بھی زیادہ تھا ۔ پھر ارجمند کیوں شادی کی تاریخ ملتوی نہ کرتی ؟ اسے خیال تھا کہ اگر اسے کافی مہلت ملی تو اسکا حسن ، اس کی مدھری مسکراہٹ ، اس کا ناچ اور سنیما کا شوق ہدایت اللہ کے دل میں نیاز کی جو محبت تھی اس کی بیخ کنی کے لئے کافی ہوگا ، لیکن جب اسے ذرا اندیشہ ہوا کہ شاید یوں کام نہ چلے تو اس نے ایک اور ترکیب سوچی ، وہ معصوم بنی ایک رات کو نیاز کے پاس جا کر رونے لگی ، اور یہ دکھلا کر کہ نیاز اور ہدایت اللہ کی خواہشوں کا اسے کوئی علم نہیں اس نے کہا کہ اسکی طبیعت نادر حسین سے بالکل ہٹ گئی ہے اور وہ ہدایت اللہ سے شادی کرنا چاہتی ہے ۔ نیاز کی ایثار پسند طبیعت بھلا یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے وہ چھوٹی بہن کی آرزوئیں مٹی میں ملائے ۔ اس نے صرف اپنی محبت اور اپنے ارادے چھپائے نہیں بلکہ جوش میں ارجمند سے وعدہ کر لیا کہ وہ نادر حسین کو سمجھا دے گی ، ہدایت اللہ کو اگر خدانخواستہ کوئی تامل ہوا تو اس کو بھی راضی کرے گی ، اور ارجمند کو لوریاں گا کر سلا دیا ۔

نیاز نے ایثار تو کیا لیکن اسکا صدمہ برداشت نہ کر سکی ، دوسرے دن شام کو اسے بہت تیز بخار چڑھا ، بخار میں نیند آگئی ، دو بجے رات کے قریب اسکی آنکھ کھلی تو پسینہ جاری تھا ، اور طبیعت بہت ہلکی تھی ، اس نے سوچا کہ بخار کسی مرض کی وجہ سے تو ہے نہیں ، اس لئے پسینہ نکلنے سے جو الجھن ہو رہی تھی اسے دور کرنے کے لئے ٹھنڈے پانی سے نہالی ، سویرے ڈاکٹر آئے اور کہا اسے نمونیہ ہو گیا ہے اور اسکے بچنے کی بہت کم امید ہے ۔

نیاز کی موت نے سب کی زندگی میں بڑا انقلاب پیدا کر دیا، ہدایت اللہ کے دل میں پھر عیاشی اور آوارہ گردی کی ہوس پیدا ہوگئی۔ نیاز کے تیجے کے بعد ہی اس نے اپنے شہر واپس جا کر شراب نوشی اور ناچ گانے میں نیاز کی یاد بھلانے کا ارادہ کر لیا لیکن نیاز کے مرتے ہی ارجمند کا حسن ایک عجیب طریقے پر نکھر آیا اسکی مسکراہٹ اور نشیلی ہوگئی، اس کے انداز نے ایک بیباکی سیکھ لی جو اس میں پہلے نہیں نظر آتی تھی، ہدایت اللہ پر اسکا کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ اپنا جانا ملتوی کرتا رہا۔ ارجمند اپنی طرف اپنی شادی کی تاریخ ملتوی کرتی رہی یہانتک کہ نادر حسین نے اس سے شادی کرنیکا خیال فضول سمجھ لیا اور اس سے ملاقات کرنا تک چھوڑ دیا، زیب النساء بیگم کو اب زندگی سے مطلق دلچسپی نہیں رہی، یہ ممکن تھا کہ دو بیٹیوں کی محبت سے وہ اس ایک کو فیض پہنچائیں جو زندہ تھی اور خوش معلوم ہوتی تھی لیکن خدا جانے انہیں کیسے شبہ ہوگیا کہ نیاز کی موت کی دراصل ارجمند ذمہ دار ہے۔ انہوں نے ارجمند کو اس کے حال پر چھوڑ دیا، کبھی یہ خواہش بھی ظاہر نہیں کی کہ وہ ہدایت اللہ سے شادی کرے اور گھر آباد کرے۔ ارجمند نے بھی انہیں اپنے معاملات سے الگ رہنے دیا اور جب اسے یقین ہوگیا کہ نادر حسین اس سے کوئی توقع نہیں رکھتا تو ہدایت اللہ سے شادی کر لی۔ دونوں کی رنگیلی زندگی شہر شہر مشہور ہوگئی، باتصویر اخباروں میں ارجمند کے فوٹو بھی چھپنے لگے، اور ارجمند کا نام ملک کی خوش قسمت عورتوں میں شامل ہوگیا۔

زیب النساء بیگم سے صرف عبداللہ کبھی کبھی ملنے آتا تھا، اور دونوں گھنٹوں بیٹھ کر نیاز کی باتیں کیا کرتے تھے، آخر کار وہ موت کا انتظار کرتے کرتے تھک گئیں، اور عبداللہ کے ذریعے سے انہوں نے ایک شریف اور غریب لڑکی تلاش کر کے اسے متبنیٰ کر لیا۔ روز شام کو وہ اس کے ساتھ باغ میں بیٹھتی تھیں، اس کے سر کو پھولوں سے سنوار کر اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی تھیں اور انکے دل کے حوصلے اپنی گہری نیند میں کنمناتے تھے۔

رائنر ماریا رلکے

(گذشتہ جلدوں میں ڈاکٹر سلیم الزمان صاحب صدیقی اس جرمن شاعر کی زندگی اور اسکے کلام سے ناظرین "جامعہ" کو روشناس کر چکے ہیں۔ اس پرچہ میں اسکی چند منتخب نظموں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں)

بیوہ کا گیت

شروع شروع زندگی میں ایک مزہ تھا،
ایک امنگ تھی، ایک ڈھارس تھی۔
یہ کہ جوانی میں یونہی ہوتا ہے۔
ان دنوں کیا معلوم ہوتا۔
نہ معلوم تھا کہ زندگی کیا چیز ہے؛
اور دفعتاً زندگی یہ ہوگئی۔
کہ سال آیا اور سال گیا۔
نہ اچھی مزار ہا، نہ تغیر، نہ تحیر؛
جیسے کوئی بیچ سے دو ٹکڑے کردے۔
اس میں نہ اسکی خطا تھی نہ میری،
ہم دونوں صابر تھے اور صبر بھی کرتے رہے،
لیکن موت کو صبر نہیں۔
میں نے اس کو آتے دیکھا (کیا ہی برا آنا تھا اس کا آنا)
اور میں اسکو تکتی رہی اور وہ سمیٹتی گئی، سمیٹتی گئی۔

کچھ میری تھوڑی ہی تھی، میری!
پھر تھا کیا میرا؟ میری، میرا؟
کیا میرا سوگ تک مانگے کا نہ تھا،
قسمت کا دیا قرض؟
تقدیر نصیب ہی نہیں لیتی
دل کا سچ اور جگر کے نالے تک لوٹ لیتی ہے۔
اور پھر اجڑے کھنڈل کو گدڑی کے داموں خرید لیتی ہے۔
ہاں! تقدیر آئی اور ایک نہیں کے بدلے سب کچھ لے گئی،
میرے چہرے کی ہر ہر بات،
میری چال، ڈھال،
سب،
جیسے روز کے روز کا نیلام،
اور جب کچھ نہ رہا تب اپنے حالوں چھوڑ دیا۔ ۔ ۔ ۔
خالی ہاتھ کھڑی ہوں!

سٹراں کا گیت

لوگ مجھے روکتے نہیں، پتانے دیتے ہیں۔
کہتے ہیں کچھ ہو نہیں سکتا۔
مّز[1] لے ہیں۔

(۱) تشدید "م" پر ہے "ز" پر نہیں

کچھ ہو نہیں سکتا! ایک دنیا آتی ہے
اور چکر پر چکر لگاتی ہے،
بار بار روح القدس کے گرد،
ارمہ ایک روح ہے روح القدس،
(سمجھے!)۔
مزے ہیں۔
نہیں، سچ مچ کوئی یہ نہ سمجھے،
اس میں کوئی ڈر کی بات ہے،
یہ خون ہے خون۔
اور خون کا بوجھ سارے بوجھوں پر بھاری ہے
میاں بڑا وزن ہوتا ہے خون کا۔
اور اب تو اکثر یوں لگے ہے۔
کہ بھئی اب تو اپنوں سے یہ نہیں سدھنے کا۔
مزے ہیں۔
ارے، یہ کیا ہے، گیند کہ غبارہ!
لال لال، گول گول، جیسے سارا سنسار
بھئی اچھا کیا لو گو اسے بنایا۔
مگر یہ آئے گا بھی جو اسے بلائیں!
کیسی ہر چیز لایعنی لاثانی ہے
ایک دوسرے میں گھسی جاتی ہے
ایک دوسرے سے نکل آتی ہے؛

کچھ مزے مزے، کچھ ڈھل مل یقین،
بھئی مزے ہیں لوگو، مزے ہیں (۱)

یتیم کا گیت

میں نہ کچھ ہوں، نہ کچھ ہوں گا۔
ابھی تو خیر ہونے کو عمر ہی کیا ہے،
لیکن آئندہ بھی۔
ماں باپو۔
رحم کرو مجھ پر رحم۔

(۱) ہمارے گاؤں میں بادن دین نامی ایک سڑی رہتا تھا۔ میری عمر اس زمانے میں چار پانچ سال کی ہوگی۔ جب کبھی وہ اپنی چیٹ بھر لنگوٹی باندھے گھر کے پاس سے گذرتا میں اسکے ہونق چہرے سے ڈر کر بھاگ جاتا۔ وہ نہ کسی کو مارتا نہ پیٹتا صرف سر اٹھا کر چاروں طرف گردن کو آہستہ سے گردش دیتا اور دبی آواز سے بڑبڑاتا "یوسب ہمار آسے" قارئین میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی ایسی ہی ہستی کا تجربہ ہوا ہوگا رسلکے کی اس نظم کو پڑھکر اس سڑی کی شکل سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہر سڑی کی بڑ میں کچھ نہ کچھ دل کو لگتا ہوا فلسفہ ہوتا ہے اور ایسا نہ ہوتا تو مجذوب مجذوب کیوں کہلاتے۔ رسلکے کے سڑی میں اس کی خاص شہرت ہے۔ وہ کبھی اپنے خون کے "بوجھ" سے عاجز ہو کر چیختا ہے کہ اب یہ بار نہیں اٹھتا کبھی قلا بیچ مار کر کہتا ہے کہ "مزے ہیں" کبھی اس دنیا کو بھجتے یا نکلتے ہوئے آفتاب کو لال لال غبارہ قرار دیتا ہے اور انگلی کے اشارے سے بلاتے ہوئے کہتا ہے کہ "مگر یہ آئیگا جواب بلائیں" رسلکے کی ایک ایک تحریر آنکھوں کے سامنے ایک ایک تصویر پیش کر دیتی ہے اور تصویر بھی ایسی تصویر کہ نہایت شدید اور جامہ دریدہ جسے دیکھکر انسان کچھ دنوں تک تو آنکھوں سے محو نہ کر سکے۔ واللہ اعلم بالصواب

مگر عبث ہے میرا پلنا پوسنا،
میری نمیاد بے بود۔
میرا کون اور میں کس کا؟
آج ابھی بہت سویرا ہے
اور کل ہو جائے گی بہت دیر
میرے صرف یہی ایک تن کا جامہ ہے
گھستا ہے، بیرنگ ہوتا ہے۔
مگر کٹنے نہیں آتا،
شائد یہ ابدا ابد کا ساتھی خدا کے گھر تک جائے۔
میرے صرف یہی سر کے چند بال ہیں۔
(نہ کبھی سکٹے نہ بھے)
کبھی کسی کے پیارے تھے،
اب کسی کے نہیں۔

باونے کا گیت

میری روح شائد سیدھی اور ثابت ہو
لیکن اس سے میرا دل، میرا ٹیڑھا خون،
میری ٹیڑھی رگیں، میرے ٹیڑھے عضو،
(یہ میری کوفت کے نشان)
سیدھے نہیں ہوئے
اس کے لئے نہ باغ ہیں نہ کیاریاں،

میری نکیلی ہڈیوں کے نکیلے ڈھانچے پر لٹکی
دہشت کے مارے پھڑپھڑا رہی ہے
میرے ہاتھوں سے بھی کچھ نہیں ہونے کا۔
کیسے مار گئے ہیں، یہ دیکھو:
چمڑے چمڑے، بھیگے بھیگے، بھاری بھاری،
پھدکتے ہیں جیسے برساتی بوٹ۔
اور تن بدن میں اور جو کچھ ہے
سب پھٹا پرانا افسوسناک،
پھر تجھے کا ہے کی دیر ہے۔
کیوں ان لتوں کو کوڑے کے ڈھیر میں نہیں کر دیتا۔
یا شائد وہ میرے اس چہرے پر خفا ہے،
میرے بھولے منہ پر؟
ہاں یہ منہ بار ہا تیار تھا کہ بالکل ہلکا۔
اور دل میں صاف ہو جائے
لیکن کتوں کے سوا کوئی پاس نہ پھٹکا۔
اور کتوں میں وہ بات کہاں

کوڑھی کا گیت

دیکھو میں وہ ہوں جس کو سب نے چھوڑ دیا ہے۔
شہر میں کسی کو میری خبر نہیں
مجھ پر کوڑھ چڑھا ہے۔

اور میں اپنی ڈگڈگی[1] بجاتا ہوں،

(اپنی آفت کا نشان)

کہ سب سن لیں۔

اور کہیں پاس نہ آجائیں

اور اونچے کانوں سننے والے ہیں

کہ اس طرف نظر تک نہیں کرتے

کہ دیکھیں تو سہی کسی پر کیا مصیبت آئی ہے۔

انکی بلا سے۔

(میرے بھی مزے ہیں)

جہاں تک اپنی ڈگڈگی کی آواز جائے اپنا گھر ہے

لیکن شائد تو اس ڈگڈگی کی آواز اتنی کردے

کہ اب پاس سے کترا جانے والے پھر کوسوں دور پر گھبرائیں۔

اور میں دیر دیر تک دور دور چلا جاؤں

اور نہ کوئی لڑکی دکھائی دے

نہ عورت

نہ مرد

نہ کوئی بچہ

جانور شائد نہ بھاگیں سہم کر۔

---

(۱) پرانے زمانے میں یہ دستور تھا کہ کوڑھی شہر سے باہر رکھے جاتے، اور انکو شہر کے نزدیک آتے وقت ایک ڈگڈگی بجانی پڑتی تاکہ لوگ ہوشیار ہوجائیں اور انکے سامنے سے بچیں۔

شذرات

۱۴ اپریل قومی ہفتہ کا آخری دن ہے اور یہ دن جس طرح ہندوستان کے ہر ہر حصہ اور ہر ہر گوشہ میں منایا جاتا ہے، جامعہ میں بھی اس دن کی یادگار منائی گئی، لیکن جامعہ میں یہ یادگار ایک خاص طریقہ سے منائی جاتی ہے۔ اس دن یہ ہوتا ہے کہ بھنگی بہشتی، خدمتگار اور تمام دوسرے ملازمین کو چھٹی دیدی جاتی ہے اور انکا تمام کام لڑکے خود اپنے ہاتھ سے ملکر کرتے ہیں جس میں اساتذہ بھی شریک ہوتے ہیں۔ غرض اس کی یہ ہے کہ لڑکوں میں ادنے سے ادنے کام کرنے سے بھی کبھی عار نہ پیدا ہو اور ضرورت پڑے تو نہ صرف اپنا بلکہ دوسروں کا بھی معمولی سے معمولی کام کرنے میں تامل نہ ہو اور اسکا مشاہدہ اس دن صاف طور پر ہوتا ہے۔ لڑکے اپنے کمرہ اور گرد و پیش کی صفائی کے لئے تو فی الفور تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب دوسروں کا سوال آتا ہے تو اسوقت کسیقدر پس و پیش کرتے ہیں۔ لیکن جب اس رسم کی غرض و غایت اور اس کام کا اصل مقصد ان کو بتایا جاتا ہے تو پھر وہ بلا تامل اسکے لئے آگے قدم بڑھاتے ہیں اور پھر من و تو کی تفریق نہیں رہتی۔

'بڑوں' کو 'چھوٹوں' کے درجہ پر لانے کا تو یہ حال ہوتا ہے لیکن 'چھوٹے' جب 'بڑے' رتبہ پر آگے کئے جاتے ہیں تو اس وقت کا نظارہ اس سے بھی زیادہ قابل دید ہوتا ہے۔ دوپہر کے وقت جب تمام لڑکے اور استاد اپنے اپنے کام سے فارغ ہو چکتے ہیں تو اس وقت کا کھانا طلبہ و اساتذہ مع تمام دیگر ملازمین ایک ہی دسترخوان پر بیٹھکر کھاتے ہیں۔ اس موقع پر خدمتگاروں اور نوکروں کو اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ بیٹھنے میں جو گریز اور تامل ہوتا ہے، وہ اس ذہنیت کو مٹانے کا سب سے کھلا ثبوت ہے۔ حیرت ہے بنی آدم نے جو ایک ہی جسم کے مختلف اعضا ہیں، رسم ریت آپس میں ایک دوسرے سے اس درجہ بے گانہ اور نا آشنا ہو گئے ہیں کہ 'بڑے' کو 'چھوٹے'

کے کام سے اس درجہ ننگ و عار آئے اور چھوٹے کو بڑے کے قریب سے اس قدر بعد اور گریز ہوا! سچ تو یہ ہے کہ "بڑائی" اور "چھوٹائی" کا یہ تخیل خود ہمارا پیدا کردہ ہے، جبتک ہم ہی اس کو دور نہ کریں گے یہ لعنت ہم سے دور نہیں ہوسکتی، جامعہ اپنی اس چھوٹی سی برادری کے اندر اور ۳۶۵ دن میں کم سے کم ایک دن عملاً یہ بتانا چاہتی ہے کہ انسان انسان برابر ہیں اور کام اور فرائض کے اختلاف سے انسانیت کے درجہ میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔

لیکن اس سال جامعہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اور اپنے کام کا دائرہ نہ صرف جامعہ کے اندر محدود رکھا ہے بلکہ اپنے گرد وپیش کے انسانوں کی خدمت اور ہمدردی بھی اس نے اپنے ذمہ لی ہے، بعض حضرات کی تحریک سے یہ طے پایا ہے کہ خدمت خلق و رفاہ عام کے اس قسم کے کام بھی کافی نہیں کہ صرف سال میں ایک دن یا دو دن کئے جائیں بلکہ انہیں مستقل اور متواتر جاری رہنا چاہئے تاکہ دوسروں کو نفع بھی پہنچے اور کرنے والوں میں اس جذبہ اور خواہش کی استقلال کے ساتھ پرورش اور نشو و نما ہو۔ چنانچہ اس غرض کے لئے جامعہ نے سردست دو کام اپنے ذمہ لئے ہیں، ایک قرول باغ میں صفائی اور حفظان صحت کا انتظام اور دوسرے بے کار مرد اور عورتوں کے لئے تھوڑی بہت معاش کا انتظام۔ اول الذکر کام تو ایک جماعت "ریٹ پیرز ایسوسی ایشن" کے نام سے انجام دے رہی ہے جس کے ناظم بھی ہماری جامعہ ہی کے ایک کارکن ہیں لیکن موخر الذکر کام کے لئے البتہ کوئی جماعت کام نہیں کر رہی تھی اور اس کے لئے طلبہ اور چند اساتذہ کی ایک جماعت تیار ہوگئی ہے جو عنقریب اس کام کو شروع کرنیوالی ہے۔ سردست معاش کا انتظام اس کے سوا اور اس سے بہتر اور کوئی دوسرا نظر میں نہیں آیا ہے کہ ان سیکڑوں بیواؤں اور غریب بوڑھیوں کو چرخہ اور روئی فراہم کیجائے اور اس کے عوض مناسب اجرت دیکر ان سے سوت لیا جائے۔ اس سوت سے اگر خود اہل بستی میں ایسے بننے والے نکل آئے تو انہی سے اجرت دیکر کپڑا تیار کرایا جائے، ورنہ فی الحال دوسری جگہ بھیجکر بنوایا جائے۔ یہ کام نہ صرف

وقت کا ایک اہم ترین کام ہے بلکہ اپنے اندر ایک مستقل اور دیرپا نفع رکھتا ہے اور اس سے علاوہ اس کے کہ ایک طرح سے ملک کے اقتصادی پروگرام کی تعمیل ہوگی. خود طلبہ میں مفلس اور نادار انسانوں کی خدمت کا جذبہ پیدا ہوگا جن کے اندر رہ کر انہیں آئندہ بہت کچھ کام کرنا ہے۔

کسی نے سچ کہا لوگ فرعون کو ناحق بدنام کرتے ہیں۔ اس میں اور ہماری سرکار میں فرق صرف یہ ہے کہ اُس غریب کو "کالج کی نہ سوجھی"، ورنہ تعلیم کا وار تلوار سے کسی طرح بھی کم کارگر نہیں ثابت ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ مقتولین تعلیم کے جان و تن کا ربط قائم ہے مگر وہ آج اپنے لئے، اپنی قوم کے لئے، اپنے دین و ایمان کے لئے بالکل مردہ ہیں۔

سمیات ذہنی کے یہ عظیم الشان معمل جو سرکاری مدارس کہلاتے ہیں اپنا کام حسن نظم و اہتمام سے کر رہے ہیں۔ اس پر ارباب نظر کو سنجیدہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ تدارک کی معقول صورتیں نکالی جاسکیں۔ ہم یہاں صرف ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو صورت حال پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے۔

محکمہ تعلیم کی جانب سے دلی کے منتظمین۔ مدارس امدادی کو ایک گشتی چٹھی کے ذریعہ دھمکی دی گئی ہے کہ اگر مدرسہ کا منیجر یا کوئی رکن مجلس انتظامیہ حکومت کے خلاف سیاسی سورشوں میں حصہ لیگا تو حسب دفعہ قانون گرانٹ ان ایڈ بلا اطلاع مدرسہ کو سرکاری امداد دینا بند کر دیا جائیگا۔ گویا سرکار کا روپیہ تعلیم کے لئے نہیں رعیت کی آزادی عمل خریدنے کے لئے ہے!

جب سے ہندوستان میں قومی تحریک کا زور ہوا ہے مدرسہ کے لڑکوں کو سیاسیات سے الگ رکھنے میں سرکار و حامیان تعلیم سرکاری نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ بلاشبہ اس معاملہ میں انکے عذر کے اندر ایک معقولیت تھی، سیاسی تحریکوں کی تخریبی ذہنیت اس سکون و اطمینان کی دشمن ہے جو نوعمر لڑکوں کی تربیت کے لئے ضروری ہے۔ اگرچہ اس اعتراض کا جواب کسی کے پاس نہیں کہ

سرکاری تعلیم بذات خود ایک مضر شے ہے جس سے اجتناب ہی کرنا بہتر ہے۔ لیکن طالب علموں سے گذر کر مدرسہ کے منیجروں اور اراکین مجالس انتظامیہ کو سیاسی تحریکوں میں شرکت سے روکنا ایسا غیر معقول اور استبدادی طرز عمل ہے جس کی ہر طرح مخالفت کرنی چاہیے۔

اسوقت کہاں ہیں وہ لوگ جو مدارس کے لئے سرکاری امداد نہ لینا حماقت تصور کرتے تھے اور جن کو سرکاری و نیم سرکاری تعلیمگاہوں کی پیدا کردہ غلامانہ ذہنیت، انکے خود غرضی و قوم فروشی سکھانیوالے ماحول، ان کی فرقہ وارانہ جذبات کو برانگیختہ کرنیوالی کتب تواریخ، انکی سطحی اور قوئ عملی کو مفلوج کرنیوالی تعلیم سے اس سوال کا جواب نہ ملتا تھا کہ "گورنمنٹ سے اپنا ہی روپیہ تعلیم کے لئے ہم کیوں نہ لیں؟" آئیں اور محکمہ تعلیم کی اس گشتی چٹھی میں اپنے سوال کا جواب لکھا ہوا دیکھ لیں۔ کیا اب بھی انہیں شبہ ہے کہ حکومت تعلیمی اداروں سے اپنا استحکام چاہتی ہے نہ کہ رعیت کا فائدہ؟

بلاشبہ بے حسوں کی تشفی اس چٹھی سے بھی نہ ہو سکے گی۔ انکے نزدیک تو یہ ایک برمحل ہدایت نامہ ہے جو تنخواہ اران حکومت کو انکے فرائض منصبی سے آگاہ کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ لیکن جن کے دلوں میں غیرت قومی ہے وہ جانتے ہیں کہ جس قانون کے ماتحت یہ چٹھی بھیجی گئی ہے اس کا وجود اور استعمال ملک کے لئے ایک اہانت آمیز چیلنج ہے جس کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ سرکاری امداد واپس کر دیجائے اور مدارس کو حکومت کے اغراض نہیں بلکہ قوم کا فائدہ مدنظر رکھکر چلایا جائے، خواہ اس کوشش میں کچھ مدرسے ٹوٹ ہی کیوں نہ جائیں۔

رسالہ ادب

"ادب" ہر حیثیت سے اسم با مسمّیٰ ہے۔ اردو ادب کی خدمت اس کا شیوہ ہے اور تہذیب و متانت اس کا شعار۔ تمام معاصرین نے اس کا شمار بہترین رسالوں میں کیا ہے۔ اور آئندہ بہت کچھ ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ دل آزاری۔ دریدہ دہنی۔ لفظی نزاع۔ جماعتی تنگ نظری۔ مذہبی تعصب اور سیاسی اختلافات کے دھبوں سے ادب کا دامن پاک ہے اس کی تنقیدیں بے لاگ ہوتی ہیں لیکن ادب کے دائرے سے خارج نہیں ہوتیں۔ ادب کسی خاص جماعت کا نقیب نہیں ہے۔ تمام ادب اہل ادب اس کی برادری میں شامل ہیں۔

"ادب" دنیا کو دکھانا چاہتا ہے کہ موجودہ صحافتی طوفان بے تمیزی میں بھی ادبی خدمات کا دامن تمام آلائشوں سے کیونکر پاک رکھا جا سکتا ہے۔ مذاق عام کی پیروی کے سائے میں پروان چڑھنا تو آسان ہے لیکن ادب کا سطح نظر اس سے بلند ہے۔ وہ مذاق عام کی اصلاح اور ادبیت و ادبی خدمات کا صحیح معیار پیش کرنا چاہتا ہے۔ کیا اردو کے بہی خواہ اس مقصد مقاصد کے حصول میں ادب کی مدد کرینگے۔

اگر آپ کو اس رسالے کی شان۔ بلند نگاہی۔ اور متانت کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے چند پرچے ملاحظہ فرمائیے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ حجم کم از کم ۷۲ صفحے۔ چندہ للعہ سالانہ ایک پرچے کی قیمت ۶ر

منیجر "ادب" متصل چوراہا یحییٰ گنج لکھنؤ

مطبوعات
ہندوستانی اکاڈمی صوبۂ متحدہ الہ آباد

۱۔ ازمنہ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات — از علامہ عبداللہ یوسف علی ایم اے۔ ایل ایل ایم

سی۔ بی۔ ای۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے غیر مجلد عہ

۲۔ اردو زبان اور ادب (یعنی زبان اور ادب کی مختصر تاریخ) از مولوی سید محمد ضامن علی صاحب ایم۔ اے۔ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ (عہ)

۳۔ عرب و ہند کے تعلقات — از مولنا سید سلیمان صاحب ندوی مجلد ۳۲۴ صفحات۔ قیمت چار روپیہ

۴۔ ناتن (جرمن ڈراما) — ترجمہ۔ مولنا محمد نعیم الرحمان صاحب ایم۔ اے۔ ایم آر۔ اے۔ ایس مجلد ۔۔۵ صفحات قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)

۵۔ فریب عمل (انگریزی ڈراما) — ترجمہ۔ بابو جگت موہن لال صاحب رواں۔ مجلد ۳۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپیہ (عہ)

زیر طبع

۱۔ قرون وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن — از رائے بہادر مہاپادھیائے پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا

۲۔ ہندی شاعری۔ از ڈاکٹر اعظم کریوی

۳۔ ترقی زراعت۔ از خانصاحب مولوی محمد عبدالقیوم صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت۔

ملنے کا پتہ: جنرل سکرٹری ہندوستانی اکاڈمی۔ یو پی۔ الہ آباد

کیا نام کہ ہم پھر آگئے

حاجی الحرمین الشریفین حاجی بلیغ العلیٰ المعروف بالمجہول بحاجی بغلول نور اللہ مرقدہٗ

کیا نام کہ

صرف تین روپے سکہ رائج الوقت چہرہ شاہی کہ نصف جس کے ایک روپیہ آٹھ آنے ہوتے ہیں، دفتر رسالہ "کامیابی" دہلی میں پہنچکر آپ پورے ایک سال تک بحساب شمسی و قمری ہر مہینہ ہماری زیارت کرسکتے ہیں۔

کہ ہم کامیابی میں ہر مہینہ اتنی "سیاحت" طبع کراکر اور چھپواکر پرنٹر اور پبلشر کیا کریں گے۔

روپئے بھیجنے کا پتہ:۔ مینیجر رسالہ "کامیابی" پوسٹ بکس نمبر ۵ دہلی

ایجنٹوں کی ضرورت ہے

جو ہمارے ہر قسم کے دیسی اور ولایتی کپڑے کے آرڈر حاصل کرسکیں۔ تنخواہ تیس روپیہ ماہوار سے سو روپیہ ماہوار تک دیجائیگی۔ ضمانت نقد مبلغ دو سو پچاس روپیہ داخل کرنا ہوگی۔ جو صاحب نقد ضمانت نہ داخل کرسکیں وہ درخواست کرنیکی زحمت نہ گوارا فرمائیں۔ جواب کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ آنا لازمی ہے۔

سنٹرل کمرشل کمپنی لائل پور (پنجاب)

رجسٹرڈ
نمبر ۱۸۹۲
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
جلد ۱۴
بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۳۰ء
نمبر ۵
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927

رجسٹرڈ
نمبر ۱۸۹۲
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
نمبر ۵
بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۳۰ء
جلد ۱۴
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی
1927

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

نمبر ۵	بابتہ ماہ مئی سنہ ۱۹۳ء	جلد ۱۴

فہرست مضامین

ہندوستان میں فن کا دورِ جدید

(۳)

بمبئی آرٹ اسکول

سرِعنوانِ بالا کے ضمن میں فن اور تنقیدِ فن کے متعلق ہم سال گذشتہ کے جون کے پرچے میں اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں یعنی یہ بتلا چکے ہیں کہ فن کا صحیح مفہوم کیا ہے اور تنقیدِ فن کا موجودہ رنگ کیا ہے۔ اور کیا ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد ماہ ستمبر کے نمبر میں ہم نے "ٹیگور اور ٹیگور کے شاگرد اور خوشہ چیں" کے عنوان ضمنی میں ہندوستان کے سربرآوردہ فنی نمائندوں کے اوپر اظہارِ رائے کیا ہے اور ضمناً انکا یورپ کے دورِ جدید کے استادانِ فن سے موازنہ بھی کیا ہے۔ مضمون کے اس تیسرے حصہ میں ہم ٹیگور کے علاوہ جو اثرات موجودہ فن پر مسلط ہیں۔ اُن پر نظر ڈالیں گے۔ افسوس اس کا ہے اور وہ بھی کم نہیں بلکہ نہایت تنگی و افلاس کے ہاتھوں ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہم جن مصوروں اور جن تصویروں کا ذکر کرتے ہیں ان کے مرقع بھی شائع کر سکیں۔ اس سے کہنے والے کی بات آدھی رہتی ہے۔ اور پڑھنے والا اگر یہ خشک بیانی جھیل بھی لے گیا تو آخر تشنہ رہتا ہے۔ بہر صورت۔

گذشتہ مضمون میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستان میں ٹیگور کا کیا عمل اور کیا اثر رہا ہے اور ان کے اثر سے گریز ہر کس و ناکس کے لئے کس درجہ دشوار ہے۔ البتہ وہ لوگ اس سے آزاد ہیں جو حکومت حال کے زیرِ سایہ فن کے یورپی نہیں بلکہ انگریزی نقطہ نظر کے حامل ہیں۔ اور جن کی تعلیم بالذات یا بالصفات انگریزی روش کے سب سے بڑے مدرسہ یعنی بمبئی آرٹ اسکول میں ہوئی ہے۔ اس رنگ کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ اس اسکول کی سالانہ نمائش میں بمبئی

کے سربرآوردہ مصوروں اور صورت تراشوں کے کارناموں کو دیکھا جائے۔ ان نمائشوں میں اگر آپ جائیں تو دیکھیں گے کہ دیواروں پر شروع سے اخیر تک بھڑیا دھسان تصویریں نہایت بے ڈھنگے پن کے ساتھ لدی ہوئی ہیں اور ان میں سے بے شمار نمونوں کے نیچے۔ خدایان ذوق کہئے یا ممتحنان فن کے مختلف الشدت نعرہ ہائے تحسین چپاں ہیں۔ کسی چٹھی پر لکھا ہے کہ "خوب" کسی پر "نہایت خوب" کسی پر "تمغہ نقرئی"، کسی پر "تمغہ طلائی"، کسی پر دو سو کا انعام سرکار کسی پر اسیقدر انعام دربار وغیرہ وغیرہ اور جس پر کچھ نہ ہو اس کو جانئے کہ امتحان میں فیل۔ پھر اس شدت رائے میں بالعموم حس بدمذاقی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ کچھ دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ تصویروں کو دیکھئے تو ان میں رنگوں کی وہ بے معنی بھرمار کہ ان میں کہیں انفرادی ذوق نگاہ کا پتہ نہیں چلتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسٹیشن پر انگلستان کے بنے جرمنی کے چھپے Visit Benares یا Visit Kashmir کے اشتہار لٹکے ہوئے ہیں۔ جس طرح ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے اسی طرح مغرب کے جہانیاں جہاں گشتوں کو پورٹ سعید کے اس طرف بس رنگ ہی رنگ کی بوچھار نظر آتی ہے اور انکے مصوروں کے یہاں سال بھر ذلوں کی ہولی رہتی ہے۔ ان کے زیر اثر ہمارے غریب ہم ملک بھی سبز سرخ کی چٹک مٹک "ڈبل میں آپ ہی آپ" بنانے لگتے ہیں یہ نہیں کہ آدمی رنگوں کے چٹخارے کا قائل نہ ہو یا اس سے منکر ہو کہ ہندوستان بلکہ سارے مشرق میں رنگوں کا نکھار خاص بات رکھتا ہے۔ لیکن رنگ صرف سطحی چیز ہے اور نیا آنیوالا ایک نئی دنیا میں صرف سطحی چیز کو دیکھتا ہے اگر خوش نیت ہے تو شوخی رنگ و بو سے محظوظ ہوگا اگر بدنیت ہے تو مس میو کیطرح مایوں میں منہ ڈالکر خود پراگندہ ہوگا اور دوسروں کو پراگندہ کریگا۔ مگر ہم تو ہندوستان میں نئے نہیں ہیں۔ ہم خدا کے بندے یہ رنگ تو پہ کیوں بھریں۔ ایک چیخ ہے کہ رنگ، رنگ، رنگ! رنگ اے جنٹا میں نہیں؟ مغل روش میں نہیں؟ راج پوت مصوری میں نہیں؟ لیکن ہمارے رنگوں کے پس پشت جو شے ہے دیکھنے والا اسکو دیکھے اور دیکھنے والا یہ دیکھے کہ ہمارے رنگ کبھی بے درد نہیں ہوتے اور انسے گہرائی پھوٹ پھوٹ کر نمایاں ہے انکے پس پشت ہم کہیں گوتم بدھ کا شدت سکون نظر آتا ہے تو کہیں نٹ راجا کے رقص کی شدت حرکت کہیں

جہانگیر کے عیش و طرب کا شدت لطف تو کہیں سرمد شہید کا شدت جذب ۔ بمبئی میں ہم کو یہ نہیں ملتا بمبئی میں ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں وہاں کے فیل، فیل اور پاس بالعموم درفیل نظر آتے ہیں ۔ "کولا کو " کی خیر اکثر تصویریں اچھی ہوتی ہیں بقول بمبئی والوں کے "چلین گا" لیکن اس سے زیادہ نہیں اور وہ بھی اس نا ہندی رنگ میں رنگے ہیں ۔ جو چند مستثنیات کو چھوڑ کر بمبئی کے بالعموم تمام مصوروں پر چھایا ہوا ہے ۔ ان مستثنیات میں ایک بہتر شخصیت ہیں " اے آرسی " لیکن وہ بمبئی اسکول کے ہاتھوں نہیں بلکہ بہت کچھ پھر ٹیگور ہی کے ہاتھوں ۔ تاہم اہی وا سی کا طرز نہایت خاص ہے ۔ انکا راستہ بنگال اسکول سے بڑی حد تک جداگانہ ہے ۔ ان کی تصویروں میں ایک بہتر تصویر ہے " بھگت ہرداس " جسکو دیکھنے سے اس دعوے کی دلیل ملتی ہے لیکن بمبئی کے خدایان فن کے منتخب ترین ہندوں میں مسٹر ٹاسکر معلوم ہوتے ہیں ۔ اس سے انکار نہیں کہ ان کو اپنے موقلم پر بہت کچھ قابو ہے اور وہ خودداری میں بھی کوشاں ہیں لیکن ایک تو ان کی یہ ہوس ان کو تباہ کرتی ہے کہ دریائے گنگا کے بہ شدت ہندی کناروں پر روم اور یونان کے سستے بے مزہ رنگ ڈھنگ پیش کریں اور دوسرے ان کی بت گری میں ان پر راوی ورما کا بدمذاق اور بے وقار رنگ حاوی ہے جو کھاتے پیتے حلوائیوں اور پان بیڑی سگریٹ والوں یا انہیں جیسی ذہنیت کے مہاراجاؤں کے مکانوں کی سجاوٹ میں صرف ہوتا ہے ۔ اس قماش کے مصوروں کی انتہا ہم کو وہاں کے دو مسلمان حضرات میں نظر آتی ہے یعنی مسٹر علی بخش اور مسٹر شریف میں جنکو معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ہندو بھائیوں کے جذبات کا نہایت وطن پرستی کے ساتھ احساس ہے اور بازار کے بھاؤ اور بکری کا نہایت صحیح اندازہ ہے ۔ مذہب نہیں لیکن ملائیت کا خطرناک جمود وہ شے ہے جو ہندوستان کے فن کو اسی طرح پامال کر رہا ہے جس طرح ہندوستان کی سیاسیات کو اور جس طرح سیاسیات میں اسی طرح فنیات میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو ہمہ وقت عوام کے رکیک احساسات پر اپنے رکیک اغراض کی پرورش کرتے رہیں گے خواہ وہ زمانہ موجودہ کے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا کر ممکن ہو یا زمانہ پارینہ کے ۔

اوپر ضمناً حلوائیوں اور پان بیڑی ۔ سگریٹ والوں کی خوش مذاقی کا ذکر آیا ہے ۔ ان

سے شکایت بیجا۔ ان کا طبقہ دنیا میں ہر جگہ رہا ہے اور رہے گا۔ ہاں رونا ہے تو اس کا کہ ہمارے یہاں ان اونچے طبقوں میں انہیں کا سا مذاق رائج ہے جو ہر ملک میں اور ہر زمانہ میں صحت مذاق کے حامل رہے ہیں اور جن کے وجود کا سچ پوچھئے تو صرف یہی ایک کفارہ رہا ہے کہ انہوں نے فنی قدروں کی رکھوالی کی ہے۔ صحیح مذاق ہمیشہ ملک رہی ہے ایک مخصوص گروہ کی جس میں ایک طرف تو فن کے برتنے والے اہل فن ہوتے تھے اور دوسری طرف اس کے سمجھنے پرکھنے اور فن سے دلچسپی رکھنے والے۔ اور یہ گروہ سرچشمہ ہوتا تھا فنی قدروں کے انعکاس کا جس سے عاری الحسن بھی ایک حد تک تر زبان ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آج ہمارے یہاں جبکہ فن کی پرانی روشیں پامال ہو چکی ہیں اور نئے سانچوں میں ڈھل رہی ہیں ہم اپنے یہاں رؤسا کے اُس طبقہ کو سر اسر ناپید پاتے ہیں۔ عام طور پر اس طبقہ کا معیار حسن محض قیمت رہ گیا ہے۔ یہ حضرات رُوس رائیس سے لے کر فورڈ کے جو پہیئے تک حسب المقدور مشینوں کے علاوہ قیمتی سے قیمتی اور ارزاں سے ارزاں یورپ کی مشینوں کا بنا ہوا کوڑہ خریدیں گے۔ لیکن خود ہندوستان کے فن اور دستکاری کے بہترین نمونہ ان کے پس پشت رہیں گے اور عام درباری اس قیمتی خرافات کو دیکھیں گے اور عش عش کرینگے۔ "جی ہاں سرکار"۔ اکثر شاید معترض ہوں کہ نہیں ہمارے یہاں ایک نئی زمین اور نیا آسمان بن رہا ہے اور ہمارے متمول طبقہ میں فنی قدر کا حس آچلا ہے۔ لیکن بمبئی کی نمائش دیکھئے تو اور دہلی کی نمائش دیکھئے تو فروخت سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر کسی کو کوئی اچھی چیز نظر آئی تو پوچھنے سے معلوم ہوا کہ کسی سیاح نے لی ہے۔ ایک ہونہار مثال ہیں حیدرآباد کے ایک نہایت درجہ فن پرور نواب جن کے یہاں مغل اور فارسی تصاویر کا نہایت بے بہا ذخیرہ موجود ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ دیکھئے تو یورپ کی بیش بہا مبتذلیات بھی نظر آئیں گی جن کو محل کی سجاوٹ میں ممتاز ترین درجہ نصیب ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے جدید اہل فن اپنی سی کر رہے ہیں اور خوب کر رہے ہیں لیکن عام بد مذاقی کا اثر یا تو یہ ہوتا ہے کہ مصور اپنی اُمنگ کا خون کر کے جس چیز کی مانگ ہے یعنی "تورے نیناستمگر جادو بھرے" بنانے لگتا ہے یا

خودکشانہ اور نخوت آگیں بے نیازی میں اپنی پناہ لیتا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ ہندوستان کے نئے اہل فن اسکول کے لڑکوں کی طرح سونے چاندی کے تمغوں کو اپنا منتہائے نظر نہ بنائیں گے اور اپنے موقلم کی ٹھوکروں سے سوتوں کو ایک دن جگائے بغیر دم نہ لیں گے۔

تصویروں کے علاوہ بمبئی میں صورت تراشی کا بھی خاصہ چرچا ہے لیکن کیا صورتوں کے ہال میں داخل ہو جئے تو ہر مورت موت سے مشابہ زندگی کی تصویر معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی انگلستان میں مادام توسو کے موم خانہ میں اچانک داخل ہو گیا ہے یا کسی عجائب خانہ کے بھس بھرے آدمیوں کی شبیہوں کے کمرہ میں۔ ان مورتوں کو غور سے دیکھکر اپنی موجودہ پستی کی انتہا معلوم ہوتی ہے اور دل کو ایک سخت ٹھیس لگتی ہے۔ یہ امر کہ آیا خدا نے انسان اور دو عالم کو بنایا ہمیشہ کے لئے فلسفیوں کی فلسفہ چینی کا مرکز رہے گا لیکن ہندوستان کے پرانے بت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس امر کے شاہد ہیں کہ انسان اگر چاہے تو ایسے خدا تراش سکتا ہے جو اپنے کو منوائے بغیر نہ رہیں اور جن کے سامنے سر نیاز کو خم سجدہ کے سوا یارا نہ ہو! ور یہ ہندوستانی جو یہ سب کچھ کر سکتے تھے اور جو پہاڑ کے پہاڑ تراشکر ان کے سینوں میں اجنٹا اور ایلورا جیسے عفریتوں کی جان ڈالنے پر قادر تھے آج اس سے زیادہ کے اہل نہیں کہ ایسے بے جان مردے بنائیں جن میں اگر زندگی کا کچھ شائبہ معلوم ہو تو اس سے زیادہ نہیں جتنا کہ بھس بھرے جانوروں کے ہیوے میں نظر آتا ہے اور انسان کو جس درجہ اپنے وطن کے قدیم صورت تراشوں کی عظمت کا احساس ہو گا اسی درجہ ان ہیولوں کو دیکھکر اپنی حقارت اور کم مایگی پر افسوس وندامت دامنگیر ہو گی۔ بمبئی کی موجودہ فن صورت تراشی کے سورما تالم، گورگاؤکر اور واک نظر آتے ہیں۔ سب کے سب ایک سے بے لطف، بے رنگ، بے کار۔ اس لحاظ سے غزنوی کو اب ہونا چاہیئے تھا کہ جب نندوانہ نامی ایک غیر پیشہ ور

صورت تراشی کے "ہندوستانی بھیا" سے البتہ اُمید کی ایک ذرا سی جھلک نظر آتی ہے۔ شکل کا انوکھا پن، اظہار کا پرتو، دستکاری کی قدرت یہ سب کچھ مگر ڈرتے ڈرتے۔ کس سے؟ نالم، گور گا ؤکر اور واگ جیسے بے بضاعت پیشہ وروں سے جن کی ملک اور "گونڈمنٹ بہادر" میں ساکھ قائم ہے۔ فن صورت تراشی کو بھی ہندوستان میں ٹیگور جیسے راہبر کی ضرورت ہے۔ اس وقت چاروں طرف دیکھئے مگر کوئی نظر نہیں آتا۔ شاید آگے چل کر کوئی اللہ کا بندہ نکلے اور ان بے رس پیشہ وروں سے نجات دلائے۔

ایک اور چیز بمبئی آرٹ اسکول کے پیرووں میں خاص طور پر نمایاں ہے یعنی پرانی مذہبی روایات کے علاوہ جو اسلاف کے تخیل خانہ سے ہر شخص کے لئے خیرات بٹتی ہیں، ان کے یہاں فطری منظروں اور شبیہوں کی بھرمار۔ نفسی عنصر ان کے عملوں میں تقریباً ناپید ہے اور جہاں کہیں اس کی کوشش کی گئی ہے نتائج نہایت ناکامیاب رہے ہیں۔ چینی مصوری کے برخلاف ہندوستانی مصوری میں فطری مناظر عام طور پر دوسرے درجہ کی چیز رہے ہیں۔ ان کی حیثیت ہمیشہ پس منظر کی رہی ہے اور اصل تصویر کا جولانگاہ نفس انسان رہا ہے یعنی اُس کے ولولے، اُس کے جذبات، اسکی اُمنگیں۔ چینیوں نے جس چیز کو دامن فطرت کے ہمہ گیر انعکاس میں ظاہر کرنا چاہا اُس کو ہندوستانیوں نے نٹ راجا کے اضطرار رقص یا بدھا کے سکون کل کی شدت میں یکجا کرنے کی کوشش کی۔ اس سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ ان میں سے ایک کی کوشش یا حاصل پر دوسرے کی کوشش یا حاصل کو فوقیت دی جائے بلکہ صرف دو مختلف انسانی صنفوں کے فنی رجحان کے اختلاف کا بیان مقصود ہے۔ لیکن آجکل کے ہندوستانی نہ منظروں کو چینی نقطۂ نظر سے بناتے ہیں نہ خود اپنے اسلاف کے صحیح معنوں میں پیرو ہو کر نفس انسان کی پرکاریوں کی صورت گری کرتے ہیں۔ اُن کے منظر نہ زمین اور آسمان کے

اوکھڑے اوکھڑے ٹکڑے ہوتے ہیں جن کو وہ اُنیسویں صدی عیسوی کی فنی روش کی چاکرانہ تقلید میں کاغذ یا کینوس کی سطح پر ریشم پشتم پیش کرتے ہیں۔ ان کے منظر سراسر محدود ہوتے ہیں، اُن میں وہ ہمہ گیریت نہیں جو چینیوں کے منظروں میں پائی جاتی ہے۔ اور ان میں وہ سطحی لطف تک نہیں پایا جاتا جو اُنیسویں صدی والوں کے عمل میں تھا کیونکہ یہ انکی فطرت پرستی سے بالکل بے واسطہ ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں محض ایک غلام قوم کا غلامانہ رنگ لئے ہوئے۔ اُس میں شخصی مشاہدہ اور دلی مجبوری کا عنصر نہیں ملتا جس کے بغیر تو بس "کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا" یعنی جسد بے جان اور مصور کی بیدادو ناداری کا فریادی۔ ہندوستان کے نورنگ اہل فن خواہ وہ ٹیگور اسکول کے دلدادہ ہوں خواہ راجپوت یا مغل اسکول کے پیرو آج سب کے سب اس نکتہ سے آشنا ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر اس قومی وجہ امتیاز میں کوشاں ہیں جس کا بیان اوپر کی سطور میں ہوا ہے۔

جہاں تک شبیہہ کشی کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم کے مصوروں کو اس موضوع سے خاص دلچسپی رہی ہے اور جائز رہی ہے لیکن ہندوستانیوں کی موجودہ شبیہہ سازی میں صرف بُھس بھری کھال والی شباہت نظر آتی ہے۔ یورپ نے بہت کچھ انیسویں صدی میں بے رس شبیہہ سازی سے اپنے کو آزاد کرلیا ہے لیکن عاری التخیل انگریز اور اُنکی ساکھ کے ماننے والے ہندوستانی ابھی تک اسی دھوکے میں مبتلا ہیں۔

رباعیات عزیز

(۱)

دل ہی نہیں وہ بات کہاں سے لاؤں عشرت کے خیالات کہاں سے لاؤں
وہ دانت ہیں موتی سے نہ وہ موئے سیاہ اب تاروں بھری رات کہاں سے لاؤں

(۲)

سب محوِ تحیر ہیں کوئی کیا بولے غنچہ کہ ہے لب بستہ زباں کیا کھولے
پرواز پہ مائل ہے چمن کا عالم جو پھول شگفتہ ہو وہ ہے پَر تولے

(۳)

پیمانہ جہاں کا حسن سے مملو ہے شاخوں میں نزاکت ہے گلوں میں بو ہے
آنکھوں میں کھُبے نہ کیوں جمالِ ہستی رنگینیِ نقشِ آفرینش تو ہے

(۴)

ہر پھول میں تیرے گلِ عارض کی مہک ہر نور میں تیرے رُخِ روشن کی چمک
میرے دلِ تاریک کو بھی چمکا دے روشنگرِ جاں انجمن افروزِ فلک

سیاسیات پر چند عربی تصانیف

ہرچند سیاسیات صدیوں سے ایک مستقل علم کی صورت اختیار کر چکی ہے، ہندوستان میں کم لوگ اس علم سے واقف ہیں، یہ ایک حد تک تو نتیجہ خود اپنی بے پروائی کا ہے، لیکن اس کی زیادہ تر ذمہ داری ہماری علم پرور سرکار پر عائد ہوتی ہے جس نے شاید کسی اندیشہ سے سیاسیات کو اپنے نصاب تعلیم میں ابتک سرے سے جگہ ہی نہیں دی تھی۔ تاہم خطاکار ہندوستانیوں نے اس شجر ممنوعہ کا پھل کھاکر بالآخر اس کو اپنے آپ پر حلال کرا ہی لیا۔ ادھر ملکی و بین الاقوامی سیاسیات سے تعلقات قریب تر ہو جانے کے باعث سیاسیات سے ہماری وہ بے توجہی بھی نہیں رہی۔ چنانچہ اب کم و بیش ہندوستان کے تمام مراکز علمی میں یہ علم دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ہے اور ایک محدود دائرہ کے اندر فلسفہ سیاست کے مسائل و نظریات پر مباحثے بھی شروع ہو گئے ہیں۔

مسلمان اس دعوے کی بنا پر، کہ اسلام ایک مکمل مذہب ہونے کی حیثیت سے اپنا مخصوص سیاسی نظام بھی رکھتا ہے، سیاسی عقائد کو مذہبی لباس میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اختلاف خیال ہر معاملہ میں اسی قدر ہے جتنا کہ ممکن ہے۔ مثلاً ہندوستانی خلافتیوں کے نزدیک ساری دنیا کے مسلمانوں کا ایک سیاسی نظام کے ماتحت آنا انکی بقاء حیات کے لئے ضروری ہے اور انکے فرائض دینی میں داخل۔ ترک اسے نہ تو عملاً ممکن سمجھتے ہیں نہ مصلحتہً و مذہباً ضروری۔ کوئی کہتا ہے اسلام "ملوکیت" کو مٹانے آیا ہے۔ کوئی "دوں فطرت" جمہور سے "متاع معنی بیگانہ" کی تلاش عبث سمجھکر مشورہ دیتا ہے کہ ؎

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو   کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

کوئی اجتماعیت کا حامی ہو کوئی انفرادیت کا موید و قس علیٰ ہذا۔ ان اختلافات کو دیکھکر طبیعت قدرۃً اصلی ماخذوں سے براہ راست حقیقت معلوم کرنے کیلئے فکرمند ہوتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ابھی تک کوئی ایسی کتاب تصنیف نہیں ہوئی ہے جو اسلامی سیاسی نظریات کو ہمارے سامنے مرتب صورت میں پیش کرے۔ یہ ایک ایسی کمی ہے جس کا احساس سیاسی بحثوں کی اہمیت کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتا جارہا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ جلد ہی اگر محض اپنے ذوق علمی سے نہیں، تو ضرورت سے مجبور ہوکر ہمیں یہ کمی پوری کرنی پڑے گی۔

اس موضوع سے متعلق پرانی تصانیف کا جن میں بہت بڑی تعداد قلمی کتب کی ہوگی، علم اور انکی فراہمی، مولف کی سب سے پہلی اور غالباً سب سے بڑی مشکل ہوگی۔ کیونکہ یہ سب یکجا نہیں مل سکتیں انکے لئے یورپ، مصر، عرب اور ہندوستان کے کتب خانوں کی تلاشی لینی پڑے گی۔

ظاہر ہے کہ اسلام کا نظریہ سیاسی معلوم کرنے کے لئے تو قرآن اور حدیث ہی سب سے معتبر ماخذ ہیں لیکن دنیاوی سیاست کی ضرورتوں نے اصلی تعلیم کی تعبیر مختلف اوقات میں مختلف کی ہو اس لئے جو شخص اسلامی نظریات سیاسی کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس بارہ میں فقہ کے مختلف مذاہب کی تعلیم کے علاوہ ان تصانیف کو بھی پیش نظر رکھے جو مختلف زمانوں میں سیاست یا اخلاق پر لکھی گئیں۔ ذیل میں ہم چند عربی کتب کی فہرست درج کرتے ہیں جن کا تعلق سیاسیات سے ہو۔

یہاں یہ ذکر کردینا ضروری ہے کہ قدیم مسلمان مصنفوں نے اکثر سیاسیات کو اخلاقیات و فقہ وغیرہ کے ضمن میں جگہہ دی ہے۔ اس لئے ان مضامین پر جو کتابیں ہیں وہ کلام مجید، احادیث شریفہ اور کتب تواریخ کے علاوہ بہت کچھ معلومات کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ فہرست میں جابجا آپ کو دوسرے مضامین کی کتابیں ملیں گی جن کو اس لئے درج کردیا گیا ہے کہ بالواسطہ وہ سیاسیات سے بھی تعلق رکھتی ہیں۔

ہر کتاب کے ساتھ فہرست میں حتی الامکان اس کتب خانہ کا پتہ بھی لکھدینے کی کوشش

کی گئی ہے جہاں وہ موجود ہے لیکن کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جن کا نام مصنف کے حال کے ساتھ تو معلوم ہے مگر یہ نہیں معلوم کہ وہ کہیں موجود ہیں یا ضائع ہوگئیں۔ تاہم احتیاطاً انکا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ شاید کسی اللہ کے بندے کو انکا سراغ لگانیکی توفیق ہو۔ اسی مصلحت سے ان مصنفین کے نام اور حالات بھی درج کردئے گئے ہیں جن کی بابت معلوم ہے کہ انہوں نے سیاسیات پر کوئی کتاب تصنیف کی تھی لیکن نہ تو کہیں تصنیف کا نام ملتا ہے نہ پتہ۔ (عبد القادر)

۱۔ کتاب الخراج۔ مصنفہ ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم بن حبیب الکوفی الانصاری کوفہ میں پیدا ہوئے سال پیدایش ۱۱۳ھ/۷۳۱ء ہے اور سال وفات ۱۸۲ھ/۷۹۵ء۔ مصنف کے شاگرد محمد بن الحسن الشیبانی نے مذکورہ کتاب مرتب کی۔ ۱۳۰۲ھ میں بلاق میں چھپ گئی ہے۔

۲۔ کتاب الخراج۔ مصنفہ یحییٰ بن آدم بن سلیمان۔ کسی فقہی مذہب سے تعلق نہ رکھتا تھا ۲۰۳ھ/۸۱۸ء میں انتقال کیا

۳۔ ترجمہ خطوط ارسطو بنام سکندر۔ مترجم ابو العلی سالم کاتب ہشام بن عبد الملک تھا۔ اسکا زمانہ حیات ۱۲۵ھ/۷۴۲ء کے حدود میں سمجھا جاتا ہے۔ کتاب کوئی سو ورق کی تھی۔

۴۔ کتاب سلوک المالک فی تدبیر الممالک۔ مصنفہ شہاب الدین احمد بن محمد بن ابی الربیع۔ خلیفہ معتصم (۲۱۸ھ/۸۳۳ء - ۲۲۷ھ/۸۴۲ء) کے لئے لکھی گئی۔ یہ شاید سب سے پرانی اسلامی کتاب ہے جو فلسفہ و سیاست کے موضوع پر آج کل موجود ہے۔ پیرس کے قومی کتب خانہ میں ہے۔ ۱۲۸۶ھ میں قاہرہ میں چھپ بھی گئی ہے۔

۵۔ کتاب الخراج مصنفہ قدامہ بن جعفر۔ یہ ۲۹۰ھ/۹۰۲ء کے حدود میں زندہ تھا۔ پہلے عیسائی تھا پھر خلیفہ مکتفی باللہ کے سامنے اسلام قبول کیا۔

۶۔ کتاب السیاست۔ مصنفہ قدامہ بن جعفر

۷۔ کتاب السیاست کبیر۔ مصنفہ ابو زید بلخی فلسفی معتزلی متوفی ۳۲۲ھ۔

۸۔ کتاب السیاست صغیر۔ مصنفہ ابو زید بلخی۔

۹۔ کتاب ادب السلطان والرعیۃ۔ مصنفہ ابو زید بلخی

۱۰۔ مکارم الاخلاق ۔ مصنفہ ابن جعفر الخرائطی متوفی ۳۲۷ھ

۱۱۔ کتاب الالفاظ الافلاطونیہ وتقویم السیاستہ الملوکیہ والاخلاق ۔ از ابو نصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی متوفی ۳۳۹ھ ۔ یہ کتاب کتبخانہ ایاصوفیہ استنبول میں موجود ہے ۔

۱۲۔ تلخیص نوامیس افلاطون ۔ از ابو نصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی لائڈن میں موجود ہے ۔

۱۳۔ التنبیہ علی سبیل السعادۃ (یا "رسالۃ السعادۃ") از ابو نصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی ۔ یہ کتاب برلن میں بھی ہے اور برٹش میوزیم میں بھی ۔

۱۴۔ کتاب سیاستہ المدنیہ ۔ مصنفہ ابو نصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی ۔ یہ کتاب برٹش میوزیم اور لائڈن کے کتب خانہ میں موجود ہے ۔

۱۵۔ کتاب فی مبادی آراء اہل المدینۃ الفاضلہ ۔ مصنفہ ابو نصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی ۔

۱۶۔ کتاب الملۃ الفاضلہ مصنفہ ابو نصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی ۔ لائڈن میں موجود ہے ۔ بلا نام سرورق ہے ۔ فہرست میں اندراج کی غلطی ہوئی ہے ۔

۱۷۔ فصول ۔ مصنفہ ابو نصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی ۔ کتب خانہ بوڈلین اکسفورڈ میں موجود ہے ۔

۱۸۔ جوامع السیر المرضیۃ فی اقتناء الفضائل الانسیتہ ۔ مصنفہ ابو نصر محمد الفارابی ۔ لائڈن میں موجود ہے ۔

۱۹۔ کتاب ۔ از امام فخر الدین بن الخطیب الرازی

۲۰۔ تصانیف قاسم ابن اصبغ بن یوسف متوفی ۳۴۰ھ اس کی تصانیف کا پتہ نہیں ۔ لیکن یہ اپنے دور کا فلسفہ اخلاق و سیاست کا سب سے بڑا مصنف ہے ۔ ولید بن عبد الملک کا مولیٰ تھا اور شہزادوں کا معلم ۔ محدث بھی تھا ۔ ابن الفرضی کہتا ہے کہ عبد الرحمٰن بن محمد بادشاہ اندلس نے خلافت سے پہلے اس سے پڑھا ہے ۔ پھر اس کے ولیعہد حاکم اور اس کے بھائیوں نے اس سے پڑھا ۔ حکومت کے کام میں اس سے مشورے لیتے تھے ۔

۲۱۔ فن حکومت کی ایک کتاب جو عبید اللہ المعیطی نے لکھکر حاکم ثانی کے نام پر معنون کی ۔ مصنف

۳۵۰ھ/۹۶۱ء کے حدود میں زندہ تھا اور قرطبہ میں حاکم ثانی کے زمانہ ہی میں تھا جس نے اس کو اپنی مجلس شوریٰ میں داخل کر لیا تھا۔ کتاب کا پتہ نہیں۔

۲۲۔ ابو محمد عبداللہ الغنی بن سعد بن علی بن بشر بن مروان بن عبدالعزیز متوفی ۴۰۹ھ/۱۰۱۸ء نے بھی کچھ سیاسیات کے موضوع پر لکھا ہے لیکن اسکی کسی تصنیف کا نام یا پتہ نہیں معلوم۔

۲۳۔ سیاست ملکی اور اصول حکومت پر دو کتابیں احمد ابن عبدالملک ابن ہشام متوفی ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء نے لکھکر حاکم ثانی کی خدمت میں پیش کیں ایک کتاب کا نام شاید "کتاب الاستیعاب" تھا۔ جس کی تیاری میں مصنف کو عبیداللہ المغیطی نے بھی مدد دی تھی۔ اس کو دیکھکر حاکم ثانی نے دونوں کو اپنی مجلس شوریٰ میں داخل کر لیا تھا۔ احمد ابن عبدالملک کی کسی کتاب کا پتہ نہیں۔ Casirius کا قول ہے کہ احمد ابن عبدالملک نے سنہ ۴ھ میں انتقال کیا۔ یہ اشبیلیہ کا رہنے والا تھا۔

۲۴۔ کتاب البر والاثم مصنفہ ابی علی بن سینا۔ مصنف کا سال پیدائش ۳۷۰ھ/۹۸۰ء ہے اور وفات ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء ہے

۲۵۔ نصیحۃ الملوک مصنفہ الغزالی۔ یہ ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں پیدا ہوئے اور ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء میں فوت ہوئے

۲۶۔ کتاب الاحکام السلطانیہ (والولایات الدینیہ) مصنفہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی یہ شافعی المذہب تھا۔ بصرہ اور بغداد میں تعلیم پائی۔ استوی میں (نیشاپور کے قریب) عرصہ تک قاضی رہا۔ پھر مستقل طور سے بغداد میں سکونت اختیار کر لی۔ اپنی زندگی میں اس نے اپنی کتابیں شائع نہیں کیں۔ ۸۶ سال کی عمر پا کر ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں انتقال کیا۔

۲۷۔ کتاب نصیحۃ الملوک۔ مصنفہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی۔ پیرس میں موجود ہے۔

۲۰۔ کتاب قوانین الوزراء۔ مصنفہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی۔ کتب خانہ شاہی شہر وین اسٹریا میں موجود ہے۔

۲۹۔ کتاب تحصیل النذر وتعجیل الظفر۔ مصنفہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی۔ غالباً ۱۸۷۶ء میں چھپ چکی ہے۔ گوتھا میں موجود ہے۔

۳۰- کتاب آداب الدنیا والدین۔ مصنفہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی قسطنطیہ میں ۱۲۹۹ھ میں چھپی اور قاہرہ میں ۱۳۰۹ھ و ۱۳۱۰ھ میں چھپی۔

۳۱- سراج الملوک۔ مصنفہ ابوبکر محمد بن الولید بن محمد بن خلف الطرطوشی اندلسی ۴۵۱ھ ۱۰۵۹ء میں پیدا ہوا۔ اور ۵۲۰ھ ۱۱۲۶ء میں انتقال کیا۔ کتاب ۱۲۸۹ھ میں قاہرہ یا بقول صاحب اکتفاء القنوع اسکندریہ میں چھپ چکی ہے۔

۳۲- سلوان المطاع فی عدوان الطباع۔ مصنفہ محمد بن محمد بن ظفر الصقلی متوفی ۵۶۵ھ ۱۱۶۹ء تونس میں ۱۲۷۹ھ میں چھپی۔ فلورنزا میں ۱۸۵۱ء میں۔ اماری نے اسکا اطالوی میں ترجمہ کیا ہے۔

۳۳- النہج المسلوک فی سیاستہ الملوک۔ یہ کتاب عبدالرحمٰن بن نصر بن عبداللہ نے سلطان صلاح الدین کے لئے لکھی۔ بلاق سے ۱۸۴۱ء میں چھپکر شائع ہو چکی ہے۔

۳۴- الشہب اللامعہ فی السیاستہ النافعہ۔ مصنفہ ابوالقاسم بن رضوان ۸۰۰ھ کے بعد لکھی گئی۔ لائڈن اور بوڈلین (اکسفورڈ) کے کتبخانوں میں ہے۔

۳۵- کتاب قوانین الدداوین اس کتاب کا مصنف الوالمکارم اسعد بن الخطیر بن المماتی ہے۔ جو سلطان صلاح الدین کے زمانہ میں عیسائی سے مسلمان ہوا اور وزیر جنگ مقرر کیا گیا۔ بعدہٗ وزیر ابن شکر کے ڈر سے حلب بھاگ گیا اور وہاں ۶۰۶ھ ۱۲۰۹ء میں انتقال کیا۔ کتاب ۱۲۹۹ھ میں قاہرہ سے چھپکر شائع ہو چکی ہے۔

۳۶- کتاب ادب الوزراء۔ احمد بن جعفر بن شاذان نے ناصر لدین اللہ المتوفی ۶۲۲ھ ۱۲۲۵ء کے زمانہ میں لکھی۔ کتبخانہ لائڈن میں موجود ہے۔

۳۷- العقد الفرید للملک السعید۔ مصنفہ کمال الدین ابو سالم محمد بن طلحہ بن محمد بن الحسن القرشی العدوی یہ سلطان الملک السعید نجم الدین غازی کا وزیر تھا ۵۸۲ھ ۱۱۸۶ء میں پیدا ہوا اور ۶۵۲ھ ۱۲۵۴ء میں انتقال کیا۔ کتاب قاہرہ سے ۱۲۸۳ھ میں چھپکر شائع ہو چکی ہے۔

۳۸- بذل النصائح الشرعیہ فی ما علی السلطان وولاۃ الامور وسائر الرعیۃ۔ مصنفہ نجم الدین احمد

بن محمد بن علی بن الرفعہ المصری الشافعی۔ یہ قاہرہ میں محتسب اور قائم مقام قاضی تھا۔ کتاب گوتھا میں موجود ہے۔

۳۹۔ الفراسۃ لاجل السیاستہ مصنفہ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی طالب الانصاری الصوفی الدمشقی شامی متوفی ۷۲۷ھ/۱۳۲۷ء پیرس کے کتبخانہ میں موجود ہے۔ قاہرہ میں بھی ہے۔ لیکن یہاں اسکا نام "السیاستہ فی علم الفراسۃ" درج ہے۔

۴۰۔ سیاستہ الامراء ولاۃ الجنود والمتضمن ثلاثۃ عہود۔ یہ کتاب ابراہیم بن عبدالواحد بن ابی النور نے متوکل علی اللہ حفصی (۸۱۰ھ/۱۴۰۸ء تا ۸۴۴ھ/۱۴۴۰ء) کے لئے لکھی۔ اسکوریال میں موجود ہے۔

۴۱۔ الطرق الحکمیہ فی السیاستہ الشرعیہ مصنفہ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر بن ایوب بن قیم الجوزیہ الزرعی الدمشقی الحنبلی۔ یہ ۶۹۱ھ/۱۲۹۲ء میں دمشق میں پیدا ہوا۔ ابن تیمیہ کا خاص شاگرد تھا۔ اور اسکے ساتھ قاہرہ میں قید ہوا۔ ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء میں انتقال کیا۔ کتاب قاہرہ اور کتب خانہ رفاعیہ میں موجود ہے۔

۴۲۔ منہاج الوزراء فی النصیحۃ۔ مصنف احمد بن محمود الجیلی الاصفہابادی ۷۲۹ھ/۱۳۲۹ء میں لکھی گئی۔ کتب خانہ ایاصوفیہ میں ہے۔

۴۳۔ تبصرۃ الحکام فی اصول الاقضیہ ومناہج الاحکام مصنفہ ابراہیم بن علی بن محمد بن فرحون المالکی الیعمری الاندلسی یہ مدینہ میں پیدا ہوا اور عہدہ قضاۃ پر مامور ہوا۔ ۷۹۹ھ/۱۳۹۷ء میں انتقال کیا۔ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ کتب خانہ لائڈن و برٹش میوزیم میں اس کے نسخے موجود ہیں۔ قاہرہ میں چھپ بھی چکی ہے۔

۴۴۔ تاج السعادۃ فی النصیحۃ الملکیہ مصنفہ محمد بن الکاشغری۔ ۷۶۴ھ/۱۳۶۲ء میں لکھی گئی۔ کتب خانہ ایاصوفیہ میں ہے۔

۴۵۔ واسطۃ السلوک فی سیاستہ الملوک۔ یہ کتاب دولت زیانیہ کے سلطان ابوحمو موسیٰ ثانی بن یوسف بن زیان العبدادی نے لکھی جو تلمسان المغرب کا۔ (۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء تا ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء) حکمران

رہا۔ خاندان زیانیہ کی حکومت ۶۵۳ھ سے لیکر ۹۰۰ھ تک رہی۔ سلطان موسیٰ ثانی کا کاتب (سکرٹری) علامہ ابن خلدون کا بھائی تھا۔ کتاب تونس میں ۱۲۷۹ھ میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

۴۶۔ الدرہ الغزار فی نصائح الملوک والوزراء۔ مصنفہ محمود بن اسمٰعیل الجیزی۔ سال تصنیف ۸۴۵ھ / ۱۴۴۱ء ہے۔ کتبخانہ رفاعیہ میں موجود ہے۔

۴۷۔ بذل النصائح الشرعیہ فی ما علی السلطان وولاۃ الامور وسائر الرعیہ۔ مصنفہ محمد المقدسی محب الدین ابو الحامد۔ یہ کتاب نجم الدین احمد کی کتاب کے اتباع میں لکھی گئی جو اسی نام کی ہے اور اسی فہرست میں درج کیجا چکی ہے۔ ۸۶۳ھ / ۱۴۵۸ء میں تصنیف ہوئی۔ برلن میں موجود ہے۔

۴۸۔ کوکب الملک وموکب الترک، اس کتاب میں اخلاق سلطانی سے بحث کی گئی ہے جہاں شاہ بن قرہ یوسف کے عہد حکومت (۸۴۱ھ / ۱۴۳۷ء تا ۸۷۲ھ / ۱۴۶۷ء) میں لکھی گئی۔ مصنف کا نام نہیں معلوم گوتھا میں موجود ہے۔

۴۹۔ البرہان فی فضل السلطان۔ مصنفہ احمد توغان المحمدی الاشرفی الحنفی۔ شہاب الدین۔ یہ ۸۷۵ھ / ۱۴۷۰ء کے حدود میں زندہ تھا۔ کتاب برلن میں موجود ہے

۵۰۔ منہاج السلوک فی سیرۃ الملوک مصنفہ احمد توغان۔ کتب خانہ اباصوفیہ میں ہے۔

۵۱۔ المقدمۃ السلطانیہ فی السیاسۃ الشرعیہ مصنفہ احمد توغان۔ کتاب قاہرہ میں موجود ہے۔ اور اس کا تتمہ برلن میں ہے۔

۵۲۔ الابریز المسبوک فی کیفیت آداب الملوک۔ یہ کتاب محمد بن علی بن محمد بن قاسم بن الارزق الاصبحی نے ۸۹۵ھ / ۱۴۸۹ء میں وادی آش ( ) میں لکھی

۵۳۔ ہدیۃ العبد القاصر الی ملک الناصر۔ مصنفہ عبد الصمد بن یحییٰ بن احمد بن یحیی الصالحی۔ یہ کتاب تقریباً ۹۰۲ھ / ۱۴۹۶ء میں لکھی گئی۔

۵۴ - لطائف الاذکار و کاشف الاسرار - مصنفہ قاضی حسین بن حسن السمرقندی - یہ کتاب جس کا پہلا حصہ "فی احکام السیاسۃ" ہے وزیر ابراہیم پاشا کے لئے لکھی گئی - اس کے چار اور حصے ہیں - کتب خانہ وین - اسٹریا میں موجود ہے -

۵۵ - فتح الملک العالم المنان علی الملک المظفر سلیمان - مصنفہ محمد بن محمد بن سلطان الدمشقی - اس کتاب میں حکمران کے حقوق و فرائض سے بحث کی گئی ہے - ۹۶۰ھ/۱۵۵۳ء کے قریب لکھی گئی برلن میں ہے -

۵۶ - کتاب الفوز - مصنفہ ابی علی مسکویہ -

۵۷ - کتاب اخلاق الناصریہ - مصنفہ خواجہ نصیر الدین الطوسی -

۵۸ - کتاب الاخلاق الجلالیہ - مصنفہ جلال الدین محمد الدوانی -

۵۹ - رسالہ - مصنفہ مولٰنا عضد الدین - اس کتاب پر ایک شرح مصنف کے شاگرد شمس الدین الکرمانی کی لکھی ہوئی ہے اور ایک شرح طاش کوبری زادہ کی -

۶۰ - رسالہ السیاسۃ الشرعیہ مصنفہ ابراہیم بن بخشی زادہ خلیفہ متوفی ۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء کتاب برلن کے کتب خانہ میں ہے -

۶۱ - اربعون حدیثاً فی فضل السلاطین و الحکام مقسطین - مصنفہ ابو الاخلاص حسن بن عمار الوفائی الشرنبلالی الحنفی استاذ فی الازہر - متوفی ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء کتاب برلن میں ہے

۶۲ - حسن السلوک فی معرفت آداب الملک والملوک - مصنفہ احمد بن احمد الفیومی الغرقادی المالکی - یہ ۱۰۸۴ھ/۱۶۷۴ء کے حدود میں زندہ تھا - کتاب برلن میں موجود ہے -

۶۳ - کشف الاسرار العلمیہ بدار الضرب المصریہ - مصنفہ منصور بن بعرہ الذہبی الکاملی - یہ کتاب ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء میں لکھی گئی - قاہرہ میں موجود ہے -

۶۴ - رسالۃ البیان فی التمدن و اسباب العمران - مصنفہ رفیق بک ابن محمود بک العظم المتوفی بدمشق ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء یہ کتاب ۱۳۳۰ھ میں قاہرہ سے چھپکر شائع ہو چکی ہے -

۶۵- قانون العدل والانصاف للقضاء علی مشکلات الاوقاف - مصنفہ محمد قدری پاشا المتوفی ۱۳۰۳ھ
یہ کتاب مصر سے ۱۳۰۳ھ میں چھپکر شائع ہوچکی ہے۔

۶۶- الکلم الثمان - مصنفہ حسین المرصفی المتوفی بالقاہرہ ۱۳۰۶ھ - یہ کتاب امتہ، وطن، حکومت
وغیرہ وغیرہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے - قاہرہ سے ۱۲۹۸ھ میں چھپکر شائع ہوچکی ہے۔

۶۷- آداب القضاۃ للمنلی - یہ کتاب حنفی قوانین قضاۃ پر ہے قسطنطنیہ سے ۱۸۵۱ء میں چھپکر
شائع ہوچکی ہے -

۶۸- الشروط والعقود السیاسیہ بین جمہوریات ایطالیہ وسلاطین مصر فی القرون الوسطیٰ - یہ ان
معاہدوں کا مجموعہ ہے جو اٹلی کی جمہوریتوں اور مصر کے سلاطین میں ہوئے تھے - یہ مجموعہ
فلورنزا میں موجود ہے اور علامہ اماری کی ادارت میں ۱۸۶۳ء میں شائع بھی
ہوا -

۶۹- مجموعہ خطوط خلفا - مرتب کردہ ابو اسحٰق ابراہیم بن العباس کاتب، خطیب و شاعر -

۷۰- الدولۃ - مصنفہ ابن البطاح -

۷۱- الدولۃ - مصنفہ الراوندی - یہ راوندی فرقہ کے لوگوں کے ساتھ بہت رہتا تھا، اور انہیں
حکومت وسیاست کی تعلیم دیتا تھا، کتاب میں کوئی دو سو ورق ہونگے -

---

سنجیدگی کا دوسرا رُخ

ہر شخص اور ہر معاملہ اور ہر خیال اور ہر واقعہ اپنی سنجیدگی و متانت کے اندر ایک دوسرا رُخ بھی رکھتا ہے جس کی سطح کے نیچے اہلِ نظر کو تفنن و مزاح کا کبھی ہلکا اور کبھی گہرا رنگ نظر آسکتا ہے تفنن و مزاح کا صحیح مذاق رکھنے والے کسی چیز کی سنجیدگی سے اس درجہ مرعوب نہیں ہوتے کہ اُس کے دوسرے رُخ سے بے پروا ہو جائیں۔

لیجسلیٹو اسمبلی، یا جمعیت مقننہ، ملک کی سب سے بڑی قانون ساز جماعت کہی جاتی ہے یہ جماعت برطانوی دارالعلوم کی سگی تو نہیں مگر سوتیلی بیٹی ضرور ہے۔ فرق یہ ہے کہ "والدۂ محترمہ" گھر کے جزو کل کی مالک ہیں اور بیٹی ہنوز گڑیوں سے کھیل رہی ہے! کیا عجب ہے کہ عالم بلوغ میں اس بیٹی کا دور دورہ بھی ماں سے کم نہ ہو۔ بہر حال بیٹی تو اُسی ماں کی ہے اور رنگ ڈھنگ بھی وہی ہے مگر ابھی اس بیٹی نے ماں کے سب "لچھن" نہیں سیکھے ہیں۔ وہاں تو اب مزاح و تفنن اتنا گندہ ہو جاتا ہے کہ گالی گلوج اور گھونسے لات تک نوبت آجاتی ہے۔ مثلاً دارالعلوم کا تازہ واقعہ سننے کے قابل ہے۔ فوجی بجٹ پر بحث ہو رہی تھی اور ارل ونٹرٹن شب کے ۲ بجے تقریر فرما رہے تھے وہ اپنی تقریر میں سوشلسٹ ممبران کے متعلق کچھ اسقدر رعلی کٹی فرما رہے تھے کہ ان ممبران کو جنکی زبان عام طور پر بہت بے تکلف ہے، اشتعال پیدا ہوا، دوران تقریر میں کسی شخص نے ایک گوشہ سے کوئی آوازہ کسا، اس پر ارل ونٹرٹن نے فرمایا کہ یہ حضرت جنہوں نے مجھے ابھی ٹوکا ہی کچھ قابل توجہ نہیں، بس پھر کیا تھا، قوم کے نمائندوں کے بادل گرجنے لگے۔ ملاحظہ ہو:-

"ارل ونٹرنے کہا کہ میں اُن قلیل التعداد اشخاص کو قابل توجہ نہیں سمجھتا جو خود اس وجہ سے اپنے اہل ملک کی نظروں میں حقیر ہیں کہ انہوں نے جنگ یورپ میں اپنے ہی ملک کو قابل الزام ٹھہرایا۔"

یہ کہنا تھا کہ ایک طوفان برپا ہوگیا۔

"او بدتمیز بندر!" مسٹر ہیکاک نے چیخ کر کہا،

سوشلسٹ کی صفوں سے "کاذب"، اور "نامعقول" کی آوازیں ارل ونٹرٹن کا خیر مقدم کرنے لگیں اور تھوڑی دیر تک دارالعلوم میں کان پڑی آواز نہ آتی تھی۔ یہ لندن کے اخبار ایوننگ نیوز کا ذرا سا اقتباس ہے!

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا!

یہ تو بڑی میم صاحبہ کا حال ہے۔ ہندوستانی اسمبلی کی "مس بابا" کا تفنن ابھی چھوٹے چھوٹے چٹکلوں تک محدود ہے۔ اسمبلی کے گذشتہ اجلاسوں کے چند لطائف و ظرائف ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں:۔

۷۔ مارچ ۱۹۳۰ء۔ بجٹ

مسٹر کیلکر وزیر ہند کی کونسل کے ممبران کے مشاغل کا یوں ذکر فرماتے ہیں:۔

"چار بجے تک کیسے گذرے!"

گیارہ سے جب بارہ تک پہنچ گئے تو بلاسے آئے" (دفتر میں)

بارہ سے تا ایک — آئے بھی اور ناحق پچھتائے"

ایک سے دو تک — کرنا دھرنا کچھ نہیں پھر کیا کیا جائے"

بیٹھے بیٹھے دو سے تین تک کیونکر جی بہلائے "

چار بجے تک کیسے گذرے!"

(مترجم عروض سے ناواقف ہے۔ معاف فرمایا جائے)

"وزیر ہند کی کونسل میں کام کرنے کا طریقہ یہ ہے اور لوگ ہیں جو ہمارے کے بہترین نظم و نسق کے ذمہ دار ہیں"

۲۴ر فروری سنہ ۱۹۳۸ء - ریلوے بجٹ

مسٹر ایشور سرن کھڑے ہوتے ہیں۔

پریسیڈنٹ : کیا آنریبل ممبر تقریر کرنا چاہتے ہیں ؟

منشی ایشور سرن : معلوم تو کچھ ایسا ہی ہوتا ہے جناب !

پریسیڈنٹ : مجھے امید ہے کہ اس مباحثہ میں اب گرمی پیدا نہ کیجئے گا ۔ منشی ایشور سرن صاحب ۔

منشی ایشور سرن : جناب ! مجھے تعجب ہے کہ مجھ جیسے صلح پسند، غیر مضرت رساں، سرد مزاج اور ٹھنڈا دماغ رکھنے والے شخص کو کسی طرح انتہائی غیر سنجیدگی کی حالت میں بھی گرمی پیدا کرنے کا گناہگار سمجھا جائے

۲۲ر فروری سنہ ۱۹۳۶ء - ریلوے بجٹ

مسٹر آنے : جناب والا ! عام طور پر میں اس بحث میں کوئی حصہ نہ لیتا لیکن چونکہ میرے آنریبل دوست مسٹر داس نے بار بار کمیٹی کے سرکاری و غیر سرکاری ممبروں کا ذکر کیا تھا اور اب وہ تمام وقت سوتے رہے ہیں ، اس لئے مجھے اس بحث میں حصہ لینے کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ کم از کم مسٹر داس کی تقریر کے دوران میں اس مجلس کو معلوم ہے کہ میں ذرا نہیں سویا !

مسٹر جناح :- اب اس وقت تو آپ ضرور جاگ رہے ہیں !

مسٹر آنے : میں تو برابر جاگتا رہا ، یہی تو مجھے کہنا ہے ۔

۱۹ر فروری سنہ ۱۹۳۸ء - ریلوے بجٹ

پریسیڈنٹ : آنریبل ممبر کے لئے صرف ۵ منٹ اور باقی ہیں ، اس کے بعد تقریر کرنے کا کوئی

موقعہ نہ ملے گا۔

مسٹر غزنوی: جناب! آج نہیں، بلکہ جب میں تخفیف کی تجویز پیش کروں گا۔ اب میں اپنی تقریر پانچ منٹ کے اندر ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔ مگر پہلے اس سے کہ میں آگے کچھ کہوں مجھے اس امر کا اعتراف کرنا ہے کہ میری مشکل بہت بڑی ہے اور وہ مشکل میرے آنریبل دوست ممبر تجارت کے مشکلات سے ملتی جلتی ہے جو ایک ہی وقت میں دو سگی بہنوں سے ازدواجی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں!

سر پرشوتم داس ٹھاکرداس: کیا دو سگی بہنوں سے شادی کرنے کا ارادہ ہے؟

مسٹر غزنوی: یہ دو سگی بہنیں "سرکاری ریلوے" اور "کمپنی کی ریلوے" ہیں۔ مگر سر جارج کو بتا دینا چاہئے کہ اس کی بہنوں سے بہ یک وقت شادی کرنا روا نہیں ہے۔

مسٹر بی داس: مگر ابھی شادی ہوئی تو نہیں۔

ایک آنریبل ممبر:۔ شادی کب ہوئی، ابھی تو شادی کے لئے تعلقات پیدا کئے جا رہے ہیں۔

مولوی محمد یعقوب: ایک اور سارداایکٹ کیوں نہ پاس کر لیجئے!

مسٹر غزنوی: مگر آنریبل ممبر تجارت دونوں مجبوریوں سے یکساں محبت نہیں کر سکتے یہی تو دشواری ہے۔

مسٹر ودیاساگر: میرا خیال تھا کہ ممبر تجارت بجٹ میں بہت قابل غور اعداد و بیانات پیش کرینگے اور مجھے امید تھی کہ ہم کو کچھ تخفیف اور آسانی کرایہ وغیرہ میں دیجائے گی۔ لیکن پہاڑ کو دردِ زہ ہوا اور اس میں سے صرف ایک چوہا تولد ہوا۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ وہ اب ایک ایسی اسکیم پیش کرنے کی بہت کوشش کر رہے ہیں جس سے ریلوے کے ادنی ملازمین کی حالت بہتر ہو سکے۔ مجھے امید ہے کہ اس معاملہ میں ان کی کوشش اتنی مایوس کن نہ ہوگی جتنی کہ بجٹ میں ہے۔

مولوی محمد یعقوب : اب کی دفعہ بجائے چوہے کے ایک ہاتھی تولد ہوگا!

---

۱۸ فروری - بجٹ

پریسیڈنٹ : (منشی ایشور سرن سے مخاطب ہوکر) اس اس سوال کے اٹھانے سے کیا فائدہ ہے، یہ تو گویا مردہ گھوڑے کے چابک مارنا ہے۔

مسٹر گیا پرشاد سنگھ : جناب نے صحیح فرمایا، معاملہ ختم ہوچکا ہے اور اب یہ گویا مردہ گھوڑے کے چابک مارنا ہے۔ مگر اس مجلس کو احتجاج ضرور کرنا چاہیے اور اس مردہ گھوڑے کے کفن دفن کے لئے ایک پیسہ نہ دینا چاہیئے۔

---

۱۱ مارچ - بجٹ

نواب سر عبدالقیوم : کیا صوبہ سرحد کی یہ حالت ہمیشہ قائم رہے گی۔ اگر یہی صورت ہو کہ ہم وہیں رکھے جائیں گے جہاں ہیں تو پھر میرے لئے . . . . . .

مسٹر جناح : سوائے نافرمانی قانون اور کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔

سر عبدالقیوم : کوئی چارہ کار نہ ہوگا سوائے اس کے کہ میں اپنی قسمت پر لعنت بھیجوں اور جو کچھ فیصلہ ہو اس پر صبر کروں۔

سید محمد مرتضٰی : ہم جانتے ہیں کہ صوبہ سرحدی کے لوگ گورنمنٹ سے کتنی ہمدردی کی توقع کرسکتے ہیں۔ فارسی میں ایک مثل ہے کہ

پچہ زدی چچہ زدی حلوا کو ؟

گورنمنٹ کب تب ہم کو ٹالے گی۔

۱۲ر مارچ ۱۹۵۰ء - بجٹ - آمدنی پر ٹیکس

سر پرشوتم داس ٹھاکر داس : میں محسوس کرتا ہوں کہ اس تحریک پر روز دینا ہمارے لئے بہت غیر ذمہ دارانہ ہوگا

مسٹر اچاریہ : ہرگز نہیں!

سر پرشوتم داس : نہ معلوم کس نے "نہیں" کہا ؟

مسٹر اچاریا : میں نے کہا۔

سر پرشوتم داس : مجھے کچھ بھی افسوس نہیں ہو جناب کہ مسٹر اچاریا نے "نہیں" کہا۔ اس لئے کہ جنکو وہ "سرمایہ دار" کے نام سے یاد کرتے ہیں، وہی ممکن ہے انکم ٹیکس سے بچ جائیں۔ مجھے اُنکے نہیں کہنے کی زیادہ پروا نہیں مسٹر اچاریا نے سوال کیا ہے کہ کیا آسمان پھٹ پڑے گا اگر ہ فیصدی کی بجٹ میں کردی گئی۔ مسٹر اچاریا کے خیال میں آسمان تو اس وقت پھٹنے والا تھا جب سارد ابل پاس ہوا تھا! میں مسٹر اچاریا کو اُن کی منطق کے اندر چھوڑتا ہوں۔

مسٹر اچاریا: آپ کی منطق بہت غلط ہے۔

سر پرشوتم داس : آپ کی منطق سے کچھ بہتر ہے!

مسٹر اچاریا : میں آپ سے کچھ بہتر منطق کا متوقع تھا

سر پرشوتم داس : اگر آپ میری تقریر میں اس طرح دخل دیں گے تو آپ مجھ سے اسی قسم کی بات کی توقع کرسکتے جس قسم کے آپ مستحق ہیں!

۱۳ر فروری ۱۹۳۲ء - مسودہ قانون ازدواج بین الاقوامی

ڈاکٹر سہروردی : جب تک سر ہری سنگھ گور اپنی کوشش کو اس حد تک محدود رکھینگے کہ اُن کا مرتبہ آئندہ نسلوں کے لئے منو کی برابر ہو جائے اُس وقت تک ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔

مگر اُنکا حوصلہ اب اس سے بھی بہت زیادہ ہے۔ یو۔ پ سے "تازہ دم آکر اور نئے نئے خیالات لاکر جن کا ذکر منشی ایشور سرن نے کیا ہے ، اور یورپ میں میرے اور منشی ایشور سرن کے ساتھ اور کبھی کبھی تنہا آوارہ گردی کرنے کے بعد وہ شاید اب جدید خیالات کے زیر اثر ہیں اور شاید وہ اُس دن کو دیکھ رہے ہیں جب ازدواج اور تعدادِ ازدواج اور اس قسم کے تمام مسائل آزادانہ محبت اور آزادانہ خیالات کے نئے اصولوں سے حل ہو جائیں گے ۔

مولوی محمد یعقوب : سوال یہ ہے کہ آپ لندن اور پیرس کی سڑکوں پر کن اوقات میں آوارہ گردی کر رہے تھے ۔

ڈاکٹر سہروردی : میرے دوست ڈپٹی پریسیڈنٹ کو ابھی انگلینڈ یا فرانس جانے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی ہے ۔ وہاں وقت کا کوئی امتیاز نہیں ۔ عیش و عشرت اور روز روشن کی اُس دنیا میں ہر وقت شام کا وقت ہے ۔

۲۲ر جنوری سنہ ۳۳ء ۔ قانون جواز شادی آریہ سماج

مسٹر غزنوی : آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ آریہ سماجی اس قسم کے قانون کی خواہش رکھتے ہیں ؟

منشی ایشور سرن : یہ ایک معقول سوال ہے ۔ خیر غنیمت ہے کہ مسٹر غزنوی نے ایک معقول سوال تو کیا !

پنڈت مدن موہن مالویہ : یہ ایک بہت وسیع قانون ہے اور اس پر بہت زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہے ۔

سر عبدالقیوم : تو آپ کچھ دنوں کے لئے کسی آشرم میں چلے جائیے

۲۲ر جنوری ۱۹۲۹ء ۔ دودھ دینے والے جانوروں کے متعلق ریزولیوشن

پنڈت مالوی: سب سے پہلے میں اس اسمبلی کے ہر ممبر سے خواہ اُس کا عقیدہ کچھ ہو اور وہ کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اُس کی رائے میں تمام انسان گائے کے کس قدر رہین منت ہیں، میرے خیال میں اکثر ممبران، اگر سب نہیں، گائے کا دودھ صبح شام چائے کے ساتھ استعمال کرتے ہیں......

ڈاکٹر سہروردی: مہاتما گاندھی تو بکری کا دودھ پیتے ہیں!

مسٹر کلکر: بعض اصحاب کہتے ہیں کہ تمام فوج میں ہندوستانیوں کے عمل دخل کے لئے سو دو برس کی ضرورت ہے

ایک ممبر: یہ اندازہ کس قدر معتدل ہے!

مسٹر کلکر: واقعی بہت معتدل ہے! یہ کہنا کہ ہندوستان کی فوج ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دو سو تین سو برس بعد آئے گی۔ لیکن اگر دو سو برس بعد ایسا ہوگا تو میں اس وقت برطانوی حکومت سے کہوں گا......

ایک ممبر: برطانوی حکومت اتنے عرصہ بعد ہوگی کہاں!

۱۸ر مارچ ۱۹۲۹ء ۔ فوج میں ہندوستانیوں کا داخلہ

مسٹر کلکر:۔ ایک دن لائبریری میں مجھے ایک لال کتاب ملی جس میں سیکڑوں صفحات پر اُن ہندوستانی سپاہیوں کے نام تھے جنہوں نے جنگ عظیم میں ڈی۔ سی۔ کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ کسی کسی وقت پر میرا یہ جی چاہتا ہے کہ اس کتاب کو ہر اُس شخص کے سر پر پھینک کر مار دوں جو یہ کہے کہ ہندوستانی افسری کے لئے نایاب ہیں۔ لیکن میں اس موضوع کو اپنے آنریبل دوست ڈاکٹر مونجے کے لئے چھوڑتا ہوں جو زیادہ قابلیت سے اس موضوع

پر بحث کر سکیں گے .....

ایک آنریبل ممبر: لال کتاب بھی اُن ہی کو دیدیجئے!

مسٹر کلکر: میں آپ کو وہ کتاب بھی دیدوں گا وہ غالباً مجھ سے زیادہ قوت سے اس کو پھینک کر مار سکیں گے۔

یہ لطائف وظرائف گو وزن میں زیادہ نہیں، مگر مقدار میں کافی ہیں اگر کسی کو اُنکے جمع کرنیکا شوق ہو۔ خالی وقت کی تفریح بری نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ اُن احمقانہ باتوں کے بھی کچھ نمونے جمع کر لئے جائیں جو اسمبلی کے اجلاسوں میں ملک کے نمائندوں کی زبان سے ادا ہوتی ہیں تو اسمبلی کے نفسیات کا یہ ایک اچھا "مطالعہ" ہوگا۔

(باقی)

جدید علم کلام

دہلی کے موقر رسالہ کامیابی بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۰ء میں سب سے پہلے "حق پسند" صاحب کا لکھا ہوا مضمون شائع ہوا جس کا لب لباب یہ ہے کہ ماضی میں مذہب کی ضرورت تھی یا نہ تھی مگر زمانہ موجودہ میں ترقی علوم کے ساتھ عقل سلیم کی ہدایت انسان کی ترقی مدارج کے لئے کافی ہے۔ اور یا تو ہم میں مذہب کی ہدایات سے متمتع ہونیکی صلاحیت نہیں رہی ہے۔ اور یا مذہب ہمارے لئے کافی نہیں ہے۔ چند صاحبوں نے اس مضمون کے مدلل جواب بھی لکھے ہیں مگر میں نہ ان مضامین میں کچھ اضافہ کرنا چاہتا ہوں اور نہ اس بحث کو بلاوجہ طول دینا چاہتا ہوں۔ بلکہ گذشتہ چالیس برس کا جو ہم انگریزی خوانوں کے خیالات کا مجھکو ذاتی تجربہ ہے اور جس قسم کے اعتراضات میں نے اپنے انگلستان، جاپان برہما اور ہندوستان کے تبلیغی سفروں میں تعلیم یافتہ مسلمانوں سے سنے ہیں ان سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں سے اکثر کے دل میں دیانتداری کے ساتھ اسلام کی تعلیم کے متعلق اہم شکوک ہیں۔ جب سر سید مرحوم اور انکی نیک نیت پارٹی نے یورپ کی فلسفیانہ رو کا مقابلہ کرکے اسلام کو حشو و زوائد سے پاک کرنے۔ خوش عقیدتی کے خلاف عقل معتقدات کی تاویل کرنے اور گویا ایک "جدید علم کلام" تیار کرنیکی کوشش بلیغ شروع کی تو علماء اور پرانے خیال کے تعلیم یافتہ لوگوں کی طرف سے اعتراضات کی بھرمار شروع ہوگئی۔ اسی قسم کا کام مصر میں مولوی عبدہٗ اور انکے رفقا نے بھی کیا۔ مگر جہانتک مجھے معلوم ہے کوئی مستقل کتاب ہندوستان یا مصر یا اور کسی اسلامی ملک میں ایسی جامع اور مانع نہیں لکھی گئی جس سے قدیم علم کلام میں معتدبہ اضافہ ہو۔ اور اگر کوئی شخص اس کتاب کو غور سے پڑھلے تو دینداری اور معاشرت کے متعلق جو ہدایتیں یا معتقدات بادی النظر میں خلاف عقل معلوم ہوتی ہیں انکا قلع قمع ہو جائے۔ سید صاحب مرحوم اور ان کی پارٹی نے زیادہ تر حضرت

امام غزالی رح اور حضرت شاہ ولی اللہ شاہ رح کی قابل قدر تصانیف سے جا بجا تمسک اختیار کیا اور عقل اور نقل میں تطابق پیدا کرنیکی کوشش کی۔ یہ سعی مشکور ہوئی۔ اور ہم "نیچریوں" میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اصل اصول اسلام سے واقف اور اسکا ول سے احترام کرنے والے ہیں۔ مگر آخری تدوین فقہ کے ہر جزو کل کو نہیں مانتے۔ اگر یورپ وہیں رہ جاتا جہاں وہ سید صاحب کے زمانے میں تھا تو اُن کی پارٹی کا پیدا کردہ لٹریچر دائماً ابداً ہمارے لئے دلیل ہدایت رہتا۔ مگر یورپ میں مادی علوم یعنی سائنس کی ترقی مسئلہ ارتقا اور جدید نفسیات کی تحقیق و تدقیق نے بے شمار مسائل ایسے پیدا کر دئے ہیں جن کے ساتھ اسلام کی تعلیم کا تطابق یا انکی تردید ضروری ہوگئی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا میں نے اپنے رسالہ اقل قلیل اسلام میں عرض کیا تھا کہ قدیم وجدید علم کلام سے قدم آگے بڑھاکر ایک جدید ترین علم کلام مرتب کیا جائے جس میں حسب ذیل امور کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔

(الف) عام مذہبی نقطہ نظر میں ترقی اور تبدیلی یعنی ایڈیلزم کے بجائے رشنیلزم کا دخل وسعت نظر وغیرہ (ب) فلسفہ اور سائنس میں معتدبہ جدید ترقیاں۔ مسئلہ ارتقا تنازع للبقا سعی للحیات۔ (ج) جدید علم النفس اور اس کے اصول تحت ادراک۔ ادراک، فوق الادراک وغیرہ اور قدیم فلسفہ کے بعض مسلمہ کلیوں مثل قوت ارادی تاریخ روح ہے۔ فوق الادراکیات کا تعلق فلسفہ، الہیات اور عامہ روحانیات سے ہے۔ وغیرہ وغیرہ کو توڑکر ان سب کو انسان کی نارمل دماغی جولانگاہ کے حدود میں تسلیم کرنا (د) جمالیات۔ آرٹس (میوزک۔ رقص۔ نقاشی۔ بت تراشی۔ ادبیات وغیرہ کو ترقی یا زندگی کا جزلاینفک تسلیم کرنا۔

(ہ) مطالعہ مذاہب دیگر (Comparative study of Religion) کی ضرورت کو تسلیم کرکے جملہ مذاہب عالم میں سے وہ باتیں انتخاب کرنا جو بطور قدر مشترک انسانوں کے لئے مفید ہیں (ز) فلسفہ نظریات پر شاہدات کو بین ترجیح دینا۔ (ز) تصوف کو قابل توجہ تسلیم کرنا۔

(۲) جدید علم کلام کیونکر مرتب ہو۔

(الف) قدما (تا امام رازی۔ ابن تیمیہ۔ امام غزالی۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رح کے

اصولوں پر متذکرہ بالا جدید تحقیقات کی روشنی میں محققانہ اور مجددانہ تنقید کرنا۔
(ب) سرسید، مولوی عبدہٗ، مولوی شبلی۔ نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی وغیرہ کی تحقیقات پر بشرح ایضاً تنقید کرنا (ج) تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف پر بشرح ایضاً تنقید کرنا (د) نہایت دیانتداری کے ساتھ ان جملہ تحقیقات کا عطر نکالکر ایک آزاد جدید ترین علم کلام مرتب کرنا اور اسپر حقیقی اسلام کو (رواجی اسلام کو نہیں) کسنا

جس قسم کے شکوک حق پسند صاحب کے مضمون میں درج ہیں۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ اس قسم کے شکوک تعلیم یافتہ طبقہ کی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اور قطعاً ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جائیگی اور موجودہ شکوک سے بڑھکر اور نئے اہم شکوک بھی پیدا ہوں گے۔ اسکا علاج میری رائے میں صرف جستہ جستہ مضامین رسالوں میں شائع کرنے سے نہ ہوگا۔ بلکہ جلد یا بدیر ہم کو ایک جدید ترین علم کلام تیار کرنا پڑے گا۔ جیسا میں نے اپنے رسالہ اقل قلیل اسلام میں وضاحت کے ساتھ عرض کیا ہے۔ پہلے اس امر کی تنقیح کرلیجائے کہ تعلیم اسلام کا وہ حصہ جس سے کم کرنے میں مواخذہ اُخروی لازم آئے کیا ہے اور صرف اُسے فرض و واجب قرار دیا جائے۔ اس کے بعد "جتنا گڑ ڈالو اتنا میٹھا ہوگی" کی رو سے باقی سب تعلیم کو بالکل علٰحدہ کرکے دکھایا جائے اور اس دوسرے حصہ کو مسنون مستحب اور اختیاری قرار دیا جائے۔ نیز اس اختیاری تعلیم کو پبلک میں اظہار اور بحث و مباحثہ کا کفیل نہ بنایا جائے۔ ہمارا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ سنت کو جو تعلیم اسلام کا نہایت ممتاز عنصر ہے پس پشت ڈالا جائے۔ یا موجودہ نظام کو جس میں فرض واجب، سنت، مستحب سب شامل ہیں درہم برہم کردیا جائے۔ بلکہ ہمارا منشا صرف یہ ہے کہ فرض و واجب۔ اور مسنون و مستحب میں حد فاصل قرار دیجائے۔ اور امت محمدیہ کے موجودہ انتشار کو مدنظر رکھکر مسنون و مستحب کو قابل بحث مباحثہ نہ قرار دیا جائے۔ اسلام کی تعلیم میں بقولے ربنا آتنا فی الدنیا حسنتاً وَ فی الآخرۃ حسنہ۔ وقنا عذاب النار۔ نجات کی دو قسمیں قرار پاتی ہیں ایک نجات دنیوی اور دوسری نجات اخروی۔ ان دونوں کو ہم نے اپنے رسالہ اقل قلیل

میں حسب ذیل الفاظ میں عرض کیا ہے۔

نجات دنیوی۔ کا قریب قریب مفہوم یہ ہے کہ جس زمانہ میں اقوام متمدنہ کا باعتبار کثرت جو معیار تہذیب، تمدن، تعلیم، تربیت، صحت وغیرہ کا ہو اس معیار پر کم و بیش پورا اترنا۔ ہر مذہب نے اپنے وقت میں ان باتوں کا معیار مقرر کیا ہے۔ مگر کسی مذہب کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ یہ حکم دے کہ میرا مقرر کردہ معیار ان شقوں میں ابداً آباد تک بلا تغیر تبدل کے جوں کا توں قائم رہے۔ جن لوگوں نے خواہ وہ کسی مذہب کے پیرو کیوں نہ ہوں اپنی نیک نیتی سے مذہب کے ذمہ بار ڈالا ہے۔ ان کو دو باتوں کی غلط فہمی ہوئی ہے اولاً یہ کہ خداوند تعالیٰ نے دنیا اور انسان کو ترقی کن اور ترقی پذیر نہیں بنایا اور گویا جانوروں کی طرح ایک حالت پر قائم رہنے والا بنایا ہے۔ یہ بات بداہتہً غلط ہے۔ اس لئے کوئی مذہب اس بات کا دعویٰ استحقاقاً نہیں کر سکتا کہ نجات دنیوی کے بارہ میں میرے بنائے ہوئے اور بتائے ہوئے قواعد تا قیام قیامت بلا کم و کاست جاری رہیں گے۔ ثانیاً یہ کہ انسان کم و بیش ایک غیر ذمہ دار مخلوق ہے۔ انسان کا اشرف المخلوقات ہونا اس کو اعلیٰ درجہ کی ذمہ داریاں بھی تفویض کرتا ہے۔ اور کوئی تعلیم ربانی اور روحانی کہلائے جانے کی مستحق نہیں جو انسان کی واجب ذمہ داریوں کے بوجھ کو ہلکا کر دے۔ ایسا کرنا انسان کے ساتھ بھلائی کرنا نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے ان قویٰ کو شل اور رفتہ رفتہ بیکار کرنا ہوگا۔ جن کے صحیح طور پر استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ نے ان ذمہ داریوں کو باحسن وجوہ پورا کرنا فطرتاً وضع کیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے کسی شخص کو شروع ہی سے بلا اشد طبی ضرورت کے ہضم شدہ (ڈائی جسٹڈ) خوراکیں دی جائیں اگر ایسا کیا جائے تو اسکے معدہ کی قابلیت ہضم زائل ہو جائیگی قرآن کی فطری تعلیم لیس للانسان الا ما سعیٰ نے جدوجہد کی دوڑ انسان پر فرض کر دی اور یہ دوڑ انسان اسی وقت جیت سکیگا جس وقت وہ اپنے دل و دماغ۔ وقت، صحت اور مال سے صحیح طور پر کام لیکر اپنے زمانے کی اقوام متمدنہ کے اوسط معیار نجات دنیوی کو پورا کرے، یہ مراد نہیں ہے کہ ہر زمانہ میں بالکل جدا گانہ قواعد بنائے جائیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ دنیا کی روز افزوں ترقی سے غافل

نہ ہونا چاہئے بلکہ بفحوائے سارعوا الی الخیرات اس میں پورا حصہ لینا چاہئے۔
نجات اخروی، کے دو حصے ہیں، ایک اُن حقایق کا یقین کرنا (بلکہ ممکن ہو تو علم الیقین کو عین الیقین کے درجہ تک پہنچانا) جس سے مرنے کے بعد دوچار ہونا ہے۔ اصطلاح مذہب میں انکو عقائد کہتے ہیں۔ دوسرے اعمال کے ذریعہ سے وہ عام صلاحیت پیدا کرنا جس سے مادی اور روحانی دنیا میں ربط پیدا ہو سکے، انہیں عبادات کہتے ہیں، ان دونوں کو پورا کرنیکے بعد دنیا کو انسانوں کے لئے جائے راحت بنانے کے لئے ایک تیسری ایجنسی کی ضرورت ہے جسے عرف عام میں اخلاق کہتے ہیں، انہیں تینوں چیزوں کے مجموعہ کا نام اسلام ہے (ملاحظہ ہو صفحہ (۱) دیباچہ الکلام حصہ دوم مرتبہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم)
ظاہر ہے کہ نجات دنیوی کی تعلیم کا بیشتر حصہ عقل سے متعلق ہے اور زمانہ کا رنگ دیکھکر علمائے دین کو اپنے میں اس قدر وسعت نظری پیدا کرنی چاہئے کہ اس حصہ کو عقل والوں پر چھوڑ دیں یعنی اگر عقل والے اس میں تصرف کریں تو اس سے نہ چونکیں۔ لباس وضع قطع اور بہت سی ایسی ہی باتیں غالباً اسی شق کے تحت میں آئینگی۔ اسپر صبر کر لیا جائے۔ نجات آخروی کی مد میں بعد عقائد کے عبادات کا درجہ ہے۔ عبادات کی بھی میز تقسیم کر دیجائے۔ ایک لازمی عبادات۔ دوسر متعدی عبادات۔ لازمی عبادات جیسے نماز روزہ اور متعدی عبادات جیسے مدارس اور یتیم خانے وغیرہ قائم کرنے۔ نکاح بیوگان کا انتظام کرنا وغیرہ وغیرہ۔ انکے متعلق یہ اصول دل و جان سے تسلیم کر لینا چاہئے کہ لازمی عبادات متعدی عبادات سے مستغنی نہیں کرسکتیں اور دونو لازم و ملزوم ہیں۔ متعدی عبادات میں اہل عقل کے مشوروں کو تسلیم کرنا نہایت ضروری ہے۔
رہیں لازمی عبادات ان میں جو طویل نظام قائم ہے اس پر علمار کو اجتہادی نظر ڈالنی ہوگی۔ دنیا کے اور مذہبوں میں بھی عبادتیں ہیں اور مذاہب عالم یا کم از کم دنیا کے بڑے بڑے اور مشہور مذاہب کی عبادات کو سامنے رکھکر طے کیا جائے کہ اسلام کی تعلیم کا اقل اور اہل حصہ کیا ہے۔ اور اسی پر زور دینا چاہئے۔ یہ اہم کام بڑے جدید اجتہاد کا محتاج ہے۔ اس کی تفصیل ہم اسلئے

نہیں کرتے کہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ پبلک میں تفصیلات پر بحث و مباحثہ شروع ہو جائے اور امت محمدیہ کے انتشار میں اضافہ ہو۔ ایسے مسائل پر بھی غور کرنا ہے۔ جو اتفاق و اتحاد کی اہم مفید غایت کو مدنظر رکھکر اسلام میں داخل عبادت قرار دئے گئے ہیں۔ مثلاً نماز با جماعت۔ محلہ کی مسجدوں میں نماز باجماعت میں زیادہ تر غریب اور بے پڑھے لکھے مسلمان شریک ہوتے ہیں اور امیر اور تعلیم یافتہ لوگ نہیں ہوتے۔ الا ماشاء اللہ۔ اس کی وجہ یہ نہیں معلوم ہوتی کہ آخرالذکر فرقہ نماز باجماعت کا منکر ہے۔ بلکہ زیادہ تر اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے سے کم درجہ کے لوگوں کے ساتھ برابر کا میل جول رکھنا دل میں پسند نہیں کرتے خواہ زبان سے اقرار نہ کریں۔ یا یہ کہ انکے مشاغل اس کے مانع آتے ہیں۔ اس پر اور مثل اس کے بہت سی اور باتوں پر ٹھنڈے دل سے اجتہاداً غور کرنا ہے۔

۴۔ استادی مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

> "علم الکلام حقیقت میں جس چیز کا نام ہے وہ عقائد کا اثبات ہے اور علم الکلام کی تاریخ میں یہی چیز جان سخن ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کے متعلق قدما کی تصنیفات ناپید ہیں اور متاخرین کا اگرچہ دفتر بے پایاں موجود ہے لیکن وہ بالکل اس مصرع کے مصداق ہے۔ ع۔ شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا" (علم الکلام حصہ اول صفحہ ۱۴۱)

قدما کی تصنیفات ناپید ہو جانے کا اور متاخرین کے مشکل اور پیچیدہ دفتر بے پایاں کے موجود ہونیکا تو ہر اہل دل کو افسوس ہوگا۔ مگر ان دونوں باتوں سے ایک یہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے کہ علم کلام کی جدید تدوین بالکل از سر نو اور جدید اصول کے موافق شروع کیجا سکتی ہے۔ عقائد میں سب سے اہم اور گویا سنگ بنیادی توحید باری تعالیٰ ہے۔ اب قدیم علم کلام اور جدید علم کلام میں بھی بحثیں ہو سکتی ہیں کہ خدا کی وحدانیت اعدادی ہے یا نہیں۔ صفات باری تعالےٰ ذات کا عین ہیں یا غیر۔ روح فانی ہے یا باقی۔ عالم قدیم ہے یا حادث۔ دنیا ختم ہوگی

یا اسی طرح چلی جائیگی۔ انسان کو مرنے کے بعد کیا پیش آئے گا۔ حشر و نشر سمجھ میں آنے کے قابل ہو یا نہیں۔ یہ اور مثل انکے بے شمار مسائل کے مجموعے کا نام ہمارا علم کلام ہے۔ فلسفہ تو ہمیشہ سے تھا سولہویں اور سترہویں صدی میں رومن کیتھولک مذہب کے زوال اور پروٹسٹنٹ مذہب کے عروج نے یورپ میں یونانیوں کے علوم کا احیا رکیا۔ اور سائنس کی ترقی شروع ہوئی۔ ہوتے ہوتے یہانتک ہوا کہ دو نظریے جیدا در مستقل دنیا کے سامنے آگئے۔ ایک نظریہ ارتقار کا اور دوسرا قدامت عالم جو اسی کا ایک جزو ہے۔ لیپا لاپی جتنی جی چاہے کر لیجئے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں مسائل یا ان دونوں کو ملا لیجئے تو اس بڑے مسئلے ارتقار نے مذاہب عالم کے اکثر معتقدات پر کاری ضرب لگائی۔ مذہب کو بیدار کرنے کے لئے صرف یہی کافی تھا۔ مگر جدید نفسیات نے اس پر مرے پر سو دُرّے کا کام کیا۔ ان دونوں پر علیحدہ علیحدہ بحث کرنی اس مضمون کی وسعت سے باہر ہے۔ مسئلہ ارتقا نے خود فطرت میں ترقی کے اجزا شامل ہونے کا دعوے کیا۔ اور مسئلہ جدید نفسیات نے دماغ انسانی کو وہ درجہ دیا جس نے روحانی دست نگری کو جھوجرا کر دیا۔ تقدیر و توکل جیسے اہم مسائل اسلامیہ میں ان دونوں مسائل نے بہت کچھ دخل اندازی کی۔ اور جس جدید علم کلام کے تیار کرنیکی ہم رائے دے رہے ہیں اس میں سب سے پہلے انہی اہم مسائل پر بحث ہونی چاہئے۔ تقدیر اور توکل پر حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی لطیف بحثوں کے موجود ہوتے ہوئے اور کیا لکھا جا سکتا ہے۔ مگر ان کی بحثوں کا جو اصل اصول ہے اسی پر ارتقا اور نفسیات حملہ کرتی ہیں۔ اس کے بعد عبادات کا نمبر آتا ہے۔ مادی اور دماغی ترقی تو ارتقا، اور نفسیات والوں کو تسلیم ہے۔ مگر عبادات کا طویل نظام ان کی تعلیم کی روشنی میں اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر بڑی دقت یہ ہے کہ بعض عبادات فرض ہیں۔ اور ان کی جزا اور سزا عالم آخرت سے متعلق ہے۔ یہ حکمائے یورپ کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ارکان اسلام کے محاسن پر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات مثل "حجۃ اللہ البالغہ" سے بڑھ کر اور کیا کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ مگر انکی استدلالات کا اصل اصول بھی خالص روحانی بنیاد رکھتا ہے۔ مثلاً ملائے اعلیٰ وغیرہ

ارتقا اور نفسیات سرے ہی سے ان باتوں کا انکار کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں جدید علم کلام میں تو کچھ ایسا ہونا چاہیئے کہ ارتقا اور نفسیات دونوں میں وحدانیت، رسالت۔ بقائے روح، حالات حشر و نشر وغیرہ کو حلول کر دیا جائے۔ مثلاً اقرار وجود باری تعالیٰ کے ساتھ اس عقیدے کو ملا لیا جائے کہ عادت اللہ یہ ہے کہ انسانی عقل کے غیر مکمل اور ناکافی ہونے کی وجہ سے وہ اپنی مرضی اپنے برگزیدہ بندوں یعنی انبیا علیہ السلام پر ظاہر کرتا ہے۔ اور انکو دنیا کا ہادی اور پیشوا قرار دیتا ہے۔ مادہ اس معنی کر کے قدیم ہو سکتا ہے کہ ازل سے ابد تک یعنی جب سے اس کے حکم سے پیدا کیا گیا اور جب تک اسی کے حکم سے فنا ہوگا۔ اپنے میں خدا ہی کی عطا کی ہوئی ارتقائی فطرت رکھتا ہے۔ انسانوں کا فرض ہے کہ ارتقائی منازل کی چھان بین رکھیں۔ اور ان سے تمتع حاصل کریں " روح " مادے کی طرح سے عالم خلق کی شے تو ہے نہیں اسی لئے اسکا صحیح علم عقل انسانی سے ماورا ہے۔ مگر دماغ انسانی نفسیات کے اصول مثل تحت الادراک ادراک۔ فوق الادراک کے ذریعہ سے روح کے متصرف ہوئے اور اس کی قوتوں کا پتہ دیتا ہے یہ بحث یا بحثیں بڑی فاضلانہ اور عالمانہ تحقیق و تدقیق کی محتاج ہیں۔ اور کتنی ہی مشکل بھی ان کو آج نہیں تو کل، کل نہیں پرسوں ضرور طے کرنا ہوگا۔ یہ اعتراض قائم ہو سکتا ہے کہ یورپ کے معدودے چند حکما کی رائے سے یا اپنے ہاں کے ان تعلیم یافتہ لوگوں سے جو انکے پیرو ہیں مرعوب ہو کر کیوں نظام اسلام درہم برہم کیا جائے۔ مگر جب ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام خدا کا آخری مذہب سب۔ ساری دنیا کے لئے ہے۔ اور نجات دنیاوی اور اخروی کا واحد مکمل ذریعہ ہے۔ تو اس میں خوش عقیدہ اور بدعقیدہ دونوں طبقوں کے لئے مکمل ہدایتیں ہونی چاہئیں۔ خوش عقیدہ لوگوں کے لئے تو نقل جیسا قرون اولیٰ میں تھا اب بھی ہے۔ اور ہمیشہ رہیگا۔ کافی ہے مگر جس طرح فلسفہ یونان کے بغداد میں ترجمے ہونیکے بعد عقلی شکوک لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوئے اور بہی خواہان اسلام کو علم کلام ایجاد کرنا پڑا۔ اسی طرح آج بھی تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ایک ترمیم شدہ علم کلام کی ضرورت ہے۔ جو تعلیم یافتہ لوگ بجا طور پر قرآن پاک سے

زیادہ اور حدیث۔ اجماع امت اور قیاس مجتہد سے کم تمسک اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ان چاروں شقوں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ چار جماعتیں موجود نہیں ہیں مگر تین جماعتیں ضرور موجود ہیں۔ ایک جماعت اہل قرآن کی ہے۔ دوسری اہل حدیث کی۔ تیسری اہل فقہ کی۔ اگر یہ جماعتیں اپنی اپنی جگہ پر اپنی مابہ الامتیاز شقوں میں اجتہاد کریں تو کچھ نہ کچھ دال دلیا ہو ہی جائے مگر نظر بر حالات موجودہ اس کی بہت کم توقع ہے۔ اس لئے مجبور ہو کر ان نظامات سے امید باندھنے کو جی چاہتا ہے جن میں دنیوی اور دینی دونوں تعلیموں کے مرکز موجود ہیں مثلاً جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد دکن۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی۔ دار المصنفین اعظم گڈھ وغیرہ۔ چونکہ یہ اہم اور متبرک کام نہ کسی ایک فرد کا ہے نہ کسی ایک جماعت کا بلکہ سب کے ملکر کرنیکا ہے۔ اس لئے خاکسار کی تجویز ہے کہ ان تینوں انسٹی ٹیوشنوں میں سے کسی ایک کو مرکز قرار دے کر اور باقی انسٹی ٹیوشنس انکے ساتھ اشتراک عمل کرکے اس کی بنیاد ڈالیں۔ علاوہ قابل آدمیوں کی تنخواہوں کے عربی، فارسی، انگریزی وغیرہ کی بے شمار قیمتی کتابیں بھی خریدنی پڑیں گی جس کے لئے ایک معقول رقم درکار ہوگی۔ یہ رقم بجائے والیان ملک روساے عظام اور متمول تاجروں سے بطور چندہ کے طلب کرنے کے بہترین تدبیر یہ معلوم ہوتی ہے کہ زکوۃ میں سے یہ کل اخراجات اٹھائے جائیں۔

کو مکمل جانا ہے اس باب میں مابعد کی تمام تالیفیں تقلیدی ہیں نہ تحقیقی۔ ان مقلدین میں وہ مصنفین مستثنیٰ سمجھے جائیں جنہوں نے ۱۹۲۰ء کے بعد داد تحقیق دی ہو۔

راقم الحروف فی الحقیقت بہت محدود اور معمولی حرف شناسی کی قابلیت رکھتا ہے لیکن باوجود نااہلی، شوق تلاش سے مجبور ہے۔ اہل نظر کے سامنے اپنی ناچیز و ناکمل خدمت پیش کرتے وقت اس کد و کاوش میں رہتا ہے کہ حتی الوسع حد تحقیق تک پہنچنا چاہئے۔ اس بحث تحقیق میں ابتداءً اپنی پیشرو ئی سے میں بھی طابق النعل بالنعل بنا رہا مگر دل میں یہ خلش برابر جاری رہی کہ جب صوبۂ دکن میں اب سے پانسو برس پہلے کا سرمایۂ نظم دست یاب ہوتا ہے تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بکثرت نہ سہی بہ قلت ہی نثر اُردو کا کوئی نمونہ نہ ہو؟

بالآخر "جوئندہ یابندہ" یہ خلش دور ہوئی اور سلاطین بہنیہ اور اُنکے بعد عادل شاہیوں کے عہدوں کی اتنی تالیفیں نظر افروز ہوئیں جن کے سامنے یہ قیاس وہم سے زیادہ وقیع نہیں رہا کہ نثر اُردو کی پہلی تصنیف محمد شاہ کے عہد میں ہوئی ہے۔

اس سے پہلے بھی لکھ چکا ہوں، اور پھر لکھتا ہوں کہ اُن پرانی کتابوں کی زبانیں اِس زمانے کے لئے یک قلم اجنبی ہیں لیکن جب کہ گیارہویں بارہویں صدی ہجری کا یہ شعر

بامن کی بیٹی ایک موری آنکھ موں پڑی   گالی دیا و غصہ کیا اور دگر لڑی

نظم اُردو کے ضمن میں لکھا جاتا ہے تو آٹھویں، نویں صدی ہجری کی یہ عبارت نثر:۔

"حضرت اپی مبارک زبان سوں حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ تے کہے ہیں، کل اصحابان ہور خاص اصحاب مجلس میں حاضر تھے" کس زبان سے موسوم کیجائے گی۔ البتہ ان کتابوں کی طرز نگارش کے متعلق اتنا کہدینا ضروری ہے کہ ابتداءً اردو نے اپنے زمانے کی مروجہ روش کو سامنے رکھا ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ طغرا و ظہوری اور ملا نور وحید و بدر چاچ کے زمانوں میں فارسی استعارات و تلازمات کا مجموعہ رہی ہے۔ یک سطری مضمون کو نئی نئی تشبیہات اور رعایت لفظی کی پیچ در پیچ الجھنوں کے ساتھ ہزار سطروں میں ختم کیا جاتا تھا چونکہ عجمی تکلف و صناعت کو فارسی کی عذوبت

تاریخ نثر اردو

کم و بیش پانچ سو چھ سو برس سے اردو زبان کا وجود پایا جا رہا ہے مگر اس طویل مدت میں پانچ چھ کتابیں بھی ایسی نہیں ملتیں جن کے مطالعہ سے صحیح علم ہو سکے کہ کس زمانے سے اس زبان کی تصنیفات کو بین الدفتین ہونے کا موقع ملا ہے۔ زمانہ حال میں دو چار کتابیں اس خصوص میں شائع ہوئی ہیں اور ان میں تاریخی واقعات لکھے گئے ہیں جن سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ اردو نے عہد بعہد کتنی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔ لیکن ہر عہد کے ایسے مکمل و مفصل نمونے نہیں ملتے جن کو پڑھ کر ہر عہد کے اسالیب بیان کا پورا اندازہ ہو سکے۔ مجوزہ بالا عنوان ایک ایسی تالیف کا نام ہے جس میں عام تصنیف و تالیف سے لے کر اشتہارات تک کے ۱۴-۱۵۔ اصلی نمونے بشرح و بسط درج کیے گئے ہیں۔ اور وہ عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ ذیل کا انتخاب اسی مبسوط تالیف سے کیا گیا ہے۔

نثر اردو کی تصنیف کا آغاز

مسلمانوں کے اکثر تاریخی کارنامے انقلابات زمانہ کی دست برد سے دریا برد ہو گئے ہیں۔ یہ سنتے آتے ہیں کہ شاہجہاں کے عہد میں لشکری زبان کی مناسبت سے اردو بازار قائم ہوا تھا مگر اس کا کوئی اثر کسی طرح کا کارنامہ زبانی روایت کو تاریخی روایت بناتا نظر نہیں آتا۔ کاش عرب کے ایام جاہلیت کی یادداشت انساب حیوانی کی طرح اس زمانے کے افغانی و ایرانی انسان بھی ایسی روایات زبانی کو علم سینہ بہ سینہ بنا کر محفوظ کرتے آتے تو شاید آج تلاش حالات میں اتنی دقت نہ ہوتی اس عدم اعتنا اور بے پروائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ فی زماننا ہم میں سے جس کسی ایک کی محدود تحقیقات، اولیت کے شمار میں آجاتی ہے وہی مختتم تحقیقات سمجھی جاتی ہے۔

وسائل تحقیقات کی قلت سمجھئے یا اپنی غفلت، کہ اردو نثر کا پہلا مرقع کتابی شمس العلما محمد حسین آزاد نے فضلی کے ترجمہ دہ مجلس کو سمجھا ہے اور اب تک جس کسی نے اردو کی تاریخ لکھی سب نے اسی تحقیق

اور فارسی دانوں کی الفت وعادت نے مانوس بنا رکھا تھا اس لئے اس کی عام دل پسندی مسلمہ ہوگئی تھی۔ اسکے مقابل میں لاوارث اُردو کی مالِ یتیما سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی اور پھر یہ کہ اسکا سودا سات پانچ کی زبانوں سے مل کر بارہ باٹ ہورہا تھا۔ کس منہ سے فارسی کی ہمنوائی کرسکتی تھی۔ غرض کہ عہدِ قدیم کی اردو میں جابجا تلازمات ورعایات، اور استعارات کی شان تو قریب قریب وہی ہے جو اُس وقت کی فارسی میں تھی لیکن نئی اور محدود وسعت وحالت کی وجہ سے کوئی دل کشی و دل آویزی نہیں پائی جاتی۔ اور یہ بات کچھ اُسی زمانے کے لئے مخصوص نہ تھی بلکہ وہ تالیف بھی جس کو تقلید آبحیات اردو نثر کی پہلی تالیف کہا جاتا ہے اس دلچسپی سے معرا ہے حتیٰ کہ اُس کے بعد بھی فسانہ عجائب اور آرائش محفل کی طرح تمام مسجع ومقفی تصنیفیں اس وقت نامطبوع سمجھی جاتی ہیں۔ بہرحال تاریخی حیثیت سے یہاں یہ دکھانا مقصود ہے کہ جس نثر اُردو کو اب تک محمد شاہی عہد کا کارنامہ سمجھا جاتا تھا وہ فی الحقیقۃ اس سے تین سو برس پہلے سلطان فیروز شاہ (دکنی) معاصر امیر تیمور (۷۹۸ھ) کے زمانے کی یادگار ہے۔

نظم اُردو کا وجود تصانیف نثر سے قبل دکن میں پایا جاتا ہے اس لئے یہ احتمال ممکن الوقوع ہوسکتا ہے کہ اُس زمانے میں نظم کے ساتھ نثر کی کتابیں بھی لکھی گئی ہوں اور انقلابات کے طوفانوں نے انکو کہیں کا کہیں بہا دیا ہو۔ جس طرح مصنف کی زندگی کے ساتھ تصنیف کی ترمیم و اصلاح قائم رہتی ہے اسی طرح اگر ذوقِ تالیف کے ساتھ شوقِ تحقیق بھی جاری رہا تو ممکن ہے کہ آج ہم کو آبِ حیات کی تلاش کے بعد فضلی سے حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز اور شمس العشاق وغیرہم مقدم نظر آئے ہیں ہمارے بعد دوسروں کے سامنے اور نئی صورتیں رونما ہوجائیں۔

باایں ہمہ اس خصوص میں یہ اعتراف واعلان ناموزوں نہیں کہ اس وقت تک ہندوستان کے صوبجاتِ شمال ومغرب میں محمد شاہ یا عالمگیر سے پہلے کوئی نمونہ اردو نثر کا نہیں ملتا۔ فضلی جن کو آزاد نے نثر اُردو کا موئف اول کہا ہے وہ بھی دکنی تھے مگر چوں کہ ان کی کتاب ہندوستان کے اکثر صوبوں میں پہنچ گئی ہے اور اُس کی ترتیب نثر قریب قریب وہی شان رکھتی ہے جس کو

نفضلی کے بعد دوسرے اہل قلم نے بھی برقرار رکھا ہے، لہٰذا اس کو ہندوستان کی شمالی و مغربی تصانیف میں شامل کرلینا بے محل نہیں۔

نفضلی سے بیس پچیس برس پہلے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد آخر میں نارنول ضلع کرنال کے سید جعفر ایک مسوڑا اور پھکڑ شاعر گذرے ہیں، جن کے تعارف کو جب تک زٹلی سے معنون نہ کیا جائے پہچانے نہیں جاتے۔ انہوں نے بھی چند خاکے اُردو نثر کے دکھائے ہیں جو دو چار سطروں سے زیادہ نہیں لیکن وہ سب کے سب حد تہذیب سے باہر ہیں اس لئے انکا نمونہ اس کتاب میں لکھا جا سکتا ہے، نہ وہ مستقل تصنیف میں شامل ہونے کے قابل۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ وہ عبارتیں خالص اُردو میں بھی نہیں ہیں۔

شمال ہند میں اُردو زبان کیوں دیر میں مروج ہوئی

جس ملک میں متعدد صدیوں تک ملک گیری اور انقلاب سلطنت کی آندھیاں رات دن چلتی رہی ہوں وہاں امن چین کے ساتھ علمی مذاق کا چرچا اور اہل مذاق کے ہاتوں کسی نئی زبان کے سدھرنے کا سامان کیا ہو سکتا تھا۔ یہاں دہلی یا نواح دہلی کے اُن انقلابات کا تذکرہ فضول ہے جو شہاب الدین کے عہد (۵۸۹ھ / ۱۱۹۳ء) سے پہلے راجہ جد ہشٹر، راجہ جرجودھن، اور راجہ بکرماجیت یا راجہ بھگونت کی باہمی آویزشوں سے ظہور پذیر ہوئے، کیوں یہ کتاب ملکی یا سیاسی تاریخ نہیں بلکہ صرف تاریخ زبان ہے۔ تاہم اس ضمنی اشارے سے یہ نتیجہ ہمارے لئے مفید مطلب ہے کہ ہندوستان ہمیشہ سے میدان کارزار بنا رہا ہے اور مسلمانوں کی آمد سے قبل اور اُس کے بعد بھی عرصہ دراز تک یہی عالم خلفشار نظر آتا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ شہاب الدین غوری کے زمانے سے نئی زبان کے بنیادی آثار نظر آنے لگے تھے اگر اثرات کو مخالف ہوائیں منتشر نہ کرتی رہتیں، اور حضرت امیر خسرو کی پہیلیوں کے بوجھنے والے انکے اُٹھتے سپتے بھول نہ جاتے اور کم از کم ایسی طبع آزمائیوں کا سلسلہ نہ ٹوٹتا رہتا تو آج شمالی ہند میں بھی اُردو پانچ چھ سو برس کی سن رسیدہ زبان ہوتی۔ میرے خیال میں شمالی ہند کے اہل ادب کو اس زبان کی خدمت نہ کرنے کے مواقع میں بڑا حائلہ سلطان محمد تغلق کا وہ سفاکانہ حکم تھا کہ جب اُس نے

۷۳۷ھ/۱۳۳۶ء میں یہ خیال قائم کیا کہ دہلی چھوڑ کر دیوگڑھ کو دارالسلطنت بنایا جائے اور اُس کا نام دولت آباد رکھا جاے۔ چنانچہ قضائے مبرم کی طرح یہ حکم جاری ہوا اور دہلی خالی ہونا شروع ہوئی جس کی ویرانی کا یہ عالم ہوا کہ تمام درندگان صحرائی شہر کو ویران پاکر بس گئے۔ اگرچہ بظاہر اسباب اس انقلابی اثر کا پانچ برس کے بعد ردّ عمل شروع ہو گیا لیکن حقیقت میں جن پشتہا پشت کے باشندوں نے جبراً قہراً ترک سکونت کی تھی اور جو اس بعید مسافت کو طے کر چکے تھے اُن میں بالاکثر معاودت کے قابل نہیں رہے۔

خلاصہ یہ کہ اس انتقال مکانی نے احوال زبانی کو مدتوں کے لئے یکسر منتشر کر دیا۔ اِدھر شمالی ہند کی حکومت کی یہ کیفیت، اُدھر بیجاپور میں حسن گنگو نے بنیاد سلطنت قائم کرتے ہی غیر ملکی (فارسی) زبان کو دفتر سے خارج البلد کر دیا۔ یہ اتفاقی اور قدرتی اسباب بتا رہے ہیں کہ دہلی و نواح دہلی میں اُس وقت اس لئے اُردو کا بول بالا نہ ہوسکا اور جنوب ہند میں اس وجہ سے اُس کا عروج شروع ہوگیا۔

امیر خسرو کے بعد سکندر لودی کے عہد (۹۱۵ھ/۱۵۰۹ء) میں سب سے پہلے کایستوں نے فارسی زبان سیکھ کر شاہی دفتر میں نام لکھوایا۔ اسی کا اثر تھا کہ اُسی زمانے کے گرو رامانند کے چیلے کبیر داس (معاہد ۹۲۴ھ/۱۳۱۱ء) نے اپنے دوہوں اور بھجنوں میں سیکڑوں، فارسی، عربی الفاظ ملانے شروع کر دئے، لیکن اس کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ حکومت کے دباؤ سے ایسا کیا گیا، بلکہ عام استعمال ورواج اور آپس کے میل ملاپ کی وجہ سے ایسا ہونا لازمی تھا۔ ذیل کی مثالوں سے اس دعوے کا ثبوت ملتا ہے۔ کبیر کہتے ہیں:-

حد حد تو سبھی گئے بے حد گیا نہ کوے
بے حد کے میدان میں رہا کبیرا سوئے

چلتی چاکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
ان پاٹن بیچ آئے کے ثابت رہا نہ کوئے

اونچے اونچے محل بنادے گہری نیویں بھرا
چلنے کا منصوبہ ناہیں رہنے کو من کرتا

آڑے ترچھے تلک لگادے گہری مالا جپتا
ہر دے بھتیر کپٹ کترنی صاحب کیسے ملتا

باباگرونانک بھی اسی زمانے کے ایک بزرگ ہیں اُنکے کلام میں عربی فارسی کے جتنے الفاظ ملتے ہیں اس بہتات سے اُس عہد میں کہیں نہیں ملتے۔ پھر انداز بیان ایسا آسان وعام فہم کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

سانس ماس سب جیو تہارا تو ہے کھرا پیارا — نانک شاعر یوں کہت ہے سچے پروردگارا
نانک ننھا اور ہو جیسے ننھی دوب — بڑی گھاس جل جائیگی دوب خوب کی خوب

یہ بھجن اور دوہے کہنے کو بھاشا میں کہے گئے ہیں مگر انکی طرز ادا ایسی صاف ہے کہ آج کل کے معمولی اُردو خواں بھی بآسانی انکا مطلب سمجھ سکتے ہیں یہ نمونے اگرچہ نظم کے ہیں مگر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ صرف مثالیں دستیاب نہ ہونے پر یہ قیاس کرلیا جائے کہ اُس عہد میں نثر اُردو مروج نہ ہوگی۔ نظم، نثر کے مقابل میں اختصار اور دل کشی کا سامان زیادہ رکھتی ہے۔ نیز یہ کہ نومولود زبان بجز معمولی بات چیت کے اور کسی مصرف کی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اور سب پر طرہ یہ کہ اسلاف ان باتوں کو قلم بند کرنے کے عادی نہ تھے۔ ان وجوہ سے نظموں کی ہم عہد نثروں کا نہ ملنا تعجبات سے نہیں اگر اُس زمانے میں جنوب ہند کی طرح شمال ہند میں بھی معمولی سے معمولی حمایت و دستگیری کسی حکومت کی طرف سے ہو جاتی تو یقیناً حضرت امیر خسرو، کبیر داس، باباگرونانک، سورداس (معاصر ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء) اور تلسی داس (معاصر ۱۰۲۳ھ / ۱۶۱۴ء) کی فارسی آمیز بھاشا کے پہلو بہ پہلو اس نئی زبان کا دامن بھی وسعت پذیر نظر آتا۔ حکومت کی حمایت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ دکن میں وہ حضرات جو دہلی سے جاکر آباد ہوئے تھے انہوں نے ۷۲۱ھ / ۱۳۲۱ء سے ۸۲۵ھ / ۱۴۲۱ء تک ایسی متعدد نثر کی تصنیفیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جو متذکرہ بالا قیاسات کو یقینیات کا جامہ پہناتی ہیں۔

ابتدائی اردو کی کتابوں کے نام

زبان کی ابتدائی سادگی کا ایک نمونہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے مصنف و مؤلف اپنی کتابوں کے نام خالص اردو میں رکھا کرتے تھے، مثلاً "سب رس" (مولفہ ۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۴ء) اس نام میں دو لفظ ہیں اور دونوں بھاشا کی ابتدا سے اُردو کے عہد حاضر تک روزمرہ بول چال میں بکثرت شامل ہیں، مگر میرا خیال ہے کہ ان سطروں

کے پڑھنے تک بعض ناظرین کا ذہن معنی یاب نہ ہوا ہوگا۔ یہ کیا ہے؟ ہمارے پرتکلف مذاق کی سادگی اجنبیت ہے بہرحال اس کا مفہوم آج کل کے ادب لطیف میں "سراپا شیریں" سے ادا ہوسکتا ہے۔ اسی طرح "پھول بن"، ترجمہ بساتین۔ مترجمہ ابن نشاطی (١٠٦٦ھ / ١٦٦٥ء) اور من لگن مؤلفہ قاضی محمود (١١١٢ھ / ١٧٠٠ء) یہ رنگ سادگی فضلی کے زمانہ تک پایا جاتا ہے، انہوں نے بھی اپنے ترجمہ دہ مجلس کا نام کربل کتھا (کربلائی کہانی) رکھا ہے۔

موجودہ اُردو کی ابتدا

نویں اور گیارہویں صدی ہجری سے قطع نظر کرکے ترجمہ فضلی کے بعد پون صدی تک کوئی نثر کتاب شمالی ہند میں نہیں ملتی محمد شاہی زمانے میں اور اُس سے آگے پیچھے، ولی۔ حاتم۔ آرزو وغیرہ بکثرت صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں، لیکن کسی ایک نے بھی اُردو نثر کی طرف عنان توجہ نہیں پھیری، خان آرزو سے خواجہ میر حسن بلکہ انشا تک جس نے اُردو زبان یا شعر کے متعلق کوئی تذکرہ یا کوئی کتاب لکھی تو اُس کی زبان فارسی ہی رکھی۔

مغلیہ خاندان کا لب بام آفتاب (شاہ عالم) اور ٹمٹماتا ہوا چراغ سحری (سراج الدین ابوظفر) کا زمانہ ایسا گزرا ہے جس میں خال خال نثر اردو کی کتابیں تالیف ہونے لگی تھیں، اگرچہ وہ کتابیں نہ شاہی دربار سے منسوب تھیں، نہ اُنکے حکم ومنشا سے لکھی گئی تھیں (جس کا سبب اُن کی برائے نام بادشاہت کی بے اثری تھی) بااین ہمہ چونکہ قلعہ معلائے دہلی میں اُن کی محدود حکومت باقی تھی اور عموماً ہندوستان میں اُنکا نام وذکر بادشاہوں کی طرح بخلوص نیت زبانوں پر جاری تھا، اس لئے ایسی کتابوں کو جو حکومت برطانیہ کے باضابطہ احکام ونظام کے علاوہ شائع ہوئی ہیں، انہیں یادگار سلاطین مغلیہ سے منسوب کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ ایسی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں، مگر جس قدر بھی ہیں قابل افسوس ہے کہ اکثر حصہ غیر مطبوع ونامعلوم ہے۔ اور پرانے خاندانوں میں کہیں کہیں تلاش سے یہ سرمایہ مل جاتا ہے۔ جیسے کہ فضلی کی کربل کتھا یا مرزا رفیع سودا کا ترجمہ شعلہ عشق وغیرہ۔ لیکن یہ سرمایہ بھی گنج بادآورد کی طرح افسانہ ہی افسانہ ہے۔ یہی زمانہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہند مضبوط اور مستقل ہوئی اور دوسرے ملکی انتظامات کے ساتھ یہاں کی زبان

کے لئے بھی ابتدائی اور عارضی توجہ شروع کی گئی۔ انہیں توجہات کا نتیجہ ہے کہ ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۳ء میں پریم ساگر للوجی نے اور چار درویش کا اُردو ترجمہ عطا حسین تحسین نے، اور حکام وقت کے ایما سے میرامن دہلوی، رجب علی سرور اور شیر علی افسوس وغیرہم نے باغ و بہار، آرائش محفل اور اخلاق محسنی (اُردو) وغیرہ کتابیں ترجمہ و تالیف کیں، اسی سلسلے میں دوسرے اہل قلم نے بھی بطور خود اُردو نثر کا سرمایۂ تصنیف فراہم کیا۔ یہ سرمایہ نہ صرف قصوں اور کہانیوں تک محدود رہا بلکہ قواعد و لغت اور تراجم مذہبی تک وسعت دی گئی۔ مثلاً شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزندان رشید شاہ عبدالقادر اور مولانا رفیع نے قرآن پاک کے ترجمے کئے۔ ان مذہبی و اخلاقی مؤلفین و مترجمین کے علاوہ مسٹر جان گلگرسٹ اور وارن ہیسٹنگز، اور مارکوئس ولزلی وغیرہ مستشرقین و حکام بالادست نے خصوصیت سے ترقی اُردو کو ملحوظ رکھا۔ اردو کی گرم مرتبہ مسٹر جان گلگرسٹ بھی اسی زمانے (۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء) کی یادگار ہے۔ خلاصہ یہ کہ اُردو نثر کی نمایاں خدمتیں انگریزی عملداری کے قیام کے ساتھ بڑھتی رہیں ان خدمتوں اور کارروائیوں کا یہ عام اثر تھا کہ ۱۲۵۲ھ / ۱۸۳۶ء میں دہلی سے مولوی محمد باقر والد ماجد شمس العلماء آزاد نے ہفتہ وار اُردو اخبار جاری کیا۔ یہ اخبار ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء سے پہلے تک جاری رہا۔

روس میں افسانوں کا ارتقاء

فرانس کے بعد غالباً دنیا میں سب سے زیادہ مکمل، دلچسپ، اور فنی اعتبار سے بلند پایہ افسانے روس کے ہیں۔ ناول نویسی میں روس نے کسی ملک سے پیچھے رہنا گوارا نہیں کیا۔ اگر فرانس کو لے مزربل (Les Miserables) اور میدل و ماپن (Mdlle de Maupin) جیسے شاہکار پیش کرنے پر ناز ہے تو روس بھی گناہ و سزا (Crime and Punishment) اور اینا کرنینا (Anna Kernina) جیسے فقید النظیر اور عدیم المثال شاہکاروں پر بجا طور فخر کرتا ہے۔

روس میں افسانوں کی ابتدا کس طرح ہوئی، یہ تو بتانا مشکل ہے۔ لیکن منظم اور باقاعدہ مختصر افسانے انیسویں صدی میں لکھے گئے۔ یعنی یہاں بھی مختصر افسانہ نگاری اسی زمانے میں شروع ہوئی جس میں یورپ کے دوسرے ممالک یعنی آسٹریا، ہنگری، بلجیم، ہالینڈ وغیرہ میں۔ لیکن ان ممالک میں فنِ افسانہ کا ہنوز روزِ اولین ہے۔ اور روس میں یہ فن اپنے نصف النہار پر ہے۔

جب زار پطرس اعظم نے سینٹ پیٹرس برگ کو اپنا دار الخلافہ مقرر کیا تو گویا روس میں مغربیت کے لئے ایک دروازہ کھل گیا۔ اور وہ سرزمین جو تاتاریوں کے دورانِ حکومت میں مشرقیت کی آماجگہ بنی ہوئی تھی، رفتہ رفتہ مغربی تہذیب، مغربی علوم و فنون، مغربی طرزِ معاشرت، مغربی تمدن، یہاں تک کہ مغربی ادب سے آشنا ہونے لگی۔

مغربی ادب کی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ مغربی ادب کا تتبع بھی شروع ہوا۔ قدیم فرانسیسی اور جرمن شعرا کی پیروی میں لومونوسوف اور درزہافین نے (جو روسی شاعری کے ولی یا چاسر کہے جا سکتے ہیں) نظمیں لکھیں جن کا طرزِ ادا اس قدر قدامت لئے ہوئے ہے کہ جدید ناظرین کے لئے بہت کم دلچسپی کا باعث ہے۔ روسی امرا اور عمائدین اکثر اپنے لڑکوں کو تعلیم کے لئے فرانس

اور جرمنی بھیج دیتے، اور عوام الناس بے بضاعتی کے سبب مجبور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم روسی ادب کا بہت بڑا حصہ امرا کے قلم کا نتیجہ ہے۔

جب نپولین اعظم کی تیغ خارا شگاف وسطِ یورپ میں چمکی اور ساری دنیا کو خیرہ کر دیا تو روس کو بھی اپنے تحفظ کے لئے پیش قدمی کی ضرورت ہوئی۔ اور روسی جنگجو سرحدِ فرانس تک جا پہنچے یہ ایک ایسا نادر موقع تھا کہ روسی افسر، جن میں بہت سے ادیب بھی تھے، مغربی تہذیب و تمدن مغربی اثرات اور مغربی علم و عمل سے واقف ہونے کا ایک اور موقع پا گئے۔ اور تقریباً اسی زمانے میں روس کے دو نامور شاعر اور افسانہ نگار پشکن اور لرمنطوف پیدا ہوئے، جنہوں نے اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ اسی دور میں ایک اور قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ نپولین کی فتوحات اور بڑھتی ہوئی قوت کی وجہ سے یورپ کے دوسرے ممالک میں خوف اور دہشت نفرت کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ روس بھی اس اثر سے محفوظ نہ رہ سکا۔ یہاں تک کہ روس میں فرانس اور اہلِ فرانس سے اسقدر نفرت بڑھ گئی کہ فرانسیسی علم و ادب چھوڑ کر روسی ادیبوں نے جرمن اور انگریزی علم و ادب کو اپنا خضرِ راہ بنایا۔ چنانچہ پشکن اور لرمنطوف کو ہم بائرن اور اسکاٹ کے نغموں سے مخمور پاتے ہیں۔

ٹھیک اسی زمانے میں مختصر افسانہ نگاری نے روس میں جنم لیا۔ پشکن پہلا شخص ہے جس کے مختصر افسانے صحیح معنوں میں مختصر افسانے کہلانے کے مستحق ہیں لیکن قبل اس کے کہ ہم روس میں مختصر افسانے کی ارتقا پر ایک اجمالی نظر ڈالیں، یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ روس میں مختصر افسانے کی کیا صورت ہوتی تھی۔

روسی افسانے عموماً تین قسم کے ہوتے تھے:۔

(۱) رومان (Roman) یعنی طویل ناول جن کی ضخامت دو سَو صفحات سے لیکر بسا اوقات ہزار صفحات تک ہوتی تھی۔

(۲) پوویسٹ (Povyest) یعنی مختصر ناول جنکو انگریزی میں (Novellette)

کہتے ہیں۔ ان میں وہ افسانے شامل ہیں جن کی ضخامت تقریباً ۳۰ صفحات سے لیکر ۲۰۰ صفحات تک ہوتی ہے۔ یہ صنف روس میں سب سے زیادہ مقبول ہے کیونکہ نہ یہ مختصر افسانوں کی طرح اس قدر مختصر ہے کہ اس میں کرداروں کے ارتقا کی گنجائش نہ ہو اور نہ طویل ناولوں کی طرح اس قدر طویل ہے کہ پڑھنے والا تھک تھک جائے۔

(۳) رسکاز (Razskaz) یعنی مختصر کہانیاں جنکی ضخامت ۳۰ صفحات سے کم ہو۔ اور یہی وہ صنف ہے جس میں روسی ادب کے جواہر پارے سب سے زیادہ نظر آتے ہیں۔

ان تینوں اصناف افسانہ میں سے اگرچہ ہر ایک نے اپنی جگہ پر خوب ترقی کی ہے۔ مگر مختصر کہانیوں نے سب سے زیادہ اہمیت حاصل کی۔ روسی ادب کے مشہور نقاد مسٹر کامٹ کا قول ہے کہ "مختصر افسانہ ہمیشہ روسی ادب میں ایک خاص اہمیت کا حامل رہا۔ اور تقریباً تمام باکمال روسی ناول نویسوں نے اس کی طرف خاص توجہ کی"

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے ممالک کے خلاف روس میں مختصر افسانوں نے طویل افسانوں کے ساتھ جنم لیا۔ یہ خصوصیت صرف روس ہی کو حاصل ہے کہ یہاں طویل افسانے (ناول) اور مختصر افسانے ایک ساتھ پیدا ہوئے۔ اور ایک ساتھ نشو و نما پائی۔

الکزنڈر سرگیوچ پشکن (Alexander Surgeevich Pushkin) روس کا پہلا افسانہ نگار ہے۔ اگرچہ اپنے ملک میں اس کی شہرت کا اصل باعث اس کی شاعری ہے۔ اور یہ روسی زبان کا بہترین شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ تاہم بہ حیثیت ایک افسانہ نگار کے، اس کا رتبہ کچھ کم نہیں۔ اِسکا منظوم ناول "اوجینی اُونی جن" (Evgeni Onegin) اسکا بہترین شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں اس نے شاعری اور افسانے کو ترکیب دیکر ایک ایسا لطیف پیکر تیار کیا ہے، جس کی جسقدر تعریف کیجائے کم ہے۔ اس ناول کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

لیکن اس مضمون میں ہمیں اُس کی شاعری سے کوئی واسطہ نہیں صرف اُس کے افسانوی کارناموں پر ایک نظر ڈالنا ہے۔ مذکورہ بالا منظوم ناول کے علاوہ اس نے متعدد قصے نثر

میں لکھے ہیں جو اپنی دلچسپی اور دلکشی کی وجہ سے بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں ان افسانوں کا ترجمہ مسٹر ٹی کین نے کیا ہے اور بوہن لائبریری سے یہ افسانے شائع ہوئے ہیں۔

پشکن کے افسانوں میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو اُس کے ہمعصر فرانسیسی اور جرمن مصنفین میں موجود ہیں۔ سب سے زیادہ اُس پر اپنے ہمعصر ہاف مین (Hoffmann کا اثر پڑا ہے۔ اس کے قصوں میں وہی دہشت نا اجنبیت پائی جاتی ہے جو ہاف مین کا طرۂ امتیاز ہے۔ اپنے طویل افسانے "کپتان کی لڑکی" میں اُس نے ایک بڑی حد تک انگریز ناول نگار اسکاٹ (Scott) کا تتبع کیا ہے۔ افسانہ دیکھکر صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ قصہ نگار نے یہ افسانہ Rob Roy یا Ivanhoe سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ اپنے ایک اور افسانے "کفن دوز" میں وہ ہاف مین کے اس قدر قریب پہنچ گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ قصہ پشکن کا نہیں بلکہ ہاف مان کا لکھا ہوا ہے۔ اس زمانے کے مذاق کے مطابق پشکن نے ایک حد تک مافوق الفطری عناصر سے بھی اجتناب نہیں کیا۔ لیکن یہ صرف ایک حد تک ہے اور باوجودیکہ فرانس میں اس وقت فن افسانہ ارتقا کے بہت سے منازل طے کر چکا ہے تاہم پھر بھی زولا (Zola) جیسے باکمالوں نے بھی اس کو روا رکھا ہے۔

لیکن بعض لوگ حقیقی معنوں میں افسانہ نگاری کا بانی پشکن کو نہیں بلکہ گوگل (Gogol کو کہتے ہیں۔ یہ پشکن کا ہمعصر تھا۔ اس نے اکثر افسانے ہاف مین کے تتبع میں لکھے ہیں۔ اس کے قلم میں ظرافت کی جھلک جا بجا نمودار ہے۔ افسانے اکثر مذہبی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر اُن میں ظرافت نہ ہوتی تو شاید ایک خاص طبقے کے سوا مقبول نہ ہوتے بایں ہمہ اس کا شمار روس کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہے۔ مشہور روسی نا دلسٹ دوسطوئسکی کا قول ہے "ہمکو یہ عبا[1] گوگل کے ورثے میں ملی ہے۔"

[1] یعنی افسانہ نگاری

پشکن کا دوسرا اہم عصر میکائیل لرمنطوف۔ شاعری اور افسانہ نگاری دونوں میں ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ وہ فوج میں افسر تھا اور اُس کی زندگی کا بہت بڑا حصہ کوہ قاف کے گرد و نواح میں گزرا۔ ادیہیں اُسکی شاعری نے نشو و نما پائی۔ اس پر لارڈ بائرن کے کلام کا بڑا گہرا اثر پڑا اور اتفاق یہ تھا کہ اُس کی اپنی سوانح حیات ایک بڑی حد تک بائرن سے ملتی جلتی تھی۔ اُس کی شاعری کا زندہ جاوید کارنامہ ایک طویل نظم ہے "آسیب" جس میں نواح قاف کی ایک خوبرو لڑکی کا ایک پراسرار عفریت سے عشق، اور اس پرستیدہ خیال کے عشق کی شاعرانہ وارداتیں اس خوبی سے دکھائی گئی ہیں کہ صرف یہی ایک نظم لرمنطوف کو روس کے بہترین شعراء میں گنوانے کے لئے کافی ہے۔

مگر یہاں ہمیں اُس کے افسانوی کارناموں پر نظر ڈالنا ہے جو اس قدر شاندار نہیں جس قدر کہ اس کی شاعری۔ تاہم ایک خصوصیت قابل ذکر ہے کہ اُس کا ناول "ہمارے زمانے کا ہیرو" روسی زبان میں پہلا ناول ہے جس میں کردار نگاری کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور یہ ناول قدیم ناولوں اور جدید نفسیاتی ناولوں کی درمیانی کڑی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سے مختصر افسانے لکھے ہیں جو ایک بہت بڑی حد تک شاعرانہ کہے جانے کے مستحق ہیں۔ اس کے افسانوں میں لطافت اور محبت کی دلکش چاشنی کی رنگ آمیزیاں غضب ڈھا جاتی ہیں۔ اُس کو فرانس کے شاعرانہ افسانہ نگار گاتری (Gautier) کا مقابل ٹھرایا جاسکتا ہے۔

پشکن اور لرمنطوف دونوں فن افسانہ نگاری میں ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ دونوں ہاف مین کے روحانی شاگرد ہیں۔ اور عجیب تر بات یہ ہے کہ دونوں کا انجام بھی ایک ہی ہوا یعنی پشکن اور لرمنطوف دونوں ڈوئل میں مارے گئے۔

اس کے بعد روسی افسانہ نگاری کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اور وہ زمانہ آتا ہے کہ روسی افسانے بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے لگے۔ اس دور کی سب سے پہلی نمایاں شخصیت

آئیفن طرجنیف کی ہے - یہ پہلا روسی مصنف ہے جسے مغرب نے قدر کی نظروں سے دیکھا - ایک کھاتے پیتے زمیندار کا بیٹا تھا جس نے اس کی تعلیم میں خاص توجہ کی اور اُسے مزید تعلیم کے لئے جرمنی بھجوایا جہاں اس ہونہار نوجوان کی ادبی زندگی کی داغ بیل پڑی - اپنی زندگی کا بہت بڑا زمانہ اس نے پیرس میں بسر کیا - اور یہاں فرانس کے نامی گرامی اُدبا، فلابیر (Flaubert) الفونسو دادے (Alphonse Daudet) اور ایملی زولا (Emile Zola) کی صحبت میں اُس نے اپنی ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھا - اپنی زندگی ہی میں اُسے بہت کافی شہرت حاصل ہوگئی سیاسی نقطۂ نظر سے وہ اشتراکیت اور جمہوریت کا حامی تھا - اس لئے ملک سے جلاوطن کر دیا گیا - اُس نے کئی ناول اپنے ملک کی سیاست میں اشتراکی روح پھونکنے کے لئے لکھے - جن میں "بنجر زمین" (Virgin Soil) اور "باپ اور بیٹے" (Fathers and Sons) بہت مشہور ہے - اس زمانے میں روس میں وہ مواد پک رہا تھا جو بعد میں اشتراکی تحریک بن کر زار کی سلطنت کو زیر و زبر کر گیا -

طرجنیف نے ہر قسم اور ہر طبقے کے افراد کی مصوری کی ہے اور خوب کی ہے - پہلا روسی افسانہ نگار ہے جس نے روسی ادب کا پایہ اسقدر بلند کر دیا کہ وہ دنیا کے بہترین شاہکاروں کے مقابلے میں اپنی پیداوار پیش کرنے کے قابل ہو سکا - اُس کے ناولوں میں "دھواں" - "رودِن" اور "باپ اور بیٹے" بہت مشہور ہیں - لیکن اُس کے ناولوں سے زیادہ اُسکی مختصر کہانیاں پسند کیجاتی ہیں - اُس کے افسانوں میں لطافت اور بانکپن پایا جاتا ہے - دل کے لطیف جذبات کی ترجمانی، اور محبت کی نازک کیفیات کی نقاشی اُس سے بہتر غالباً کسی روسی مصنف نے نہیں کی - اُس کے مختصر افسانے دل کی لطیف کیفیتوں، روح کی گہرائی میں مچلنے والی موجوں کو صفحۂ قرطاس پر پیش کرتے ہیں - عجیب تر بات یہ ہے کہ اس کی سیاسی آویزشوں کا اثر اُس کے مختصر افسانوں پر بہت کم پڑا - اُس کے افسانوں میں "دور بہار"، "آسیا"، "اجنبی" "ایک کھلاڑی کے تجربے"، وغیرہ بہت مشہور ہیں - اس کے جملہ ناولوں اور مختصر افسانوں

کے انگریزی ترجمے کا مجموعہ ہین مین کمپنی نے شائع کیا ہے۔

طرجنیف کا ہمعصر فیدور دوسطوفسکی (Fedor Doestovsky) دنیا کے مشہور ترین ناول نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ سیاسی سرگرمیوں کے باعث اُسے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ سائبریا میں ایک قیدی کی حیثیت سے گزارنا پڑا۔ وہاں سے واپس آکر اس نے ۱۸۶۶ء سے وہ غیرفانی ناول لکھنا شروع کئے جنھوں نے اُسے دنیا کے عظیم ترین ناول نویسوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ اس کے ناولوں میں "گناہ و سزا" "ذلت و اذیت" "احمق" وغیرہ دنیا کے بہترین ناولوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ افسانہ نگاری اور دوسطوفسکی گویا لازم و ملزوم ہیں۔ اُس نے بہت سے مختصر افسانے بھی لکھے ہیں۔ اُس کا اسلوب بیان طویل لیکن دلچسپ ہوتا ہے۔ فطرت انسانی کا جتنے عمق سے مطالعہ اس نے کیا ہے، شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ اس نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ انتہائی بدنصیبی میں بسر کیا ہے۔ برسوں قید میں رہا۔ گناہگاروں چوروں، بیکسوں، بدمعاشوں، غریبوں، امیروں، غرضکہ ہر قسم کے آدمیوں کی فطرت کا مشاہدہ کرنے کا اُسے موقعہ ملا۔ اور چونکہ وہ خود زخم خوردہ تھا، اس لئے ان باتوں نے اس کے دل پر ایک گہرا اور نمایاں نقش کیا۔ اُس کے افسانے گویا اُس کے دل کی بھڑاس ہیں۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ انسانی فطرت کا پوشیدہ سے پوشیدہ راز بھی وہ اس خوبی سے عریاں کر جاتا ہے کہ دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے جس طرح ڈراما میں شکسپیر کے کمال کے آگے دنیا کے تمام ڈراما نگار ہیچ نظر آتے ہیں، اسی طرح افسانوں میں دوسطوفسکی کے مقابلے میں بہت کم افسانہ نگار نگاہوں میں جچتے ہیں۔ اُس کے ہمعصر اور روس کے زندہ جاوید ادیب طالسطائی نے اس کے مرنے پر یہ الفاظ لکھے "میں نے کبھی اسے نہیں دیکھا، اور نہ کبھی مجھ سے اور اُس سے تعلقات رہے لیکن اس کی خبر مرگ سنکر میں نے محسوس کیا کہ میرا قریب ترین، اور عزیز ترین شخص مرگیا جو کام وہ کرتا میرے خیال میں نوع انسانی کی بہلائی کے لئے کرتا۔ وہ مرگیا تو میں نے محسوس کیا کہ میں نے ایک جوہر کھو دیا"

پھر بھی دوسطوفسکی کے افسانوی کارناموں کا اگر کوئی ہمِ مقابل ٹھہر سکتا ہے تو وہ اس کا معصر اور روس کا مشہور ترین شخص کونٹ لیو طالسطائی (Count Leo Tolstoy) طالسطائی اخلاقیات مذہب، سیاست، اور فلسفے کا امام تسلیم کیا جاتا ہے لیکن افسانہ نگاری میں بھی اُسکا مرتبہ کچھ کم نہ تھا۔ بلکہ ملکۂ رومانیا کا قول تھا کہ "اس عظیم ہستی کے تمام کارناموں سے زیادہ مجھے اُسکی مختصر کہانیاں پسند ہیں"

طالسطائی اپنی صدی کا سب سے بڑا آدمی خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی ہر تحریر اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ اُس کے افسانوں میں بھی یہی خصوصیت بیّن طور پر نظر آتی ہے، اُس کے ناولوں میں سے اینا کرنینا (Anna Kernina) اور "ری زرکشن" (Resurrection) دنیا کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جنگ اور صلح (War and Peace) اسکا مشہور تاریخی ناول ہے جس میں نپولین کے زمانے کی لڑائیوں کی داستان ہے۔

مختصر افسانوں میں اس کا ایک ناولٹ (Novellette) کروٹزر سوناٹا (Kreutzer Sonata) غیر فانی شہرت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے مذہبی، تمدنی، اخلاقی، اور دیہاتی افسانے ایک کثیر تعداد میں لکھے

ہر مذاق کے لوگوں کو اپنے مذاق کے افسانے طالسطائی کے یہاں مل سکتے ہیں۔ اس کے مختصر افسانوں کا ایک مجموعہ مسٹر اور مسز ایلمر ماڈ نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور ورلڈ س کلاسک میں شائع ہوا ہے۔

طالسطائی اور دوسطوفسکی کے بعد روس میں افسانہ نویسی کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ دوسرے دور میں طویل ناولوں کی طرف خصوصیت سے توجہ کی گئی۔ اور روسی طویل ناول، فرانسیسی ناولوں کے ہمِ مقابل سمجھے جانے لگے۔ لیکن اس تیسرے دور میں مختصر کہانیوں کو اہمیت دی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بلجیم میں مارس ماٹرلنگ (Maurice Maeterlink) فرانس میں موپاساں (Maupassant) اور آسٹریا میں آرتھر سینٹ زلر (Arthur Schnitzler) جیسے مختصر افسانہ نگار پیدا ہو رہے تھے اور مختصر افسانے مقبولیت اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جا رہے تھے

روس میں بھی یہی کیفیت تھی۔

تیسرے دور کا سالارکارواں انطون چیخوف (Anton Chekhov) ہے جس کی مختصر کہانیاں اُسے دنیا کے مختصر افسانہ نگاروں کی صف اولین میں جگہ دلواتی ہیں۔ اسکی شاہراہ جملہ متقدمین سے علٰحدہ تھی۔ اسکا کام صرف فطرتِ انسانی کی عکاسی کرنا ہے۔ اس نے کبھی شیرینی اسلوب کی پروانہیں کی بلکہ ایک نقاد کے الفاظ میں " اُسکے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں فطرت انسانی کا صحیح عکس دیکھ لیتا اور پھر یہی عکس دنیا کو دکھاتا۔"

چیخوف کے مشہور پرستار اور نقاد مسٹر ولیم گرہارڈی جنہوں نے چیخوف کے کمال کے اعتراف میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "جب ہم چیخوف کو پڑھتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں۔ اوہ۔ یہ تو بالکل ہماری تصویر ہے۔ یہ تو بالکل ہم ہیں" یہی چیخوف کا کمال ہے۔ یہی وہ کمال ہے جو طویل افسانوں میں دوسطوفسکی کا طرۂ امتیاز رہا۔ دوسطوفسکی میں اور چیخوف میں فرق یہ ہے کہ چیخوف میں دوسطوفسکی کا ساطول نہیں۔ دوسطوفسکی فطرتِ انسانی کے تمام تر نشیب و فراز، انسانی دل کی تمام کیفیتیں ایک ہی پلاٹ میں بیان کرجاتا ہے۔ اور چیخوف ایک پلاٹ میں زندگی کی صرف ایک قاش پیش کرتا ہے۔ ہر دلی کیفیت کو دوسرے پلاٹ میں بیان کرتا ہے۔ بادی النظر میں یہ بہت بڑا نقص ہے۔ لیکن یہ چیخوف کی خطا نہیں۔ مختصر افسانوں میں کردار کے نشو ونما پانے کی گنجائش نہیں رہتی۔ یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے ناول کو مختصر افسانے پر فضیلت دیجا سکتی ہے۔ چیخوف نے صرف مختصر افسانے ہی لکھے۔ اور مختصر افسانے کو من حیث الفن ترقی دی۔

شروع شروع چیخوف نے چند مزاحیہ افسانے لکھے۔ مگر جوں جوں سن بڑھتا گیا، دنیا کا تجربہ بڑھتا گیا۔ ہنسی کھیل کی جگہ غور و خوض نے لے لی اور پھر اس نے نہایت متانت سے دنیا کا معائنہ کیا۔ چیخوف کے افسانوں کے ایک مترجم مسٹر کامٹ نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے۔ "اس کے مضامین وہی ہیں جو وہ اپنے ارد گرد دیکھتا تھا۔ اس کے کردار، بہادرانہ کارناموں کے مظہر نہیں ہوتے بلکہ اُن آدمیوں کا نمونہ ہوتے ہیں، جن کو وہ روزانہ دیکھتا۔ کسان اور

متوسط طبقے کے لوگ۔ وہ بڑے بڑے کارناموں کے مالک نہیں، اُنکے پیش نظر بڑے بڑے نصب العین نہیں۔ بلکہ اکثر وہ اپنی بدنصیبیوں میں اضافہ کرتے رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن میں سے بعض کامیاب ہوتے ہیں اور بعض ناکامیاب ''

قصہ مختصر یہ کہ چیخوف نے مختصر افسانے کو ترقی دے کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اُس کے ہمعصروں میں گارشن (Garshin) خصوصیت سے قابل ذکر ہے جس نے طرجنیف کے تتبع میں اکثر افسانے لکھے اور ایک بڑی حد تک وہ لطافت اور وہ دلکش اسلوب بیان پیدا کرلیا۔ اس کا ایک افسانہ ''سُرخ پھول'' بہت مشہور ہے۔ موپاساں کی طرح گارشن بھی دماغی بیماریوں میں مبتلا رہا۔ چنانچہ اس کے اکثر شاہکار موپساں کی طرح نیم جنون کی حالت میں لکھے گئے ہیں۔ بالآخر خودکشی کرکے مرا۔

چیخوف کا دوسرا ہم عصر جسے مختصر افسانہ نگاری میں کافی بلند مرتبہ حاصل ہے۔ سالوگب (Salogub) ہے۔ اس کے افسانے ایک بڑی حد تک چیخوف سے ملتے جلتے ہیں۔ بعض نفسیاتی افسانے اس نے بہت بہتر لکھے ہیں۔

چیخوف کا تیسرا ہم عصر لیونڈ انڈریف (Leonid Andreyv) ہے جس نے میکسم گورکی اور چیخوف کے برابر شہرت پائی ایک بہت بڑی حد تک وہ ماٹرلنک Macterlinck اور ایڈگر ایلن پو (Edgar Allen Poe) کے اسلوب بیان کا تتبع کرتا ہے۔ اسکے افسانوں میں اسرار کے ساتھ غم اور فلسفیت کی بھی ہلکی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ وہ خود انقلاب کا بہت بڑا حامی تھا لیکن انقلاب کا نتیجہ دیکھنے سے قبل ۱۹۱۸ء میں مرگیا۔

روسی افسانہ نگاری کا چوتھا یعنی موجودہ دور میکسم گورکی سے شروع ہوتا ہے۔ میکسم گورکی کو اگرچہ کہ چیخوف کا ہمعصر بھی کہا جاسکتا ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُسکا کمال اُس وقت ظاہر ہوا جبکہ چیخوف کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اُس نے چیخوف سے کم شہرت نہیں حاصل کی۔ اُس کا طرز بیان انوکھا، دلچسپ اور شیریں ہے۔ اس کے بچپن کا زمانہ نہایت تنگدستی

میں بسر ہوا۔ برسوں وہ قلی اور جہاز میں کوئلہ ڈالنے والا رہا۔ چنانچہ جب اُس نے افسانہ نگاری شروع کی تو اپنی سوسائٹی کا حال لکھا۔ یہ ایک نئی دنیا تھی جس کا خاکہ پہلی بار دنیا کے سامنے پیش کیا گیا اور حد سے زیادہ پسند کیا گیا۔ میکسم گورکی نے اس رنگ کو بہت ترقی دی۔ انقلاب میں اس نے اشتراکیوں کا ساتھ دیا۔ اشتراکی دور حکومت کے افسانہ نگاروں کا سرخیل بھی وہی ہے۔ اب بھی بقید حیات ہے۔

میکسم گورکی کے ہمعصروں میں الکزنڈر کرین سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ ابتدا میں اس نے فوجی زندگی کے متعلق چند افسانے لکھے۔ رفتہ رفتہ اس کے افسانوں میں فلسفیانہ شان پیدا ہوتی گئی۔ جس کو اس کے دلکش طرز ادا نے اور زیادہ پر لطف بنا دیا۔

موجودہ دور یعنی اشتراکی دورِ افسانہ نگاری میں افسانہ برابر ترقی کر رہا ہے۔ اسی سال انگریزی میں اشتراکی دور حکومت کے افسانوں کا ایک انتخاب (Short Stories of the Sovict Russia) کے نام سے شائع ہوا جو روس میں فن افسانہ کی دن دونی رات چوگنی ترقی کی تازہ ترین مثال ہے۔

جب دنیا کی تاریخ افسانہ پر نظر ڈالی جائے تو روسی ادیبوں کے شاہکار نہایت واضح اور نمایاں جگہ پر نظر آتے ہیں۔ پشکن کی قدیم رومانی کہانیاں پھر طرجنیف کے لطیف اور شیریں قصے پھر دوسطوفسکی اور طالسطائی کے نفسیاتی قصے۔ پھر چیخوف کے حقیقت آمیز افسانے۔ پھر میکسیم گور کی اور الکزنڈر کرین کے افسانے جن میں فلسفیت کی شان پائی جاتی ہے، روسی افسانہ نگاری کی ارتقا کا نہایت پر شکوہ منظر پیش کرتے ہیں۔

ایک بدنصیب انسان

ابن راوندی اور اسکی محبوبہ

عالم مشرق میں، اہل قلم، ادیب، مصنف اور شاعروں کی زندگیاں اکثر ناکامی، تنگدستی اور زمانے کی ناسازگاری میں گذری ہیں۔ یہ مصیبت آج کی نہیں، بلکہ عرصے سے چلی آرہی ہے، اور شاید اسی میں کوئی قدرت کی حکمتِ بالغہ پنہاں ہے کہ ہنرمند فلاکت کے ہاتھوں برباد رہے اور بے ہنروں نے ہر نعمت دنیا کو حاصل کیا، مزے اڑائے اور اپنی حیات مستعار رنگ رلیوں، عیش پرستیوں، کامرانیوں شادمانیوں میں گذار گئے۔ یہی نہیں کہ صرف مفلسی کی تکلیف ان کی شریک حیات رہی بلکہ اور بھی بہت سی آفتیں مختلف بلائیں ان پر ٹوٹیں۔

یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ اس پر بہت کم انشا پردازوں اور ارباب قلم نے قلم اٹھایا ہے لیکن مصر حاضرہ کے ایک مشہور ادیب محمود کامل ادیب نے اس موضوع خاص پر ایک ڈیڑھ سو صفحے کی کتاب لکھ ڈالی ہے جس میں ان بدنصیب انسانوں کے حالات درج کئے ہیں جو صاحب قلم، صاحب علم تھے، صاحب فن تھے، مگر اس بہارستان کائنات میں ہمیشہ خزاں زدہ رہے اور انکے چمن حیات میں ثروت و کامرانی کی کبھی بہار نہ آئی یا آئی تو بہت جلد ہمیشہ کے لئے پامال خزاں ہوگئی۔ اس کتاب کا نام "البوساء فی عصور الاسلام" ہے یعنی اسلامی دور حکومت کے بدنصیب لوگ۔ کتاب کے شروع میں انہوں نے بوس و بدبختی پر عالمانہ بحث کی ہے۔ اس کی قسمیں بتائی ہیں اور یہ کہ حقیقی بدبختی کیا چیز ہے اور اسکی بنیاد اصل کیا ہے، اور کس قسم کے لوگ اس میں زیادہ

گرفتار نظر آتے ہیں، قدرت کاملہ نے زیادہ کسے اس کا اہل سمجھا ہے، اسلام کے مختلف
دوروں میں کون کون سے نامور لوگ ایسے گذرے ہیں جن کا دامن بدبختی نے نہیں چھوڑا
یہ کتاب اگرچہ اسلام کے بدنصیب مشاہیر پر ہے لیکن تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ
اور قومیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ یہ بحث مصنف نے نہایت قابلیت سے کی ہے
لیکن افسوس ہے کہ ان علماء، دنیا اور فلاسفۂ اسلام کے حالات بہت مختصر لکھے ہیں زیادہ
تفصیل سے کام لیا جاتا تو یقیناً یہ کتاب بہت طول کھینچتی۔ بہرحال اپنے موضوع پر
مشرقی زبانوں میں یہ غالباً پہلی کتاب ہے۔ اسمیں ابن راوندی کا حال بھی لکھا ہے جو
میرے لئے بہت دلچسپ ثابت ہوا اور بے اختیار جی چاہا کہ اپنی زبان میں اسے منتقل
کرلوں چنانچہ بلاکم وکاست اسے "جامعہ" میں دے رہا ہوں اگر یہ پسند ہوا تو اسکی
دوایک قسطیں اور دوں گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ناظرین کی طلب صادق دیکھکر یوں ہی بتدریج
پوری کتاب اردو میں آجائے۔ یہ موضوع عام لوگوں کے لئے شاید زیادہ دل پسند ہو
اور یہ بالکل سچ ہے کہ خوشگوار نہیں تاہم یہ ضرور ہے کہ ہمارے انشاپرداز و مصنف جو
اس بلائے عام میں گرفتار ہیں انہیں پڑھکر تسکین ہوگی کہ وہ ہی ناقدردانی زمانہ کے
شکار نہیں بلکہ یہ قدرت الٰہی کی سنت جاریہ ہے اور شکر ہے کہ کم ازکم اس باب میں
تو ہم اپنے اسلاف کے نقش قدم پر ہیں مجھے امید ہے کہ اُردو کے فدایان ادب
ضرور اسے شوق سے پڑھیں گے۔

ابن راوندی، عرب کا ایک زبردست مسلمان عالم گزرا ہے، وہ اجتہاد کا درجہ، اور
علم وفضل میں بلند پایہ رکھتا تھا، اس امام اجل اور عالم باعمل کا پورا نام حسن بن محمد بن علی راوندی
ہے۔ سنہ ۹ ھ میں اسلام کی مشہور راجدھانی بغداد میں پیدا ہوا۔ وہ اتنا ذہین تھا کہ سات سال
کی عمر میں اُس نے پورا قرآن شریف حفظ کیا، اور اپنی زندگی کی بارہویں منزل میں پہنچکر اُس نے
علم تجوید (قرأت) سیکھ کر ساتوں قرأتوں میں کمال پیدا کرلیا وہ نہایت ہی خوش آواز اور اعلیٰ نغمہ

نواز تھا۔ اسکی جاں نواز آواز کسی معصوم فرشتے کی دلگداز آواز معلوم ہوتی تھی، وہ دلوں کو مدہوش کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی خدا نے اسے حسن صورت اور حسن سیرت بھی عطا کیا تھا، اسکا چہرہ صبیح تھا اور اعضا متناسب ساتھ ہی پرہیزگار اور متقی بھی۔ اس نے زہد و ورع میں نشوونما پائی تھی، نہایت عبادت گذار تھا۔ رات رات بھر عبادت میں گذارتا اور بہت کم سوتا تھا، صرف جھپکی لے لیتا تھا۔ اس کا شہرہ تمام اسلامی ممالک میں پہنچ گیا تھا۔ اس نے عراق کے اکثر شہروں کی سیاحت کی تھی، اسے ہر جگہ لوگوں کی طرف سے، ہردلعزیزی اور اعزاز و اکرام کا سابقہ پڑا۔ اس نے اور بھی اُسے علم پر ہمہ تن جھکا دیا۔ امرا نے اس کی نہایت عزت کی اور بادشاہوں اور ملوک نے اس کو اپنے دربار میں جگہ دی اور اس کے گرویدہ ہوگئے۔ اور جب اپنی عمر کے بیسویں سال میں اس نے قدم رکھا ہے تو وہ خدا کے فضل و کرم سے علم میں کمال اور فتنہ انگیز حسن و جمال کے تمام اوصاف کا سرمایہ دار بنا دیا گیا تھا حسن و جمال کا یہ عالم تھا کہ عورتیں اس پر فریفتہ ہوتی تھیں، زینت و آرائش سے بے نیاز حسن والیاں اور حسین نازنین اس پر مرتی تھیں اور ہر دولت مند غنیہ (وہ خواتین جن کا حسن خود مسلم اور فائق تھا ان) کی یہ آرزو تھی کہ کاش وہ اس کی ماں ہوتی اور اس کی حسن آفریں طلعت اور نادرۂ روزگار صورت سے ہر وقت کامیاب رہ سکتی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ابن الراوندی سوا بادشاہوں کے نہ کسی کے ہم نشینی میں رہتا تھا اور نہ امرا کے سوا کہیں اور رات کی صحبتیں گرم ہوتیں۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ اسے امیر بہاء الدین بن شاد نے مدعو کیا۔ اس زمانے میں بنو شاد اس جزیرے کے سادات میں تھا، انکے بہت سے زمین کے قطعات تھے، شاداب چمن زار اور باغیچے اور بلند و شاندار محلات تھے جن کی وجہ سے بجا طور پر وہ اور بادشاہوں اور دوسرے امرا کیساتھ منافرت کا اظہار کرسکتے تھے بیان کیا جاتا ہے کہ ابن شاد کا لشکر سلم کے زمانے میں بیس ہزار سے کم نہ تھا اور رب کے زمانے میں اس کی تعداد خدا ہی جانے خدا نے راوندی کو جو حسن سیرت و حسن صورت عطا کیا تھا اس کا دور دور تک چرچا تھا۔ اسکا آوازہ

بہاؤالدین کے کانوں تک بھی پہنچا، امیر نے اسے دیکھنے اور اس کی خوش آوازی سننے کا ارادہ کیا کہ ایک شاندار دعوت کرے جس میں تمام امرا اور پاس پڑوس کے شہروں کے امراء و شرفاء کو بھی بلائے اور کامل ایک مہینے تک اپنے ایک خوبصورت شہر میں رنگ رلیاں منائے اس نے اپنے کوتوال شہر کو خط دیکر ابن راوندی کے پاس بھیجا جس میں اسے دائلیہ تشریف لانے کی دعوت دی۔ اس کے لئے خاص عماری اور تمام ان ضروری اسباب راحت کا سامان مہیا کیا۔ جس وقت امیر کا پیامی پہنچا تو راوندی فوراً روانگی کو تیار ہو گیا اور دل ہی دل میں وہ نہایت شاد و مسرور تھا۔ جب وہ دائلیہ پہنچا تو لوگوں نے نہایت جوش مسرت اور دھوم دھام سے خیر مقدم کیا۔ ڈھول تاشے بجائے گئے اور خود امیر بن خشاد اس کے استقبال کو نکلا۔ اور ابن خشاد ابن الراوندی کو دیکھتے ہی بغلگیر ہوا، بخیریت پہنچنے کی مبارکباد دی اور اپنی استدعا قبول کرنے پر اسکا شکریہ ادا کیا اور جب وہ سفر کی صعوبت دور کرنے کے لئے تین روز آرام کر چکا تو امیر نے لوگوں کو جمع ہونے کے لئے بلایا۔ راوندی کے بیٹھنے کو ایک خاص اونچی جگہ تجویز کی تاکہ سارا مجمع اسے دیکھ سکے۔

راوندی اپنی ٹکڑی کے بیچ وسط میں بیٹھا۔ یہ اسی جیسے چار نوجوان تھے جو اپنے کمال میں ضرب المثل تھے۔ اور یہ چاروں اس کی آواز کو اٹھاتے اور دُہراتے تھے، موسیقی کے انہیں جدید اصول کے موافق جو اس استاد کامل (راوندی) نے بتائے تھے۔ ابھی یہ مجلس قرآن شریف کی چند آیات کی تلاوت سے شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس کے بعد راوندی نے ایک عشقیہ قصیدہ الاپنا شروع کیا۔ حاضرین کی یہ حالت تھی کہ بے تابانہ اُٹھ اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ امیر ابن خشاد تو یہ سحر آفریں موسیقی سنکر حیرت زدہ تھا، اس سریلی، شیریں اور موہنی آواز کے الاپوں نے اسے بے حال کر دیا۔ اس کی ہر تان اور ہر اتار چڑھاؤ میں ایک خواب شیریں کی لذت نمایاں تھی۔ ہر سننے والے کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ تانوں کا سلسلہ قلب کی گہرائیوں تک برابر لگا ہوا ہے۔

امیر کی عجب حالت تھی، وہ اپنے ان احباب اور مصاحبوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا: "اگر میں یہ قسم کھاؤں کہ آج میں نے فرشتوں کی آواز سنی ہے تو یقیناً میں اپنی قسم میں جھوٹا نہیں ہوں گا"

ابن راوندی برابر گا رہا تھا۔ وہ الاپ اور تانیں اڑا اڑا کر بیخود و مدہوش بنا رہا تھا۔ یہانتک کہ ساری محفل اپنے ہوش وخرد کھو بیٹھی، آخر یہ جان نواز مجلس نشاط صبح کے وقت ختم ہوئی تمام حاضرین نماز فجر کے لئے اٹھ اُٹھ کر روانہ ہوئے اور پھر اپنے اپنے کاموں کو ادہر اُدہر چلدئے۔ تمام لوگوں پر ابن راوندی کی خوش گوئی کا جادو چل چکا تھا اور انہیں محو حیرت بنا چکا تھا۔ امیر ابن خشاد اس کے پاس آیا اور اسے اپنی آغوش میں لے کر گلے لگایا اور اس سے نہایت درجہ محبت کا اظہار کیا، جوش مسرت سے آپے سے باہر ہو رہا تھا، دیر تک یہی حالت رہی یہانتک کہ راوندی کو اس کمرے میں پہنچایا جو خاص اس کے سونے اور آرام کرنے کے لئے مخصوص طور پر آراستہ کیا گیا تھا۔ یہ نہایت گراں بہا فرش فروش اور ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ اس میں ایک پلنگ تھا اور اس پر ایک ریشمی اعلیٰ درجہ کا امرا۔ کے آرام کرنے کا بستر۔ اور اس کے لئے ایک خاص خادم مقرر کیا۔ پھر اس سے رخصت ہوا تاکہ وہ آرام کرے۔ ابن راوندی نے شب خوابی کا لباس پہنکر پلنگ پر ذرا لیٹ ہی لگائی تھی کہ اپنے کرۂ استراحت کے دروازے پر ایک خفیف آہٹ اور کنڈی کے کھٹ کھٹانے کی آواز سنی۔ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک دوشیزہ کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ اس قدر خوبصورت نظر آتی تھی کہ اس سے زیادہ حسین چشم زمانہ اور انسانی آنکھ نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ اس حسینہ نے اشارہ سے سلام کیا اور نہایت شیریں الفاظ میں کہا:۔

میں سمجھتی ہوں کہ آپ مجھے بالکل نہیں پہچانتے ہوں گے؟ اور میرے یہاں آنیکی وجہ سے بھی بے خبر ہوں گے۔ میں ایک پردہ نشین شریف خاتون ہوں۔ آپ سے پہلے کسی مرد سے میری جان پہچان نہیں اور نہ یوں کسی کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہے۔

راوندی نے نہایت احترام اور شرم سے اُس پر ایک نگاہ ڈالی مگر آنکھیں جھکالیں اور ادب آمیز انداز سے کہا: "میرا خیال اگر درست ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ شاہی خاندان کی کوئی رکن ہیں جو شرافت اور سیادت میں مانا ہوا اور مسلمہ طور پر بلند و سرفراز ہے۔" نازنین دیر تک

اس کے چہرے کو ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی، اس نگاہ میں محبت اور رحم کی درخواست شامل تھی پھر اس نے شرما کر کہا: آپ کا خیال بالکل درست ہے، میں امیر ابن خشاو کی بہن ہوں اور آپ کے پاس اس لئے حاضر ہوئی ہوں کہ اپنے محبت کے جذبات کو کھول کر رکھ دوں اور آپ کو یہ بتاؤں کہ رات میں نے آپ کا نغمۂ ساحرانہ سنا جس نے مجھے بے تابانہ شدید محبت، بے اختیارانہ جذبہ الفت سے از خود رفتہ کر دیا ہے، میں نے آپ کے حسن آواز کو خوب .... جس نے میرے تمام جذبات کو آپ کی طرف رجوع کر دیا ہے۔ اور جب مجھے آپ کی شرافت نفس اور حسن اخلاق و نجابت خاندانی کا پورا ثبوت مل گیا تو کوئی مانع محبت نہ رہا اور آپ کی پاک و شریفانہ شکل نے دل میں بے اختیار گھر کر لیا .. میں آپ کو اپنے دل کا مالک بنا چکی ہوں۔

ابن راوندی کانپ اٹھا، اس کے جوڑ جوڑ میں یہ سن کر ایک رعشہ تھا وہ ہکا بکا، جہاں کا تہاں رہ گیا۔ ایک گہری فکر میں اس وقت ڈوب گیا تھا دیر تک اس پر ایک گہری خاموشی اور فکر کی حالت طاری رہی، پھر اس نے اپنا سر اٹھا کر نازنین خاتون سے کہا: یہ آلام محبت کی ایک کھٹک ہے اور عشق خانہ خراب کے لئے بناہ جذبات کی ایک لہک ہے .... میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے بہت زیادہ جلد بازی سے کام لیا اور یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ میرے اور آپ کے درمیان بہت سی ہوسناک اور پرخطر گہرائیاں حائل ہیں جنہیں طے کرنا میرے لئے امکان سے باہر ہے۔

آپ شریف پردہ نشین، عفت مآب اور شاہی خاندان کی خواتین سے ہیں ایک فرمانروا بادشاہ کی بہن ہیں، کسی صورت اور کسی حالت میں بھی یہ ممکن نہیں کہ میں انکے سلسلہ خدم میں شامل ہوسکوں۔ خدا کے لئے آپ مجھے اس سعادت سے محروم ہی رہنے دیجئے۔

نازنین رونے لگی اور بولی: ابن راوندی! تم ایک ایسے نوجوان ہو جسے اللہ نے نایاب و نادر محاسن سے آراستہ کیا ہے، اُن اوصاف سے جو عورتوں کی آنکھ میں کھٹے بغیر نہیں رہ سکتے اور میں ایک ایسی دوشیزہ ہوں جو اپنے نفس پر قادر نہیں میں خود اپنی ناچیز محبت کا ہدیہ پیش کرنے آئی ہوں، اور آپ سے رحم و کرم کی خواستگار ہوں میں چاہتی ہوں کہ اس محبت میں

اس کے اقتضا کے موافق آپ بھی شرکت کریں اگرچہ اس کے لئے جان جائے اور زندگی کام آئے۔

ابن راوندی کو دل اور آنکھوں پر اختیار نہ رہا اور بہت پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور نازنین کی طرف دیکھ کر بولا: معزز خاتون! بیشک تم ایسی حسین نازنین وحسن آرا خاتون ہو جس کے حسن و جمال میں کچھ شک وشبہ کی مجال نہیں اور میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے اپنے اندر محبت کی تاثیر پاتا ہوں اے رعنائی شباب کی مالکہ اور اے حسن بے مثال کی سرمایہ دار خاتون یقیناً تم سے مجھے محبت ہوگئی ہے لیکن میں کل اپنی تابناک امیدوں پر آنسو بہاؤں گا اور اس مبارک زندگی کو عذاب میں مبتلا دیکھوں گا۔ ممکن نہیں۔ خانہ خراب محبت تباہ و برباد کئے بغیر رہ سکے۔

نازنین: پیارے راوندی یاد رکھو کہ ہم دونوں زبردست اور ہولناک امیدوں کو اپنے کاندھوں پر لے چکے ہیں۔ اور ہمارے دل سوز و گداز کے مالک ہیں۔

راوندی: بیشک! لیکن نہایت افسوس کہ یہ عزیز جانیں نقصان وضرر سے دو چار ہوں گی۔

نازنین نے کہا جو کچھ ہو۔ اس کے بعد دونوں نے محبت اور وفاداری کا عہد کیا۔

تقریباً کامل ایک مہینے تک خفیہ طور پر راوندی اور حسینہ دونوں ملتے رہے۔ اس دوران میں دونوں میں کسی کے لئے بھی ممکن نہ تھا کہ ایک دوسرے سے جدا ہوسکیں۔ محبت برابر بڑھتی جاتی تھی۔ وہ شاہی محفلوں میں محبت کے نغمے گاتا رہتا تھا اور یہ عالم تھا کہ جو بھی سنتا تھا بے اختیار مجروح قلب ہو کر چیخ اٹھتا تھا۔

یہ کہانی آخر ختم ہوئی اور امیر ابن حشادنے ان جلسوں کے ختم کرنے کا اعلان کیا۔ آسمان اس محبت کی تنہا ملاقاتوں کو نہ دیکھ سکا۔ ابن راوندی اور اس کی محبوبہ حسنات کی بدقسمتی رنگ لائی یہ واقعہ پیش آیا کہ آخری رات سے ایک رات پہلے امیر ابن حشادنے اپنی دعوت پر تمام حضرات کی تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ کل کی رات ان تمام جلسوں کی آخری رات ہوگی۔ آپ لوگوں کی مسلسل تکلیف فرمائی کا میں بہت بہت شکر گزار ہوں۔

رات ختم ہوئی اور جلسہ برخاست ہوا اور صبح کے وقت تقریباً ٹھیک اپنی عادت کے موافق

نازنین حسنات، راوندی کے خوابگاہ عشرت میں آگئی اور دونوں ساتھ بیٹھکر عشق و محبت کی باتیں کرنے میں محو ہوگئے۔ یہ دونوں اس رنگین گفتگو میں مدہوش اور کائنات کی ہر چیز سے بیخبر تھے۔ آنکھیں جو اوپر اٹھیں تو کیا دیکھتے ہیں امیر انکے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ اس نے آنکھیں چار ہوتے ہی کہا: "سلام علی العشاق فی کل مکان" ہر جگہ اور ہر مکان میں عشاق کو سلام اور سلام ہو تم دونوں کو کہ بیشک تم دونوں ایسے عاشق و معشوق ہو کہ زمانے نے جن میں تفرقہ ڈالا اور جدائی کا حکم سنا دیا۔

دونوں محبت کے متوالے جھجک کر رہ گئے، ان پر شدید خوف چھا گیا، وہ دونوں کھڑے کانپ رہے تھے، ان پر حیا مستولی تھی اور اس حیا نے حسن و جمال کی تابش کو اور نمایاں کر دیا تھا۔

امیر تاڑ گیا کہ راوندی رعشہ براندام ہے اور اس کے عزم و استقلال کمزور ہوگئے ہیں وہ کھڑا رہا، چہرے کا رنگ فق تھا غصے کے جوش سے چہرہ تمتما رہا تھا اور خود وہ کانپ رہا تھا۔ اس کے بشرے پر حزن اور یاس کا جوش ہیجان غالب تھا۔

نازنین کو شدت ندامت و حیا نے کپکپا دیا۔ اس پر حیا چھا گئی تھی، اس کے دونوں پیروں کے تلے سے زمین نکل گئی اور وہ زمین پر لڑکھڑا کے گر گئی۔

سردار اسے اٹھا کر ایک دوسرے کمرے میں لے گیا، اور اپنے غصے کو اس نے چھپایا اس کے بعد وہ راوندی کے پاس پلٹ کر آیا اور کہنے لگا: تم رنجیدہ نہ ہو اور نہ کچھ اندیشہ کرو۔ یقین کرو کہ میں نے حسنات کو تمہیں کو بخشا۔

اور اسی قسم کی دلدہی اور تشفی کی باتیں کرتا رہا، یہانتک کہ راوندی کا دل خوش ہوا شک و شبہ دل سے نکل گیا۔ پھر یہ دونوں دوشیزہ حسنات کے کمرے میں گئے، اور جب تک اسے ہوش نہ آیا وہ وہیں رہا۔ پھر امیر نے اسے بھی یہ کہکر تسلی تشفی دی کہ تمہیں ابن راوندی کو دے چکا اور تم بالکل اطمینان رکھو۔

یہ جانفزا مژدہ سنکر دونوں دلدادۂ محبت نہایت ہی خوش ہوئے اور اس مسرت کو اور زیادہ کرنے کے لئے امیر ابن خشاد نے کہا: اور جب میں تم دونوں کو ملنے اور مفارقت نہ کرنے کا حکم دے چکا ہوں، اب ہمیں چاہیئے کہ سب یکجا بیٹھکر آنیوالی صبح ہمدید کا خیر مقدم کریں آؤ سامان نشاط بہم پہنچا کر شراب بہاری کا جام پئیں۔

اسی وقت شراب لائی گئی امیر خشاد نے راوندی کے لئے پیمانہ بھرا بہن نے بھائی کا اور بھائی نے بہن کا ساغر لبریز کیا۔ اور ابن راوندی نے اپنا گلدستہ۔ ابن خشاد نے نہایت حیرت انگیز پھرتی سے اُن دونوں کے پیالوں میں زہر قاتل ملا دیا۔

تینوں میں شراب صافی کا دور چلا، اور اس کے پیتے ہی نازنین حسنات نے نہایت سخت دوران سر محسوس کیا اور وہ فوراً اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ابن راوندی کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کی آنکھیں چاک چاک ہوئی جاتی ہیں، امیر نے اُسے بھی ایک خاص کمرے میں پہنچا دیا اور تنہا چھوڑ کر چلا آیا اسوقت راوندی کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ بہت جلد دنیا سے چل بسے گا۔ ابن راوندی یہ بھی سمجھ گیا کہ امیر نے کیا سلوک کیا ہے۔ وہ اسی رات موقع پاکر بھاگا اور اپنی اس بیماری و تکان کی تکلیف میں تمام رات برابر پیدل چلتا رہا۔ جس کی وجہ سے اسکے لئے یہ جنگل بیابان کا ہولناک سفر طے کرنا سخت دشوار تھا۔ وہ بیچارہ تین مہینے تک ایک شخص کی مہمانی میں رہا۔ اس دوران میں وہ صرف ہڈی چمڑا رہ گیا تھا، اس کی حالت نہایت دردناک اور افسوس کن تھی۔

اسکے بعد بیماریاں برابر اسکی جان کو لاگو رہیں اور آلام و اندوہ پیش آتے رہے۔ یہانتک نوبت پہنچی کہ اسکی شکل و صورت بالکل بدل گئی۔ اور یہ حالت ہو گئی کہ اُسے جو دیکھتا پہچانتا بھی نہ تھا کہ یہ آدمی ہے۔ اسکا ڈیل ڈول بالکل بدل گیا، چہرہ مسخ ہو گیا اور تمام جسمانی حسن و جمال ضائع ہو گیا اور اسکی آواز کی شیرینی و موسیقی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ اسکی شکل و صورت بدل کر خوفناک اور بھیانک سی ہو گئی اور یہ سب اس زہر ہلاہل کی تاثیر تھی جو اُسے پلا دیا گیا تھا۔

اسکی آواز بھاری اور سخت ناگوار ہو گئی تھی جو اُس کے نرخرے سے بڑی مشکل سے نکلتی تھی

اسوقت اس کی عمر تقریباً تیس سال کی ہو چکی تھی۔ اب وہ نہایت کس مپرسی کی حالت میں بغداد واپس چلا آیا اور یقین کے ساتھ یہ جان چکا تھا کہ اسکی آواز کا کمال ہمیشہ کیلئے جا چکا ہے اور اب اُسکی زندگی نہ ہونیکے برابر ہے۔ وہ پوری توجہ کے ساتھ حصول علم پر جھک پڑا اور اپنی رات دن کی محنت کی بدولت زبردست عالم ہو گیا۔ ملک کے نامور علماء میں اُسکا شمار ہونے لگا۔ لیکن وہ تنہا تھا۔ اسکا گھر بار نہ تھا اس لئے اُس نے اپنی ہی ایک قوم کی اور اپنی ہی جیسی نہایت غریب و مفلس عورت سے نکاح کر لیا۔ خدا کی شان کہ اُس نے باوجود ابن راوندی کی مفلسی اور سقیم حالت کے اُسے کثرت سے اولاد دی۔ لیکن اسکی خوش نصیبی کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ وہ تھوڑا سا آٹا بازار سے خرید کر لا رہا تھا۔ اس نے یہ آٹا اپنے دامن کے ایک کونے میں رکھ کر ایک تاگے سے اسے باندھ کر اپنے کاندھے پر رکھ لیا تھا۔ وہ اپنے گھر چلا جا رہا تھا کہ اسے اپنی اس بری حالت کا خیال آیا جس میں وہ آجکل مبتلا تھا اور جس تنگدستی کے عذاب میں گرفتار تھا، اور مصائب و آفات کے اس ہجوم کا جنہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا، اُس نے اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا: "خدایا میری مشکل آسان کر" محویت کے ساتھ بار بار یہ دعا کرتا چلا جا رہا تھا کہ ایک پتھر کی ٹھوکر لگی۔ اسکے پاؤں لڑکھڑا گئے اپنے جسم کو نہ سنبھال سکا اور لڑکھڑاہٹ کی شدت سے وہ تاگا ٹوٹ گیا جس سے آٹا پلو میں بندھا ہوا تھا، زمین پر سارا آٹا پھیل گیا اور مٹی میں رل مل گیا۔ یہ دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس بے اختیار منہ سے نکل گئی اور یہ الفاظ زبان پر آ گئے: "خدا کا شکر ہے کہ میری مشکل آسان ہو گئی" اور اب بال بچے بھی بھوکوں مریں گے۔ اس واقعہ کا اس کے دماغ پر اتنا بڑا اثر ہوا کہ اُس کی عقل و حواس بجا نہ رہے، دماغ مختل ہو گیا۔ اور راوندی پاگل ہو گیا، اور پھر چند ہی ہفتوں کے بعد اُس نے ہمیشہ کے لئے دنیا کے ان بے درد مصائب سے نجات پائی۔ راوندی کی وفات ۲۹۸ھ میں ۹۵ سال کی عمر میں ہوئی۔

دنیا میں اور نہ جانے کتنے ایسے بدنصیب انسانی افراد ہوں گے، آہ !!!

(ترجمہ از عربی)

مزدور و سرمایہ دار

از مولنا محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی - لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد (دکن)

دنیا کی راحت کچھ بھی نہیں، دنیا کی مسرت کچھ بھی نہیں
سرمایہ دارو! سنتے ہو، یہ دھن یہ دولت کچھ بھی نہیں
یہ دنیا آنی جانی ہے، ہر چیز یہاں کی فانی ہے
کیوں ظلم کسی پر کرتے ہو کیا جی میں آخر ٹھانی ہے
گر خون غریبوں کا چوسا، مزدوروں کا دل کلپایا
ایمان سے کہنا کیا تم نے اس بے دردی کا پھل پایا
کچھ ہمدردی انسانوں کی، کچھ جوش حمیت تم میں نہیں
غیروں کی مروت کیا ہوگی، اپنوں کی محبت تم میں نہیں
اپنے ہی بھائی بندوں پر تم ظلم کا ہاتھ بڑھاتے ہو
مزدور کماتے ہیں جو کچھ، تم چھین کے سب کھا جاتے ہو
لے لیتے ہو حاصل اُس کا، مزدور جو محنت کرتا ہے
کچھ یہ بھی خبر ہے پیٹ اپنا وہ بیکس کیونکر بھرتا ہے
جسموں پر اُنکے کپڑے نہیں، سردی سے بچے اکڑتے ہیں
سڑکوں کے کنارے اندھیرے راتوں کو جا پڑتے ہیں
بستر ہے، نہ تن پر کپڑے ہیں ہگر ہے نہ کہیں گھر بار اُن کا
ہے سب یہ تمہاری ہی باعث یہ غربت یہ ادبار ان کا
غرق اُنکے دل کا سفینہ ہے، حق تم نے جو اُنکا چھینا ہے

بیکار یہ اُن کا جینا ہے جب خون جگر یوں پیتا ہے
تم اپنی ثروت کی خاطر پنجے میں ان کو جکڑتے ہو
وہ روتے ہیں تم ہنستے ہو، وہ کڑھتے ہیں تم اکڑتے ہو
اے بے دردو! تم کیا جانو جو اُنکے دل پہ گزرتی ہے
ہر فریادِ دل دوز اُن کی شق سینہ اپنا کرتی ہے
جب بچے انکے بلکتے ہیں کس حیرت سے وہ تکتے ہیں
چہرے سے رنج ٹپکتا ہے، آنکھوں سے اشک ڈھلکتے ہیں
آتا نہیں تم کو رحم ذرا، دل ان کا غم سے روتا ہے
چہرے پہ چمک، ہونٹوں پہ تمہارے کیا تبسم ہوتا ہے
اللہ کے تم بھی بندے ہو، اللہ کے وہ بھی بندے ہیں
لیکن یہ تمہارے دستِ ہوس گردن میں انکی پھندے ہیں
تم ان کو مفلس رکھتے ہو اور اپنا خزانہ بھرتے ہو
پھر اس پہ سوا احسان اپنے، گردن پر انکی دھرتے ہو
ہیں ہاتھ بھی خالی جیبیں بھی اور دامن بھی اُن کے خالی
معمور تمہارے خزانے ہیں۔ اللہ ری تمہاری خوش حالی
ان بیچاروں کی پامالی ہاتھوں سے تمہارے ہوتی ہے
سرمایہ داری کی یہ ہوس کشتی کو انکے ڈبوتی ہے
پر یہ بھی سوچا ہے تم نے، کیوں حاصل اطمینان نہیں
اس ثروت اور اس دولت پر بھی یعنی بجا اوسان نہیں
فطرت نے ضمیر دیا ہے جو ہر دم وہ ملامت کرتا ہے
اکثر یہ تمہارا دل تم پہ تنہائی میں لعنت کرتا ہے

اے کاش سنو گوش دل سے مزدور کے دل کی فریادیں

اور دیکھو چشم باطن سے پڑتی ہیں جو اس پر افتادیں

قسمت میں تمہارے چین نہیں تسکین اطمینان نہیں

تم گویا جسم مردہ ہو، ایمان کی جس میں جان نہیں

ہو راحت تو کیونکر تمہیں، سکھ کیا پاؤ آرام ہو کیا

نخوت نے تمہاری جب تم کو، دکھ سکھ سے انکے سبق نہ دیا

یہ عیش تمہاری یہ ثروت، اک عبرت ہے دنیا کے لئے

یہ ایک طلسم دولت ہے، دھوکا ہے دل بینا کے لئے

ہے اپنے ہی آرام کی دھن، اور اپنی دولت میں ہو مگن

غیروں کی کیا پروا ہو تمہیں، اپنوں کی نہیں جب دل میں لگن

راحت ہی تمہاری جو کچھ ہے، مزدور کی راحت کچھ بھی نہیں

عزت ہی تمہاری جو کچھ ہے مزدور کی عزت کچھ بھی نہیں

تنقید و تبصرہ

الجہاد فی الاسلام ۔ مصنفہ مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی رفیق اعزازی دارالمصنفین۔ حجم ۵۰۰ صفحے تقطیع ۲۰×۲۶ ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ۔قیمت صہ ملنے کا پتہ دارالمصنفین اعظم گڈھ

اس مبحث پر اس سے پہلے بھی کتابیں ہم نے پڑھی ہیں مگر مولنا مودودی نے جس شرح بسط اور تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھا ہے وہ کچھ اور ہے ۔ اس میں اسلامی جہاد کی حقیقت اور اصول جنگ اور جنگ کی غرض و غایت پر تفصیلی بحثیں ہیں ۔ اقوام سابقہ کے جنگ کی کیفیتیں دکھا کر انہوں نے بتلایا ہے کہ اسلام نے اس میں کس قدر اصلاحات کیں اور اس کے اغراض کو کس قدر مقدس اور مفید بنایا۔

معترضین جو اسلام کے مسئلہ جہاد پر اپنی نادانی سے اعتراض کرتے ہیں انکے تحقیقی جوابات دئے ہیں ۔ اور جملہ شکوک کا ازالہ کیا ہے ۔ اور دوسرے ادیان کی تعلیمات کے ساتھ مقابلہ کرکے اسلامی جہاد کی برتری اور فضیلت ثابت کی ہے اور جو کچھ لکھا ہے معتبر کتب کے حوالہ سے لکھا ہے خاصکر اسلامی جہاد کے متعلق قرآن اور حدیث اور فقہ کی تعلیمات کو تاریخی روشنی کے ساتھ واضح کیا ہے ۔

آخر میں جنگ اور تہذیب جدید کے عنوان سے موجودہ مغربی تہذیب کے اصول اور اغراض جنگ دکھائے ہیں اور نور و ظلمت کے فرق کو اچھی طرح نمایاں کیا ہے ۔

بیان سادہ اور سلیس ہے اور معلومات سے لبریز میرا خیال ہے کہ کتاب زیر تنقید مسئلہ جہاد کے متعلق ان تمام کتب میں جو اب تک اس عنوان پر نہ صرف اردو بلکہ عربی میں بھی لکھی گئی ہیں ۔ سب سے زیادہ پر مغز اور فیصلہ کن کتاب ہے ۔ اور دارالمصنفین اسکی اشاعت پر شکریہ کا مستحق ہے ۔

اسلامی کارنامے - مؤلفہ مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب جنرل سکریٹری مسلم ایسوسی ایشن وسکریٹری انجمن تعلیم الاطفال پھلواری شریف۔ مجلد قیمت عہ حجم ۱۳۶ صفحہ۔ لکھائی چھپائی کاغذ متوسط۔

ملنے کا پتہ: محمد فصیح اللہ صاحب۔ مسلم بک ڈپو۔ پھلواری شریف۔ پٹنہ۔

اس کتاب میں مؤلف نے مسلمانوں کی ملکی۔ علمی اور صنعتی ترقیاں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ اسلام سے اسلامی فتوحات۔ علمی تصانیف۔ مدارس۔ کتب خانے اور شفاخانے پھر عمارات اور صنائع وغیرہ دکھلائی ہے۔ اس کو پڑھکر یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ کن وجوہ سے ہمارے اسلاف نے ترقی کی تھی اور کیوں ہم قعر مذلت میں گر گئے ہیں۔

کتاب میں چند مشہور اسلامی عمارات کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

اسلام کی پہلی کتاب - مصنفہ مولوی حکیم سید عبداللطیف صاحب چشتی) قیمت درج نہیں غالباً ۲ر ہوگی۔ ملنے کا پتہ: اکبر بک ڈپو سعید منزل۔ دہلی۔

مولوی عبداللطیف صاحب جو ایک اسکول میں عربی کے مدرس ہیں بچوں کے لئے دینیات کا سلسلہ لکھنا چاہتے ہیں یہ رسالہ اس کی پہلی کڑی ہے۔ اس میں ابتدائی عقائد کی باتیں بطور سوال وجواب کے لکھی گئی ہیں۔ بعض اہم اخلاقی تعلیمات اور نماز کا بھی بیان ہے بیان کا طریقہ سادہ ہے جو بچوں کے لئے مناسب ہے۔

تاریخ الامت حصہ ہفتم - تاریخ الامت کا آخری حصہ چھپکر شائع ہوگیا۔ اس میں سلاطین و خلفاء آل عثمان یعنی عثمانی ترکوں کی شروع سے آجتک کے تاریخی حالات حسب معمول نہایت تحقیق اختصار اور سلاست کے ساتھ عربی ماخذوں سے لیکر لکھے گئے ہیں۔ ترکوں کی تاریخ میں اردو زبان میں اسکو پہلی تصنیف سمجھنا چاہئے کیونکہ آجتک جو کچھ انکے متعلق اس زبان میں لکھا گیا ہے وہ ترجمے ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت فی نسخہ عہ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ قرولباغ۔ دہلی۔

معلومات - اس سال سے یہ جدید ماہانہ رسالہ چھوٹی تقطیع پر احسن الدین صاحب احمد مارہروی ایم اے کی ادارت میں الہ آباد سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ قیمت سالانہ عاسہ ملنے کا پتہ - دفتر معلومات الہ آباد

اسمیں مختلف قسم کی معلومات صنعتی جغرافی اور تجارتی وغیرہ جو زیادہ تر اسکول کے طلبہ کے لئے مفید ہو سکتے ہیں دئے جاتے ہیں۔ دو جز کا نہایت معمولی رسالہ ہے۔ کاش اس کو دلچسپ اور زیادہ مفید بنانیکی کوشش کیجاتی۔

کعبہ - یہ ہفتہ وار اخبار آٹھ صفحے کا آل انڈیا جمعیتہ القریش کی سرپرستی میں حضرت کوکب نے دہلی سے شائع کرنا شروع کیا ہے۔ اسمیں قوم قریش قصابان کی اصلاح اور بہبود کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ مضامین نظم و نثر اچھے اور مفید درج کئے جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہندوستان میں ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں بھی پیشہ اور نسل کے لحاظ سے ذات پات کی تفریق پھیل گئی۔ اور اسلام جس چیز کو مٹانے کے لئے آیا تھا اسی میں مسلمان پھر گرفتار ہو گئے۔ یہ رسالہ اگرچہ ایک خاص جماعت کا آرگن ہے لیکن یہ دیکھکر اطمینان ہوتا ہے کہ فرقہ پرستی کو مٹانے والا اور وحدت کا حامی ہے۔ قیمت سالانہ سے ؏

ساقی - اُردو کا علمی اور ادبی ماہوار صحیفہ مسٹر شاہد احمد بی اے آنرز کی ادارت میں دہلی سے اسی سال سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ حجم چار جز قیمت ہے سالانہ

مسٹر شاہد احمد مشہور عالم شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے پوتے ہیں۔ ادب اردو کا ذوق انہیں موروثی ہے چنانچہ اسی ذوق نے انکو اس رسالہ کے نکالنے پر آمادہ کیا۔

انکے اعوان و انصار کا حلقہ اچھے اچھے ادیبوں۔ کاتبوں اور شاعروں پر مشتمل ہے جسکی وجہ سے انکا یہ رسالہ نہایت دلکش اور ادیبانہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ وہ خود بھی ایک خوش نگار قلم رکھتے

ہیں کہ انکا یہ رسالہ ترقی کرے گا اور اردو ادب کی خدمت کرسکے گا۔

ملنے کا پتہ : دفتر رسالہ ساقی ۔ کھاری باؤلی ۔ دہلی۔

البلاغ ۔ یہ ایک مذہبی علمی اور ادبی ماہانہ رسالہ ہے جو نظیر آباد لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ حجم ۲ جز تقطیع ۲۰×۲۶ قیمت سالانہ صہ ہے جو نسبتاً زیادہ ہے۔

البلاغ پہلے ۱۹۲۴ء میں لکھنؤ میں ہفتہ وار اخبار کی صورت میں جاری ہوا تھا لیکن پھر بند ہو گیا۔ اب اسی کو ماہانہ رسالہ کی شکل میں نکالنا شروع کیا ہے۔ اس کے مدیر سید محمد افضل شاہ ثاقب ندوی بہرائچی ہیں۔ مضامین متوسط درجہ کے ہیں۔ فرید وجدی کے ایک مضمون کا ترجمہ اچھا ہے۔ اگر مدیر رسالہ قرآن کی تعلیمات کو پیش کرنیکا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھیں تو امید ہے کہ یہ رسالہ زیادہ مفید اور کارآمد ہو جائے گا۔

قیام الدین ۔ حضرت مولانا عبد الباری مرحوم آخری آفتاب فرنگی محل کے غروب ہو جانے پر آن کی یادگار رہیں انکے نام سے فرنگی محل سے یہ ماہانہ رسالہ زیر ادارت حسن انصاری صاحب نکلنا شروع ہوا ہے رسالہ کا حجم ۲۰ × ۲۶ تقطیع پر تین جز ہے اور چھپائی لکھائی معمولی ہو۔ قیمت للعہ سالانہ ہے جو زیادہ ہو۔ مضامین مذہبی اور اصلاحی ہیں۔ طلبائے علوم عربیہ اور مذہبی خیال کے لوگوں کے لئے یہ رسالہ مفید ہے۔

معاون ۔ چودہری غلام مصطفےٰ صاحب بیرسٹر کی زیر زیر نگرانی یہ ماہوار رسالہ گوجرانوالہ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ علمی ادبی طبی، اقتصادی، اصلاحی، زرعی اور امداد باہمی غرض قوم کی جس قدر ضرورتیں ہیں ان سب پر مضامین شائع کرتا ہے۔ بڑی تقطیع پر ۵۰ صفحے کا حجم ہو لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ اور قیمت سالانہ ؏ ہے۔ تصویریں بھی دیتا ہے۔

مضامین کے لحاظ سے نہایت قابل تعریف ہو۔ ہم کو امید ہے کہ یہ رسالہ ترقی کرے گا۔

سروش۔ یہ ماہوار باتصویر رسالہ محمد عنایت خاں صاحب حیرت کی ادارت میں ماہانہ لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ حجم چار جزاور قیمت سالانہ قسم اول للعہ ر۔ قسم دوم سے ہے
مضامین اور ترتیب نیز لکھائی چھپائی اور کاغذ کے لحاظ سے یہ رسالہ ادب کے اچھے رسالوں میں سے ہو۔ مارچ نمبر ہمارے پاس بغرض ریویو موصول ہوا تھا جس میں اچھے اچھے اہل قلم کے مفید اور دلکش مضامین نظم و نثر ہیں۔ دو تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

ضیاء القریش۔ یہ رسالہ حکیم محبوب الٰہی صاحب صدیقی زبدۃ الحکماء کی ادارت میں گوجرانوالہ پنجاب سے اس سال ماہوار نکلنا شروع ہوا ہے۔ قومی، اسلامی، تاریخی۔ تمدنی اور ساتھ ہی طبی دلچسپیوں کا مجموعہ ہے۔ تین جز حجم ہوتا ہے اور قیمت بھی سے ر سالانہ ہے۔ منیجر صاحب ضیاء القریش گوجرانوالہ سے طلب فرمائیں۔

شذرات

جو پیدا ہوتا ہے وہ مرتا بھی ہے - اس دنیا کا یہی دستور ہے۔ مرنے والے کی موت پر سچے جھوٹے آنسو بھی بہائے جاتے ہیں، اتنا اٹل تو نہیں پر یہ بھی دستور ہے، امیروں کی موت پر لوگ چلا چلا کر روتے ہیں اور غریب کی تربت پر کوئی غمزدہ چند خاموش آنسوؤں کے موتی چڑھا دیتا ہے۔ اچھا تو نہیں ہے شرافت انسانی کا یہ تقاضا ہونا چاہئے پر کیا کیجئے یہ بھی دستور ہے۔ مگر کچھ موتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر آدمی چلاتا بھی ہے اور چلانے سے زیادہ خاموشی سے آنسو بہاتا ہے۔ یہ اُن بافیض ہستیوں کی موت ہوتی ہے جو اگرچہ غنی اور امیر تھیں مگر جن کے دل غریب تھے اور دردمند۔ جو اپنی دولت کو اپنے بنی نوع کی امانت سمجھتی تھیں اور اس امانت کے فرض کو زندگی بھر دیانت سے ادا کرتی تھیں۔ اس مہینہ میں ہماری بدنصیب قوم سے ایک ایسی ہستی اُٹھ گئی۔ اور اس کے اُٹھنے سے اس تشنہ کام زمین میں سے فیض کا ایک چشمہ بند ہو گیا۔

ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ کی موت پر جتنا ماتم اشخاص نے کیا ہو گا اس سے زیادہ اداروں نے کیا ہے۔ اس لئے کہ شاید ہی ملک کا کوئی مفید ادارہ ہو جو اس فیاض خاتون کے دست کرم سے فیضیاب نہ ہوا ہو۔ اور مدد بھی بے سمجھی مدد نہیں کون ادارہ ہے جس کی ان خوبیوں کو جنہیں ظاہر بیں نگاہیں نہیں پہچانتیں اس نے نہ سمجھ لیا ہو اور اس پر کارکنوں کی حوصلہ افزائی نہ کی ہو اور کونسی وہ برائیاں ہیں جو ظاہری شان و شوکت کی وجہ سے کم نظر لوگوں سے پوشیدہ رہتی ہیں انہیں اس نے نہ دیکھ لیا ہو اور بے لاگ تنبیہ نہ کر دی ہو۔ ہمارے ملک میں اور بھی اہل کرم ہیں پر انہیں ہم نے سر بفلک عمارتوں میں فقدان روح پر ماتم کرتے اور مفلس و نادار کارکنوں کی جھونپڑیوں میں اگلوں کے نمونوں سے ڈھارس بندھاتے نہیں سنا۔ یہ چیز

مرحومہ ہی کے ساتھ مخصوص تھی اور اب شاید اس اجتماع صفات کو آنکھیں ڈھونڈیں گی اور مشکل سے کہیں پائیں گی۔

گزشتہ سال جب جامعہ کا وفد بھوپال حاضر ہوا اور مرحومہ نے اسے شرف باریابی بخشا اور حکیم صاحب مرحوم کا ذکر آیا تو فرمانے لگیں کہ مجھے جب حکیم صاحب مرحوم جامعہ دکھا رہے تھے تو میں نے ان سے کہا تھا، کہ حکیم صاحب، اب میری دنیا میں بس ایک آرزو ہے۔ کہ جب یہاں سے جاؤں تو آپ اور میری قوم یہ کہدے کہ "یہ خادمۃ المسلمین" تھی۔ افسوس کہ حکیم صاحب نہ رہے انہوں نے تو مسلمانوں کی خدمت ہی میں جان دی" ہاں حکیم صاحب تو نہیں ہیں لیکن مسلمانان ہند آج زبان حال سے اس خادمۃ المسلمین کا جو اسی خدمت کی وجہ سے انکی مخدومہ تھی ماتم کر رہے ہیں اور جبتک انکا کوئی بھی تعمیری کام جاری ہے اس محسنہ ملت کی یاد باقی رہے گی خدا مرحومہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور حضور نواب صاحب بھوپال اور دیگر پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور قوم کو ان کاموں کو اچھی طرح چلانیکی توفیق دے جن میں سے اکثر کا وجود اور بہتوں کی ترقی مرحومہ کے دست کرم کی رہین منت ہے۔

دور حاضر میں شاید مسلمانان کے اندر تنظیم، تعمیر ملت، اتحاد پر کبھی تقریر و تحریر کی اتنی قوت صرف نہ کی گئی ہوگی جتنی کہ پچھلے ۔ ۔ ، سال میں۔ اور شاید اس ملک میں ہماری پوری تاریخ کا کوئی زمانہ ایسا نہ بتایا جاسکے جب انتشار، تخریب اور نفاق کی قوتیں اس سے زیادہ قوی ہوں جتنی کہ اس زمانہ میں رہی ہیں۔ تفصیلات کو چھوڑ کر، کہ انکے ذکر اور خیال سے کلیجہ منہ کو آتا ہے، یہ حقیقت کسی چشم بینا سے پوشیدہ نہ ہوگی کہ اس زمانہ میں مسلمانان ہند کے سامنے کوئی ملی مطمح نظر، کوئی تمدنی مشق، کوئی سیاسی پروگرام، نہیں رہا۔ انکی سیاست، انکی تعلیم، انکی تنظیم، انکی تبلیغ سب کسی دھمکی کے جواب میں، کسی دوسرے کو نیچا دکھلانے کے لئے، کسی پر غصہ اتارنے کے لئے، رہی ہے۔

اور یہ نہیں کہ یہ مخالفت صرف قومی یا معاشی ہو، اکثر و بیشتر خود مختلف "رہنمایان ملت" کی باہمی رقابت، مزاجوں کی عدم مناسبت، طبیعتوں کی عجلت پسندی، تعاون کی کمی اور رواداری سے بیگانگی اس مصیبت کا باعث ہوئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہماری جماعتی سعی کے تمام میدانوں کا مجموعی حاصل صفر ہے۔ اور یہی نہیں کہ پچھلے زمانہ کی بے ثمری پر ہی آنسو بہائے ہوں آئندہ کی توقعات بھی کچھ بہت حوصلہ افزا نہیں۔ اسلئے کہ جماعتی کاموں میں اہم کام تقریباً سب صبر آزما اور دیر طلب ہوتے ہیں۔ اور ایک نسل کو اپنے کاموں کے چلاتے رکھنے کے لئے آئندہ نسلوں کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے رہنماؤں کی اس نسل نے جس کے ہاتھ میں بظاہر اسوقت ملی زندگی کی باگ ہے۔ جب حال کو بگاڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تو ان سے استقبال کے لئے کیا توقع ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ملی زندگی کے کسی شعبہ پر نظر ڈالئے موجودہ کام کرنے والوں کے جھگڑے ٹنٹے دکھائی دینگے اور آئندہ کام کرنے والوں کا کال۔ شاید کسی جماعت کے نوجوان اپنے رہنماؤں سے اتنے بیزار ہونگے جتنے مسلمانان ہند کے۔ اس لئے نہیں کہ ہمارے نوجوان کام سے جی چراتے ہیں، قربانیوں سے ڈرتے ہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ اس باب میں مسلمان نوجوان کسی سے پیچھے نہیں لیکن جب وہ خلوص و عقیدت، خدمت و ایثار کی نظریں لے کر کبھی اپنے رہنما کے سامنے جاتے ہیں تو انکے دل امیدوں، حوصلوں اور ولولوں سے لبریز ہوتے ہیں۔ مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ یہ سب   سے مایوس لوٹتے ہیں۔ پھر جس شدت کی انکی امیدیں تھیں اسی شدت کی مایوسیاں ہوتی ہیں۔ اور یہ شخصی اغراض کو حاصل کرنے میں اپنی قوتیں صرف کرنے لگتے ہیں۔ جماعتی معاملات سے بس اتنا لگاؤ ہوتا ہے کہ فرصت کے اوقات میں اس فطری قوت مبالغہ سے کام لیکر جو شباب کی خصوصیت ہے ان رہنماؤں کی ہجو سے اپنی محلسوں میں گرمی یا تفریح کا سامان پیدا کرتے ہیں اور اس طرح قومی کاموں میں بداعتمادی اور مایوسی کی فضا دن بدن قوی تر ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ عقیدہ اب ہندوستان کے مسلمانوں میں عام ہے کہ مسلمانوں کی سیاست ہو یا تعلیم، اصلاح معاشرت کی کوشش ہو

یا تبلیغ دین کی سب کی سب خود پرستی اور شخصی ضد اور ہٹ یا شخصی اغراض کے مظاہر اور پرتو ہیں۔ قومی زندگی کا انتشار اس عقیدہ کی تصدیق کرتا اور تصدیق سے اسے اور قوی بناتا ہے۔

پھر کیا اس قوم کے لئے جس نے دنیا کو چھوڑی خود ہندوستان کے لئے اتنا کچھ کیا کہ کسی اور نے بس اتنا ہی کیا ہوگا اس سے زیادہ نہیں، جس نے اس ملک کے تمدن کی جسم مردہ میں جان ڈالی، جس نے اس کی مذہبی زندگی کو رسمیت کے جمود سے اٹھا کر خلوص کی راہ پر لگایا جس نے اس کی سرزمین پر ایسی عمارتیں کھڑی کر دیں جنھیں آجتک انسانوں کی آنکھیں ہی نہیں آسمان، ستارے بھی حیرت سے دیکھتے ہونگے، جس نے اس کی موسیقی کو جلایا، اس کو ایک نئی زبان دی جو اور سب زبانوں سے زیادہ اس کی قومی زبان بننے کی اہل ثابت ہوئی جس نے اس کی منتشر سیاسی زندگی میں مرکزیت پیدا کی اور اس طرح ایک متحدہ ملک اور قوم کی بنیاد ڈالی، جس کے بہادروں نے اس کی تاریخ کو شجاعت وجوانمردی کے وہ افسانے دئے جنہیں پڑھ پڑھکر اسکی آئندہ نسلیں ہمیشہ اپنے دل گرمائیں گی جس کے فقیروں نے بےغرض خدمت خلق کی وہ روایات چھوڑیں کہ انپر چلکر ہی آجتک اس ملک میں کوئی مفید سیاسی وسماجی کام ممکن ہے۔ تو کیا اس قوم کے لئے دوسروں کے ظلم وستم سے نہیں خود اپنی غفلت اور اپنے انتشار سے مستقبل کی کوئی امید نہیں ؟ لکھتے ہوئے قلم کانپتا ہے لیکن ہاں، اگر اب اس کے پاس شخصی خودغرضی اور انفرادی خواہش تفوق کے علاوہ جماعتی زندگی کے لئے کوئی تحفہ نہیں تو اس کے رہنما اپنی خودغرضیوں اور خود پرستیوں پر "حقوق المسلمین" کے لاکھ پردے ڈالیں یہ ناگوار حقیقت نہ چھپیگی اور اس بدنصیب جماعت کا وہی حشر ہوگا جو ہر اس مجموعہ کا ہوتا ہے جس کے اجزا میں خودسری پیدا ہوکر اس کے ذرہ ذرہ کو منتشر کر دیتی ہے، اور پھر ہوا کا ہر ہلکا سا جھونکا ان دونوں کو جدہر چاہتا ہے اڑائے پھرتا ہے۔

جماعت کے ذروں یعنی افراد میں ارتباط، اشتراک، مقاصد، اشتراک روایات، اشتراک عقائد سے پیدا ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے موجودہ انتشار کو بھی اگر کوئی چیز رفع کرسکتی ہے تو یہی۔ اور جب ہندوستان میں مسلمانوں کی طرف سے ساری گفتگو کی اور حقوق طلبی کی بنا ہی یہ ہے کہ ہم تمدنی شخصیت ملی رکھتے ہیں جسے ہم کسی دوسری سماجی شخصیت میں ضم کرنے کو آمادہ نہیں اور جس کی ہلاکت کو ہم نوع انسانی کا نقصان جانتے ہیں تو مسلمانوں پر اور بھی لازم ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی جماعت کو اپنے مخصوص تمدنی و معاشرتی وظائف سے آگاہ کریں اور انمیں انکے لئے سعی و کوشش کا جذبہ اور اس جذبہ کو بارآور بنانے کے لئے محنت و استقلال کی عادت ڈالیں۔ یہ کام از سر تا پا تعلیمی کام ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک مسلمانان ہند کے لئے وقت کی سب سے بڑی ضرورت انکی ملی تعلیم کا مسئلہ ہے۔

ہندوستان میں سرسید مرحوم کے وقت سے مسلمانوں کی توجہ کم و بیش اس تعلیمی مسئلہ پر رہی ہے لیکن شیرازہ ملی کی عام پراگندگی، معاشی حالت کی پستی، اور حکومت کے شوق نے مسلمانوں کی توجہ تمامتر اسی تعلیم کیطرف رکھی جو انہیں سرکاری ملازمتوں کے لائق بنادے۔ اور اس تنگ نظری کے باعث مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد کے نتائج بہت حقیر اور جماعتی اعتبار سے بہت ہی ناقابل اعتنا رہے۔ اور اس وقت اسی تنگ نظری کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ جب ملک میں جمہوری ادارے قائم ہو رہے ہیں تو مسلمان ان سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ علیگڈھ اور چند دوسری اعلی تعلیمگاہوں نے بعض ایسے لوگ تو پیدا کردئے ہیں جو وزارتیں کرنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں اور اہلیت سے زیادہ خواہش بھی۔ لیکن وہ رائے دینے والے ابتک ناپید ہیں جو جداگانہ حلقہائے انتخاب کی صورت میں بھی اچھے نمائندے بھیج سکیں۔ ملک کے موجودہ سیاسی اداروں میں خالص مسلم حلقہائے انتخاب کے چنے ہوئے نمائندوں کے کارناموں پر نظر ڈالئے اور ان کی قابلیت، حالات سے واقفیت، معاملات

کے فہم کا اندازہ لگائیے اور دوسرے نمائندوں سے انکا مقابلہ کیجئے تو سوائے شرم سے سر جھکالینے کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ غرض ہر لحاظ سے خواہ اپنے تمدنی و مذہبی خصائص کی حفاظت کیلئے خواہ اپنی سیاسی حیثیت کو سنبھالنے کے لئے، ضرورت اس کی ہے کہ مسلمانوں کا تعلیمی نظام اس ملک میں اچھا ہو۔ ہمیں امید ہے کہ اس انتشار کے زمانے میں بھی دو چار مسلمان تو ایسے ہوں گے جو اس اہم مسئلہ پر غور کریں اور مسلمانوں کے تعلیمی پروگرام کو انکی مخصوص ضروریات کے لحاظ سے طے کریں۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر دو چار آدمی ایسے بھی ہونگے جو اپنے بس بھر اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرینگے اور شاید یہی جماعت اپنے کام کی خوبی اور اپنی راہ کی صحت کے سبب بہت سے ساتھی جمع کرے اور یہ اہم قومی ضرورت پوری ہو جائے

اس باب میں غور طلب مسائل کی تعداد غیر محدود سی ہے لیکن چند چیزیں بہت اہم ہیں اور ان پر غور کرنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے وہ مسلمانوں کے لئے سخت مضر ہے۔ سب سے اہم مسئلہ تو غالباً ابتدائی تعلیم کا ہے۔ آیا مسلمانوں کا عام اور لازمی ابتدائی تعلیم کا نظام حکومت کے ہاتھ میں ہونا چاہئے، چاہے وہ پردیسی حکومت ہو چاہے ہندوستانی، انہیں خود اپنا جداگانہ نظام رکھنا چاہئے۔ اس ابتدائی تعلیم میں اپنی مخصوص ضرورتوں کی رعایت کرنا مسلمان ماہرین تعلیم کا نہایت مشکل مگر اتنا ہی ضروری فرض ہے۔ وہ کم سے کم عقیدے جنکی جگہ ہر مسلمان کے دل میں ہونی ضروری ہے، وہ کم سے کم ملی روایات جن سے آشنائی حیات ملی کے لئے ازبس ضروری ہے۔ وہ ضروری رجحانات جن کے بغیر ایک بدلتی ہوئی دنیا میں زندگی ممکن معلوم نہیں ہوتی وہ ضروری عادتیں جنکے بغیر کارزار حیات میں کامیابی کا تخیل بھی ناممکن ہے کسطرح ہر مسلمان میں پیدا کردی جائیں۔ اس ضرورت کو کیسے نصاب تعلیم سے حاصل کیا جاسکتا ہے اور کیسے معلموں کی معرفت یہ سب سوال اپنی جائے کیلئے بہترین قابلیت کے لوگوں کی مخلصانہ فکر کے محتاج ہیں۔

ثانوی تعلیم کے متعلق مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وسیع پیمانہ پر خود اسکا انتظام کرنے یا

حکومت سے انتظام کرانے کے بجائے اپنی معاشی حالت کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ بہتر نہ ہوگا کہ صنعت و دستکاری کے مدارس کے قیام کی طرف زیادہ توجہ کیجائے۔ اور علمی و ادبی تعلیم کا انتظام صرف ان لوگوں کے لئے ہو جو یا تو اسکی خاص اہلیت رکھتے ہیں یا اپنے وسائل کی فراخی کے باعث اعلیٰ تعلیم سے بھی فیضیاب ہونا چاہتے ہیں۔ ثانوی تعلیمگاہوں میں اور نیز مخصوص اعلیٰ مذہبی درسگاہوں میں دین کی تعلیم کی طرف بھی فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ کیا دین کی تعلیم کا نام چندے وصول کرنیکے لئے ہی لیا جاتا ہے اور دین کے نام سے غلط سائنس اور ناکمل فلسفہ اور کچھ قانون پڑھایا جائے۔ یا واقعی اس تعلیم سے دین کی عزت و عظمت دل میں پیدا کرائی جائے اور اس سے محبت و تعلق، دل کی صفائی اس کا مقصود ہو یا دماغ پر بوجھ۔ اس ضمن میں موجودہ اسلامیہ اسکولوں اور عربی دینی مدارس کی مذہبی تعلیم کی پوری تحقیق اور اس کے نتائج کی جانچ ازبس ضروری ہے، کہ کہیں دین کی جڑ کھوکھلی کرنے کا نامبارک کام بے سمجھے انہیں کی معرفت نہ انجام پا رہا ہو۔

علوم جدیدہ کی اعلیٰ تعلیم کے متعلق جسپر اتبک مسلمانوں نے اپنی ساری قوت صرف کی ہے، یہ سوچنا ہے کہ اس کے لئے اپنے مخصوص جامعات اور کلیوں کی ضرورت کس حد تک ہے اور اگر ہے تو آیا انہیں سب وہ کچھ کرنا چاہئے جو دنیا کی یا ملک کی اور جامعوں میں ہوتا ہے یا اپنے کام کو محدود کر کے پہلے صرف ان چیزوں پر توجہ کرنی چاہئے جس سے ملت کے اہم فوائد وابستہ ہوں۔ یہ سوچنا ہے کہ ہم اپنی ملی جامعات میں طبعیات و کیمیا، حیاتیات و فلکیات کے اعلیٰ شعبے ایسی حالت میں بھی قائم کریں کہ ان سے چند سو میل پر دوسری تعلیمگاہیں ان چیزوں کی تعلیم کا ویسا ہی یا اس سے بہتر انتظام کر رہی ہیں۔ اور اپنے ملی مدارس کو چلانے کے لئے اچھے معلم تیار کرنیکا کام ہم دوسروں پر چھوڑتے رہیں جو ایسا کام ہے جسے یہی نہیں کہ دوسرے کرتے نہیں بلکہ کر ہی نہیں سکتے۔ کیا ہم یونان و روما کی تاریخ پر اپنی جامعات میں اس سے بھی پست درجہ کی تعلیم کا انتظام

کرتے ہیں جتنی یورپ کے معمولی سے معمولی مدرسہ میں ہوتی ہے اور ہندوستانی اور اسلامی تاریخ پر تحقیق کا کام پس پشت ڈالکر یورپ کے مستشرقین کیلئے چھوڑدیں جو باوجود اپنے علم و فضل کے اس تاریخی مواد کے فہم سے بوجہ اختلاف تمدن و اختلاف تخیل بڑی حد تک قاصر ہیں۔

عورتوں کی تعلیم کے متعلق مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آیا وہ اسمیں بھی وہی غلطی کرینگے جو مردوں کی تعلیم میں ان سے ہوئی۔ یعنی اپنی تمدنی متاع کو چھوڑکر دوسروں کے خزانوں سے فائدہ اٹھانیکی ناکام و نامراد کوشش کیا عورتوں کی تعلیم میں بھی کیجائیگی اور اس طرح ایک مضمحل ملت کے بکھرتے ہوئے شیرازہ کو بالکل منتشر کردیا جائیگا۔ ہم اپنی عورتوں کو اچھی باتیں بتانے کی کوشش کرینگے یا اچھی دلیل؟ اس سلسلہ میں بھی موجودہ رجحانات بہت خطرناک ہیں اور اگر کسی صحیح رہنمائی نے انکی رفتار کو روکا نہیں تو زیادہ عرصہ نہ گذریگا کہ قیام و بقاء ملت اسلامی کی امید کا یہ آخری مورچہ بھی اندھی تقلید اور مردہ جمود دونوں کے ہاتھوں سر ہوچکیگا۔ اللھم حفظنا۔

بچوں اور بچیوں، لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے ان مسائل کے علاوہ بالغوں کی تعلیم اور نیز عام ضرورت ملی سے دلچسپی اور لگاؤ پیدا کرنیکا مسئلہ بھی مذکورہ بالا مسائل سے کسی طرح کم اہمیت نہیں رکھتا۔ کہ نہ تو اس کے بغیر کم عمر افراد ملت کی تعلیم کا مسئلہ صحیح طور پر حل ہوسکتا ہے اور نہ ملک کے جمہوری اداروں میں شرکت اسکے بدون مسلمانوں کے لئے مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ غرض متعدد مسائل ہیں جنپر غور و فکر کی اشد ضرورت ہے۔ ہم نے صرف چند مسائل کی طرف اس امید سے اشارہ کیا ہے کہ اہل فکر حضرات انکی طرف توجہ کرینگے اور ہم اسے بڑی خوش نصیبی سمجھینگے اگر "جامعہ" کے صفحات ان مسائل پر بحث و نظر کے لئے کام میں لائے جائیں۔ ہمارا قصد ہے کہ ملک کے اہل فکر کو ان مسائل پر اظہار رائے کی علٰحدہ شخصی طور پر بھی دعوت دیں لیکن اس وقت ان سطور کے ذریعہ ناظرین جامعہ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان یا ان جیسے اور مسائل کے متعلق اپنی رائے سے ہمیں مطلع فرماکر ممنون فرمائیں۔

چاند کا دیکھنا اچھا مانا جاتا ہے۔ "دوج" ہو تو مبارک، اور "پورن" ہو تو دلکش ہوتا ہے۔ اردو "چاند" کا بھی یہی حال ہے، اس کو دیکھنا اصلاح و فلاح کی فال ہے، امن و محبت کا نور پھیلاتا ہے۔ علم و ہنر کی چاندنی چھٹکاتا ہے، آنکھ، دماغ، روح اور دل کے لئے سرمایۂ نور و سرور ہے۔ زن و مرد سب کا خیر خواہ، بچوں کا دل بہلاؤ، بوڑھوں کا ہمدم، جوانوں کا رفیق، اور پژمردہ دلوں کے غنچہ ہائے دل کو کھلانیوالا ثابت ہو رہا ہے۔ آٹھ روپیہ میں ہر مہینہ سوا سو صفحوں سے بھی زیادہ۔ عمدہ کاغذ، صاف لکھائی، اعلیٰ چھپائی اور نفیس مضامین نثر و نظم کے ساتھ بکثرت دلکش تصاویر کا مرقع دیکھئے اور سال میں ایسی ہی بارہ کتابیں ملاحظہ فرمائیے۔ یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔ نمونہ منگا کر دیکھئے یقین ہے کہ آپ ضرور پسند فرمائینگے اور دل و جان سے خریدار بنینگے۔ ع " ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے "

ایڈیٹر منشی کنھیا لال، ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی ایڈووکیٹ۔ چندہ سالانہ ۸؎ ششماہی ۵؎ فی جلد ۱۲؍ کاپی نمونہ بلا قیمت ارسال ہوگی

چاند

نگاہ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں

چاند (اردو) کے دوسرے نمبر کو ایک ہزار زائد شائع کیا گیا۔ اور تیسرا نمبر اور بھی ایک ہزار بڑھایا گیا۔ مگر نمونہ کی مانگ کیلئے کافی نہ ہو سکا۔ اس سے ضرور معلوم ہو گیا کہ پبلک کو "چاند" پسند آیا۔ لیکن چاند کے نوبہ نور رہنے کیلئے اس کی سخت اور جلد تر ضرورت ہے کہ اس کے مستقل معاونین کی تعداد فی ہو جائے تاکہ یہ رسالہ اپنے زندہ رہنے کی امید پاکر نور افشانی اور خدمت گزاری ملک و قوم میں بیش از پیش سرگرمی دکھا سکے۔ اس وقت ہم ذیل میں معاصرین اور علم دوست اصحاب کی معزز آراء کا کچھ خلاصہ دیتے ہیں۔ اس سے پبلک کو چاند اردو کے متعلق صدائے تحسین بلند ہونے کا تھوڑا علم ہو جائیگا۔ اور وہ اس کی عدات سے مستفید ہونے کے لئے اس کے قائم و باقی رکھنے کی سرپرستانہ کوشش فرمائینگی کیونکہ کوئی رسالہ یا جریدہ جبتک وہ اپنی حیات کی ضمانت نہ پا جائے کبھی مفید خدمت انجام ہی نہیں دے سکتا۔ اور خدانخواستہ اُس کا ابتدائی عمر میں ناکام و معدوم ہو جانا تو اور بھی بُرا ہے۔ اس سے نہ صرف پریس کا اعتبار جاتا رہتا ہے۔ بلکہ قوم و ملک کی شہرت پر بھی بدنما دھبا لگتا ہے۔ کہ اُس کے تغافل سے ہونہار خدمتگزار پنپنے نہیں پاتے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ناظرین قدردانی اور اعانت سے کام لینگے اور بہت جلد چاند کی مستقل اشاعت اس قدر بڑھا دینگے کہ وہ دُور از حال (غروب و زوال کی زد میں) نہ آسکے۔ چند آراء کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

معاصرین کی ہمت افزائی

اخبار خبردار ہفتہ وار لاہور: "چاند 'اردو' بھی ہندی چاند کی طرح ہندوستان کی بد رسموں کے دور کرنے میں جد و جہد کر رہا ہے۔ ہم بزور سفارش کرتے ہیں کہ ہر اردو داں پبلک اس رسالہ کو ضرور خریدے اور دیکھے کہ وہ خود کہاں ہے اور زمانہ اسے کس جگہ چاہتا ہے؟"

نظام عالم: "میں بلا خوف ملامت کہہ سکتا ہوں کہ یہ رسالہ جہاں قوم و ملک کیلئے چراغ ہدایت ہے۔ وہاں انفرادی حیثیت سے اُس کی سیاسی دُنیا کا اچھا نشا اور مذہبی دُنیا کا بہترین پیشوا ہے۔ ہم خدا سے پبلک کے دلوں کو اس کی خریداری کی طرف مائل کرنے کی دُعا کرتے ہیں۔"

جھنگ سیال لاہور: "اردو علم ادب کی ترقی چاہنے والوں کو بلا جھجک چاند کا خریدار بن جانا چاہیئے۔"

پرکاش لاہور: "چاند (اردو) اس سے بھی زیادہ خوبیوں کے ساتھ نکلے اور مقبولیت میں ہندی چاند سے پیچھے نہیں رہیگا۔"

اکالی: "رسالہ کی اُٹھان کو دیکھکر اس کی کامیابی یقینی نظر آتی ہے۔ کہ یہ رسالہ بہت ہر دل عزیزی حاصل کریگا۔"

شعلہ ہفتہ وار: "الہ آباد کی ایک ہیجان خیز وطن کی یاد اور ملک کے درد ترپ اُٹھتی ہے۔ اور یکجہتی کی اُلفت سے اتفاق کے میدان میں عملی قدم بڑھاتی ہے۔ وہ رسالہ چاند (اردو) ہے۔ اگر ایک طرف ہندو بزرگوں کے اقوال ہیں۔ تو دوسری جانب ہادی اسلام کے بیش قیمت پند و نصائح۔ زبان بھی وہ پسند کیگئی ہے جو نہ ہندو کی ملکیت ہے اور نہ مسلمانوں کی۔ بلکہ حقیقت میں تمام ملک کی واحد مشترکہ زبان ہے۔"

حقیقت (روزانہ): "الہ آباد کے رسالہ چاند اردو کو اپنے ہندی ہمعصر کے مطابق شاندار و مفید پاتے ہیں۔" (بہت سی آراء کا خلاصہ باقی رہ گیا ہے)

ایڈیٹر منشی کنھیا لال ایم اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ۔ الہ آباد

چندہ سالانہ آٹھ روپیہ ششماہی پانچ روپیہ۔ فی جلد ایک روپیہ۔ نمونہ بلاقیمت نہ جائیگا۔ نام نامی بلا توقف مندرج فہرست خریداران کرائیے۔

چاند (اردو) میں اشتہارات دینا کامیابی کا معقول وسیلہ ہے۔ مفصل کیفیت دفتر چاند (اردو) ایڈیشن چندر لوک، الہ آباد سے دریافت کیجئے۔

خاص نوٹ۔ مضامین نظم و نثر اور دیگر ایڈیٹوریل مضامین کی مراسلت بنام ایڈیٹر چاند (اردو) ہونا چاہیئے۔

رجسٹرڈ
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
جلد ۱۴
بابت ماہ جون سنہ ۱۹۳۰ع
نمبر ۶
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ، ڈی

جلد ۱۷	بابتہ ماہ جون سنہ ۱۹۳۰ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

ارضِ خفی

وسط ایشیائی کی تاریخ حاضرہ پر ایک نظر

وسط ایشیا، کا پورا صفحہ ماضی، حال اور استقبال سے منقش ہے۔ ایک ہنگامہ خیز اور بہت طویل "ماضی" کے بعد اُسکا "حال" بھی کچھ کم نہیں ہے۔ لیکن میں اس کو ارضِ خفی اس لئے کہتا ہوں کہ اُس کے حالات ہماری نظر سے بہت دور رہے ہیں۔ وہ لوگ بھی، اصطلاح جدید میں وہ ماہرین بھی جو ایشیا کے حال و استقبال پر نظر غائر ڈالتے ہیں وسط ایشیا کی اجتماعی زندگی کا بہت کم کھوج پاتے ہیں۔ ایشیا کے جسم کا یہ بظاہر کمزور و مفلوج مگر آئندہ پیدا ہونیوالی قوتوں کے تمام امکانات رکھنے والا عضو گو آج معطل و معذور ہے مگر اپنی رگوں کے اندر زندگی کی کافی حرارت رکھتا ہے وہ حرارت جو قوتوں کے بقا کی ہمیشہ ضامن ہوا کرتی ہے جس دن کسی طوفان کا کوئی جھونکا اس سیاہ چادر کو اٹھا دے گا جو وسط ایشیا کی اسلامی ریاستوں کو ارضِ خفی بنائے ہوئے ہے۔ اُس دن دنیا کے روبرو ایک نئی طاقت زندگی کے میدان میں اپنا حصہ طلب کرے گی۔ ان اعتقادات و جذبات سے قطع نظر میں صرف واقعات بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ہندوستان کے تمام ذریعہ رسل و رسائل نہ صرف محدود بلکہ کلیتاً حکومت کے ھاتھ میں ہیں۔ یعنی جس وقت حکومت چاہے ہندوستان کو ساری دنیا سے علٰحدہ اور بے خبر کر سکتی ہے اس امکان کا ایک نمونہ ہم جنگ عظیم میں دیکھ چکے ہیں۔ جب ہماری آنکھیں غیروں کی آنکھیں تھیں۔ ہمارے کان دوسروں کے کان تھے اور جو رنگی ہوئی خبریں ہم تک آتی تھیں اُنکے علاوہ ہم کسی چیز سے باخبر نہیں ہو سکتے تھے۔

ہندوستان اس اعتبار سے محض ایک قید خانہ ہے۔ جس کا کوئی دریچہ شاذ و نادر ہی کبھی کھل سکتا ہے۔ اور سورج کی روشنی اتنی ہی دیر اس کے اندر داخل ہو سکتی ہے جتنی دیر کہ داروغہ محبس اس کی اجازت دے! جنگ عظیم کے زمانہ میں جب وسط ایشیا ایک بہت بڑے انقلاب کے لئے تیار ہو رہا تھا اس قید خانے کے قیدی وہاں کے حالات سے ناآشنا تھے۔ انقلاب روس کے بعد جب وسط ایشیا کی ریاستوں میں بولشویکوں نے مداخلت شروع کی تو اس وقت کچھ اڑتی اڑتی خبریں ہندوستان تک بھی پہنچیں۔ مگر ان میں سے اکثر کا نہ سر تھا نہ پاؤں۔ اور ان میں سے بیشتر پروپیگنڈا کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ ہندوستان میں جو غلام رہتے ہیں۔ وہ رسل و رسائل کے معاملہ میں۔ ہسپتال کے ان مریضوں سے بدتر ہیں جن کو سوائے اس غذا کے جو ڈاکٹر تجویز کر دے ایک نمک کا ریزہ بھی نہیں مل سکتا۔ اگر ڈاکٹر نے پتلی دال کا پانی تجویز کر دیا ہے تو اب ممکن نہیں کہ اس کے ساتھ ایک نوالہ چاول کا بھی مل جائے! ڈاکٹر کی سخت گیری کے علاوہ خود بیمار کی معذوری و مجبوری کس قدر ماتم انگیز ہے۔ ہندوستان کی اخباری زندگی دوسرے متمدن ممالک کے مقابلہ میں محض صفر ہے۔

الا یہ کہ چند انگریزی کے اخبارات اور چند انگریزی خبر رساں ایجنسیاں ایک خاص سیاسی جماعت یعنی (گورنمنٹ) کی اغراض کو پورا کرتی ہیں۔

ذریعہ معلومات میں نے یورپ میں متعدد سفر کئے اور ہر سفر میں وہاں کے عام باخبری سے تھوڑی بہت خوشہ چینی کی۔ آخری سفر یورپ میں ایک دوست کی عنایت سے وسط ایشیا کے کچھ معتبر سیاسی حالات معلوم ہو سکے میری فرمائش پر ان دوست نے یہ تمام معلومات ایک طویل تحریر کی صورت میں مرتب کر کے مجھے دی۔ لیکن جن دوست نے یہ تکلیف اٹھائی وہ خود ایک مخصوص سیاسی نقطہ نظر رکھتے تھے۔ اور ان کی تحریر ان کے ذاتی عقائد کی رنگ آمیزی سے پاک نہ تھی۔ وہ خود ایک پرجوش کمیونسٹ تھے۔ اور اسی رنگ میں وسط ایشیا کے حالات مجھے

سمجھانا چاہتے تھے۔ میرے لئے یہ دشوار تھا کہ میں اُنکے سیاسی عقائد کے جزوکل سے متفق ہوسکوں۔ انکی امیدوں انکے ارادوں اور اُنکے منصوبوں کا وسیع میدان میرے لئے ہندوستانی نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ دلچسپ نہ تھا لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ اُنکے دئے ہوئے کاغذات کو دوسرے ذریعہ سے بھی جانچا جائے۔ اور پھر جو کچھ لکھا جائے اس کو سیاسی عقائد کی بحث کا ایک میدان بنانے کے بجائے تاریخی تفتیش و جستجو تک محدود رکھا جائے۔ جو حقائق صاف نظر آئیں ان کو یکجا مرتب کر کے شائع کر دیا جائے۔

وسط ایشیا کے حالات و واقعات سے ہندوستان کی بیخبری اتنی زیادہ ہے کہ یہ سلسلۂ مضامین اس ملک کی تاریخ حاضرہ کا بہت ادنیٰ جزو ہونیکے باجود اہل نظر کے لئے کچھ نہ کچھ دلچسپ ضرور ہوگا۔ انہیں خیالات نے مجھے اُن اجزائے پریشان کے یکجا کرنے کی ترغیب دی جو ایک عرصہ سے میرے کاغذات میں ردی کی طرح پڑے ہوئے تھے۔

تاریخ قدیم وجدید | خیوا، بخارا سمرقند توران (یا ترکستان) بدخشاں و بلخ یہ وہ الفاظ ہیں جن سے ہندوستان میں اب بھی مسلمان بچوں کے کان ناآشنا نہیں ہیں۔ جبتک مکاتیب و مدارس میں فارسی زبان کا دور دورہ رہا اور جبتک ایران کی تہذیب و تمدن کا نقش ہندوستان میں باقی رہا۔ اُس وقت تک وسط ایشیا کے یہ اسلامی نشانات ہم سے زیادہ دور نہ تھے۔ جس کسی نے چنگیز خاں کا حال پڑھا یا تیمور کا نام سنا وہ خیوا اور بخارا سے بھی ناآشنا نہ رہا۔ ترکستان میں تیمور کے عہد "طلائی" کا ترکہ ہندوستان کی سلطنت مغلیہ تھی۔ یہ تو سب اب تاریخ قدیم ہے لیکن تاریخ حاضرہ بھی سلجوقیوں۔ چنگیز خانیوں اور تورانیوں کے ہنگاموں سے کم ہنگامہ خیز نہیں۔ گزشتہ جنگ عظیم نے یورپ کے دفاتر خارجہ میں اس حقیقت کو خوب واضح کر دیا ہے کہ کسی نہ کسی دن وسط ایشیا دنیا کی دو سب سے بڑی اور سب سے زیادہ خطرناک طاقتوں کی کشتی کا میدان بنے گا۔ ترکستان و بخارا کے گذشتہ انقلاب نے وسط ایشیا کا بہت بڑا حصہ حکومت روس (سوویٹ) کے زیر

اثر کر دیا ہے ۔ اور اس طرح برطانوی ہندوستان اور روسیوں کے درمیان فاصلہ پہلے کے
مقابلہ میں کم اور اسی اعتبار سے تصادم کا امکان بہت زیادہ ہو گیا ہے ۔ ۱۸۶۵ء میں جس
وقت زار کی فوجوں نے پہلی دفعہ ترکستان میں روسی شہنشاہیت کا جھنڈا بلند کیا تھا ۔ اسی دن
سے انگلستان کے درمیان رقیبانہ جنگ کے امکانات زیادہ قوی ہو گئے تھے ۔ برطانوی ہندوستان
اور روس کے درمیان افغانستان کی آزادی ہی صرف ایک ایسی چیز تھی اور ہے جس نے
اب تک انگلستان کے سرمایہ داروں اور روس کے مزدوروں کی شہنشاہیت کو متصادم ہونے
سے روکا ہے ۔ لیکن اس پیشین گوئی کو تمسخر انگیز نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا کی دوسری اور غالباً
آخری جنگ عظیم اسی وسط ایشیا اور افغانستان کے میدان میں سرمایہ دار اور مزدور تہذیب قدیم و
جدید شہنشاہیت اور جمہوریت کا فیصلہ کرے گی ۔ وہ فیصلہ بہت خونریز اور بہت انقلاب انگیز
ہوگا ! ۔ ترکستان پر روسی شہنشاہیت کا ابتدائی قبضہ محض ایک سیاسی فتح نہ تھی بلکہ ایک بہت
بڑی اقتصادی کامیابی تھی جو روس کے اقتصادی اور تمدنی فلاح و بہبود کی ممد و معاون
ہوئی ۔ زمین کی پیداوار سے زیادہ انسانوں کی خونریزی کا باعث کوئی دوسری چیز نہیں ہوئی ۔
ہر کمزور ملک اس لئے غلام بنتا ہے یا بنایا جاتا ہے کہ اس کی زمین غلہ یا روئی پیدا کرتی ہے ۔
خصوصاً ہر ایشیائی ملک کا سب سے بڑا گناہ یہی ہے جس کی سزا اس کو یورپ کا امپیریلزم دیتا ہے
دنیا کی ہر طاقتور جماعت یا قوم غلہ اور روئی مانگتی ہے اور یورپ کے ہر ملک گیر کی یہ رائے ہے
کہ وہ کمزور ممالک جو غلہ یا روئی پیدا کرتے ہیں آزاد رہنے کا کوئی حق نہیں رکھتے ۔ ترکستان میں
علاوہ غلہ اور روئی کے نہروں اور ریلوں کا وسیع سلسلہ روس کے لئے ایک بہت بڑی اقتصادی
برکت ثابت ہوا ۔ روسی قبضہ کے بعد ترکستان میں روئی کی کاشت بہت زیادہ ہو گئی حتیٰ
کہ آج دنیا کے روئی پیدا کرنے والے ممالک میں ترکستان کا دوسرا درجہ ہے ۔ روس کی
اقتصادی طاقت میں یہ اضافہ عام طور پر سارے یورپ کے لئے دلدوز اور خصوصاً انگلستان کے
لئے روح فرسا تھا ۔ اور اسی وقت سے روس کے اس دیرینہ رقیب کے دل کو ترکستان کی

روئی اور غلہ کے خیال نے بےچین کر دیا تھا۔ مصر کی برطانوی روئی جس طرح روس اور دیگر یورپین ممالک کے دل میں کھٹک رہی تھی اسی طرح ترکستان کی روئی انگلستان کی آنکھ کا کانٹا بن گئی تھی باہمی رقابتوں کے اس عالم میں یکایک جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔

۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب گو اس کی بظاہر توقع نہ تھی مگر حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ جرمنی کی بڑھی ہوئی طاقت نے انگلستان و روس کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے رقیبانہ جذبات کو بھلا کر باہمی تحفظ کی فکر کریں اور جنگ کے پہلے ہی ہفتہ میں دنیائے سیاست نے یہ عجیب منظر دیکھا کہ زار کی شہنشاہیت انگلستان کی امپیریلزم سے بغلگیر ہو رہی ہے بڑے بڑے جنگلوں میں جب طوفان آتا ہے تو سراسیمگی کے عالم میں شیر اور ہرن ایک ہی جگہ پناہ لیتے ہیں۔ اور مشترکہ مصیبت میں اپنی دیرینہ دشمنی کو بھول جاتے ہیں۔ یہی حال جنگ عظیم میں دول یورپ کا تھا۔ اور مشترک خطرے کے مقابلہ میں وہ پرانی رقابتوں کو نظر انداز کر کے اپنی متحدہ قوت جرمنی کے خلاف استعمال کر رہے تھے۔ ۱۹۱۷ء تک یعنی جب تک کہ زار کی خود مختاری کا علم سرنگوں نہ ہوا تھا انگلستان و روس کا اتحاد دنیا کے سارے جغرافیہ کو بدلنے پر تلا ہوا تھا۔ لیکن روسی شہنشاہیت صدیوں کی سخت گیری اور مظالم کے باعث اپنی بنیادیں کمزور کر چکی تھی۔ اور ۱۹۱۷ء میں عامۃ الناس کے انقلاب عظیم کا مقابلہ نہ کر سکی وہ ایک طوفان نوح تھا جس نے سرزمین روس پر شہنشاہیت کا کوئی نشان باقی نہ رکھا۔ اس خونریز انقلاب نے درحقیقت نہ صرف روسی قوم کی آئینی زندگی کو بدل دیا بلکہ اس کا مقصود یہ تھا کہ تمام دنیا کی سیاست کے شیرازہ کو درہم برہم کر کے ایک نئی عمارت تیار کی جائے۔ یہ مقصد کسی نہ کسی وجہ سے حاصل نہ ہو سکا۔ لیکن جو تحریک روس میں پیدا ہوئی تھی وہ اپنی اخلاقی تمدنی سیاسی اور دماغی حیثیت میں ہنوز زندہ ہے۔ اور ملک کے اندر ایک حد تک کامیاب بھی ہے۔ یہ موقع اس بحث کے چھیڑنے کا نہیں ہے۔ کہ فی نفسہ روسی انقلاب کے بنیادی اصول برے ہیں یا اچھے کامیاب ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن جہاں تک ان اوراق

کا تعلق ہے۔ اس واقعہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس انقلابی تحریک سے ایشیا کے بعض ممالک کم و بیش متاثر ہو رہے ہیں۔ قدرتاً انقلاب کا سب سے زیادہ اثر وسط ایشیا پر پڑا جو پہلے ہی سے روس کے زیر اثر تھا۔ آپ ان اوراق میں دیکھینگے کہ ترکستان و بخارا کا انقلاب بھی عام سیاسی انقلاب کی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کے اندر بھی تمدنی جماعتوں کی وہی آویزش صاف نظر آتی ہے جس نے روس کی سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں کو یکسر فنا کر دیا۔ وسط ایشیا کے انقلاب کی بنیاد بھی سوسائٹی کے مختلف طبقات کی باہمی رقابت تھی اور یہی وجہ ہے کہ روس کے انقلاب سے وسط ایشیا کی ریاستیں بہت جلد متاثر ہوئیں اور انکو جدید و قدیم جنگ میں بالشویک اور کمیونسٹ سے کافی امداد حاصل ہوئی۔

وسط ایشیا میں روسی سرمایہ دار۔ وسط ایشیا میں سرمایہ داروں نے اپنے قدم جما دیے تھے۔ جس طرح ہر مفتوحہ ملک میں فاتح قوم کے سرمایہ دار جما یا کرتے ہیں یہ صورت حالات اندرونی نہ تھی بلکہ بیرونی اور ایک فاتح اور شہنشاہیت پرست قوم کی لائی ہوئی تھی۔

زار کی حکومت نے جب وسط ایشیا کو روئی کی کاشت اور غلہ کی تجارت کا مرکز بنایا تو قدرتاً روسی سرمایہ داروں کا پنجہ وسط ایشیا کی گردن پر حاوی ہو گیا۔ روئی کی کاشت اور ریلوے جن سرمایہ داروں کے قبضہ میں تھی وہی ملک کی اقتصادی زندگی پر حاوی تھے۔ زار کی حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ وسط ایشیا کو گورے رنگ والوں کے لئے ایک نوآبادی بنا دیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوتا رہا کہ یورپین روس سے روسی تارکان وطن بھیجے جاتے تھے اور ان کو مرکزی حکومت بڑے بڑے قطعات زمین خاص رعایتوں اور مخصوص حقوق کے ساتھ روئی کی کاشت کرنے کے لئے دیتی تھی۔ یہی لوگ ترکستان میں حاکمانہ اقتدار رکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ ملک کی زمین کا بہت بڑا حصہ روئی کی کاشت کے لئے مخصوص ہو گیا۔ اور زمین کا حاصل روسی سرمایہ داروں کی جیب میں جانے لگا۔ اس طرح ایک خالص زراعتی ملک تجارت اور اس

کے ساتھ آنیوالی اقتصادی مشکلات کا شکار ہونے لگا۔ جیسا کہ ایشیا کے ہر محکوم ملک میں پیش آتا ہے۔ یہاں بھی جو زراعت اہل ملک کی زندگی کا سہارا تھی وہ کم ہوگئی اور ملک کے خوشحال کسان کارخانوں اور روئی کے بازاروں میں یورپین تجار کے دست نگر ہوگئے۔ بجائے زراعت کے وہ مجبور ہوئے کہ مزدوری کریں یا کارخانوں میں نوکری کو وجہ معاش بنائیں ریلوے کمپنی کے دفتروں میں روئی کے کارخانوں میں نہر کے محکموں اور یورپین تجار کے دفاتر میں وہ ملازمتیں ڈھونڈنے لگے اور بے روزگاروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا عہد جدید کا یہ تباہ کن انقلاب ہر محکوم ملک میں یقیناً پیدا ہوتا ہے۔ خواہ کتنا ہی آہستہ اور بتدریج ہو۔

روس کے سرمایہ داروں نے اہل ترکستان کی دنیا بالکل بدل دی اور ایک ایسی اقتصادی داروگیر پیدا کر دی کہ ملک میں ایک دوسرے سے رقیبانہ آویزش رکھنے والے دو طبقے پیدا ہوگئے۔ مزدور اور سرمایہ دار

قدیم تاتار | دنیا کے ممالک میں شاید ہی کوئی ملک تاتار سے زیادہ قدیم اور تاریخی ہو۔ لیکن ہم آج اس کی تاریخ قدیم وجدید سے زیادہ آشنا نہیں۔ جغرافیہ داں یہ بتاتا ہے کہ ترکستان بحیرۂ ارل سے بحیرۂ کیسپین تک ریگستان دریا اور سبزہ زاروں کا ایک وسیع ٹکڑا ہے اس کے ریگستان کسی عہد قدیم کی تاریکی میں سمندر کے نیچے تھے۔

لیکن عہد قدیم کا وہ سمندر خشک ہوگیا جہاں پانی تھا وہاں اب ریگستان ہے جہاں سرسبز جزیرے تھے۔ وہاں اب عہد جدید کی پانچ آبادیاں ہیں جو وسط ایشیا کی ریاستیں کہلاتی ہیں یعنی خیوا بخارا تاشقند کوہ کند اور مرو مورخ بتاتا ہے کہ ان پانچ خانوادوں میں سے ہر ایک ۱۹ ویں صدی عیسوی تک ایک ایک رئیس یا خان کے زیر نگیں تھا۔ یہ خان اپنے قبیلے کے سردار اعلیٰ ہوتے تھے اور اپنے علاقہ میں آزادانہ حکومت کرتے تھے ۱۹ ویں صدی کے وسط میں زار روس کے آہنی پنجہ نے ان خانوادوں کو کچل ڈالا اور وہ روسی شہنشاہیت کے باجگذار اور غلام بنا لئے گئے جو علاقے کسی زمانہ میں ایک دوسرے سے دور تھے اُن

کو ۹ سو میل کی ریلوے نے ایک دوسرے سے قریب کر دیا۔ تمدن جدیدہ کی غلامی کی پہلی بیڑی ریلوے ہی جو آزاد قوموں کو غلام بناتی ہے، اُن ریگستانوں پر جو ان خانوادوں کو ایک دوسرے سے جدا کئے ہوئے تھے۔ ۹ سو میل لمبی آہنی پٹری کا جال پھیلا کر روسی حکومت نے خانوادوں کی خانخانی کو ختم کر دیا۔ آج لینن گراڈ (جس کا نام جنگ سے پہلے پیرو گراڈ اور اس سے پہلے سینٹ پیٹر سبرگ تھا) سے سمرقند تک جہاں دنیا کے عظیم الشان فاتحین میں سے ایک تیمور محو خواب ابد ہی۔ ریل کا سفر پانچ دن میں ختم ہو جاتا ہے اسی ریلوے کی دو شاخیں مرو اور بحیرہ کیسپین کے بندرگاہ کراستو وڈوسک تک جاتی ہیں۔ یہ دو مرکز وہ ہیں جن کو کہا جاتا ہی کہ ہندوستان پر حملہ کرنیکے لئے روسی حکومت نے قائم کیا تھا۔ اگر اس جغرافی حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے کہ مرو ہرات سے شمال کی طرف صرف ۲۰۰ میل کے فاصلہ پر ہے اور یہ تاریخی حقیقت بھی یاد رکھی جائے کہ ہرات افغانستان کا وہ دروازہ ہے جن سے ہندوستان کے بہت سے فاتح گزر چکے ہیں تو ماننا پڑے گا کہ ۱۹ ویں صدی کے برطانوی ماہرین سیاست کا یہ خطرہ بے بنیاد نہ تھا۔ اسکندر، تیمور، چنگیز اور نادر کے بعد ایک دن نکالس کی فوجیں بھی روسی راستہ پر قدم بڑھا سکتی تھیں۔ لیکن بہ یک گردش چرخ نیلوفری" وہ سارے نقشے درہم برہم ہو گئے اور زمانہ کے بے پناہ ہاتھ نے نکالس کے تن بے جان کو گوشۂ قبر سے بھی محروم کر دیا۔ ہندوستان کے ہونے والے فاتحین عرصہ تک ایک ایسی خونریزی میں مبتلا رہے کہ جس کی مثال کم از کم عہد جدیدہ کی تاریخ کے اندر ملنا مشکل ہو تاہم اگرچہ زار کی طاقت باقی نہیں لیکن برطانوی ہندوستان کے متعلق روسی تخیل ہنوز باقی ہے۔ ہو سکے جبونکے اب بھی مرو و ہرات کی طرف آرہے ہیں وہ وقت دور ہو مگر مشتبہ نہیں ہو!

وسط ایشیا کے باشندے زیادہ تر منگول نسل سے تعلق رکھتے ہیں مذہب عام طور پر اسلام ہے۔ بخاریوں اور ترکستانیوں کی طرح ترکمان تاتاری اور کرغی وغیرہ بھی ایسے قبائل ہیں جن کا خون ایک دوسرے سے ملا ہوا ہے انکی سیکڑوں نسلوں نے صرف ایک

ہی طرز تمدن دیکھا ہے یعنی قبائل پر خانوں اور ملاؤں کی حکومت اور ایک قسم کی مذہبی خود مختاری روسی فتوحات نے اس تمدنی حالت کو بدستور چھوڑ دیا اور صرف کیا یہ کہ عامۃ الناس سے اپنے لئے زیادہ مقدار میں ٹیکس وصول کر کے انکو مفلس بنا کر پہلے سے زیادہ سرمایہ داروں کا غلام بنا دیا۔ وسط ایشیا کی ان ریاستوں کے باشندے روسی حکومت کے تحت میں تعلیم سے ہمیشہ محروم رہے۔ اس لئے کہ محکوم اقوام کی تعلیم و تربیت کو زار کی گورنمنٹ اپنے لئے خطرناک سمجھتی تھی۔ چنانچہ روسی فتوحات کے بعد بھی وسط ایشیا جدید تمدن و علوم سے اتنا ہی دور رہا جتنا کہ پہلے تھا البتہ زندگی کی سادگی جو وسط ایشیا کے لئے ایک قدیم برکت تھی ناپید ہو گئی روسی حکومت کی رشوت ستانی سختگیری اور تہذیب جدیدہ کے مکروہ خصوصیات کی بدولت ملک کے بدنصیب باشندوں کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتے لگی ملک کی زمین روئی کی کاشت کے لئے روسی سرمایہ داروں کے قبضہ میں محفوظ کر لی گئی اور کاشتکار و مزدور بے روزگاری کا شکار ہونے لگے۔ ایک محکوم ملک میں ان حالات کا جو نتیجہ پیدا ہوا کرتا ہے اس کے آثار وسط ایشیا میں بھی نظر آنے لگے اور جنگ کے جو اثرات دنیا کی دوسری محکوم قوموں پر مرتب ہو رہے تھے وہ وہاں بھی اپنا کام کرنے لگے۔ حکومت کی سخت گیریوں اور عام افلاس نے وسط ایشیا کے باشندوں میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا اور رفتہ رفتہ ایک حقوق طلب جماعت عالم ظہور میں آئی جس نے اپنے حقوق شہریت کا مطالبہ شروع کر دیا اُس زمانہ کی روسی حکومت نے جو بلاشبہ اُس وقت دنیا کی جابر ترین حکومت تھی اپنے غلاموں کی اس جسارت کو انتہائی سختی کے ساتھ روکا۔ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔

قومی تحریک کے خلاف اس قسم کی انسدادی کارروائیوں نے اصل تحریک کو بظاہر مٹا دیا۔ مگر درحقیقت سطح کے نیچے پہنچا دیا اور ایک آئینی تحریک ایک خفیہ سازش بن گئی، وہ مردوں کے پیچھے اور حکومت کی نظر سے دور اپنا کام کرنے لگی۔ قوم پرستوں کی یہ جماعتیں جو ایک ہی مقصد کے لئے مختلف ناموں کے ساتھ کام کر رہی تھیں اندر ہی اندر اپنا پروگرام مضبوط

بناتی رہیں" نوجوان سارو"، "نوجوان کرغی" "نوجوان بخاری"، وغیرہ یہ سب اُن جماعتوں کے نام تھے جو انقلاب روس کے بعد اور کرنسکی کے برسر اقتدار آتے ہی پردے سے باہر آگئیں۔

آغاز انقلاب جس وقت روسی انقلاب شروع ہوا اُس وقت وسط ایشیا میں دو طبقے ایک دوسرے کے مقابلہ میں تیار تھے۔ ایک طرف عمال حکومت کی جماعت تھی جس کے حامی تھوڑے سے مقامی اکابر خوشامدی اور دولتمند اشخاص اور کچھ "ملا" تھے اور یہ سب اپنے ذاتی اغراض و مفاد کے خیال سے حکومت کی اعانت پر تلے ہوئے تھے اور جانتے تھے کہ اگر انقلابیوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور موجودہ حکومت کا نظام قائم نہ رہا تو وہ اپنے ہم قوموں کی جہالت اور کمزوری سے وہ فوائد حاصل نہ کرسکیں گے جو اب تک اس غیر ملکی حکومت کے سایہ عاطفت میں انکو حاصل تھے۔ اور جس کے متعلق ناواقف اور جاہلانہ مذہبی جذبات رکھنے والے لوگ کبھی اعتراض نہ کرتے تھے اور نہ کرسکتے تھے۔ دوسری طرف ایک محدود طبقہ وسطی کے نوجوانوں کی مختصر جماعت تھی جنہوں نے اپنے مطالبہ حقوق کا جواب اکثر تلوار اور بارود سے پایا تھا اور اس لئے جانتے تھے کہ جب کبھی حکومت کے مظالم سے تنگ آکر وہ بغاوت کرینگے تو انکا خون بہانے کے لئے حکومت اُن ہی کے ہم قوموں سے کام لے گی۔ جیساکہ وہ پہلے بھی کئی دفعہ کرچکی ہے۔

روس میں مارچ ۱۹۱۷ء کے ابتدائی انقلاب کا اثر وسط ایشیا تک نہ پہنچ پایا اُس کے اثرات زیادہ تر یورپین روس تک محدود رہے تھے۔ روس کی اس جدید حکومت نے صرف اتنا ہی کیا کہ ترکستان میں ایک نیا گورنر بھیج دیا اُس کے مشورہ اور ہدایت کے لئے مسلمان عمال حکومت کی ایک مقامی کمیٹی بنادی جس کا کوئی اثر امن و نظم حکومت پر نہ پڑ سکتا تھا امیر بخارا وخیوا کی حکومت کو جو درحقیقت روسی حکومت کے ادنےٰ غلام تھے بدستور مضبوط رکھا گیا۔

لیکن اس انقلاب کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ قوم پرستوں کی جماعت نے اپنی قوت اور تنظیم کی طرف زیادہ توجہ شروع کر دی اور جب انکو یہ معلوم ہوا کہ روس میں خود مختاری کا خاتمہ کیا جا چکا ہے تو قدرتاً انہوں نے بھی اپنا یہ مطالبہ پیش کیا کہ اب وسط ایشیا کو کافی آئینی حقوق دئے جائیں ابھی زندگی کا یہ نیا نقشہ قائم نہ ہوا تھا کہ ابتدائی انقلاب کے بعد ہی دوسرا خونریز انقلاب رونما ہوا جس نے سلطنت روس میں بولشویک جماعت کو برسر اقتدار کر دیا۔ اس انقلاب نے وسط ایشیا کی سیاسی فضا میں دفعتاً ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ بولشویک حکومت کی انقلابی پالیسی نے وسط ایشیا کے مظلوم اور مجبور کسانوں اور عامۃ الناس کی آنکھیں کھولدیں اور سوسائٹی کے ان طبقات کی بیداری نے زندگی کے ساکن پانی میں تلاطم پیدا کر دیا۔ بولشویک حکومت نے نومبر ۱۷ء میں اپنا پہلا اعلان وسط ایشیا میں شائع کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ۔

(۱) آئندہ روسی قوم کے تمام عناصر خواہ کسی نسل اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں حکومت کی نظر میں مساوی حقوق اور مساوی درجہ رکھیں گے۔

(۲) اہل روس کو (بلا لحاظ قومیت و مذہب) تجویز طرز حکومت خود اختیاری (Self - determination) کا پورا حق حاصل ہوگا حتی کہ اگر کوئی جماعت روسی حکومت سے قطع تعلق کر کے آزاد رہنا چاہے تو اس کو بھی ایک جداگانہ ریاست قائم کر لینے کا حق حاصل ہوگا۔

یہ اعلان تھا جس نے وسط ایشیا میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی اور اس اعلان کے ایک ایک لفظ کا نہایت جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔

نومبر ۱۷ء کے اس انقلاب کے اثرات وسط ایشیا کی مختلف ریاستوں پر مختلف صورتوں میں نمودار ہوئے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہر حصہ ملک کے متعلق واقعات کو جداگانہ مرتب کیا جائے۔

جدید علم کلام

۴۔ ہم اس بات کو واضح کر دینا بہت ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام نہ مغرب کے خیالات سے مرعوب ہو سکتا ہے اور نہ مشرق کے ان لوگوں کے خیالات سے جو مغربی تعلیم کے زیر اثر ہیں۔ اسکی یہ وجہ نہیں کہ ہم میں کوئی جاہلانہ ہما ہمی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پیش نظر حسب ذیل تین اہم نظریہ ہیں :۔

(۱) اسلام ساری دنیا کے لئے ہے۔ نہ کسی خاص ملک کے لئے

(۲) اسلام کی تعلیم وقت تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہے

(۳) اسلام ساری دنیا اور سب ملکوں کے لئے نجات دنیوی اور نجات اخروی کا واحد مکمل ذریعہ ہے۔

ان نظریوں کو پیش نظر رکھکر ہم جدید علم کلام سے یہ کام لینا چاہتے ہیں کہ اسلام کی تعلیم میں جو کچھ مختص بالمقام۔ مختص بالوقت اور مشترک بمذاہب دیگر ہے اس کو بالکل علٰحدہ کرکے دکھایا جائے۔ اور اگر ممکن ہو تو اسے صراحتًا اختیاری قرار دینا چاہئے۔ اس کے بعد جو کچھ باقی رہیگا وہ متذکرہ بالا تینوں نظریوں کے لئے کافی اور وافی ہونا چاہئے۔ اور یہی فرض و واجب اور لازمی ہو سکتا ہے۔ اس عنوان سے اسلامی تعلیم دو حصوں میں تقسیم ہوگی۔ لازمی اور اختیاری۔ لازمی اسلام کا پاس مارک ہوگا۔ اختیاری نظام اسلام کو قائم رکھنے کے لئے کہیں ضروری ہوگا کہیں غیر ضروری۔ اب اسلام کا ایک آنرز کورس باقی رہ جاتا ہے جس میں خدا رسول کی محبت تعلیم اسلام پر صدق دل سے کاربند ہونا۔ شرافت نفس کو ترقی دینا۔ دوسروں کے لئے اپنا وقت روپیہ اور ہمت صرف کرنا وغیرہ وغیرہ آتا ہے یہ **تصوف** ہے اور اسی لئے اس کی تعلیم شروع ہی سے سینہ بسینہ رہی۔ اور سفینہ کی محتاج قرار نہ دی گئی۔ اختیاری اور تصوفی تعلیم

کسی حال میں بھی پبلک بحث مباحثوں اور مظاہروں کی کفیل نہ کیجائے۔ اگر ہمارا مجوزہ علم کلام یہ تقسیم کرے تو موجودہ خلط مبحث اور انتشار رفع ہوجائے۔ اسلام میں جو بہتر تہتر فرقے کہے جاتے ہیں۔ ان پر نظر تعمق کرڈالنے سے یہ بات واضح ہوگی کہ متکلمین کے اختلافات زیادہ تر فروعی ہیں۔ اصولی نہیں ہیں۔ ایسے جدید علم کلام میں نہایت وضاحت سے بحث کیجائے۔ اور متذکرہ بالا تینوں نظریوں کو ہر حال میں مشعل ہدایت قرار دیا جائے۔ اس کو ہم صرف ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق منصوص قرانی دعلی العرش ستوی ید اللہ فوق ایدیہم۔ فاین ماتولوفثم وجہ اللہ وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ظاہری فرقہ کے متکلمین اس سے جسم لازم قرار دیتے ہیں باطنیہ اور معتزلیہ ان سے خداوند تعالیٰ کا حاضر ناظر ہونا۔ قدرت وغیرہ مراد لیتے ہیں۔ ان اختلافات کی نوبت ایک وقت میں تکفیر تک پہنچی۔ حالانکہ مقصود صرف اتنا ہے کہ اسکی عظمت قدرت اور محیط ہونے پر یقین رکھنا لازم ہے۔ اس سے آگے بڑھئے تو محض مثال کے طور پر مسئلہ خلق قرآن کا پیش کیا جاتا ہے جس پر عرصہ دراز تک کیا کیا لے دے رہی ہے اور کیسے کیسے جلیل القدر علما جبر وتشدد کا نشانہ بنائے گئے ہیں۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ عادت اللہ کے موافق انبیا علیہم السلام پر بندوں کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے احکام صادر فرمائے۔ ہمارے ہاں اس مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ اب اس بحث میں کیا رکھا ہے کہ احکام حادث ہیں یا قدیم۔ ہمارے اوپر کے لکھے ہوئے تینوں نظریوں میں سے تیسرے نظریے کے تحت ہیں کہ اسلام ابدالآباد تک نجات دنیوی اور اخروی کا مکمل اور واحد ذریعہ ہے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے احکام جب تک دنیا موجود ہے جاری رہنے والے ہیں۔ نہ اس میں حادث کی بحث آتی ہے نہ قدیم کی۔ ہمارا نیا علم کلام ان مسائل پر اور ان جیسے اور بیشمار مسائل پر معقول اور مفصل بحث کرے اور ہر معاملہ کو صاف کرے۔

۵۔ عبادات کا مسئلہ بہت اہم اور پیچیدہ ہے خصوصاً نماز کا مسئلہ سب سے بڑی امتیازی شان اسکی بفحوائے ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتاً۔ تحقیق نماز ایمان والوں پر

بپابندی قت فرض ہیں) تدوین فقہ کی رو سے مثلاً صبح کی نماز ساری دنیا میں سورج نکلنے سے قبل ادا کرنی چاہیئے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ضروریات سے فارغ ہونے اور وضو کرنے کے لئے آدھ گھنٹہ پاؤ گھنٹہ سورج نکلنے سے پہلے آدمی اٹھے۔ میں جون جولائی کے مہینہ میں لندن میں تھا۔ جہاں صبح کے تین بجے صبح صادق ہو جاتی تھی۔ انہی دنوں میں وہاں مغرب کی نماز ۹ بجے ہوتی تھی۔ اس کے گھنٹہ سوا گھنٹے کے بعد عشا کی نماز محسوب کر لیجئے تو لندن میں نمازی مسلمان کو دس بجے سے ڈھائی بجے تک صرف چار گھنٹے سونے کے لئے ملتے ہیں جو کافی نہیں ہوتے۔ جو لندن کا حال ہے ساری دنیا کے سرد ملکوں کا قریب قریب وہی حال ہے۔ عام طور پر اسکا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ صبح کی نماز تو سورج نکلنے سے پہلے پڑھ لو اور اس کے بعد سو رہو۔ اس جواب کی خوبی ہماری سمجھ میں اچھی طرح نہیں آتی۔ ہم تو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام کی ہر عبادت الٰہی کے انسان کی دنیوی اور جسمانی فلاح وبہبود بھی مرکوز خاطر ہے یعنی دن بھر کام کر کے رات کو چھ سات گھنٹے آدمی سولے۔ اور صبح کو اٹھکر دن کے کاروبار کے لئے طہارت جسمانی اور طہارت نفس یعنی عبادت الٰہی سے مسلح ہو اگر دو ڈھائی بجے رات کو بیچ میں نیند توڑ کر دوبارہ سوئے اور صبح کے آٹھ بجے اُٹھے تو منشا فطرت پورا نہ ہوا۔ عیسوی مذہب نے اس کا یہ علاج کیا ہے کہ انکی نماز باجماعت کے اوقات موسم کے اعتبار سے بدلتے سدلتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھ سے منصوری میں ایک گرجا کے آگے سائن بورڈ دیکھا جس میں صبح کی نماز کا وقت ۳۰ ستمبر تک کے لئے یعنی گرمی میں ساڑھے چھ بجے یا سات بجے تھا۔ اور یکم اکتوبر یعنی شروع جاڑے سے ایک گھنٹہ آگے بڑھا دیا گیا۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اسلام ساری دنیا کے لئے ہے نہ صرف سرد ملکوں کے لئے ہے اور نہ صرف گرم ملکوں کے لئے۔ مگر موجودہ زمانے میں زیادہ تر دنیا کے گرم ملکوں (ہیٹ بلٹ) میں ہی مسلمان رہتے ہیں۔ اس لئے جو احکامات اسلام زیادہ تر گرم ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں ان میں ردوبدل کی ضرورت پیش نہیں آتی مگر ہمارے مجوزہ علم کلام میں ساری دنیا کی اسلامی ضرورتوں کا

خیال کرنا ہوگا۔اور نہایت قوی اجتہاد سے کام لینا پڑے گا۔اسی طرح روزہ۔حج۔زکوٰۃ سب پر علیحدہ علیحدہ مفصل اجتہادی نظر ڈالنی ہوگی۔ظاہر ہے کہ یہ کام نہایت مشکل ہے۔مگر بجائے اس کے کہ ہر تعلیم یافتہ آدمی ضرورتوں سے مجبور ہو کر اپنے لئے آپ مجتہد بن بیٹھے اگر ملت اسلامیہ بحیثیت ایک جماعت کے اجتہاد کرے تو وہ بہت کم مضر ہوگا۔نماز کے مسئلہ کے ساتھ ایک اور اہم مسئلہ بغیر معنی سمجھے ہوئے قرآن شریف پڑھنے کا ہے۔بے پڑھے لکھے آدمیوں کو تو ہم مستثنیٰ کرتے ہیں مگر یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ جو مسلمان معمولی پڑھا لکھا ہو اور اس کی مادری زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ بھی موجود ہو۔خصوصاً ایسی صورت میں کہ کئی چھوٹی چھوٹی سورتیں قرآن شریف میں ایسی ہیں جو معہ ترجمے کے آسانی سے یاد ہو سکتی ہیں اس کے لئے بے معنی کا قرآن شریف کا پڑھنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔میرے ایک استفتاء کے جواب میں ایک جید عالم نے یہ جواب لکھا تھا۔کہ ذکر کے لئے معنی سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ سمجھتا ہے۔البتہ تذکرہ کے لئے معنی سمجھنے کی ضرورت ہے۔اہل عرب کو تو یہ دقت پیش آتی ہی نہ تھی کیونکہ انکی مادری زبان عربی ہے عجمیوں کو (اصطلاح میں ہر غیر عرب کو عجمی کہتے ہیں) یہ دقت ضرور پیش آتی ہے۔غالباً احناف میں کوئی فتویٰ موجود ہے کہ عجمی لوگ اپنی اپنی زبان میں تلاوت قرآن کر سکتے ہیں اور نماز ادا کر سکتے ہیں۔غالباً یہ فتویٰ زیادہ تر اہل فارس کے لئے تھا۔ہمیں اس کی پوری تحقیق نہیں ہے اور صرف بسبیل تذکرہ اس کو بیان کر دیا گیا ہے۔مجوزہ علم کلام کو اس نازک مسئلہ پر بھی غور کرنا ہے۔

۶۔بے شمار فقہی مسائل بیع وشریٰ نکاح وطلاق وغیرہ وغیرہ کے ایسے ہیں جن پر نہایت نیک نیتی سے غور کرنا ہے۔اور ان میں حسب ضرورت اجتہاد سے کام لینا ہے۔اگر شیعہ اور سنیوں میں کم از کم معاشرتی اتحاد مقصود ہے تو کوئی راستہ ایسا نکالنا پڑے گا جس کی رو سے سنی شیعہ کے پیچھے اور شیعہ سنی کے پیچھے نماز ادا کر سکے۔اور مکہ معظمہ میں جہاں سنیوں کے چار مصلے قائم ہیں وہاں امامیہ مصلیٰ بھی قائم ہو جائے۔نادر کے وقت میں جو خطاد

کتابت سلطان روم سے اس معاملے میں ہوئی تھی اس پر از سر نو غور کرنا ہوگا۔

اسی کے تحت میں یہ مسئلہ بھی طے ہو جائے کہ مسلمان مختار الفقہ قرار دئے جائیں نہ مجبور الفقہ۔
اب جو یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص حنفی ہے تو وہ عملی طور پر شافعی حنبلی اور مالکی فقہ کو بائیکاٹ کر دیتا ہے حالانکہ اپنی اپنی جگہ تینوں جائز قرار دی گئی ہیں اسی طرح اگر ایک شخص شافعی ہے تو وہ باقی اور فقہوں کو بائیکاٹ کر دیتا ہے۔ پولیٹیکل اور عدالتی ضرورتوں کے واسطے یہ احتیاط ضرور مفید ہے مگر شد و مد کے ساتھ مثل ناجائز ہونے کے دوسری فقہ کو بائیکاٹ کرنا اسلام کی حقیقی خوبی پر پانی پھیر دیتا ہے اصطلاح فقہ میں اس مسئلہ کو تلفیق کہتے ہیں۔ ہمارا مجوزہ علم کلام اس مسئلہ کو از سر نو صاف کرے ہمارا منشاء یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص صبح کی نماز حنفی طریقہ سے پڑھتا ہے ظہر کی نماز شافعی طریقہ سے عصر کی نماز مالکی طریقہ سے مغرب کی نماز حنبلی طریقہ سے اور عشاء کی نماز امامیہ طریقہ سے تو یہ سب کچھ جائز سمجھا جائے۔ پچاس برس کے قریب ہوئے کہ حنفیوں اور اہل حدیث میں دلی شریف میں آمین بالجہر پر لڑائی جھگڑا شروع ہوا۔ لاہور تک جہاں اس وقت چیف کورٹ تھی اور اب ہائیکورٹ ہے مقدمہ گیا۔ وہاں سے یہ فیصلہ ہوا کہ احناف اپنی مسجدوں پر مسجد حنفی لکھکر لگا دیں۔ پھر اگر غیر حنفی وہاں آکر آمین بالجہر کہیں گے تو انکا عذر قابل سماعت نہ ہوگا۔ آج بھی دلی میں سینکڑوں مسجدوں میں یہ الفاظ پتھر پر کندہ موجود ہیں، ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہر مسجد اسلامی مسجد ہے اور اس کو کسی خاص فرقہ کے ساتھ مخصوص کر دینا صحیح نہیں ہے۔ ہمارا مجوزہ علم کلام اس پر بھی غور کرے۔

۷۔ عرصہ ہوا پنجاب میں ایک فرقہ قرآنی نکلا جس کے سرگروہ مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی تھے اب بھی اس فرقہ کے بہت سے لوگ موجود ہیں اور اس فرقہ سے تعلیم قرآنی کو معقول مدد مل سکتی تھی۔ مگر جہانتک ہم کو معلوم ہے انکی تعلیم میں حدیث اجماع اور قیاس تینوں سے استغنا برتا گیا ہے۔ اہلحدیث کا بھی معقول گروہ ہے۔ مگر انکا نقطہ نظر زیادہ تر فقہ سے ایک بڑی حدتک سبکدوش کرنا ہے۔ اب فقہ والوں میں مسئلہ تلفیق نے جس کا اوپر

ذکر کیا گیا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے چار مستقل اور علیحدہ علیحدہ کیمپ قائم کر دئے ہیں
اور ہر فرقہ کا ماننے والا کسی فقہی مسئلہ کو اپنے امام تک پہنچا دینا کافی سمجھتا ہے۔ غالباً اس کا سبب
انحطاط علم ہے۔ ورنہ عملی طور پر تو یہ ہونا چاہئیے تھا کہ مسئلہ اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کے
متعلق نص یہ ہے معتبر اخبار یہ ہے اجماع امت یہ ہے۔ اور قیاس مجتہد یہ ہے۔ جیسا ہم اوپر لکھ
آئے ہیں متذکرہ بالا فرقے اپنی اپنی تحقیقات میں اجتہادی خصوصیت پیدا کریں یعنی اسکے
اکسپرٹ ہو جائیں۔ پھر کوئی جماعت ایسی ہو جو انکی تحقیقات پر منصفانہ نظر تعمق ڈالے۔ اسی طرح
سے یہ جماعت صوفیا کی مختلف جماعتوں سے سوالات قائم کرکے جوابات مانگے۔ اور پھر یہ
جماعت ان سب کو سامنے رکھکر جدید علم کلام تیار کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام جتنا مشکل ہے اس
سے زیادہ سب فرقوں میں اتفاق اور اتحاد کا محتاج ہے۔ اگر یہ نہ ہوگا تو غیروں کے اعتراضات
اور اپنوں کے شکوک دن بدن بڑھتے جائیں گے۔ اور پھر قرآن حدیث اجماع اور قیاس۔ ان سب
کا سنبھالنا علیحدہ علیحدہ ہر فرقے کے لئے اور مجتمعاً کافۃ المسلمین کے لئے خاکم بدہن دشوار سے
دشوار تر بلکہ ناممکن ہو جائیگا۔ اگر اس خالص اسلامی ضرورت کا ہم لوگوں میں احساس پیدا ہو سکے
اور یہ اہم کام ایک مرکزی حیثیت اور سب فرقوں کے اتفاق اور اتحاد سے شروع ہو سکے تو قوی
امید ہے کہ معترضین اور مشککین کی سیل رواں کا سد باب ہو جائیگا۔ اور یہ کام نہ صرف مسلمانان
ہندوستان کے لئے بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے کارآمد ہوگا۔ اس سے انکار نہیں
ہوسکتا کہ خصوصاً ہندوستان میں بہت سے اہم نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ اور آئندہ
ضرور اور ہونگے۔ مثلاً ایک مسئلہ ملکی اور مقامی ٹیکسوں کا ہے۔ اگر ایک صاحب نصاب مسلمان
نہایت نیک نیتی کے ساتھ زکوۃ شرعی نکالدے تو اجتہاداً اس کا ذمہ دار ہونا چاہئیے کہ ملکی اور
مقامی سارے ٹیکس اسی میں سے ادا ہو سکیں۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً ایک صاحب
نصاب مسلمان کے پاس سو روپیہ واجب الزکوۃ ہیں اس کو چاہئیے کہ دیانتداری کیساتھ
ڈھائی روپیہ زکوٰۃ کے نکالکر علما کی اس انجمن میں داخل کر دے جو مسلمانوں سے زکوۃ وصول

کرنے اور ملکی اور میونسپل ٹیکس ادا کرنیکے لئے قائم ہو۔ اب یہ انجمن ایک پرچہ بنائے کہ اس کو کیا کیا ٹیکس دینے ہیں اگر وہ ڈھائی روپیہ کے اندر اندر ہیں تو جتنا روپیہ اسے ٹیکس میں ادا کرنا ہو وہ واپس کردیں۔ اگر ٹیکسوں کا مجموعہ ڈھائی روپیہ سے زاید آتا ہے اور وہ شخص بطیب خاطر زائد دینے پر مستعد نہیں ہو تو یہ علما، کی انجمن انفرادی طور پر نہیں بلکہ اجتماعی طور پر گورنمنٹ اور میونسپل کمیٹیوں سے اپیل کرے کہ ڈھائی روپیہ سے زاید ٹیکس میں تخفیف کیجائے۔ خیر یہ تو نہایت مشکل کام ہے اور کون ایسی انجمن بناتا ہے اور اپنے ذمہ یہ دردسری لیتا ہے۔ سردست اتنا ہی کافی ہے کہ علما فتوے دیدیں کہ ٹیکس زکوۃ میں سے دئے جا سکتے ہیں۔ علما، اس کے جواب میں یہ فرمائیں گے کہ زکوۃ کا مصرف نصوص قرانیہ سے مقرر شدہ ہے۔ اور ہم اس میں مداخلت کرنے کے مجاز نہیں ہیں ہم نے جو اوپر لکھا ہے کہ اجتہاد زکوۃ میں سے ٹیکس ادا کرنیکا کفیل ہو اس سے ہماری یہی مراد ہے کہ علما، امت سر جوڑ کر بیٹھیں اور نیک نیتی کے ساتھ۔ نئی ضرورتوں کے موافق نئے مسائل تیار کریں۔

۸۔ تعلیم عام۔ تعلیم نسوان۔ پردہ۔ انتظام نکاح اور مثل انکے بہت سے ایسے مسائل ہیں جن میں مذہب اور رواج کا خلط ملط ہے رواج صدیوں کی عام ضرورتوں کے اعتبار سے جاری ہوتا ہے۔ اور ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ رواج کی ہر بات کا قلع قمع ہو جائے۔ بلکہ ہم صرف اسقدر چاہتے ہیں کہ ہر مسئلہ میں تنقیح کر دیجائے کہ اسمیں ناگزیر مذہبی عنصر اسقدر ہے اور اختیاری رواجی عنصر اسقدر۔ رواجی عنصر پر موجودہ زمانہ کی قومی اور ملکی ضرورتوں کے اعتبار سے نظر ڈالی جائے اور اس نقطہ نظر پر نہایت ٹھنڈے دل سے نظر ثانی کیجائے کہ فلاں بات مسنون ہو یا مستحب، سنت اسلام کا بڑا امتیازی عنصر ہے۔ اور اسکی تخفیف یا اس سے روگردانی کرنیکے لئے کوئی اہل دل مسلمان مشورہ نہیں دے سکتا۔ مگر اجتہاد اس قدر تو کر سکتا ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں موجودہ ضرورتوں کے اعتبار سے ردوبدل یا ترمیم کی ضرورت محسوس ہو تو متبحر عالم اس نظریہ کو سامنے رکھکر اجتہاد کریں۔ کہ اگر آج رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام اور

مجتہدین دنیا میں تشریف فرما ہوتے تو وہ کیا حکم دیتے۔ بہ تبدیل الفاظ قرآن حدیث اور فقہ سے استنباط کر کے نئے مسائل میں بڑی احتیاط اور دیانتداری کے ساتھ اجتہاد کریں۔ اس سارے مضمون کا خلاصہ یہ نکلا کہ جدید علم کلام بنانے کی ضرورت ہو یا نہ ہو، قرآنی فرقہ حق پر ہو یا اہلحدیث۔ یا اہل فقہ حق پر ہوں۔ یہ شکایت صحیح ہو یا غلط کہ مسلمان سست عمل ہوتے جاتے ہیں اور مذہب کو چھوڑتے جاتے ہیں۔ مگر یہ بات بالکل واضح ہے کہ اجتہاد کی اشد ضرورت ہے اور اسی پر ہم زور دینا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر ڈنکن بی میکڈونلڈ ایم اے بی ڈی اپنی کتاب موسومہ
Development of Muslim Theology, Jurisprudence & Constitutional Theory
("اسلامی دینیات قانون اور اصول تنظیم کی تدریجی ترقی") میں فرماتے ہیں۔

" اگر اسلام میں آئندہ ترقی کرنیکا موقعہ ہے تو تعلیم کو اچھی طرح وسیع کیا جائے۔ تربیت یافتہ دماغوں کا اوسط بہت زیادہ بڑھایا جائے اور ان میں اور عوام میں جو سکندری ہے اس کو ہٹایا جائے۔ قلت تعلیم ناکام ہو چکی۔ اس نے اس اصول کو تباہ کیا جس کی حفاظت اسے منظور تھی۔ شاگرد کی غلامی اپنے استاد کے ساتھ بالکل مسدود ہو جانی چاہئے۔ تقلید کے برخلاف طالب علم کے واسطے ہمیشہ یہ ممکن ہونا چاہئے کہ وہ ابتدائی اصول اور ابتدائی واقعات پر نظر ڈال سکے۔ اور جو بڑے اماموں اور مجتہدوں نے سکھایا ہے اس کو نظر انداز کر سکے۔ اہل ظواہر میں کم از کم اتنی خوبی ضرور تھی۔ ابتدائی واقعات میں طبعیات کے سائنس کے واقعات شامل ہونے چاہئیں۔ طالب علم کو چاہئے کہ مختلف طبقوں کے جوئے کو اپنی گردن پر سے اتار کر اپنی ذات اور نفس کے مطالعہ سے روگردانی کر کے دنیائے عظیم کا مطالعہ کرے اور یہ مطالعہ مابعد الطبیعات کے طور پر صرف ان قوانین کا جو دنیا پر بحیثیت ایک

(عہ[1]   ) منتظم جامع کے حاوی ہیں نہ کرے بلکہ اس سائنس سے
بحث کرے جو زندگی سے اس کے ہر شعبہ میں بحث کرتا ہے۔[2] اور طالب علم کو یہ چاہئے
کہ اپنے آپ کو حقائق کی بھول بھلیوں میں کھو دے۔ بلکہ بجائے بلند نظریہ قائم کرنیکے
خود تجربہ کرے اور آزمائے"

ڈاکٹر موصوف کا ارشاد ہمارے واسطے نعوذ باللہ قرآن وحدیث کا حکم تو رکھتا نہیں مگر
جس وقتِ نظر کے ساتھ انہوں نے ان اصول کو بیان کیا ہے جو انکی رائے میں اسلام کی آئندہ
ترقی کے لئے ضروری ہیں ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہر اہل علم کا خوشگوار فرض ہونا
چاہئے۔ زندگی کے ہر شعبہ کی تحقیقات سے سائنس کی نہایت وسیع اور صحیح کوشش مراد
ہے اور یہ اسلامی تعلیم کے آئندہ نصاب میں قطعاً داخل ہونا چاہئے۔ ہم نے دسمبر ۱۹۲۹ء میں
اپنے مضمون خلاصہ تعلیم اسلام میں جو رسالہ "المذہب" میں چھپا تھا عقیدہ توحید کے ضمن میں
عرض کیا تھا۔

" اس عقیدہ میں ذات واحد کی برتری اور قدرت کی طرف اشارہ کرنے کے علاوہ کل مادی
اشیا کا فانی اور تغیر پذیر ہونا بتایا ہے اور اس میں ایک یہ بھی مصلحت ہے کہ انسان ان میں سے کسی کو اپنے خیالات کا
منتہا اور ضمناً مستحق توجہ خاص یعنی مستحق عبادت نہ ٹھہرائے۔ مگر اسلام کا منشا ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے کہ ان سے روگردانی
کیجائے اور عقل اور تجربہ کی مدد سے انکی ماہیت نہ دریافت کیجائے اور ان سے خاطر خواہ کام نہ لیا جائے
مادی اشیاء فانی اور تغیر پذیر ضرور ہیں مگر بے کار اور بے سود نہیں ہیں ربنا ما خلقت ہذا باطلاً
(اے پروردگار تو نے اسکو عبث پیدا نہیں کیا) کا زریں اصول انکے کارآمد ہونے کی دلیل ہے
اور انسان پر جس کا حق پیدائش ترقی کرنا ہے لازم ہے کہ ماہیت اشیاء کی تحقیق کرے اور
اُن سے بنی نوع انسان کی خدمت کا واجبی کام لے۔ اس کلیہ سے سائنس کا پڑھنا قریب
قریب فرض کے ہو جاتا ہے اور اس میں مصروف ہونا ایک امر اختیاری اور منجملہ کمالات
دنیوی کے ایک کمال قرار نہیں پاتا بلکہ ایک صحیح عقیدہ کی تائید اور تکمیل کا فن تسلیم ہوتا ہے صانع

عہ[1] Cosmology   عہ[2] Biology

حقیقی کی صنعتوں کا علم خواہ انسان کو کتنا ہی محدود کیوں نہ حاصل ہو اُس کی عظمت وجلال کو دل میں مضبوط کرتا ہے اور مادی اشیاء سے انسانوں کی خدمت لینا عین منشاء الٰہی کے موافق معلوم ہوتا ہے جو لوگ ماہیت اشیاء دریافت کرنے اور ان سے انسانوں کی خدمت کا کام لینے کے علوم اور فنوں کو نظر انداز کرتے ہیں اور ان کی طرف توجہ نہیں کرتے وہ معنوی طور پر صانع حقیقی کی صنعتِ کاملہ کا انکار کرتے ہیں اور جو رموز انکشاف عظمت وجلال الٰہی کے ان میں مظہر ہیں اُن سے بے خبر رہتے ہیں اور ایک دن انہیں اپنی اس غفلت اور لاپرواہی کا جواب دینا ہوگا۔ اس مسلمان کا جس کو خدائے وحدہٗ لاشریک اور قادر مطلق کا پورا یقین ہے جیسا کہ تعلیم اسلام کے موافق ہونا لازمی ہے۔ سائنس بہترین خادم اور رفیق راہ ہے نہ کہ دشمن دین اور گمراہ کرنے والا۔ خلاصہ اسکا یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کے نصاب کی پوری چھان بین اور پڑتال کرنی ہے اور غالباً بالکل نیا نصاب اختیار کرنا ہوگا۔ پھر ساری مہذب دنیا کی طرح ایک حد خاص تک علما اور دنیا داروں کی تعلیم کو قدرے مشترک کرنا ہوگا جس طرح ایک پادری صاحب ایم۔ اے اور ڈی ڈی ہوتے ہیں یعنی ڈاکٹر آف ڈِوِنٹی یعنی عالم دینیات کا کورس انہوں نے ایم اے کورس کے علاوہ پڑھا ہے۔ اس ایم اے کے کورس میں وہ اس پروفیسر یا سول افسر سے تعلیم میں اشتراکِ عمل رکھتے ہیں جو انکی طرح ایم اے ہے مگر ڈی ڈی نہیں ہے۔ اسی طرح ہمارے علما کی تعلیم ایم اے نہیں تو بی اے تک ضرور رہی ہونی چاہئے جو دنیا دار بی اے کی ہوتی ہے۔ یہ طریقہ کہ بعض اسلامی مدارس میں صرف انگریزی بطور زبان کے تھوڑی سی پڑھائی جاتی ہے یا ٹوٹا پھوٹا تھوڑا سا جغرافیہ تاریخ اور حساب سکھایا جاتا ہے۔ بالکل ناقص اور ناکافی ہے۔ ہم تو اجتہاد سے یہ کام لینا چاہتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ پر بھی اچھی طرح غور کرے اور مسلمانوں کی تعلیم کا مکمل اور تفصیلی پروگرام بنائے۔

آخر میں مودبانہ مستدعی ہوں کہ اسلامی اخبارات ورسائل اور دوسرے اہل قلم مسلمان اس وسیع اور اہم مضمون پر اظہار خیال فرماکر عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہوں۔

مشرقی اور مغربی تہذیب کا موازنہ

از علامہ ہوشی

ہندوستان میں ہمیشہ سے لیکن یورپ میں جنگ عظیم کے بعد سے نمایاں طور پر ہمیں ایک ایسی جماعت نظر آتی ہے جسے روز مغرب کے زوال کا خواب دکھائی دیتا ہے علاوہ کاونٹ کایزرلنگ (Count Keyserling) اور سینورتی کے جرمن فلسفی اسپنگلر کی کتاب "انحطاط یورپ" کے عنوان اور مضامین سے قارئین کرام واقف ہونگے۔ ہندوستانیوں کے لئے اس قسم کے خیالات کوئی عجوبہ نہیں ہیں جنگ سے بہت قبل حضرت اکبر الہ آبادی مغرب کی ہجو کر چکے ہیں۔ کچھ تھوڑے ہی دن بعد علامہ اقبال نے اپنا مخصوص رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اور خیر آج تو یہ عالم ہے کہ ہر کس و ناکس یہی راگ گاتا ہے۔ ضرورت اب یہ ہے کہ اس مسئلہ پر متانت سے غور کیا جائے۔
تمدن کی قسمت کا فیصلہ اس طرح تو نہیں ہو سکتا کہ لسان العصر مرحوم نے فرمایا کہ:۔

مشرقی کو ہے ذوق روحانی — مغربی کو ہے میل جسمانی
کہا منصور نے خدا ہوں میں — ڈارون بولے بوزنا ہوں میں

غالباً علامہ اقبال کو خود ہی کچھ تسکین اس شعر سے ہوئی ہوگی کہ موصوف نے جمہوری طرز حکومت کے متعلق ایک فیصلہ صادر فرمایا کہ:۔

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

اس قسم کی تعلیمات پر صرف وہ سوسائٹی وجود میں آسکتی ہے جس سے ہم سب اس عجلت اور بدحواسی سے نجات پانا چاہتے ہیں۔ مگر خیر شاعر کے لئے سب کچھ جائز ہے۔

میں اس سلسلہ میں ایک نوجوان چینی علامہ ہوشی (Hu - Shih) کے خیالات جامعہ کے قارئین کرام کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ موصوف کا رتبہ چین میں کچھ پنڈت جواہر لعل جی جیسا ہے۔ اگر عوام موصوف کے نام سے آشنا نہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ علامہ موصوف عام سیاسی تحریکات کے بجائے علمی تحریکات سے وابستہ ہیں۔ موصوف کی اہلیت کے متعلق صرف اس قدر لکھنا کافی ہوگا کہ ۱۹۲۲ء میں علامہ موصوف ایک تحقیقی مقالہ قدیم چینی فلسفہ اور منطق پر لکھ چکے ہیں جو انگریزی زبان میں شنگھائی سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۳۴ء آپ کی تصنیف "چین کی نشاۃ ثانیہ" پیکنگ سے شائع ہو کر ہر طبقہ کے لوگوں سے آپ کو روشناس کرا چکی ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ مصنف ظواہر کا پرستار نہیں بلکہ اپنی اور مغربی تہذیب کے تمام پہلوؤں پر عالمانہ عبور رکھنے کے بعد مشرقی تہذیب کی تنقید پر مجبور ہوا ہے۔ باقی فیصلہ قارئین خود کر لیں گے کہ مصنف کو مغربی تمدن کی ترجمانی میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے۔

اس ضمن میں میں قارئین کو مسٹر برڈ (Charles A. Beard) کی ایک کتاب سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔ مسٹر برڈ نے جو علم المعیشت اور تاریخ کے ماہر اور بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک مجموعہ مضامین "انسانیت کس رخ پر جا رہی ہے" کے نام سے امریکہ میں ۱۹۲۸ء میں شائع کیا تھا جس میں متعدد بین الاقوامی حیثیت رکھنے والے صاحبان بصیرت کو بلا قید لکھنے کی دعوت دی تھی۔ تمدن جدید کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد پوری تہذیب کا جائزہ مصنفین نے لیا ہے اور مسٹر برڈ نے ایک پر بصیرت مقدمہ اور تتمہ اس میں شامل کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مسٹر ہوشی کو مشرقی اور مغربی تمدن کے موازنہ پر لکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ مولف نے علت طبع پر اپنے خیالات کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:-

"یہ کتاب ایک قسم کا دعوٰے ہے۔ بے معنی اوہام کی پوٹ نہیں ہے۔ کوئی خاص رمز اس میں پنہاں نہیں ہے۔ ہمارا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ اس کرہ زمین پر سائنس اور مشین دو زبردست ملنے والے حقائق ہیں جن سے ہر ایک کو چاہیے وہ مصنف ہو یا معلم۔ واعظ ہو یا قائد ملت ضرور دوچار ہونا پڑیگا۔ انکے منکر کی قسمت میں پہلے سے ہی شکست اور نامرادی لکھی ہوئی ہے۔ یہ تصنیف چسٹرٹن بیلاک اور اسپنگلر جیسے فلسفیوں کے مایوسانہ خیالات کو صحیح ماننے سے انکار کرتی ہے اور بجائے مایوسی کے مغربی تمدن کے امید افزا پہلوؤں کو پیش کرتی ہے وغیرہ وغیرہ"

میں نے ترجمہ میں وہ چند سطور حذف کر دی ہیں جن میں خصوصیت سے چینی حالات کو سامنے رکھکر چینی فلسفہ کے مخصوص اثر سے بحث کی گئی ہے۔ میں مصنف اور پبلیشر کا خصوصیت سے ممنون ہوں کہ انہوں نے جامعہ کے لئے مجھے اس مضمون کے ترجمہ کی بلا قید اجازت دی ہے۔

محمد اشرف

کچھ مدت سے بعض مغربی مصنفین کی مایوسانہ طبیعت نے وہی پرانی خام خیالی کی صورت اختیار کر رکھی ہے یعنی مغربی تمدن کی مادیت اور بے بنیادی اور مشرقی تمدن کی روحانیت اور برتری کے راگ گائے جانے لگے ہیں۔ گذشتہ سال جب میں جرمنی میں مقیم تھا تو ایک جرمن عالم نے نہایت متانت کے ساتھ مجھے باور کرایا کہ مشرقی تہذیب کے بنیادی اصول روحانیت پر مبنی ہیں۔ وہ اس درجہ جوش میں تھے کہ وہ تشریح کے طور پر فرمانے لگے کہ [1]مشرق میں آدمی تو آدمی انکی روحانی تقسیم بھی اخلاقی مراتب کے مطابق کیجاتی ہے۔ گو اس قسم کے خیالات جنگ زدہ یورپ کی نیم بیمار ذہنی کیفیت کے مظاہر ہیں اور اس سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتے مگر بدنصیبی سے اس کا یہ برا اثر ضرور ہوتا ہے کہ اس سے مشرقی تہذیب کے مدعیوں اور رجعت پسندوں کے دست و

[1] مسئلہ تناسخ کی طرف اشارہ ہے۔

باز و مشرق میں اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ مغرب میں بھی جیسا کہ مجھے اپنے حال کے سفر سے اندازہ ہوا ایسے حضرات کی تعداد کم نہیں ہے جو اس قسم کی خام خیالی کی بدولت اپنے تمدن کے صحیح معانی جو اب یورپ سے بڑھکر انسانیت کا تمدن ہو جاتا ہے۔ سمجھنے سے قاصر ہوئے جا رہے ہیں میں ایک نئے سطح نظر سے اس مسئلہ پر غور کرنا چاہتا ہوں اور ایک نئی بنیاد پر اس بحث کو منتقل کر کے مشرقی اور مغربی تمدن سے بحث کروں گا۔

(۱)

ایک سچے چینی کی طرح میں کنفوشش کے فلسفہ سے ابتدا کروں گا۔ کنفوشش کی تعلیمات کے مطابق تمدن کے تمام آلات کا ابتداءً روحانی ہوتے ہیں۔ آخر انکا ماخذ تصورات داعیان ہیں۔ اگر ایک طرف انکے ذہنی تعلق کا نام تصورات ہے تو دوسری طرف انکی جسمانی صورت کو "آلات" سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب ایک آدمی اُن سے کام لینا چاہتا ہے تو وہ اس کا "شکل" یا "سانچہ" نام دیدیتا ہے۔ جب وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان سے کام لیتا ہے تو وہ اسپر حیران رہ جاتا ہے اور انہیں دیوتاؤں کے کارناموں سے منسوب کرتا ہے۔ تشریحاً اس سلسلہ میں کنفوشش نے بہت سی مثالوں سے اپنے خیال کو واضح کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ پہلے پہل آدمی نے سطح آب پر لکڑی کے ٹکڑوں کو تیرتے دیکھا اور اسکی مدد سے شدہ شدہ اُس نے جہاز اور کشتیاں ایجاد کیں۔ شاید کبھی اس کی نظر پانی کے نیچے دبی ہوئی لکڑی پر پڑ گئی اور اپنے والدین کے مردہ اجسام کو محفوظ رکھنے کے خیال سے اُس نے تابوت اور مزارات بنا ڈالے اُس[۳] نے آسمان سے بارش کے قطرے گرتے دیکھے اور غالباً اس خوف سے کہ آہستہ آہستہ واقعات انسانی حافظہ سے محو ہو جاتے ہیں اس نے گرہ لگا کر یاد رکھنے کے بجائے طرز تحریر ایجاد کیا۔

ف۳ یہ ایک خالصاً چینی خیال ہے اس لئے کہ چینی حروف اوپر سے نیچے اچھوتے طریقہ پر لکھے جاتے ہیں۔

غالباً اس کے اظہار کی ضرورت نہ ہوگی کہ کنفوشش کے اس خیال کی مغرب میں افلاطون اور ارسطو نے تائید کی ہے غرض انسانی آلات اور ادارات کی ابتدا تصورات سے ہوئی یا خیالی سانچوں سے جنہیں سقراط "علت صوری" سے موسوم کرتا ہے۔ کانفوشش افلاطون اور ارسطو اُس بھلے زمانہ میں تھے جب انسانی ذہن قرون وسطیٰ کی اس دوئی میں مبتلا نہ ہوا تھا جس نے روح اور مادہ کی بے معنی تقسیم کی اور اس زمانہ تک انسانی ایجادات کی مادی اور روحانی صورتوں کی یکسانیت کو نہ بھولا تھا۔ حقیقتہً ایسا کوئی وجود نہیں ہے جس پر خالص مادی تہذیب کا اطلاق کیا جاسکے۔ تمدن کا ہر آلہ کار انسانی ذہن کا ہی کرشمہ ہے جو فطری ودیعے کام لیکر مادہ اور قوت سے اپنی ضرورتوں خواہشوں اور روحانی و ذہنی پیاس کو رفع کرتا ہے مٹی کا ہر کوزہ اسی درجہ روحانی ہے جس قدر کہ شاعر کے شعر اور اسی اعتبار سے وولورتھ[۳] بلڈنگ گرجائے سنٹ پال سے کم روحانی مرتبہ نہیں رکھتی۔ دراصل جب پہلی بار انسان نے لکڑی کی رگڑ سے آگ پیدا کی تو یہ ایجاد فی نفسہٖ ایک روحانی کرشمہ سمجھی گئی اور اسے ایک بڑے دیوتا سے منسوب کردیا گیا۔ تمثیلاً چین میں مذہبی فسانہ کے بڑے بڑے کیرکٹر تمام موجد تھے فلسفی نہ تھے۔ مثلاً سوجین آگ کا موجد تھا۔ یوٹسو نے پہلی بار دنیا میں سکونتی مکان کی بنیاد ڈالی۔ شینگ زراعت اور طب کا استاد اول سمجھا گیا۔

ہمارے اجداد آلات کے موجدوں کو دیوتا قرار دینے میں حق بجانب تھے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ انسان ایک آلات ساز حیوان ہے اور آلات بنانے کا دوسرا نام تمدن ہے آگ کا علم انسانی تمدن کی ایک منزل ہے۔ زراعت دوسری منزل کا نام ہے۔ طباعت تیسری کا۔ وقس علی ہذا۔ کچھ دنیا کے بڑے بڑے مذاہب ہی بجا طور سے اس کا دعوے کرسکتے ہیں کہ انہوں نے بحر چین سے لیکر جزائر برطانیہ تک دنیا کی بڑھتی ہوئی تمدنی ترقی کو قرون وسطیٰ کی مخصوص روایات

---

[۳] ایک مشہور دوکان کا نام ہے۔

کے سیلاب میں ڈبو دیا۔ خدا خدا کر کے خورد بین۔ دخانی انجن۔ بجلی اور ریڈیو کی بدولت متمدن دنیا اب اس جگہ پہنچی جہاں ہم اسے پاتے ہیں۔ اور اگر گزشتہ زمانے کے عابد اور زاہد اس قابل سمجھے گئے کہ انہیں ولیوں اور رشیوں کا مرتبہ دیا گیا تو آج گلیلیو۔ واٹ۔ اسٹفنس۔ مارس۔ بیل ایڈیسن بلکہ فورڈ بھی قطعی اس کے مستحق ہیں کہ انکی دیوتاؤں کی طرح عزت اور حرمت کیجائے بلکہ پرامتھیوس اور کیڈمس کی طرح انکے نام کے عبادت خانے قائم کئے جائیں۔ یہ ہستیاں انسان کی انتہائی الوہیت کی مظہر ہیں یعنی اس ذہانت اختراعیہ کی جو آدمی کے لئے اوزار فراہم کرتی اور تمدن کو معنی پہناتی ہے۔

ہر قوم کا تمدن اس کے مجموعہ کمالات پر مشتمل ہے جو اس نے اپنے ماحول سے مانوس ہونے میں پیدا کیا ہے۔ اس میں کامیابی یا ناکامی اس قوم کی اپنی ذہانت کے استعمال کرنے کی قابلیت پر منحصر ہے یعنی یہ کہ وہ کس درجہ موثر اور تعداد میں کسقدر ضروری آلات اپنی ضروریات کے لئے فراہم کرتی ہے۔ تمدن کی ترقی کا دارو مدار ان آلات کے بہتر ہونے پر منحصر ہے۔ تمدنی ادوار کے مختلف ناموں میں مثلاً دور حجری دور آہنی دور دخانی و برقی تمدنی ترقی کی داستان پنہاں ہے اور جس طرح یہ تعریف تمدن کے تاریخی ارتقا پر صادق آتی ہے اسی طرح یہ تمدن کی جغرافیائی تقسیم پر بھی ہو بہو صحیح اترے گی۔ مشرقی اور مغربی تمدن کا فرق انکے آلات مستعلہ کے اختلاف پر مبنی ہے۔ گزشتہ دو صدیوں میں مغرب مشرق کو اس اعتبار سے بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے، کیونکہ بعض مغربی قوموں نے فطرت پر قابو پانے کے نئے آلات اور اپنے کام کرنے کی قابلیت بڑھانے کے نئے وسائل معلوم کر لئے ہیں۔ مشرق جو متعدد معرکۃ الآرا آلات کا موجد رہ چکا ہے آج اپنی اس پرانی عظیم الشان روایت کو بھول چکا ہے اور اس کی بدولت آج جسمانی محنت کے دور میں پڑا ہوا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک زمانہ ہوا کہ مغرب دخانی طاقت اور برقی قوت کے استعمال سے بھی دو قدم آگے بڑھ چکا ہے۔

غرضکہ مشرقی اور مغربی تمدن کا فرق صرف اس قدر ہے کہ مشرقی تمدن کی بنیاد بیشتر

جسمانی مشقت پر ہے یعنی اس اعتبار سے کہ جسمانی محنت تمام قوت عاملہ کا سرچشمہ ہے۔ مغرب کا جدید تمدن مشین کی قوت پر تعمیر ہو رہا ہے۔ یا بالفاظ دیگر جس طرح میرے ایک محترم امریکن دوست نے نہایت خوبی سے ادا کیا کہ "امریکہ میں ہر مرد عورت اور بچے کی چاکری میں ۳۵ سے ۴۰ تک مشینی غلام لگے رہتے ہیں۔ جبکہ اسی نسبت سے چین میں ہر مرد عورت اور بچہ کے حصے میں مشینی غلام کا صرف تین چوتھائی حصہ آتا ہے۔" ایک امریکن انجینیر نے تقریباً ہم معنی الفاظ میں اسی مفہوم کو اس طرح ادا کیا کہ "ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہر فرد واحد کے لئے ۳۵ نادیدہ غلام کام میں لگے رہتے ہیں۔ امریکن مزدور روزی کی غلامی میں نہیں بلکہ ایک بڑی قوت کے مالک کی حیثیت سے چاہے وہ خود اس کا احساس کرے یا نہ کرے، زندگی بسر کرتا ہے۔

یہاں آکر دونوں تمدنوں کے اختلاف کی تشریح ہو جاتی ہے۔ ابتداءً یہ فرق صرف کمیت میں نمایاں تھا لیکن ہوتے ہوتے اب یہ فرق کیفیت میں بھی بین نظر آتا ہے

۲

جولائی ۱۹۳۶ء میں یورپ جانے کے ارادے سے میں بندرگاہ ہاربن میں آیا۔ موجودہ شہر ہاربن اس سے پہلے روسیوں کے قبضہ میں تھا۔ ایک نہایت مختصر تجارتی مرکز سے بڑھتے بڑھتے ہاربن اب شمالی چین کا شنگھائی سمجھا جاتا ہے۔ روسی شہر کی ترقی کے ساتھ ساتھ چند میل دور ایک چینیوں کا شہر بھی آباد ہو گیا ہے۔ جہاں ابتداء میں چند کسانوں کے گاؤں تھے۔ شہر سے گذرتے ہوئے میں نے خصوصیت سے اس امر پر غور کیا کہ اگرچہ چینی شہر میں تقریباً تمام ذرائع آمد و رفت رکشا یا وہ گاڑیاں ہیں جو آدمی خود چلاتے ہیں لیکن پرانے روسی علاقہ میں رکشاؤں کا داخلہ بند ہے۔ گو اب یہ روسی شہر بھی چینیوں ہی کے قبضہ میں ہے۔ لیکن پرانی روسی روایات اور ان کے اثرات بدستور سابق جاری ہیں۔ یعنی یہ کہ جدید شہر میں بھی آمد و رفت و رسل و رسائل ٹرام اور ٹیکسی کے

ذریعہ سے ہے۔ اور رکشاؤں کا داخلہ ممنوع ہے بلکہ حکم یہ ہے کہ بغیر کرایہ دیئے انہیں حدود شہر سے باہر کر دیا جائے۔

یہاں میں نے اپنی جغرافیائی معلومات میں ایک عظیم الشان اضافہ کیا یعنی مجھے اس درمیانی خط کا پتہ چلا جو مشرقی اور مغربی تمدن کا حد فاصل ہے۔ شہر ہاربن مشرق اور مغرب میں اس طرح امتیاز قائم کرتا ہے کہ ایک میں رکشائی (یعنی آدمی کی چلائی ہوئی گاڑیوں والا تمدن ہے اور دوسرے میں موٹر والی (یعنی مشین والی) تہذیب ہے۔ مشرقی تہذیب کے حمایت کرنیوالو۔ خدارا اس واقعہ پر غور کرو۔ آخر ایک ایسے تمدن میں جو انسانی غلامی کی اس خوفناک اور مسخ صورت کو جسے رکشا قلی کہتے ہیں گوارا کرتا ہو کیا روحانیت کے عناصر ہو سکتے ہیں۔ کیا ہم سنجیدگی اور متانت سے خیال کر سکتے ہیں کہ ان انسانی صورت کے بارکش جانوروں میں جو ان عجیب غلامانہ پابندیوں میں مبتلا ہیں' نہ معیار مزدوری سے واقف ہیں نہ ان کے کام کرنے کے اوقات کی کوئی حد ہوا کرتی ہے۔ بھلا اس دوڑ دھوپ اور خون پانی ایک کرنے میں کوئی روحانی زندگی ممکن ہے۔ کیا سچ مچ ہمارا خیال ہے کہ ایک رکشا قلی کی زندگی اس امریکن مزدور سے زیادہ روحانی اور اعلیٰ اخلاقی سطح پر ہے جو روزانہ موٹر پر کارخانے آتا جاتا ہے۔ جو اتوار کے دن اپنے تمام خاندان کو باہر سیر تفریح کے لئے عمدہ سے عمدہ پارک اور خوشنما جنگلوں میں لیجاتا ہے۔ جو تقریباً مفت میں بہتر سے بہتر گانا ریڈیو کے ذریعہ سے سنتا ہے اور جس کے بچے ان مدارس میں تعلیم پاتے ہیں جہاں بہتر سے بہتر کتب خانے اور جدید سے جدید معلموں کی سہولتیں موجود ہیں۔

جب ہمارے دل میں پورا پورا احساس ہو جائے کہ رکشا چلانے میں کیا کلفتیں اور سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اور ان انسانی صورت کے بارکش جانوروں پر اس کے چلانے سے کیا کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ صرف اسوقت ہر شخص صدق دل اور

یہی روحانیت سے مجبور رہوگا کہ موجدان عہد مثلاً ہارگریو۔ کارٹ رائٹ۔ واٹ۔ فلٹن اسٹفنسن۔ اور رفورد کو دل سے دعا دے جنھوں نے انسانی کام کے لئے مشینیں مہیا کردی ہیں۔ اور اسے بہت سی وحشیانہ مشقتوں سے نجات دلادی ہے جو اسکے مشرقی بھائی کے کام کے ساتھ اب بھی وابستہ ہیں۔

اس مقام پر اس مادی تہذیب کی حقیقی روحانیت بلکہ مشین والی تہذیب کی من حیث النوع روحانیت معلوم ہوتی ہے مشین کی ترقی کا مدعا صرف اسقدر ہے کہ آدمی اپنے آلات اور اختراعی قوت کا استعمال کرے تاکہ کام کرنے کی سہولت اور پیدا کرنے کی قوت فروغ پائے اور وہ اس لعنت سے نجات پا جائے۔ کہ بلا امداد غیرے کرنے کو تو دن رات لگاتار کام کرتا ہے۔ مگر بمشکل اپنے لئے قوت لایموت مہیا کرپاتا ہے۔ مشین کے استعمال کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ مشین کے استعمال کی بدولت اس کے پاس اتنی مہلت اور طاقت باقی رہے گی کہ تہذیب کی اعلیٰ برکتوں سے متمتع ہو۔ جہاں انسان کو ادنی سے ادنی قسم کے روزی فراہم کرنے کے لئے خون پسینہ ایک کرنا پڑے بھلا سوچو کہ تمدن اور تہذیب تو درکنار اس غریب میں جان کیا باقی رہ جائے گی۔ اگر تمدن تمدن کہلانے کا مستحق ہے تو اس کی بنیاد صرف مادی ترقی پر ہونی چاہیئے جسے ۲۶ سال ہوئے کہ ایک چینی مدبر نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ذلت وعزت کا امتیاز صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تن کو کپڑا اور پیٹ کو روٹی میسر ہو جائے اور لوگ اچھے آداب واخلاق صرف اسوقت سیکھتے ہیں جب کھلیان ناج سے بھرے ہوئے ہوں۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ کو اس فلسفہ کی تعلیمات پر متوجہ کروں جو تاریخ کی اقتصادی تاویل سے بحث کرتا ہے۔ یہ باتیں عام فہم اور اظہر من الشمس ہیں۔ اپنے تصور میں ذرا اس تمدن کی تصویر کھینچو جہاں لڑکے لڑکیاں اور معمر عورتیں بانس کی ٹوکریاں پیٹھ پر باندھے نکیلی لکڑیاں ہاتھوں میں لئے جہاں کہیں کوڑا کرکٹ دیکھتی ہیں جمع ہو جاتی

ہیں اور غلاظت کے ہرانبار میں ایک چیتھڑا یا ادھ جلا کوئلہ تلاش کرتی پھرتی ہیں بھلا یہ کیونکر ممکن ہے۔ کہ اس فضا میں کوئی اخلاقی یا روحانی تمدن پرورش پائے۔

ایسی صورت میں لوگ جب کسی تمدن کو مادی اعتبار سے پستی میں پاتے ہیں تو ان مقامات کی روحانی زندگی پر زور دینے لگتے ہیں۔ میں اس موقع پر ان مشرقی مذاہب سے بحث نہیں کروں گا جنکے بڑے بڑے دیوتا گذرگاہوں پر اعضائے تنلی کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ میں صرف اسقدر مودبانہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خدارا کوئی مجھے سمجھا دے کہ آخر اس بڑھیا میں کیا خاص روحانیت جلوہ گر ہے۔ جو انتہائی عسرت میں جان دیدیتی ہے مگر مرتے دم تک اس کی زبان سے "نا ما استا بدھا" کا حکم نہیں چھوٹتا اور اس کا ایمان ہے کہ وہ مرتے ہی اس بہشت میں پہونچ جائے گی۔ جہاں امتا بدھا کی روح جاری وساری ہے۔ یہ کہاں کا اخلاق اور کہاں کی روحانیت ہے کہ اس بدنصیب کو ایک غلط عقیدہ ایسا لکھا پڑھا دیا گیا کہ وہ ایک نہایت پست اور ذلیل زندگی میں اس ساحری کی بدولت نہایت خوش رہی۔ اور اسی مسرت میں مرگئی۔ اگر وہ ایک دوسرے تمدن میں پیدا ہوئی ہوتی تو اس کے لئے زندگی کے معنی اور اس کی لذتیں مختلف ہوتیں۔

میں ایک بار نہیں ہزار بار باصرار کہتا ہوں کہ اس زندگی میں کوئی روحانی عنصر نہیں ہے۔ یہ تمام ساحری جسے مذہب کے نام سے پکارتے ہیں اس دور انحطاط کے آثار میں سے ہے جب انسانی قوی پست ہو چکے تھے۔ اور وہ فطرت کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بے بس پاتا تھا۔ اس بے بسی سے عاجز آکر وہ مایوس ہوگیا اور اس نے ہمت ہار دی اور جس طرح لومڑی اور انگور کا قصہ ہے کہنے لگا کہ انگور کھٹے ہیں صرف اس لئے کہ اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ اب اس نے اپنی طبیعت بہلا کر دنیا کو بھی سکھانا پڑھانا شروع کردیا کہ دولت اور راحت نفرت کے قابل ہے۔ اور صرف غربت اور ناداری کی تمنا کرنا چاہئے۔ اس راہ میں ایک قدم بڑھانا تھا کہ اس نے کہنا شروع کردیا کہ یہ زندگی خود

رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اور انسان کو صرف حیات مابعد کے انتظار میں جینا چاہئے اور اسوقت جب کہ بہت اطمینان سے ان تعلیمات کی تلقین میں مصروف تھے چند من چلے جوشیلے دو قدم آگے بڑھے اور انھوں نے خود فراموشی۔ خود آزاری بلکہ خودکشی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ مغرب میں زاہدوں نے اعتکاف کیا۔ فاقے کئے۔ اپنے آپ کو ستونوں سے باندھکر سینہ اوفات پر کوڑوں سے مارنے کی ریاضتیں جاری کیں قرون وسطیٰ میں چینی رہبانوں نے پوجا پاٹ کی۔ روزے رکھے۔ اور روزانہ تیل کھاکر اور جسم پر تیل کے پھاہے باندھکر مہایانا بدھ مت کے کسی دیوتا کے نام پر جل کر قربان ہوگئے ان یاس و حسرمان سکھانے والے مذاہب نے تمام متمدن دنیا کو اس طوفان بے تیزی میں ڈبو دیا جنھیں قرون وسطیٰ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہزاروں برس کی کشمکش کے بعد انسانیت کا ایک گروہ ہاتھ پاؤں مارکر اس تمدن سے باہر آیا جس نے عزت کو قابل فخر اور علالت کو قابل حرمت قرار دیا تھا اور اس نے آہستہ آہستہ ایک نئے تمدن کی بنیادیں قائم کیں۔ جو موجودہ زندگی کو باعث مسرت اور ناداری کو جرم قرار دیتا ہے۔

آج ہر طرف نظر ڈالو۔ قرون وسطیٰ کے مذاہب اب بھی موجود ہیں۔ گرجا اور معبد اب بھی آباد ہیں۔ رہبانوں اور خانقاہوں کا اب بھی چرچا ہے۔ لیکن اب دنیا کا مطمح نظر بہت کچھ بدلا ہوا ہے۔ آخر یہ کیوں۔ اس انقلاب کی بڑی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ دو صدیوں میں انسان نے بعض بنیادی ایجادیں معلوم کرلی ہیں جن کی بدولت بیشمار آلات اور مشینیں فطرت کے خزانوں اور ان کے ذرائع حصول پر قابو پانے کے لئے وجود میں آگئی ہیں۔ ان مشینوں کی بدولت آدمی کی سخت جسمانی محنت کم ہوگئی ہے۔ فاصلہ محدود ہو گیا ہے۔ ہوا میں پرواز ممکن ہوگئی ہے۔ پہاڑوں میں سرنگیں بن گئی ہیں۔ اور بڑے بڑے سمندروں کی تہ میں جہاز رانی ممکن ہوگئی ہے۔ اب ہماری گاڑیاں چلانے

کے لئے بجلی ہماری غلام ہے۔ اور ہم اپنے پیغامات کو دنیا بھر میں پہنچانے کے لئے ایتھر سے پیامبری کا کام لیتے ہیں۔ سائنس اور مشین کے مقابلہ میں فطرت عاجز اور بے بس معلوم ہوتی ہے۔ اس سبب سے زندگی زیادہ سہولت اور آسایش سے بسر ہوتی ہے اور انسانی خود اعتمادی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ آج انسان اپنے مقدر کا خود مالک ہے۔ ایک انقلاب پسند شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

بحر ہستی کو خود ہی کرنا ہے پار   امداد کرے نہ کوئی میری زینہار

مصلوب ہو میرے بخشوانے کے لئے!   عیسے نہیں مجھ کو کوئی ایسا درکار

غرضکہ دور جدید کے نئے تمدن نے انسان کو ایک نئے مذہب کی تعلیم دی ہے جو خود اعتمادی پر اسقدر زور دیتا ہے جس طرح شکست و مایوسی قرون وسطی کے مذاہب کی خصوصیت تھی۔

۳

ہم سب کے پاس کچھ نہ کچھ قرون اولیٰ کا ترکہ پہنچا ہے اور تمدن جدید کی خصوصیات صرف اسوقت صحیح طور پر ذہن نشین ہو سکتی ہیں جب قرون وسطی کے تمدن سے اس کا علاقہ سمجھ میں آجائے مشرق اور مغرب کے تمدن میں فرق صرف اسقدر ہے کہ قرون وسطی کے خیالات اور ادارات سے جو کبھی تمام متمدن دنیا پر حکمران تھے ایک کم اور دوسرا زیادہ متعلق ہے۔ مغربی تمدن کی بڑی خصوصیت جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں یہ ہے کہ وہ بہ نسبت دوسروں کے بڑی حد تک قرون وسطی کی خصوصیات سے آزاد ہو چکا ہے۔ مغرب کے مقابلہ میں دوسری طرف ہندوستانی تمدن ہے جو قرون وسطی کی تمام خصوصیات من وعن ظاہر کرتا ہے۔ ان دو مرکزوں کے مابین ہم مشرق کے تمام اقسام تمدن کو ترتیب دے سکتے ہیں۔

چین نے قرون وسطی میں بہت سے علوم تاریخی اور فلسفہ میں ترقی کر لی تھی لیکن باوجود

یہ ترجمہ میرے محترم دوست اظہر علی فدوائی کے زور طبیعت اور قوت فکر کا نتیجہ ہے موصوف کئی سال تک جامعہ میں ابتدائی ایام میں تعلیم پا چکے ہیں۔ مترجم

ان سب ترقیوں کے اور باوجودیکہ چینی فلسفہ مذہب کی کثافت سے آہستہ آہستہ آزاد ہو چلا تھا چین آج بھی اس پستی میں ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ مانا کہ چین نے دقیانوسی مذاہب سے نجات پالی ہے لیکن عام آدمی کی زندگی میں اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔ میں یہ بھی تسلیم کئے لیتا ہوں کہ چین نے علمی تحقیقات کی بنیاد عقل اور ادراک پر رکھی ہے لیکن ابھی تک اس کا رواج کتابوں تک محدود ہے۔ کسی حد تک دماغ قیود اور پابندیوں سے آزاد ہو گیا ہے لیکن ابھی تک ہمیں اپنے مادی ماحول پر وہ قابو حاصل نہیں ہوا جو خود اس ذہنی آزادی کے لئے اور اسلئے کہ عوام کی روزمرہ زندگی میں کوئی حقیقی تغیر رونما ہو ضروری ہے ستر ہویں صدی کے حکماء اس تلخ حقیقت پر حسرت کے آنسو بہا چکے ہیں کہ ۵۰۰ سال کی فلسفیانہ موشگافیاں اس بدنصیب ملک کو قحط و غارت گری اور ایک اجنبی اور وحشی قوم کے تسلط سے نہ بچا سکیں اس تکلیف دہ انکشاف کے بعد جب کہیں ان کی آنکھیں کھلیں تو انہوں نے فلسفہ سے منہ موڑ کر ان علوم کیطرف توجہ کی جنھیں اب جا کر انہوں نے "مفید علوم" کا درجہ دیا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ آیندہ ۳ صدی کی باضابطہ تعلیم بھی ایک نئی منقولیت کی صورت اختیار کرلے گی اور عوام کی نجات اور ترقی کے لئے اسی درجہ بے معنی اور دور از کار ہو گی۔

چین کے مقابلہ میں دوسری طرف جاپان ہے جس نے زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ مغربی تمدن اختیار کیا ہے۔ جاپان کی ترقی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس نے مغربی آلات اور مشینوں کے اختیار کرنے میں کسی امتیاز سے کام نہیں لیا۔ کچھ زیادہ دن نہیں گذرے جب پہلی بار پیری (Perry) نے جاپان کے دروازہ پر دستک دی تو جاپانی زمانہ وسطی کی روایات میں گہری نیند سو رہے تھے۔ کچھ تھوڑے سے کشاکش کے بعد جاپان نے اپنے دروازے مغربی اثرات کے لئے چوپٹ کھولدئے۔ باوجودیکہ جاپان کو اپنے قومی جذبات کی پامالی اور عام تباہی کا خوف لاحق تھا۔ اس نے دقیانوسی مذاہب اور فرسودہ فلسفہ اخلاق کی مطلق پرواہ نہ کی۔ اور دل کھولکر اس نے اپنے آپ کو جدید اسلحوں سے مسلح کیا۔ نئے نئے آلات حرب،

وسائل تجارت، کام کرنے کی مشینیں اور تنظیم کے اصول وضوابط اختیار کئے نتیجہ یہ کہ نصف صدی میں جاپان کا یہی نہیں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی متمدن اقوام میں شمار ہونے لگا بلکہ اس نے بہت سے اہم مسائل کا حل معلوم کرلیا جسے نہ بدھ مت سلجھا پایا تھا نہ چینی فلسفہ۔ جاپان میں اس دور وسطیٰ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ دستوری حکومت اور پارلیمنٹ کی نمایندگی تسلیم کی گئی اور دقیانوسی مذاہب کی بیخ کنی برابر جاری ہے۔ کل تک جاپان رکشا کا موجد سمجھا جاتا تھا لیکن آج کوئی یاکوہاما اور ٹوکیو کے صنعتی مرکزوں پر نظر ڈالے تو رکشا قلی کے دور کا جنازہ آنکھوں کے سامنے نظر آتا ہے۔ رکشا قلی کی لعنت دور کرنے میں جاپانی یا دوسرے مذاہب کی "انسانیت" کو کوئی دخل نہیں ہے نہ ان انجمنوں کے ارکان کی مساعی کو واسطہ ہے جو حیوانات کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ صرف غریب فورڈ کی موٹر کو جو جاپانی محاورہ میں" ہر جگہ نظر آتی ہے"۔ تمول اور خوشحالی کے ساتھ جو مشین کے استعمال اور جدید حرفت کے فروغ سے جاپان کو حاصل ہوئی ہے اس مختصر سے عرصہ میں جاپان نے نئے فنون لطیفہ اور ایک نیا ادب کو اپنی مادی ترقی کی نسبت سے پیدا کرلیا ہے آج جاپان میں سائنس اور حرفت کی تحقیقات کے لئے ۹۰ ادارات ہیں اور اس کی انجنیری کی انجمن کی فہرست رکنیت میں ۳۰۰۰ ہزار نام نظر آتے ہیں۔ ان کارکنوں اور ان وسائل کار کی بدولت ایک عظیم المرتبت تمدن جو کسی طرح روحانیت سے خالی نہیں ہے مشرق میں فروغ پا رہا ہے۔

اس طول طویل داستان کا سبق واضح ہے یعنی یہ کہ انسانی تمدن کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ وہ پہلے پہل اوزار بنانے والا حیوان تھا اور اس نے تمدن کی بنیاد اپنے مادی ماحول پر قابو پانے کے لئے نئے نئے اوزاروں پر رکھی جب انسان اپنے فطری ماحول سے جنگ کرتے کرتے عاجز آگیا تو اس نے روحانی زندگی میں پناہ لی اور تمدن اس قعر مذلت میں گر گیا جس کا نام دور وسطیٰ ہے۔ حرفت اور سائنس کی بدولت انسان نے اپنی کھوئی ہوئی خود اعتمادی حاصل کی اور اس کی بنا پر جدید مغربی تمدن کی عمارت تعمیر کی اسی سائنس اور حرفت نے

جاپان کی ہیئت بدل دی اور اسے جدید تمدن کی برکتوں سے مالا مال کر دیا اور آخر کار یہی سائنس اور حرفت ہوگئی جو مشرق کی صورت بدلے گی اور چین اور ہندوستان کو متمدن دنیا میں دوش بدوش لاکر کھڑا کرے گی۔

۴

میں نے ابتدا میں آپ کے سامنے جدید مغربی تمدن کے سب سے مادی شعبہ یعنی اس کے صنعتی کارناموں کا روحانی پہلو آپ کے سامنے پیش کیا۔ جدید حرفت بدرجہ اولیٰ روحانی ہے اس لئے کہ اس کا مدعا یہ ہے کہ انسانی ذہانت اور قوت فکری کو کام لیکر (جو ودیعہ فطرت ہیں) انسانی کوشش کو غیر ضروری مشقت سے نجات دلا دیجائے اور اس کے لئے موجودہ زندگی کی مسرتیں اور اس کے حاصل کرنے کے لوازمات فراہم کئے جائیں انسان بعد میں جس طرح بھی اس راحت اور مہلت سے کام لے صعوبت اور روح فرسا محنت سے نجات دلانا فی نفسہ ایک عمل روحانی ہے ورنہ یہ اسی قسم کا استدلال ہوگا کہ چونکہ بعض سچے اور حق پرست لوگ خدا کے نام پر جلا دیئے گئے تھے اس لئے خدا خود ایک مذموم ہستی کا نام ہے۔

میں اب چاہتا ہوں کہ مغربی تمدن کے دوسرے پہلوؤں کا روحانی پہلو آپ کے سامنے پیش کروں میں سر دست اپنی بحث سے فنون لطیفہ موسیقی اور ادب کو خارج کئے دیتا ہوں کیونکہ یہ سب کے نزدیک مسلم الثبوت ہے کہ مغربی ادب اور فنون لطیفہ کم از کم مشرق کے ہم پلہ ضرور ہیں اور اس کا علم موسیقی اس سے بدرجہا زیادہ ترقی یافتہ ہے جس پر مشرق نازاں ہے۔ لاؤ سائنس سے ابتدا کریں۔ روحانی زندگی کے معنی جو بھی ہم سمجھتے ہوں غالباً آج دنیا میں کسی کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علم کی جستجو، ایک نئی چیز کی تلاش انسان کے جائز روحانی مطالبات میں شامل ہے لیکن تقریباً تمام پرانے مذاہب نے انسانی دماغ کی اس خواہش کو دبانے کی کوشش کی ہے۔ کتاب پیدائش کے مطابق آدم علیہ السلام کا بہشت سے

اخراج بی بی ہوا نہیں بلکہ حصول علم کی بدولت ہوا بہت سے مشرقی پیشواؤں نے اس قسم کی تعلیمات دی ہیں کہ "احتیاج علم کی بدولت ہے اسلئے نہ علم ہوگا نہ احتیاج ہوگی"۔ "دنیا میں کل کے لئے سوچنے کی کیا ضرورت ہے آدمی کو راضی برضا رہنا چاہئے"۔ "دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند + کانزا کہ عقل بیش غم روزگار بیش"۔ مشرق کے ایک بزرگ نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے کہ "زندگی مکان و زمان کی پابند ہے اور علم لامکان ہے۔ کیا تماشہ ہے کہ لامکان شے سے مکان و زمان کی عقدہ کشائی کرنا چاہتے ہو"۔ ان عقائد کی بدولت "معلمان انسانیت" نے علم کی جستجو سے پرہیز کیا اور احتساب نفس عرفان۔ دھیان اور سمدھی کے پیچھے ہو لئے "عرفان" کی تلاش ہیں جس کے معنی کچھ وہ خود ہی سمجھے ہونگے بعض نے "علم لدنی" کے حصول کے طریقے بتائے اور "استغراق" کو اسکے لئے مشعل راہ قرار دیا۔ کسی نے "دھیان" کے ۴ مقامات[1] کا پرچار کیا جس سے ۶ الوہی قوتیں حاصل ہوتی ہیں۔

دور کیوں جائیے جنوری ؁۱۹۲۶ء میں امریکن ناظرین کے سامنے ایک مصری "درویش" نے مشرق کے اعلیٰ روحانیت کا اس طرح ثبوت دیا کہ وہ دو گھنٹہ ۵۲ منٹ ۵ فیٹ نیچے زمین میں زندہ درگور رہنے کے لئے آمادہ تھا اور اس طرح اس نے مشہور جادوگر ہوڈنی کے وقفہ میں بقدر ۸۲ منٹ کے سبقت کی لیکن لو[illegible] کمپنی نے اس خوف سے کہ غالباً دیکھنے والے صبر کے ساتھ ۳ گھنٹے انتظار کے لئے تیار نہ ہوں گے کہ اس مشرقی پیکر روحانیت کو دوبارہ زندہ ہوتے دیکھیں معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان ٹوٹکوں میں روحانیت کا شائبہ برائے نام ہے لیکن مشرق کا روحانی طبقہ اب بھی اس قسم کی لایعنی حرکات کو مایۂ ناز شمار کرتا ہے۔ اس قسم کی زندگی تو بہت سے جانور بھی بسر کرتے ہیں کہ مہینوں زمین میں چھپے رہتے ہیں اور ایک خاص موسم میں کچھ دنوں کے لئے باہر آجاتے ہیں۔ دوسری طرف اگر غور کیا جائے تو سائنس والوں

---

[1] یہ چینی بلکہ بدھ مت کا عقیدہ ہے۔ مترجم

کے کاموں میں ایک حقیقی روحانیت نظر آتی ہے۔ یہ طبقہ بڑی بڑی ریاضتیں کر کے فطرت کے
چھوٹے چھوٹے پوشیدہ راز معلوم کرتا ہے حقیقت بہت سے پردوں میں مستور رہتی ہے اور کبھی
ان بے ادب انسانوں کے سامنے بے نقاب نہیں ہوتی جو فطرت کے بالمقابل بے سر
وسامانی، غیر تربیت یافتہ توہمی شعوری کیساتھ جاتے ہیں۔ سائنس ہماری قوت فکری کی تربیت
اور پرورش کرتی ہے۔ اور اس کے لئے ضروری آلات اور طرق کار فراہم کرتی ہے۔ وہ ہر
قدم پر ہمیں سمجھاتی ہے کہ علم کے لامحدود ہونے سے ہمت نہ ہارو۔ انہیں چھوٹے چھوٹے علمی ذروں
سے ہی فطرت کا راز معلوم ہوتا ہے۔ ہر ادنیٰ سے ادنیٰ اضافہ معلومات ترقی کی منزل میں ایک
قدم ہے اور ترقی کا ہر قدم چلنے والے کے لئے ایک وجدانی کیفیت رکھتا ہے۔ جب ارشمیدش
پر غسل خانہ میں داخل ہوتے ہی سائنس کے ایک پیچیدہ مسئلہ کا حل منکشف ہوا تو وہ خوشی کے مارے
اس درجہ آپے سے باہر ہوگیا کہ برہنہ سڑک پر دوڑتا پھرتا تھا اور ہر ایک سے پکار پکار
کے کہتا تھا کہ "میں نے پالیا ہے"۔ روحانی مسرت کی یہ وہ کیفیت ہے جو سائنس کی تحقیقات
میں ہر طالب علم مثلاً گلیلیو۔ نیوٹن۔ پاسیو، ڈکوخ کو نصیب ہوئی ہے۔ یہ وہ وجدانی کیفیت ہے جس سے
گذشتہ تمدن کی پیغمبر بالکل بے بہرہ تھے حقائق عالم کی جستجو میں وہ استغراق اور خود فریبی سے آگے
نہ بڑھ سکے بس اسی قدر اُن کا مبلغ نظر تھا۔

سائنس کا انتہائی روحانی عنصر اس حالت شبہ[1] میں مضمر ہے جو ہر شے کو بے اعتباری
سے دیکھنا سکھاتی ہے اور بغیر تشفی بخش ثبوت کے کسی چیز پر ایمان لانے کی اجازت نہیں دیتی
یہ انداز صرف منفی ہی نہیں گو اس صورت میں بھی اس نے انسانی دماغ کو اسناد اور توہمات کی
غلامی سے نجات دلا کر ایک گرانقدر خدمت کی ہے۔ یہ حالت شبہ حقیقتاً مثبت اور بڑے بڑے
نتائج سے پُر ہے۔ صحیح عقاید دیانت داری سے صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتے ہیں۔
اس کا مقصد خود اس کیفیت "شبہ" پر قابو پانا اور عقاید کو جدید بنیادوں پر قائم کرنا ہے۔ اُسنے

---

[1] Attitude of doubt

اپنے اس بے پناہ ہتھیار سے کہ" ہر بات کی دلیل پیش کرو" صرف فرسودہ عقائد سے ہی نبرد آزمائی نہیں کی بلکہ اس نے نئے نئے مسائل بھی پیش کئے ہیں اور انہیں شواہد و اثبات کے اصرار کی بدولت اس نے نئے نئے انکشافات بھی کئے ہیں۔ یہی وہ تیسری ارتداد کی روح ہے جس نے روح رواں ان سائنس مثلاً ڈارون ہکسلے۔ پاسٹیور اور کوخ کے سوانح حیات کو انسانی تاریخ میں الہامی مرتبہ دیدیا ہے جس طرح قرون وسطی میں ہمنے عقیدت کی بدولت اولیا ر اور مشایخ بنالئے تھے اسی طرح اس روح ارتداد نے اپنے پیشوا پالتے ہیں جو فطرت کو قابو میں لاکر انسانیت کو اس کے خزانوں سے مالا مال کر رہے ہیں۔

۵

مغربی تمدن کا انتہائی روحانی پہلو اس کے اس نئے مذہب میں ظاہر ہوتا ہے جسکے لئے میرے ذہن میں "مذہب جمہوریت" سے زیادہ موزوں کوئی اور نام نہیں ہے جدید تمدن کی ابتدا ر مذہبی جستجو سے نہیں ہوئی، مگر اس کی انتہا ایک نئے مذہب کا آغاز ہے۔ اس نئے تمدن نے بہت زیادہ فلسفہ اخلاق پر توجہ نہیں کی لیکن اب اس نے ایک نیا نظام اخلاق مرتب کر لیا ہے۔ پندرہویں اور سولہویں صدی کی یورپین حکومتیں کھلم کھلا طور پر غارت گروں کی ریاستیں تھیں۔ اس دور کے بڑے بڑے نامور مثلاً کولمبس ہیگنز۔ ڈریک اور ان کے ہمجنس بڑے بڑے بحری قزاق تھے جو بے دھڑک سونے چاندی۔ مسالوں اور بردہ گیری کے لئے نامانوس سمندروں میں اپنی جان ہتیلی پر لئے پھرتے تھے۔ اکثر اوقات ان کی نوابوں اور بادشاہوں نے ہمت افزائی کی ہے اور ان کی غارتگری اور شہرت میں حکومتیں اور حکمران ان کے شریک رہے ہیں۔ انہوں نے نہایت لاپرواہی سے اپنی مذہبی تعلیمات کو پس پشت ڈالدیا تھا جو انسانی ہمدردی کی تعلیم دیتی تھیں اور جن کے نزدیک سود لینا ممنوع تھا۔ اس غارت گری نے یورپ کی تجارت اور مستعمرات کے لئے نئے نئے براعظموں کے دروازے کھولدیئے جس کی وجہ سے بعض یورپین حکومتوں کی مادی طاقت اور دولت میں گراں قدر

اضافہ ہوگیا اور ان میں ایجاد کی بڑی حرص پیدا ہوگئی۔ اس کا ثمرہ وہ صنعتی انقلاب تھا جس نے
اکتساب کے طریقے سرے سے بدل ڈالے اور یورپین ریاستوں کی قوت اکتسابی کو ایک ساتھ
بڑھا دیا۔ مادی آسایش اور ایک نئے طبقہ کے عروج کے ساتھ انسانی تعلقات کا تخیل اور ہمدردی
کے معنی بھی بدل گئے ہیں۔ اپنے اوپر بھروسہ کرنے سے انسان اب چونکہ اپنے آپ کو اپنی قسمت
کا مختار و مالک سمجھنے لگا ہے مدنیت کے احساس اور مدنی خصایص کے اعتبار سے کئی قسم کے لوگ
نظر آتے ہیں۔ اس کا مجموعی اثر یہ ہے کہ ایک نئے دور جمہوریت کی داغ بیل پڑ گئی ہے۔ میں اس کے
تاریخی ارتقا میں اٹھارہویں صدی کے فلسفہ انفرادیت اور گذشتہ سو سال کے اشتراکی خیالات
کو بھی شامل کرتا ہوں۔ اٹھارہویں صدی نے حریت۔ مساوات اور اخوت کے جدید عقاید
کا اضافہ کیا۔ گذشتہ صدی کے وسط میں جا کر اس نئے مذہب نے "اشتراکیت" یا سوشلزم کا نام اختیار
کر لیا ہے۔ یہ سب وہ روحانی قوتیں ہیں جو پرانے تمدن کے کبھی خواب میں بھی نہ تھیں۔ یہ مانا
کہ مشرق میں ایسے مذاہب ہوئے ہیں جنھوں نے نوع انسانی کی ہمدردی کی تعلیم دی ہے۔ ایسے
حکیم بھی گذرے ہیں جنھوں نے زمین اور مال کی مساوی تقسیم سکھائی ہے لیکن تمدنی اعتبار سے
یہ عقاید صرف کتابوں تک محدود رہے ہیں اور کبھی سوسائٹی یا نظام سیاسی میں ان پر عمل کرنے
کی نوبت نہیں آئی۔ برخلاف اس کے مغرب میں انقلاب امریکہ، انقلاب فرانس اور انقلاب ۱۸۴۸ء
نے حریت۔ مساوات اور اخوت کو اپنا نعرۂ جنگ قرار دیا اور اس کے بعد یہ خیالات جملہ انقلابی
تحریکات کے سرچشمۂ حیات رہے ہیں۔ نئی جمہوری حکومتوں نے ان پر اپنی دستوروں کی بنیاد
رکھی ہے۔ ان کی اشاعت کی وجہ سے ملوکیت۔ شہنشاہیت اور امارت کا زوال ہوا ہے۔ ان تعلیمات
نے قانوناً مساوات۔ حریت عقاید۔ حریت اشاعت اور مذہبی آزادی کو تسلیم کیا ہے۔ اور سب سے
بڑھ کر یہ کہ ان خیالات نے عورت کو آزادی دی ہے اور تعلیم عامہ کو عملی صورت بخشی ہے

اشتراکی خیالات اپنے ماقبل جمہوری فلسفہ کا جو انفرادیت کا رنگ لئے ہوئے تھے
تتمہ ہیں۔ تاریخی اعتبار سے بھی یہ اسی وسیع جمہوری تحریک کا جزو ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط

Industrial Revolution

میں یہ محسوس کر لیا گیا تھا کہ ایک نہایت منظم اور مرکوز نظام اقتصادی میں مساوات اور حریت پھیلانے کے لئے "عدم مداخلت"[1] کی پالسی کافی نہیں ہے لوگ لازمی تعلیم کو اپنی آزادی میں مداخلت تصور کرتے تھے اور مزدوری اور کارخانوں کی نگرانی کے قوانین کا "جماعتی قانون" نام رکھ چھوڑا تھا۔ اس نئے اقتصادی دور کی ضروریات ایک جدید تمدنی اور سیاسی فلسفہ کی متقاضی تھیں اس کا صریح نتیجہ یہ تھا کہ اشتراکیت کی تحریک پھیلنا شروع ہوگئی۔ اگر اس تحریک پر "جماعتی جنگ" اور "اقتصادی تاویل"[2] کی الجھنوں سے قطع نظر کر کے غور کرو تو صاف معلوم ہوگا کہ اس کا مدعا صرف اسقدر ہے کہ سوسائٹی یا حکومت کی مجموعی قوت سے جمہور کی زیادہ سے زیادہ خدمت کیجائے اس تحریک نے عملاً دو صورتیں اختیار کی ہیں۔ ایک طبقہ اسطرف متوجہ ہے کہ مجموعی اجرت ٹھہرانے کے طریقوں اور ہڑتال سے کام لیکر مزدور پیشہ جماعت اور اس کے جماعتی حقوق کا موثر تحفظ کیا جائے۔ دوسری طرف اسیقدر شدت سے حکومتوں نے اسکا اس طرح سدباب کرنا چاہا ہے۔ کہ بجائے جماعتی کشمکش میں قوت ضائع کرنے کے انھوں نے بہت سے اشتراکی عقاید کو اپنا لیا ہے اور اس قسم کی تجاویز پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے مثلاً ضعیفی کے لئے مزدوروں کا بیمہ کرانا۔ مزدوری کے اوقات کی نگرانی۔ کم سے کم معیار اجرت کا اجرا، وغیرہ وغیرہ

غرضکہ ایک صورت سے یا دوسری صورت سے بلکہ بعض اوقات دونوں صورتوں کے مجموعی اثر کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہر حکومت نے اپنے قانون اور دستور میں وہ خیالات اور عقائد شامل کر لئے ہیں جو کبھی نہایت خطرناک اور تباہ کن سمجھے جاتے تھے۔ عجب نہیں کہ بہت لوگ ملکیت شخصی[3] کی حرمت میں ایمان رکھتے ہوں لیکن آمدنی اور میراث کے ٹیکس حکومتوں کی آمدنی کا ایک معتد بہ حصہ ہیں۔ آپ جب چاہیں جماعتی جنگ کو برا اور مذموم کہہ سکتے ہیں لیکن مزدوروں کی تنظیم اور قوت ایک امر واقعی ہے۔ اور تقریباً تمام دنیا میں ان کا ہڑتال کرنے کا حق تسلیم کر لیا گیا ہے انگلستان میں جو سرمایہ داری کا کعبہ رہ چکا ہے۔ ایک بار مزدور حکومت برسر اقتدار آ چکی ہے

---

[1] Laisser Faire [2] Economic Interpretation

[3] Private Property

اور ممکن ہو کہ جلد دوبارہ مزدور جماعت حکومت کرے۔[1] ریاستہائے متحدہ امریکہ جو کبھی انفرادیت کی بڑی حامی تھی آج مسکرات کے لئے قومی امتناعی قوانین نافذ کر رہی ہے۔ غرضکہ دنیا انجانے اشتراکی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہ مذہب حریت صرف اسی پر قناعت نہیں کرتا کہ ایک شہری کی آزادی کی حفاظت کرے یا دوسروں کی آزادی قائم رکھنے کے لئے ایک فرد کی آزادی پر قیود قائم کرے بلکہ برابر اس میں سرگرم ہے کہ ہر مرد اور عورت کے لئے آزاد زندگی ممکن العمل بنا دے اس مذہب کو اس پر صبر نہیں ہے کہ سائنس اور مشین پر قابو پا کر لوگ نہایت آرام سے زندگی بسر کریں بلکہ یہ قانون اور نظام سیاسی سے کام لیکر کوشاں ہے کہ دنیوی راحت کے اسباب زیادہ سے زیادہ شہریوں کے نصیب میں آ جاویں۔ اور یہ نعمت مغربی تمدن کی سب سے بڑی روحانی میراث ہے۔ میرے لئے ضروری ہے کہ میں قارئین کرام کو اس موقع پر یہ یاد دلاؤں کہ عورت کے حقوق کی آزادی یا جمہوری طرز حکومت یا تعلیم عامہ کے اصول نام نہاد مشرقی تمدن کی برکات سے بالکل بے نیاز ہیں۔ بے ادبی نہ سمجھی جائے تو میں اس کا بھی اضافہ کر دوں کہ ایسے تمدن میں جس نے اپنی مستورات کے پاؤں[2] تقریباً ایک ہزار برس تک جکڑ دیئے تھے اور لطف یہ کہ کبھی ایک آواز بھی احتجاج کی بلند نہیں ہوئی یا ایک دوسرے تمدن میں جس نے مدتوں ستی اور بیوہ کے جلانے کی رسم گوارا کر لی اور جو آج بھی ذات پات کی تقسیم قائم رکھتی ہے۔ روحانیت کا کوئی عنصر نہیں ہو سکتا

۶

اس خاصی طویل بحث کے خاتمہ پر میں چاہتا ہوں کہ تتمہ کلام کے طور پر چند غلط مستعمل اور الجھن میں ڈالنے والے الفاظ "روحانی تمدن" "مادہ پرست تمدن" "مادی تمدن" اور ان کے مفہوم پر اپنے خیالات پیش کروں۔ جہانتک میرا ناقص ذہن کام کرتا ہے میرے نزدیک

---

[1] مصنف نے مزدور پارٹی کے دوبارہ حکومت قائم کرنے سے قبل یہ مضمون تحریر فرمایا تھا۔ مترجم

[2] چینی رسم جو زمانہ حال تک جاری رہی۔

اصطلاح "مادی تمدن" کا اطلاق غیر ذی روح اشیا تک محدود ہونا چاہیئے اسلئے کہ تمدن کے تمام آلات کار تخیلات کی جسمانی صورت کا نام ہیں۔ مشرقی تمدن جو چرخی لگا کر کام نکالتا ہو اسیقدر مادی ہے جسقدر انجن کی قوت مغرب میں۔ میں سمجھتا ہوں کہ "مادہ پرستی" کا اطلاق جو مغربی تمدن کو مسخ صورت میں پیش کرنے کے لئے کیا جاتا ہے اس کا بدرجہ اولیٰ مشرقی تمدن مستحق ہے اس لئے کہ میرے نزدیک صرف وہ تمدن مادہ پرست ہو جو مادہ کی قید سے باہر نہ جاسکے اور جو اپنے مادی ماحول کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پاتا ہو۔ اور انسانی حالات کو بہتر بنانے کے لئے فطرت پر قدرت پانے میں انسانی ذہانت کا کما حقہ استعمال نہ کرسکے صوفیا اور مشائخ جو چاہیں قناعت پسندی کے راگ گاتے رہیں اور جس صورت سے چاہیں اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے راضی برضا رہنے کی تعلیم دیتے رہیں لیکن حقیقتاً یہ فلسفہ اسیقدر بلکہ اس سے زیادہ گندہ ہے جس قدر گندے ان کے مکان جن میں وہ سکونت کرتے ہیں ان کے چند لقمے جو شاید انہیں میسر آتے ہوں ان کے سنگ و چوب جن سے وہ بت تراشتے ہیں نظر آتے ہیں اس کے مقابلہ میں للہ انصاف کرو کہ کیا وہ تمدن انتہائی روحانیت اور الوہیت سے پر نہیں ہے جو انسانی خدمت کے لئے فطرت کو قابو میں لاکر مادہ کی ہیئت منقلب کردے اور اس راہ میں انسانی ذہانت اور قوی اختراعی سے پورا پورا کام لے جو انسانی روح کو باطل پرستی جہالت۔ اوہام پرستی اور فطرت کی غلامی سے نجات دلاوے اور جو تمدنی اور سیاسی اداروں کی ادھیڑ بن میں صرف اس لئے برابر سرگرم ہو کہ زیادہ سے زیادہ بندگان خدا راحت اور آرام سے بسر کرسکیں یقیناً مغربی تمدن برابر فروغ پائے گا اور دن دونی رات چوگنی ترقی کریگا لیکن اس کا کوئی گمان یا شبہ نہیں ہو کہ متمدن لوگ کسی منزل پر پہنچکر دوبارہ مشرقی روحانیت کی طرف رجوع کریں گے۔ مستقبل میں لوگ اور زیادہ باخبری سے اور پورے غور و فکر سے کام لیکر ان روحانی امکانات کو وسعت دیں گے جو ابتک اس تمدن کی ترقی میں انہیں نظر آئے ہیں

سرکاری قرضہ

ابھی وہ وقت تو نہیں آیا جب ہم لوگ اپنے ملک کی سیاسی اور معاشی تاریخ کے دلچسپ واقعات کو پڑھ کر ہنسیں اور اسطرح ہنسیں جیسے دنیا آج ہم پر ہنس رہی ہے لیکن اگر کبھی فرصت کے وقت اپنے گرد وپیش کے حالات سے ایک لحہ کے لیے قطع نظر کر کے ہم اپنی غلامی کی تاریخ کی ورق گردانی کریں تو جس طرح ہماری آزادی کا خون خود ہمارے ہاتھوں سے اور ہمارے روپیہ سے کیا گیا ہے اسکو پڑھکر ممکن نہیں کہ شرم وندامت کے کچھ آنسو ہماری آنکھوں سے نہ گر پڑیں، کون یقین کر سکتا ہے کہ ہماری موجودہ سرکار دولت مدار نے ہمارا ملک، ہمارا وطن، ہماری جان اور ہمارا مال ہماری تہذیب اور ہمارا تمدن جس روپیہ سے خریدا وہ روپیہ بھی ہماری جیبوں سے لیا گیا تھا اور اس میں جتنی کمی اسوقت رہگئی تھی اس کا بار نسلاً بعد نسلٍ ہماری گردنوں پر منتقل ہوتا رہا، یہانتک کہ آج دوسو برس کے بعد بھی ہم لوگ اس قرضہ سے سبکدوش نہیں ہو سکے ہیں اور سال بسال اس اصل کا کروروں روپیہ سود ادا کر رہے ہیں۔

کانگریس نے اپنے گذشتہ اجلاس میں جہاں کامل ازادی کی اہم تجویز منظور کر کے اپنے جائز سیاسی حقوق کو حاصل کرنے کا قصد مصمم کیا ہے اسی کے ساتھ ایک دوسری اہم قرارداد کے ذریعہ یہ اعلان بھی کر دیا ہے کہ سرکاری قرضہ کا جو بار ہندوستان کے ذمہ ڈالا گیا ہے اور جس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اس کی کلیتہً ادائیگی کی ذمہ داری آیندہ ہندوستان کی آزاد حکومت پر نہ ہوگی بلکہ اس رقم میں سے صرف اسیقدر رقم ہندوستان ادا کریگا جو ایک غیر جانبدار پنچایت کے فیصلہ کے مطابق جائز اور ہندوستان کے ذمہ واجب الادا قرار دیجائیگی اس قرارداد کو منظور کر کے کانگریس نے نہ صرف ہندوستان کو بلکہ ساری دنیا کو اس عظیم معاشی نقصان کیطرف متوجہ کر دیا ہے جو موجودہ غیر ذمہ دار اور خودغرض حکومت اپنی پیش رو ایسٹ انڈیا کمپنی کی غارتگرانہ طرز حکومت کی روایات کی وارث بنکر ہندوستان کو اسوقت تک

برابر پہونچا رہی ہے، اس قرارداد سے قدرتاً ایک خاص ہلچل اور بے چینی پھیل گئی ہے،
ہندوستان میں اینگلو انڈین طبقہ شور کر رہا ہے اور انگلستان میں بھی شاید ہی کوئی ایسا معتبر
اخبار ہوگا جس نے بڑے بڑے افتتاحیہ اس موضوع پر نہ لکھے ہوں، نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان
اور انگلستان کے صرافوں میں مبادلہ کے اتار اور چڑھاؤ کا اندیشہ ہونے لگا، مجبوراً دارالعوام
میں طرح طرح سے سوالات کرکے وزیر ہند سے اطمینان حاصل کیا گیا کہ برطانوی حکومت ہند
اس امر کی ذمہ داری لیتی ہے کہ ہندوستان کی آیندہ ذمہ دار حکومت اپنے تمام قرضوں کو تسلیم
کرے گی، لیکن جو لوگ ابھی کچھ عرصہ قبل روس کے ادائیگی قرضہ سے انکار کر دینے کا مزہ چکھ چکے ہیں
وہ کیونکر وزیر ہند کے اعلانات سے مطمئن ہو سکتے ہیں۔

غرض ایک طرف تو کانگریس کے اس رویہ پر ہر طرف سے احتجاج کیا جا رہا ہے اور
دوسری طرف وہ احسانات شمار کرائے جا رہے ہیں جو برطانوی سرمایہ نے ہندوستان کے
معاشی وسائل کو بارآور بنانے کے لئے اور ہندوستانیوں کو مہذب اور متمدن بنانے کے لئے
نہ صرف ہندوستان پر بلکہ تمام مشرق پر کئے ہیں، بیشک یہ احسانات اتنے زیادہ ہیں کہ وہ نہ
میں شمار کراؤں نہ تم شمار کرو، اغریب ہندوستان سے زیادہ کون دوسرا برطانوی قوم کے
احسانات کی قدر بھی کر سکتا ہے! اور یہ محض دعویٰ نہیں بلکہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بیسویں صدی
میں بھی برطانیہ ہندوستان پر حکومت کر رہی اور اسی شان قہاری اور استبداد کے ساتھ جسکے
مقابلہ میں از منہ وسطی کی بدنام اور رسوا تر حکومتیں بھی شرما جائیں، اور ہندوستان نہایت وفاداری
کے ساتھ ہر برطانوی سیادت کا جوا اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے۔

دو سو سال کے تجربہ کے بعد ہندوستان کو اپنے دوست اور دشمن کی اچھی طرح تمیز ہو گئی
ہے اور یہ ہماری احسان شناسی اور سیاست میں بھی ایمانداری کرنے کی انتہا ہے کہ کانگریس نے
کل قرضہ کی ادائیگی سے انکار نہیں کیا بلکہ صرف اسی رقم کی ادائیگی کی ذمہ داری لینے سے انکار
کیا جو ہندوستان کے مفاد کے لئے نہیں بلکہ صراحتہً ہندوستان کے مفاد کے خلاف صرف

کرنے کے لئے قرض لی گئی تھی، اسوقت تقریباً دس ارب روپیہ کا بار جو ہندوستان پر ہے اس میں بلاشبہ وہ رقوم بھی شامل ہیں جو ہندوستان میں ریل، تار، سڑک، نہر اور دیگر مفاد عامہ کے کاموں پر صرف کرنے کے لئے قرض لی گئی تھیں لیکن اس میں کم از کم چار ارب روپیہ ایسا بھی ہے جو کسی پیدا آور کام کے لئے نہیں بلکہ تاج برطانیہ کے سب سے گرانقدر موتی کو حاصل کرنے کے لئے قرض لیا گیا تھا، پھر یہ کونسا انصاف ہے کہ اس موتی کی قیمت شاہ انگلستان کے خزانہ سے نہیں بلکہ غریب ہندوستانیوں کی جیب سے ادا کیجائے؟ اگر اس حقیقت سے کسیکو انکار ہے تو ہندوستان میں برطانوی عہد کی سیاسی اور معاشی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالکر اپنا اطمینان کیا جا سکتا ہے، ناظرین جامعہ کے لئے اگر بارِ خاطر نہ ہو تو یہ سرگذشت بھی دلچسپی سے خالی نہیں، اور آئندہ سطور میں ہم اپنے سرکاری قرضہ کی ابتدا، اور اس کی نوعیت اور بتدریج اضافہ کا مختصر حال پیش کرنا چاہتے ہیں، تاکہ اس کے متعلق ناظرین خود کوئی رائے قائم کر سکیں۔

تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ موجودہ حکومت ہند وارث ہے ایسٹ انڈیا کمپنی کی جو ۱۶۰۰ء میں ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کے لئے قائم کی گئی تھی، ابتداءً کمپنی کی حیثیت محض تجارکی تھی، لیکن بہت جلد اس ملک کی سیاسی بساط پر دوسرے مہروں کے مقابلہ میں کمپنی بہادر کی حیثیت شطرنج کے "فرضی" کی ہوگئی، کمپنی نے پہلے اپنی مدافعت کے لئے، اس کے بعد بیرونی رقیبوں کے استیصال کے لئے، پھر ملک کے اندر اپنے دشمنوں اور اپنے دوستوں کی سرکوبی کے لئے اور آخر میں تمام ملک کے اندر اپنی حکومت کا سکہ جمانے کے لئے ملک کے اندر اور ملک کے باہر بے شمار جنگیں اور لڑائیاں مول لیں

کمپنی کا کل وصول شدہ سرمایہ چھ ملین پونڈ تھا جس سے وہ حکومت بھی کرتی تھی اور تجارت بھی، اور یہ اس لئے ممکن تھا کہ بقول آدم اسمتھ کے ایسٹ انڈیا کمپنی Traded like rulers and ruled like merchants (حکمرانوں کی سی تجارت کرتی تھی، اور تاجروں کی سی حکومت) پھر بھی ظاہر ہے کہ کمپنی کا وصول شدہ سرمایہ تجارت کے لئے تو

یقیناً کافی تھا لیکن ہندوستان کی سیاست میں اپنا رسوخ پیدا کرنے کے لئے اور اپنی سلطنت کے قیام اور استحکام کے لئے یہ رقم کہاں تک کافی ہوسکتی تھی، بالخصوص ایسی صورت میں جب کمپنی کے حصہ دار اپنے سرمایہ پر منافع کے لئے ہمیشہ تقاضہ کرتے رہتے تھے، چنانچہ جنوبی ہند میں جب پہلی بار فرانسیسیوں سے سخت مقابلہ پڑا تو اُن کی قوت کو توڑنے کیلئے کمپنی کو بالآخر قرض لینا پڑا، اور یہی ابتدا کہی جاسکتی ہے ہمارے سرکاری قرضہ کی۔ ۱۷۶۵ء میں جب "شیر ارکاٹ" نے بنگال کی دیوانی حاصل کی تو اسوقت اس قرضہ کی ادائیگی کا بار صوبہ بنگال کی مالگذاری پر ڈالا گیا، اسکے بعد جو معرکہ آرائیاں ہوئیں ان کی وجہ سے قرض میں اضافہ ہوتا گیا اور ۱۷۹۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کل قرضہ تقریباً سات ملین پونڈ ہوگیا۔ وارن ہیسٹنگز کے غارتگرانہ طرز حکومت نے بنگال کو لوٹ کر ویران کر دیا لیکن کمپنی کے قرض میں کمی کی بجائے برابر اضافہ ہوتا رہا، اسلئے کہ کمپنی کے ایجنٹوں کو ہندوستان میں سلطنت قائم کرنے کا ٹھیکہ اسی شرط پر دیا گیا تھا کہ کمپنی کو تجارت میں منافع ہو یا نہ ہو کمپنی کے حصہ داروں کو دس فیصدی سالانہ منافع ضرور تقسیم کیا جائے، اور یہی نہیں بلکہ چار لاکھ پونڈ سالانہ برطانوی قوم کو بھی بطور مال غنیمت کے ایک حصہ کے نذر دیا جائے، ایک طرف یہ مطالبات دوسری طرف ہندوستان میں آئے دن کی جنگیں، لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مفتوحہ علاقوں کی آمدنی کی ضمانت پر ہمیشہ قرض لیا گیا اور ۱۷۹۹ء میں کمپنی کا کل قرضہ دس ملین پونڈ ہوگیا، اس کے بعد لارڈ ولزلی کے عہد حکومت ۱۸۰۵ء میں قرضہ اور بڑھ کر دوگنا ہوگیا اور دو سال کے اندر سات ملین کا اسپر مزید اضافہ ہوا یعنی ۱۸۰۷ء میں کمپنی کا کل قرض ۲۷ ملین پونڈ تھا، کمپنی کو اپنی اس پالیسی سے فائدہ ہوا، اور بنگال کے روپیہ سے میسور اور میسور کے روپیہ سے مرہٹوں کی طاقت کو یکے بعد دیگرے ختم کیا گیا، اگر ایک طرف قرض میں اضافہ ہوا تو دوسری طرف کمپنی کی بادشاہت بھی بڑھتی گئی، یہانتک کہ ۱۸۳۴ء میں کمپنی تقریباً تمام ہندوستان پر بلاشرکت غیرے مسلط اور قابض ہوگئی حکومت انگلستان اب زیادہ عرصہ تک اتنی بڑی سلطنت کو اپنی رعایا یعنی کمپنی کے قبضہ میں نہیں رہنے دینا چاہتی تھی، لیکن یکبارگی کمپنی کو علیحدہ کر دینا بھی اسوقت مناسب نہ تھا،

اس لئے کچھ مدت کے لئے اور کورٹ آف ڈائرکٹرس کو ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا، البتہ حکومت انگلستان نے اب اس نئی سلطنت کو کمپنی سے کلیۃً حاصل کرنیکی تیاریاں شروع کیں اور ۱۸۳۳ء کے منشور میں ایسی دفعات رکھی گئیں جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کمپنی کی سلطنت حکومت انگلستان کے ہاتھوں میں عنقریب منتقل ہونیوالی ہے، کمپنی کی ڈائرکٹرس نے ہوا کا رُخ دیکھکر حکومت کے ساتھ معاملہ کرنا چاہا، اور جو کچھ مانگنا تھا مانگا، حکومت نے بھی دل کھولکر دام لگائے، پھر ایسا سودا کہاں نصیب ہوتا، کمپنی کا قرضہ اسوقت، ۳ ملین پاؤنڈ ہوچکا تھا، اور جیسا پہلے عرض کیا گیا ہی کمپنی کی حیثیت اسوقت تک تاجر کی بھی تھی اور زمیندار کی بھی، دشواری یہ تھی کہ تجارت اور زمینداری کے بہی کھاتے شروع سے علیحدہ علیحدہ نہیں رکھے گئے تھے سنہ ۱۸۱۴ء میں بہت غور و فکر کے بعد دونوں حسابات الگ الگ رکھنے کی تجویز کی گئی تھی لیکن اگر اس نقطہ نظر سے کمپنی کے حسابات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عملاً اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اسکی وجہ سے کمپنی کے ساتھ معاملہ کرنے میں حکومت کو کچھ دشواریاں ضرور پیش آئیں لیکن طویل گفت و شنید کے بعد جو شرائط فریقین نے منظور کئے وہ حسب ذیل تھے :-

۱- کمپنی کی تمام املاک اور جائداد شاہ انگلستان کے نام لکھدی جائیں۔

۲- کمپنی کے تمام قرضہ جات نیز دیگر نقصانات کا بار حکومت ہندوستان پر ڈالا جائے۔

۳- کمپنی کے سرمایہ پر بشرح ½ ۱۰ فیصدی کل ۶ لاکھ تیس ہزار پونڈ سالانہ منافع ہندوستان کی مالگذاری میں سے سب سے پہلے وضع کرکے انگلستان میں ادا کیا جائے۔

۴- ۱۸۷۴ء کے بعد اگر پارلیمنٹ چاہے تو منافع تقسیم کرنے کے بجائے ہر سو پونڈ حصہ کو دو سو پونڈ کی شرح قیمت سے خرید سکتی ہی یعنی کمپنی کے ۶ ملین پونڈ کے وصول شدہ سرمایہ کی قیمت ۱۲ ملین پونڈ ادا کرنا ہوگی۔

۵- کمپنی کی تجارتی املاک میں سے ۲ ملین پونڈ نکال کر ایک علیحدہ محفوظ سرمایہ کا فنڈ انگلستان میں قائم کیا جائے جس میں سود در سود کا اضافہ ہوتا رہے تاکہ آیندہ اس

فنڈ سے کمپنی کے حصے خریدے جائیں نیز یہ کہ اگر کسی وجہ سے حکومت ہند کمپنی کے حصہ داروں
کو کسی سال منافع بروقت تقسیم نہ کر سکے تو وہ رقم اس فنڈ میں سے وضع کر لی جائے
۹۔ کمپنی کے وہ ملازمین جن کے سپرد کمپنی کا تجارتی کاروبار تھا ان کو مناسب معاوضہ ان
کی خدمات کا دیا جائے۔

مندرجہ بالا شرائط کسی تفصیل کے محتاج نہیں۔ کمپنی نے سونے کی چڑیا سستے داموں فروخت
کی یا مہنگے اس سے بھی ہمکو کچھ سروکار نہیں، البتہ جو چیز ہمیں واضح کرنی مقصود تھی وہ یہ کہ چڑیا
خریدی تو گئی لیکن دام کس کی جیب سے ادا ہوئے؟ اگر یہ بات واضح ہوگئی تو پھر مال مفت
دل بے رحم کے مصداق حکومت انگلستان کے تنہا کمپنی کے مفاد کا خیال رکھکر مندرجہ بالا شرائط
منظور کر لینے پر آپ کو تعجب کیوں ہے؟

سنہ ۱۸۳۴ء کے بعد کمپنی کی تجارت بالکل ختم ہوگئی اور اب صرف حکومت کے فرائض باقی
رہ گئے تھے، ہندوستان کا نقشہ تو ہماری آزادی کے سرخ خون سے رنگا ہی جا چکا تھا اب
ہندوستان کے حدود کے باہر پیش قدمی شروع کرنے کا وقت آگیا تھا۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں جب لارڈ آکلینڈ
ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے تو اس زمانہ میں روس اور انگلستان کے تعلقات بہت کشیدہ
تھے، اور روس کو نیچا دکھانے کیلئے کسی وجہ کی تلاش تھی، چنانچہ یہ اندیشہ ظاہر کر کے کہ روس افغانستان
کو حلیف بنا کر ہندوستان میں انگریزی طاقت کو نقصان نہ پہونچا دے حفظ ماتقدم کے طور پر ہندوستان
کے شمالی و مغربی سرحدی صوبہ پر جنگی کارروائیوں کے شروع کر دینے کی قرار داد منظور ہوئی نقشہ جنگ
انگلستان ہی سے تیار ہو کر لارڈ آکلینڈ کے ساتھ آیا اور اسی کے مطابق افغانستان سے جنگ ہوئی
اور اس جنگ کے تمام مصارف ہندوستان کے ذمہ ڈالے گئے، اس زیر باری پر تو ایسٹ انڈیا
کمپنی نے بھی احتجاج کیا اور خود دار العوام کے بعض مشہور ارکین نے اس ناانصافی کی شدید ترین
مخالفت کی جس کا اندازہ جان برائٹ کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو اس نے سنہ ۱۸۵۹ء میں ایک
تقریر کے دوران میں اسطرف اشارہ کرتے ہوئے کہے تھے۔

"پندرہ ملین پونڈ جو جنگ افغانستان میں صرف ہوئے اسکا تمام تر بار انگلستان پر پڑنا چاہئے، اس لئے کہ یہ جنگ انگریزی وزارت کے حکم سے ہوئی اور محض انگلستان کے اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھکر لڑی گئی تھی۔"

لیکن برطانوی عہد کی تاریخ کا نہ یہ کوئی پہلا واقعہ تھا نہ آخری، خود برطانوی حکومت کا نظام اور دستور تمام تر ایسی ہی مقدس روایات پر مبنی ہے جن کے سامنے قانون، انصاف اور اخلاق سب کو سر جھکانا پڑتا ہے، پس اگر کمپنی کے احتجاج اور برائٹ کے مشورہ کو نظرانداز کیا گیا تو اسی لئے کہ خود کمپنی اور حکومت انگلستان کے ناجائز فوجی مصارف کا بار ہندوستان پر ڈالنے کی رسم اور روایت پہلے سے قائم تھی۔ بہرحال ہمیں تو یہ دکھلانا ہے کہ جنگ افغانستان کی وجہ سے بھی کمپنی کے قرض میں اضافہ ہوا۔ اس کے بعد کمپنی نے سندھ کیطرف پیر پھیلائے، اور برما کی طرف بھی ہاتھ بڑھایا اور جو کچھ جہاں سے ملسکا اپنے قبضہ میں کیا! اور موقع بھی اسی کا تھا! ۱۸۵۱ء میں کمپنی کا قرضہ ۵۵ ملین پونڈ ہوگیا۔ اسکے بعد بھی سال بسال کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہا۔ بالآخر کمپنی کی دست درازیوں سے تنگ آکر نیز دیگر وجوہ سے جب ہندوستان کے اندر حکومت کے خلاف غدر برپا ہوگیا تو اسکو فرو کرنے کے لئے اور اُٹھتے ہوئے فتنوں کو دبانے کے لئے حکومت انگلستان کو براہ راست مداخلت کرنا پڑی اور اپنی سلطنت کے تحفظ کے لئے انگلستان سے فوجیں بھیجیں دوبارہ امن و امان قائم کرنے میں صرف ایک سال کے اندر تقریباً دس ملین پونڈ کا اور اضافہ سرکاری قرضہ میں ہوا۔ یہ کہانتک جائز تھا؟ اس کے متعلق مسٹر رامیش چندر دت اپنی معاشی تاریخ ہندوستان میں تحریر فرماتے ہیں۔

"غلطی برطانوی حکام کی تھی لیکن جرمانہ ہندوستان کو ادا کرنا پڑا اس سے قبل ہندوستانی فوجوں سے چین میں اور افغانستان میں کام لیا گیا اور جو خدمات ہندوستانی سپاہ نے ہندوستان کے حدود کے باہر انجام دیں ان کا کوئی معاوضہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو نہیں ادا کیا گیا لیکن جب برطانوی سپاہ غدر کو فرو کرنے کے لئے ہندوستان بھیجی گئی تو انگلستان نے تمام مصارف حکومت ہند سے وصول کر لئے۔"

مصارف بھی پورے پورے نہیں بلکہ کچھ زیادہ جیسا کہ میجر ونگیٹ نے اپنی ایک تصنیف میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

" برطانیہ عظمی نے نہ صرف یہ کہ اپنی فوج کے تمام مصارف کی ادائیگی کا مطالبہ کیا بلکہ ظلم یہ کیا کہ انگریزی فوج جس تاریخ کو ہندوستان کے لئے انگلستان سے روانہ ہوئی اس سے چھ ماہ قبل جو کچھ اس فوج پر صرف ہوا تھا وہ بھی ہندوستان سے وصول کرلیا۔"

میجر ونگیٹ کو یہ شکایت شاید اسلئے پیدا ہوئی کہ برطانیہ عظمی کا رویہ اس قسم کے معاملات میں اپنے دیگر مقبوضات اور نوآبادیات کے ساتھ بالکل مختلف رہا ہے جس کی تائید میں ہم ایک اور انگریزی مصنف کا قول نقل کئے دیتے ہیں

" دفتر نوآبادیات یا بالفاظ دیگر بجز ہندوستان کے تمام برطانوی نوآبادیات و مقبوضات کا تمام خرچ نیز بری اور بحری افواج کے مصارف دولت متحدہ کی مالگذاری سے ادا کئے جاتے ہیں اور یہ ایک قدرتی نتیجہ معلوم ہوتا ہو کہ ہندوستان کے معاملہ میں بھی اسی قسم کے تمام اخراجات اس ملک کو برداشت کرنے چاہئیں۔ لیکن اصل واقعہ کیا ہے ؟ برطانوی مالگذاری سے ایک پیسہ بھی ہندوستان کے فوجی تحفظ پر کبھی خرچ نہیں کیا گیا۔"

غرض جہاں تک ہندوستان پر صرف کرنیکا تعلق ہے انگلستان کو ہندوستان سے کسی قسم کا سروکار نہ تھا۔ اور تمام باتیں معاملہ کی اور تاجرانہ اصول پر طے کیجاتی تھیں۔ البتہ ہندوستان کے خزانہ سے براہ راست اور بالواسطہ جن جن طریقوں سے ممکن تھا روپیہ لیا گیا۔ ایک "مطالبات وطن" ہی کے نام سے جو رقوم سال بہ سال ہندوستان کے خزانہ سے انگلستان میں ادا کی جاتی تھیں ان کو اگر شمار کیا جائے تو ۱۸۳۴ء سے ۱۸۵۸ء تک ۵۰ ملین پونڈ سے کسی طرح کم نہ نکلیگی، اس میں سے زیادہ سے زیادہ دس ملین پونڈ کا سامان ہندوستان کو ملا باقی رقم گویا نذر کے طور پر ادا کی گئی۔ مسٹر دت کا خیال ہو کہ ہندوستان کے سرکاری قرضہ کی اصل وجہ یہی مطالبات وطن ہیں مصنف موصوف نے کمپنی کے تمام حسابات کا جائزہ لیکر یہ ثابت کیا ہے کہ باوجود کمپنی کی فضول خرچیوں اور اسراف کے ۱۸۵۸ء تک

کمپنی کی کل آمدنی کی میزان کل خرچ سے زیادہ نکلتی ہے اسلئے اگر برطانوی حکومت کے آغاز سے ہندوستان کو مطالبات وطن نہ ادا کرنے پڑتے تو ۱۸۵۸ء میں جب ہندوستان کی حکومت براہ راست تاج انگلستان کے قبضہ میں آگئی اسوقت ہندوستان کی تحویل میں ایک کثیر رقم فاضل موجود ہوتی، ہندوستان کا سرکاری قرضہ جو کمپنی نے اپنے صد سالہ عہد حکومت میں لیا تھا وہ حقیقتاً ان ناجائز مصارف کے لئے تھا جو ہندوستان کی طرف سے انگلستان میں ادا کئے جاتے تھے، اور جو انصافاً کسی صورت سے ہندوستان کے ذمہ واجب الادا نہ تھے۔

مصنف مذکور نے سرکاری قرضہ کی جو وجہ بتلائی ہو وہ غلط تو نہیں کہی جا سکتی لیکن ہمارے نزدیک مسٹر ان سی وکیل کی یہ رائے زیادہ صحیح ہو کہ سرکاری قرضہ کی ابتداء تو ان جنگوں کی وجہ سے ہوئی جو کمپنی کو لڑنا پڑیں لیکن اس میں بتدریج اضافہ جنگوں کی وجہ سے اور مطالبات وطن کی وجہ سے ہوا، یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ کل قرضہ میں کتنی رقم مطالبات وطن کی وجہ سے ہوئی اور کتنی جنگوں کی وجہ سے!

بہرحال خواہ مطالبات وطن کی وجہ سے خواہ جنگوں کی وجہ سے خواہ دونوں وجوہ سے ہو۔ ایک کثیر رقم کمپنی کے ذمہ قرض ہو گئی اور ۳۰ اپریل ۱۸۵۵ء کو کل قرضہ کی میزان ½ ۶۹ ملین پونڈ ہو گئی تھی، غدر فرد ہونے کے بعد ہندوستان براہ راست برطانوی پارلیمنٹ کے ماتحت آگیا اور ہندوستان کی بہتر حکومت کے لئے جو قانون پارلیمنٹ نے منظور کیا اس میں ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی کہ کمپنی کے تمام قرضہ جات اور مالکین کمپنی کے حصوں پر منافع ہندوستان کی مالگذاری سے ادا کیا جائیگا!

کمپنی نے اپنے حسن انتظام سے تقریباً ۷۰ ملین پونڈ کا قرضہ چھوڑا تھا، اب برطانوی پارلیمنٹ کی براہ راست نگرانی میں اس قرضہ میں دن دونی رات چوگنی ترقی شروع ہوئی اور بیس سال کے اندر کل قرضہ ۱۳۹ ملین پونڈ ہو گیا یہ اضافہ بھی زیادہ تر جنگی کارروائیوں اور فوجی مصارف کی وجہ سے ہوا اول غدر کے سلسلہ میں ۴۰ ملین پونڈ کل خرچ ہوئے اس کے بعد ۱۸۶۷ء میں جنگ ابی سینیا کے مصارف

کے لئے ایک کثیر رقم ہندوستان کے خزانہ سے وصول کر لی گئی حالانکہ ہندوستان کو اس سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ ۱۸۸۸ء سے ۱۹۱۰ء تک ۵۰ ملین پونڈ کا مزید اضافہ ہوا لیکن اس میں سے بیشتر رقم ریلوں کے جاری کرنے پر صرف کی گئی اور باقی رقم افغانستان کے خلاف ان جنگی کارروائیوں میں صرف کی گئی جو ۱۸۷۸ء اور ۱۸۹۷ء کے درمیان حکومت نے کیں ۱۹۱۴ء میں کل قرضہ ۳۰۰ ملین پونڈ سے زیادہ ہو گیا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں حکومت ہند نے ڈیڑھ ارب روپیہ قرض لیکر جنگ عظیم میں برطانوی حکومت کی امداد کی! دوران جنگ میں اور جنگ کے بعد بھی حکومت ہند کے بیزانیہ میں کئی سال تک مسلسل خسارہ رہا۔ اس کی وجہ سے بھی قرض میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور مارچ ۱۹۲۴ء میں حکومت ہند کا کل قرضہ پیدا آور اور معمولی ملاکر تقریباً سات سو ملین پونڈ یعنی دس ارب روپیہ ہو گیا، اسوقت سے ابتک اس رقم میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے بلکہ تخفیف کیلئے کوششیں کیجا رہی ہیں

جنگ عظیم میں جب برطانیہ دشمنوں کے نرغہ میں تھا اسوقت ہندوستان نے اپنی فوج اور سپاہ سے جسقدر امداد ممکن تھی کی اور برطانیہ کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے جس قدر خون غریب ہندوستان کے جسم میں تھا بہا یا گیا لیکن یہ کافی نہیں سمجھا گیا۔ اور ڈیڑھ ارب روپیہ اور قرض لیکر حکومت انگلستان کو نذر دیا گیا اس کے متعلق مسٹر کے شاہ کی رائے سے غالباً ہر شخص اتفاق کرے گا کہ وہ تحفہ یا نذر جو معطیوں کی خواہش یا منظوری یا مشورہ کے بغیر ان کے نام سے قرض لیکر وصول کر لیا جائے اس کی ادائگی کی ذمہ داری قانوناً، اخلاقاً اور انصافاً ان لوگوں پر کیونکر ہو سکتی ہے جنکو اس کی خبر تک نہیں ہے!

اب ان واقعات کی روشنی میں جو سطور بالا میں بیان کئے گئے ہیں یہ دعویٰ کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ سرکاری قرضہ تمام تر اس انگریزی سرمایہ پر مشتمل ہو جو ہندوستان کے معاشی وسائل کو ترقی دینے کے لئے اسوقت انگریزی سرمایہ داروں نے لگایا تھا جب ہندوستانی ریلوں اور نہروں کے لئے سرمایہ فراہم کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا، حکومت ہند نے اپنے کل قرضہ کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک "معمولی" اور دوسرا "پیدا آور"۔ آخر الذکر سے مراد وہ قرضہ ہے جو ریلوں نہروں اور

دیگر تجارتی کاموں پر صرف کیا گیا ہے اور اس سے منافع کی توقع ہے۔ اور اول الذکر سے مراد وہ رقم ہے جسکے معاوضہ میں کوئی منافع مادی شکل میں حکومت کو وصول نہیں ہو سکتا!

اس مضمون میں ہم نے صرف اول الذکر کی نوعیت سے بحث کی ہے آخر الذکر قسم کے قرضہ کو پیدا آور کاموں پر صرف کیا گیا ہے لیکن اسپر بھی اقتصادی نقطۂ نظر سے بہت سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں لیکن طوالت کی وجہ سے اسوقت ہم اسپر تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتے۔ صرف اسقدر اشارہ ضروری ہے کہ اس قرضہ کی بیشتر رقم انگریزی سرمایہ داروں سے لی گئی ہے۔ چنانچہ سود کی کثیر رقم جس سے ہندوستان کے سرمایہ دار فائدہ اٹھا سکتے تھے اور ملک کی دولت میں اضافہ ہو سکتا تھا وہ برطانوی سرمایہ داروں کے نیگ لگتی ہے۔!

مُلّا رموزی صاحب کا خط

گرامی منزلت ایڈیٹر صاحب رسالہ "جامعہ" دہلی ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

معلوم ہو کہ آج رسالہ جامعہ بابتہ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء ملا، دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوا، اور اسی سے "آں محترم" کی خیریت معلوم کر کے خوشی حاصل ہوئی اور از حد خوشی حاصل ہوئی۔

دیگر احوال یہ ہے کہ وہ اپنے ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب سے بھی "دو چشم دید ملاقات" ہوئی تھی اور جب سے کہ مسلمانوں کے صحیح معنی کے ہمدرد اور اسلامی اخلاق کے لائق تقلید نمونہ حضرت قبلہ حکیم اجمل خانصاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انکے ہمارے مصافحہ کرا دیا ہے اسوقت سے ان سے برابر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ حالانکہ نہ ڈاکٹر صاحب کبھی ہمارے گھر آتے نہ ہم انکے گھر جاتے مگر جناب ملاقات ہے کہ ہوتی ہی رہتی ہے اور جب ہوتی ہی رہتی ہے تو ہوتی ہی رہے گی اور جب ہوتی ہی رہے گی تو ہوتی ہی چلی جائے گی اور جب ہوتی ہی چلی جائے گی تو بس ہر وقت اسے " ہوئی " سمجھئے اور جب ہوئی تو پھر ہوتی ہوئی، مگر ہاں اس مرتبہ کا..... دیگر احوال یہ ہے کہ

ڈاکٹر صاحب ممدوح کے ہمراہ وہ کسی زمانے میں اخباروں میں چھپنے والے قبلہ عبدالمجید خواجہ مدظلہ سے بھی ہوئی تھی، بس نہ پوچھیئے کہ کس درجہ خلیق اور ملنسار بزرگ ہیں اور خیر ملنسار تو ہر علی گڑھ والا ہوتا ہی ہے وہ تو کہیئے کہ مزاج میں خشکی تو بس یہ کچھ بریلی، مراد آباد اور تھانہ بھون ہی کے حصہ میں آئی ہے اور خود یہ آپ کا ناچیز سا "ملا رموزی" ملنساری کے معاملہ میں کیا کم ہے آخر آپ نے برادرم ڈاکٹر عابد حسین صاحب مدظلہ نے برادرم احمد الیاس مجیبی نے اور سارے ہندوستان نے ہمارا تجربہ کر ہی لیا ہے۔ آئے صاحب اور تو اور وہ

آف انڈیا کی گورنمنٹ تک اس معاملہ میں ہماری قائل ہے کیونکہ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ بس جس سے ملے تو پھر ملے ہی سے اور حضرت وہ خواجہ عبدالمجید صاحب یا عبدالمجید خواجہ صاحب کس بلا کے ہمدرد اور قدردان واقع ہوئے ہیں واللہ کہ مصافحہ کرتے ہی اپنے ساتھ لیجا رہے تھے مگر وہ تو کہئے کہ مصلحت والوں نے ایسا نہ ہونے دیا اور صاحب سبحان اللہ کہ خواجہ صاحب کھدر کا لباس تو اس درجہ سفید اور صاف پہنتے ہیں کہ دنیا کے ایک گاندھی صاحب بھی ایسا صاف کھدر نہیں پہن سکتے اور صاحب ہم تو صاف کہتے ہیں کہ لباس کی صفائی ہی سے انسان کی ذہنی استعداد کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً جو شخص جتنا نفیس لباس پہنے گا اُس کے مزاج میں ترقی، بلندی، عروج اور کامرانی کے اُتنے ہی جذبات بھی مشتعل اور بیدار رہیں گے۔ اور یہ نکتہ آپ ہماری طرف سے جامعہ کے تمام طلبہ سے کہدیجئے گا مگر خدا کے لئے بھول نہ جائیگا کیونکہ معاف کیجئے گا مولوی صاحب کہ اب آپ ضروری سے ضروری بات کو بھی بھول جاتے ہیں اور اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ بڑی بڑی گورنمنٹیں جب بڑی بڑی باتیں کہکر بھول جاتی ہیں اور رعایا کے یاد دلانے پر بھی انہیں مشکل سے یاد آتی ہیں تو آپ اور ہم تو خیر آدھی گورنمنٹ بھی نہیں تو ہاں وہ نکتہ یہ ہے کہ دیکھو لڑکو اور لڑکیو کہ جو لڑکا یا جو لڑکی کہ میلا اور گندہ لباس پہنے گا یا پہنے گی اس کے مزاج میں کسل، سستی، بے ہمتی، بے عملی، پستی جمائی اور انگڑائی لینے کی عادت پیدا ہو گی اگر یقین نہ ہو تو دیکھ لو دہلی اور لکھنؤ کے چانڈو، گانجا، اور چرس استعمال کرنے والوں کا حال اور لباس۔ مگر جناب اب تو ہوا ہی کچھ الٹی چلی ہے کہ اکثر مدارس کے لڑکے لباس کی صفائی میں تو کوہ قاف کی مشہور ”نیلم پری“ کو مات کرتے ہیں مگر عمل، تعلیم، اور کسب کمالات میں کچھ اس درجہ پودے، بھدے اور گندے رہتے ہیں کہ واللہ بات کرنے کو آپ کا جی چاہتا ہو تو چاہتا ہو ہمارا جی تو نہیں چاہتا کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ باوجود ملازمت پیشہ ہونے کے ہم عمل کو کس درجہ پسند کرتے ہیں اور ایک طالب علم کی قابل احترام زندگی اس کا وہ پہاڑوں سے زیادہ اونچا عمل ہی ہو سکتا ہے جسے عام

طور پر حصول تعلیم یا حصول علم کہتے ہیں تو بس اس کے یہ معنی ہونگے کہ جو لڑکا کہ حصول علم پر حریص ہوگا مستعد ہوگا تو پھر وہی "عبدالمجید خواجہ کھدری" کہلائیگا۔

دوسری بات یہ کہ خواجہ صاحب نے پہلی ہی ملاقات میں ہم سے جو ہمدردی فرمائی وہ عملی تھی زبانی نہیں تو پھر اس کے ہوئے نا دو معنی ایک یہ کہ خواجہ صاحب میں "عمل" کی قوت بیدار ہے جو ایک محبوب ملکہ ہے تمام انسانی ملکات میں دوسرے یہ کہ عمل میں "صدق اور سچائی" بھی شریک ہو تو اگر جناب اگر آپ کے ہاں کے طلبہ میں سچائی عمل میں شریک ہو جائے تو پھر لاحول پڑھیے جو ہماری قومی اور اجتماعی ترقی کو یہ بے چارے پولیس والے روک تو لیں مگر لاحول ولا معاف کیجئے گا مولوی صاحب قصہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور اصل بات رہ گئی اس لئے۔

دیگر احوال یہ ہے کہ

مارچ کا رسالہ "جامعہ" مارچ ہی میں جب مل گیا تو الحق کہ ہم آپ کے اور منیجر صاحب کے کاتب صاحب کے اور مطبع والوں کے حوصلے، ہمت اور عمل کے قائل ہو کر رہ گئے یوں کہ وہ کل کی بات ہے کہ یہی بے چارہ رسالہ جامعہ تھا کہ تین چار مہینے لیٹ ہو گیا تھا اور ہم ہمیشہ جنوری میں پچھلے اکتوبر کے اور اکتوبر میں پچھلے جنوری کے مضامین پڑھا کرتے تھے مگر اب اسی رسالہ کو جب ہم وقت پر آتا دیکھتے ہیں تو واللہ جی خوش ہوتا ہے اور اگر اس پر اس رسالہ نے مداومت اختیار کی تو خوش ہوتا ہی رہے گا اور خوش ہوتا ہی چلا جائے گا تو اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوئی کہ جی کا خوش ہونا اصل میں "عمل" پر موقوف ہے مگر برکت ہے تو عمل کے نیک اور مفید ہونے میں ورنہ جناب عمل تو یہ بھی ہے کہ آپ جامعہ سے فارغ التحصیل ہو کر ملازمت کر لیں اور پھر مسلمانوں سے یوں ملیں گویا وہ سب آپ کے غلام ہیں انپر جرمانے کریں انہیں سزائیں دیں اُن سے سیدھی طرح بات نہ کریں سلام کا جواب دیں تو ایک انگلی سے انہیں ترقی سے روکیں اور خود ترقی کریں، اُنکے خلاف لوگوں سے

غلط شکایتیں کریں اور خود ترقی کریں، عام مسلمانوں کی خدمت سے منہ موڑ کر اپنے گھر میں قیصر جرمنی بن کر بیٹھ جائیں اگر گھر پر " گورنمنٹ آف انڈیا" ملنے آئے تو تہمد باندھے ہی دروازہ کے باہر تک استقبال کو بھاگ کر آجائیں ۔ اور جو غریب مسلمان حاضر خدمت ہو تو ملازم سے کہلا دیں کہ اس وقت آرام میں ہیں مل نہیں سکتے۔ سچ ہے مولوی صاحب یہ باتیں تو کچھ علوم دین کی تحصیل ہی سے حاصل ہوتی ہیں " پانیر" میں ان باتوں کا تذکرہ کہاں ؟ یا پھر اس قسم کی باتیں مولانا اشرف ٹو ٹکی قسم کے پروفیسر بتا سکتے ہیں۔

بے شک مولوی صاحب ہم دہلی میں آئے تھے اور " جمعیتہ علما" ہیں قیام کیا تھا مگر وہ کہئے کہ حضرت ہلال احمد صاحب زبیری ایڈیٹر اخبار " الجمعیتہ" سابق غیر بی اے وحال بی اے نے یہ کہکر جامعہ ملیہ نہ آنے دیا کہ وہاں ٹیلیفون نہیں ہے[1] ۔ اور قرولباغ یہاں سے عراق عرب کے برابر دور جگہ ہے اس لئے ہم علیگڑھ چلے گئے ، اسے صاحب مقصد کیا تھا یہی کہ معائنہ کے بعد اندازہ کرینگے کہ مسلم یونیورسٹی نمبر ۱ اور آپ کی اس مسلم یونیورسٹی نمبر ۲ کے طلبہ کی اخلاقی حالت میں کیا فرق ہے ؟ کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے بعد ہی سے تو مکاری، فریب، غرور، نخرہ، منافقت اور روزہ نماز سے نفرت یا انکار کا رواج عام ہو گیا ہے حالانکہ لوگ اس سے پہلے بھی تعلیم یافتہ ہوتے تھے اور آخر ہم آپ اسی زمانے کے تعلیم یافتہ ہیں کہ نہیں مگر دیکھئے کہ ہم آپ ماشاءاللہ مسلمانوں کے لئے کس قدر مفید ثابت ہو رہے ہیں تو بس وجہ یہی ہے کہ ہمارا آپ کا زیادہ وقت یا گزرتا تھا حصول علم میں یا پھر مسجد اور مولویوں کی صحبت میں جہاں سوائے اس کے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا کہ خدا کے خوف اور حشر کے عذاب سے دل کو ڈرایا جاتا تھا مگر اب تو کلب اور لائبریری میں وقت گزرتا ہے اور ان ہیں سوائے شیکسپیئر ملٹن اور ناولوں کے دھرا ہی کیا ہے یا

---

[1] یہ صحیح نہیں۔ جامعہ میں ٹیلیفون ہے۔ مدیر

پھر ٹینس میں وقت گزرتا ہے تو پھر آپ ہی فرمائیے کہ ٹینس میں مسلمانوں کی خدمت کرنے کا کونسا وعظ پوشیدہ ہوتا ہے؟ خیر تو جانے دیجئے واقعی ہیں اور آپ کو ان باتوں سے کیا تعلق؟ مگر مولوی صاحب وہ تو بات پر بات نکلتی ہے تو کہنا ہی پڑتا ہے اب یہ دیکھئے ناکہ طلبہ کے مزاجوں میں غیر قومی عادات اور غیر قومی اخلاق کا رنگ تو گیا پر اور قومی اور آبائی عادات و آداب کا رنگ گیا مٹ اور پھر کہتے کیا ہیں کہ ہم ہیں جناب مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور ہم ہیں جناب اسلامیہ کالج پشاور کے فارغ التحصیل اور حال یہ ہے کہ غیر ملکی لباس اختیار کرکے افلاس پھیلا رکھا ہے اور کہتے یوں ہیں کہ صاحب وہ تو مغربی قوموں کے آنے سے ہندوستان میں افلاس عام ہو گیا ہے لاحول ولا ارے صاحب اگر یہ ہندوستانی اپنی معاشرت میں قومی لباس اور قومی آداب کو برقرار رکھیں تو ایمان سے کہئے کہ پھر افلاس ایک منٹ بھی ٹھہر سکتا ہے، تو غرض قصہ کون کہے۔

دیگر احوال یہ ہو کہ بس آپ کے اس حوصلے اور ثبات عمل کی داد دیتے ہیں کہ آپ نے رسالہ "جامعہ" کو وقت کا پابند فرما دیا اور کچھ شک نہیں کہ یہ آپکے ہاں کا نہایت درجہ قابل احترام حسن ہے کہ آپ کے ہاں کی ہر چیز میں عمل ہے اور عمل کے ساتھ ہی جفاکشی اور حوصلہ وہ جو آپ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ہمارے ہاں کے جتنے "فارغت" "صحافت اردو میں کام کررہے ہیں اُن سے ہمارے ہاں کی تربیت کا اندازہ کرلو تو یہ آپ نے بالکل اور" بہت ہی بالکل فرمایا ہو" مگر کیوں مولوی صاحب آپ کے ہاں کے کچھ "فارغین" "ڈپٹی کلکٹری" ،"ججی" اور "کمشنری" کے عہدوں پر بھی فائز ہوئے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ مولوی صاحب اصل میں انسانی اخلاق اور اسلامی جذبات کا امتحان تو ان عہدوں پر پہنچکر ہوتا ہے کہ یہاں "نشۂ حکومت" سوار ہوتا ہے تو بس ہم تو تب مانیں گے آپکے طلبہ کی تربیت کو بہتر کہ وہ ان عہدوں پر پہنچکر بھی بے کس غریب اور نادار مسلمانوں کے ساتھ برادرانہ برتاؤ کریں، محلے کی مسجد میں ڈپٹی کلکٹر ہوکر بھی پانچ وقت کی نماز پڑھیں جو مسلمان انکے پاس آئے پہلے اُسے سگریٹ پلائیں پھر خود

نوش فرمائیں اردو زبان کے اخباروں کو خریدیں اور پڑھیں۔ تو خیر آپ تو انہیں سمجھاتے رہئیے مانیں انکا کام نہ مانیں اُن کا کام کیا عرض کریں مولوی صاحب واللہ نوکری سے گھراتے ہیں تو بس "نمک نا فرمانی" کے قابل رہ جاتے ہیں۔ آپ کو خط لکھیں تو کس وقت اور کس طرح اس لئے فی الحال تو آپ ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب ہی کو سلام کہدیجئے اور برادر محترم عبد المجید صاحب خواجہ کو آئندہ اشاعت میں سلام کہدیجئے گا۔ کیونکہ صاحب حق یہ ہے کہ وہ بے چارے ہیں سچے اور وضع دار مسلمان بس خدا محفوظ تو رکھے پانیر اخبار کے خریداروں سے اور "ٹائمس آف انڈیا" کے ناظرین سے

بچے بہت بہت سلام کہتے ہیں اور ہاں **وہ** بھی سلام عرض کرتی ہیں۔ باقی سب طرح خیریت ہی جامعہ کے بچوں کو درجہ بدرجہ کہدیجئے گا، بہت یاد آتے ہیں، اور دیکھئے مولوی صاحب آپ براہ کرم اپنے ہاں کے بچوں کو "بکرک ایسٹ کی چوری" سے ہمیشہ ڈراتے رہئے۔ خدا محفوظ رکھے۔ آمین

چراغ راہ

ہمارا قصبہ تو ایک چھوٹی سی جگہ تھی، اگر کوئی بڑا شہر ہوتا تب بھی محفوظ علی صاحب کی ہستی اتنی ہی مشہور اور رہنمائی میں اتنی ہی کامیاب ہوتی، وہ امیر نہیں تھے، امیدواروں کی سفارشیں نہیں کرسکتے تھے، زیادہ ملنسار بھی نہیں تھے، اور جان پہچان والوں کو ان کی صحبت میں کوئی خاص لطف بھی نہیں آتا تھا یہ سب خصوصیات ان لوگوں میں پائی جاتی ہیں جنھیں قسمت نے اپنی اصل نعمتوں سے محروم رکھا ہے۔

محفوظ علی صاحب کو قسمت نے دولت اور اقتدار کے بجائے ایک فن میں کمال حاصل کرنیکا مادہ عطا کیا تھا، دیس بدیس میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو ان سے برابری کا دعوی کرسکے، اس لئے ان کا رتبہ امیروں اور بااثر لوگوں سے بہت بلند تھا، کیونکہ دولت اور اقتدار کی نعمت تو چھوٹے بڑے حصوں میں ہزار ہا آدزو مندوں کو ملی ہے، اور محفوظ علیصاحب اپنے فن میں یکتا تھے وہ محض صاحب کمال نہیں تھے، بلکہ اپنے فن کے موجد بھی، اور یہ ان کے تصور کی رسائی، احساس کی نزاکت اور مذاق کی خوبی کی ایسی زبردست دلیل تھی کہ ہر شخص ان کی عظمت کے سامنے سر جھکانے پر مجبور تھا، ان کا قول تھا جسے سب بلا تامل تسلیم کرتے تھے کہ بغیر ایثار کے کسی فن میں کمال حاصل نہیں ہوسکتا، اور انہوں نے اپنی زندگی، اپنی خوشی، اپنے سارے حوصلے اپنے فن کی نذر کردیئے تھے، لیکن ایثار کی صلاحیت بھی کچھ خون میں ہوا کرتی ہے، اور دوسری خاندانی املاک کیطرح باپ سے بیٹے کو ملتی ہے محفوظ علی صاحب کے دادا محمود علی نے طوائفوں اور گویئوں پر لاکھوں روپیہ صرف کر ڈالا تھا، مرتے وقت تک ان کے گھر میں فاقہ کی نوبت آچکی تھی، مگر انہیں اس کا افسوس تھا کہ افلاس کی وجہ سے وہ ایک رنڈی کی قدر دانی نہ کرسکے جو حسن میں اور خوش آوازی میں تمام ہم پیشہ عورتوں اور مردوں سے بازی لیگئی تھی، محفوظ علی صاحب کے والد مقصود علیصاحب کو عورتوں اور موسیقی سے دلچسپی نہیں تھی، ان کے خیال میں صاحب فن کا اپنے جوہر دکھانے کے لئے کسی دوسرے کا محتاج ہونا خامی کی دلیل تھی، انہوں نے منشی اشیاء کے استعمال پر مہارت حاصل کی اور اسپر تمام دنیاوی حوصلے، اور سب سے زیادہ تندرستی نثار کی، اور

اس فن میں حیرت انگیز کرشمے دکھائے، وہ ٹھرا جس کا ایک گھونٹ پست حوصلہ آدمیوں کو لٹا دیتا، مقصود علیصاحب گھڑوں پی جاتے، وہ بھنگ اور چرس جس کا ایک کش دوسروں کے ہوش اڑا لیجاتا، وہ سیروں پھونک ڈالتے۔ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا اہل ہنر کو رسوا کرتی ہے ان کی آرزوؤں کا منہ چڑھاتی ہے لیکن مقصود علیصاحب کا تجربہ اس کے بالکل برعکس تھا ان کے کمال کی شہرت دور دور پھیل گئی، ہر رئیس اپنا فخر سمجھتا تھا کہ انھیں شادی بیاہ اور خوشی کے موقعوں پر بلائے اور اپنے مہمانوں کو انکے کرتب و کملات دکھلائے انھوں نے ساری عمر حیرت اور تعریف کا خراج وصول کر نہیں گذاری، زمانے کی ناقدردانی سے انھیں صرف ایکبار شکایت ہوئی جب کسی نااہل باپ نے خدا جانے کس بنا پر ان سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے سے انکار کر دیا، مقصود علیصاحب بعد کو جب کبھی اس پر غور کرتے تو اس انکار کی صرف ایک وجہ اُن کی سمجھ میں آتی، اور وہ یہ کہ اس زمانہ میں ان کی عمر چوبیس سال کی تھی، اور انھیں اپنے فن میں وہ کمال نہیں حاصل ہوا تھا جس نے آگے چلکر انھیں رشک جہاں بنا دیا۔

دنیا کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے، مقصود علیصاحب کے انتقال کے کچھ دنوں بعد ہی لوگ شراب خواری کی مجلسوں میں ان کا نام لینا اور ان کے کارناموں کی داستانیں سنانا بھول گئے، اسی طرح جیسے طوائفیں محمود علی صاحب کی قدر دانی اور خوش مذاقی بھول گئی تھیں، باپ اور دادا کی یادگار زندہ کرنے کا فرض محفوظ علی صاحب نے ادا کیا، جب کبھی ان کی تعریف کی جاتی تو وہ نہایت درجہ سعادت مندی سے اپنے بزرگوں کا ذکر چھیڑ دیتے، اور بجائے اس کے کہ مٹھائی پر فاتحہ کرا کے غریبوں میں تقسیم کرائیں، وہ اس تعریف کا ایک حصہ خدا کے یہاں مرحوموں کے حساب میں لکھا دیتے حالانکہ انھیں یقین تھا کہ ان کے بزرگوں کو دعائے خیر کی حاجت نہیں، ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ ایک ایسے شخص کا رتبہ جو اپنے فن پر جان نثار کر دے، اس جوانمرد سے کم نہیں جو میدان جنگ میں اپنی جان ملت پر قربان کرے، دونوں اپنی اپنی طرح پر شہید ہوتے ہیں، ان کے رتبوں میں اونچے نیچے کا فرق کرنا انتہائی گستاخی ہے۔

خود محفوظ علیصاحب کے کمال کا ذکر آتا ہے تو میرا قلم رک رک جاتا ہے، اور میری خامیاں

مجھے سہا دیتی ہیں، میں ہرگز اس لائق نہیں کہ ایسے نازک مسئلے کو اپنا موضوع بناؤں میرے قلم میں یہ قدرت کہاں کہ ایسے باریک نقش اتار سکے جو محفوظ علیصاحب کی صورتگری کے لئے درکار ہیں، میں اپنی تحریر میں وہ نیرنگیاں، وہ شوخی وہ تیزی اور طراری کیسے پیدا کرسکتا ہوں جو محفوظ علیصاحب کی تقریر کو سنوارتی تھی، لیکن جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے، دنیا کا حافظہ بہت کمزور ہے، میں ڈرتا ہوں کہ کہیں محفوظ علیصاحب کی یادگار بالکل بھلا نہ دی جائے۔ میں اپنی خامیوں کو محسوس کرتا ہوں مجھے افسوس ہے کہ محفوظ علیصاحب کی یادگار زندہ رکھنے کے لیے میری لنگڑی لولی تحریر کے سوا کوئی ذریعہ نہیں، اور اس داستان کے پڑھنے والوں سے میری التجا ہے کہ وہ میری کوتاہی محفوظ علیصاحب کیطرف منسوب نہ کریں، میری دشواریوں کا لحاظ کرکے میرے اوپر رحم کریں، اور اپنے تصور سے اس تصویر کو روشن کرلیں جو مجھے اندیشہ ہے کہ باوجود میری کوششوں کے دُھندلی رہ گئی ہے۔

محفوظ علیصاحب کا فن آموں کا کھانا اور کھلانا تھا، یوں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں معلوم ہوتی، ہرکس وناکس جس کی گرہ میں کافی دام ہوں آم خرید کر کھا اور کھلا سکتا ہے، محفوظ علیصاحب کا کمال اسی میں تھا کہ انھوں نے اس معمولی سی بات کو فن کے درجے تک پہونچا دیا، اور اسی طرح جیسے بڑے شاعر روزمرہ کہکر زبان پر قادر ہونے کا انتہائی ثبوت دیتے ہیں، محفوظ علی صاحب چند احباب کو آموں کی دعوت دیکر ثابت کردیتے کہ جس شخص کو خدا نے احساس اور مذاق عطا کیا ہو وہ اس معمولی سی بات میں کیا کیا کیفیتیں پیدا کرسکتا ہے، ان کے دادا شہوت کو عطر میں بساتے تھے نفس کی بھوک کو نغموں سے اور حسن کے نظارے سے تیز کرتے تھے، اور ایک خواہش جو فطرتاً ہر شخص میں ہوتی ہے اس اہتمام سے پوری کرتے تھے کہ پارساؤں کو ان پر رشک آتا، اور بوالہوسوں کو عبرت ہوتی، یہ عظمت انھیں ان کے کمال ایثار نے بہم پہونچائی، اور یہی ایثار محفوظ علیصاحب کے والد مقصود علی کی شہرت اور ہر دلعزیزی کی بنیاد تھا، وہ ٹھرے کے گلاس چڑھا کر دوسروں کی طرح نشہ سے چور نہیں ہوجاتے تھے، شراب ان کی رگوں میں دوڑتی پھرتی تھی، شراب کے تصور میں وہ ہر وقت اس طرح بیخود رہتے تھے کہ نشہ ان کی محویت میں صرف حقیقت کی شان پیدا

کر دیتا تھا، یوں ہی ہمارے محفوظ علیصاحب کے لئے آم کھانا محض ایک لذیذ شے سے پیٹ بھر نہیں تہا، ان کی ہستی آموں کی رنگت اور بو اور مزے میں گم ہوگئی تھی، جب تک درختوں میں بور نظر نہ آتا، ان کی طبیعت نڈہال رہتی، ان پر وہ ساری مصیبتیں گذر جاتیں، جو جیسے عاشق پر ہجر کے زمانہ میں گزرتی ہیں انکے مایوس چہرے اور داشتہ خاطر اور بے پرواہ نگاہوں سے ہر شخص پر ظاہر ہوجاتا کہ بس وہ ایک وعدہ پر جی رہے ہیں، فروری اور مارچ کے مہینوں میں جب بور ٹھنیوں سے پھوٹکر نکلنا شروع ہوتا تو محفوظ علیصاحب کا شگفتہ چہرہ، تیز رفتار گرم گفتار اور مستی سے ناچتی ہوئی نگاہیں دیکھکر یقین نہ آتا کہ یہ وہی بزرگ ہیں جو کچھ دن پہلے بوڑہوں کیطرح کمر جھکائے خلق خدا کی ہمدردانہ نظر وں کے سہارے لڑکھڑا لڑکھڑا کر کہیں چل پھر پاتے تھے اور ایسے اُداس تھے کہ منہ سے بات نہیں نکلتی تھی، اپریل اور مئی محفوظ علیصاحب کے لئے بڑی بے چینی کے مہینے تھے، یہ وہ مہینے ہیں جب موسم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا بیرحم آندہیوں سے باغ کے باغ برباد ہوجاتے ہیں، بیوقت بارش فصل کی فصل کا مزہ پھیکا کر دیتی ہے، ان مہینوں میں محفوظ علیصاحب دن رات اضطراب میں تڑپ تڑپ کر گذارتے تھے کبھی ایمان اور توکل سے امید دل کو جگاتے اور جلاتے، کبھی کفر کے کلموں سے دل پر نشتر لگاتے لیکن وہ دن کبھی نہ کبھی آ ہی جاتے، جب آم نشو و نما کے تمام مرحلے طے کرکے رس پر آجاتے، اور مہینوں کی کلفتوں کے بعد محفوظ علیصاحب کو زندگی میں مزہ آنے لگتا۔

مجھے اکثر ان خوش نصیب ہستیوں کے زمرے میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے جنھیں قصبے کی آبادی سے چن چن کر محفوظ علیصاحب اپنی مجلسوں میں بلاتے تھے، میں اپنی عمر کے اکثر واقعات بھول گیا ہوں، لیکن ان مجلسوں کے تصویر کے نقش میرے دل پر ایسے گہرے ہیں کہ انہیں شاید موت بھی نہ مٹا سکے دعوتیں عموماً شام کو ہوا کرتی تھیں، صحن میں تخت پر آموں کی لگن دیکھکر تمام احباب واہ واہ، جزاک اللہ سبحان اللہ کے نعرے بھرتے ہوئے خود بخود لگن کے چاروں طرف جمع ہو جاتے ان کی نگاہیں آموں پر اسی طرح جم جاتیں جیسے پروانوں کی شمع پر، اور جب محفوظ علیصاحب یہ دیکھ لیتے کہ آموں کے نظارے نے اشتیاق کو انتہا تک پہونچا دیا ہے اور اہل ذوق کے دل مرغ اسیر کی طرح تمناؤں سے

تڑپنے لگے ہیں تو وہ مسکرا کر لگن کے پاس اپنی مخصوص جگہ پر رونق افروز ہوتے، اور ان کے ہاتھ میں
چھری چمکنے لگتی، لیکن وہ آموں کے ایسے قدر دان تھے کہ وہ اس اشتیاق کو جو محض نظارے سے
پیدا ہوتا ہے، کافی نہ سمجھتے۔ اپنے احباب کی بے تابی اور اشتہا کو دوبالا کرنے کے لئے وہ ایک ایک
کر کے آموں کو اٹھاتے ان کے نام بتاتے، اور ان کے رنگ اور خوشبو کی تعریف میں فصاحت و
بلاغت کے دریا بہاتے، جب ادا شناسی کا حق ادا ہو جاتا، تو وہ یہ سوال پیش کرتے کہ کس آم سے
بسم اللہ شروع کی جائے، اور اس مشکل مسئلے پر کل احباب کی رائے لی جاتی، اسی سلسلے میں ایک نہایت
دلچسپ بحث چھڑ جاتی، اور جیسے کسی زمانے میں شاگرد شعراء دوسروں پر فضیلت جتانے کے لئے اپنے
استادوں کی خوبیاں بیان کرتے تھے، ویسے ہی محفوظ علیصاحب کے احباب میں سے ہر ایک
کوشش کرتا کہ اپنے محبوب آم کی خصوصیات واضح کرے، اور اس کی تعریف اس انداز سے کرے کہ
اس سے بڑھکر تعریف کرنے کی گنجایش ہی نہ رہے، اس بحث میں بلاغت کی جو شعبدہ بازیاں دکھائی
جاتیں اور زباں دانی و حاضر جوابی کے جو معجزے پیش کئے جاتے، انہیں ضبط تحریر میں لانا اس حقیر کے امکان
سے باہر ہے۔ لیکن اتنا ہر شخص محسوس کر سکتا تھا کہ اس مباحثے اور مناظرے میں چٹ پٹاپن محفوظ علیصاحب
کے فقرے پیدا کرتے تھے، اور سچ پوچھئے تو وہ زبان جو یہاں بولی جاتی تھی اس کی لغت اور
اصطلاحات ساری محفوظ علیصاحب ہی نے وضع کی تھیں، وہ اپنے دوستوں کی دلیلیں بڑے شوق
سے سنتے تھے، بڑی نکتہ بینی سے ان کو جانچتے، داد دیتے، اور انصاف کرتے، لیکن در اصل وہ
اپنے جوہر اسوقت دکھاتے تھے جب کل احباب یکزبان ہو کر کہتے کہ ایسے نازک معاملے میں مباحثہ
سے تصفیہ نہیں ہو سکتا، اور ہر شخص فرمایش کرتا کہ اس کا پسندیدہ آم کھلا کر محفوظ علیصاحب اس کی
رائے کو صحیح ثابت کر دیں، تب وہ نہایت پیار سے ایک آم اٹھاتے، اسے ہاتھ میں اچھالتے، اسے
سونگھ کر اس کی خوشبو سے مست ہو جاتے، جھوم کر واہ واہ کی صدا بلند کرتے، اور اپنی نیم باز آنکھوں
سے احباب پر ایک شفقت آمیز نظر ڈال کر انتہائی نفاست اور صفائی سے ایک قتلہ کاٹتے اور اس
خاص آم کے سب سے زیادہ چرب زبان شیدائی کو کھلاتے، اسے استادوں کے مشاعرے کی پہلی غزل

سمجھئے، یا مجلس رقص و سرود میں کسی پری پیکر رقاصہ کے نازک پھول جیسے پاؤں کی پہلی جنبش اُس کے گھونگھرو کی پہلی جھنکار، محفوظ علیصاحب کا قتلے تقسیم کرنا گویا ساغر کو دور میں لانا تھا محفل پر مستی چھا جاتی تھی، ہر ایک جھومنے لگتا تھا، اور اس کی زبان حیرت انگیز سہولت سے اس کے جذبات پنہاں کی ترجمانی کرنے لگتی تھی، محفوظ علیصاحب کبھی اپنی تقریر سے شراب کا نشہ بڑھاتے، اور ساتھ ہی اپنے فقروں کو گزک کے طور پر پیش کرتے کبھی جوش جذبات سے ان کی آنکھیں بجلی کیطرح اس فضا پر چمک جائیں، اسے منور کر دیتیں، اور رندوں کی نگاہوں میں چکا چوندھ ڈالدیتیں جب آخر کار آم سب ختم ہو جاتے، اور لگن کے پانی میں ہمارا عکس ہمیں منہ چڑھانے لگتا، تو محفوظ علیصاحب ایک سرد آہ بھرتے، اور کسی برمحل شعر سے اہل مجلس کو دنیا کی عیاری، اور عمر کی بے ثباتی، اور موسم گل کی ناپائداری سے آگاہ کر کے ان کے سر سے نشہ اتار دیتے لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہمیں محفوظ علیصاحب کے دعدے زندہ رکھتے تھے، ورنہ خدا جانے ہم پر کیا گذر جاتی خود محفوظ علیصاحب کی کیفیت سب سے زیادہ دردناک ہوتی تھی، ان کے گال لٹک آتے آنکھوں کی روشنی بجھ جاتی، کمر جھک جاتی، بات کرتے تو معلوم ہوتا کہ ان کا گلا گھٹ رہا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، اگر ہم یاد رکھیں کہ انہوں نے آموں پر کیسی کیسی نعمتیں قربان کی تھیں اور آموں کے کھانے اور کھلانے کے فن میں کمال حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے کس یکسوئی اور استقلال سے اپنے تمام ذہنی قوے اس مبارک کام کے لئے وقف کر دئے تھے، تاکہ دوسرے عزت، اور شہرت کے امیدوار سبق لے سکیں، اور کوئی ایسی غلط فہمی نہ پیدا ہو جو ان کی عظمت میں فرق ڈال سکے، میں اختصار کیساتھ ان کی زندگی کے حالات لکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

محفوظ علیصاحب کے والد صاحب فن کے لوازمات کیسے پورے کر سکتے تھے اگر وہ اولاد کی تربیت میں اپنا وقت صرف کرتے، ان کے توکل کا یہ نتیجہ ہوا کہ محفوظ علیصاحب کو ان کی ایک دور کی رشتہ دار نے جو خاصی خوشحال تھیں متبنے کر لیا، محفوظ علیصاحب کی ذہانت نے استادوں کا کام بہت آسان کر دیا، اور انھوں نے اسکول اور کالج کے تمام امتحانات بہت

کامیابی سے پاس کرلئے، کالج میں انھوں نے اپنا سکہ ایسا جمایا کہ فارغ التحصیل ہوتے ہی انہیں
ایک اچھی نوکری مل گئی جس میں ترقی کی بہت گنجایش تھی، اور عہدے پر معمور ہوتے ہی ان کی شادی
بھی ہوگئی، ان کی بیوی حسن اور سلیقہ میں یکتا تھیں، انہیں اپنے شوہر سے وہ گہری اور سچی محبت بھی
ہوگئی تھی، جو صرف اہل دل کا حصہ ہے، لیکن دنیا داری کے گر کچھ اور ہی ہوتے ہیں، اہل فن
کے کمالات کچھ اور محفوظ علیصاحب نے بہت جلد معلوم کرلیا کہ وہ دنیا داری کیلئے موزوں نہیں ہیں
اور اگر انہوں نے اپنی قابلیت اور ذہانت کے بوتے پر کامیابی حاصل بھی کرلی تو اس روحانی
تسلی سے محروم رہیں گے جو انسانی مسرت کا جوہر ہے پچیس سال کی عمر میں ان کے ضمیر نے انھیں
وہ راستہ بھی سجھا دیا جس کے سوا منزل مقصود تک پہنچنے کا ان کے لئے کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔

آموں کا تو انھیں پیدائیشی شوق تھا، اور انھوں نے دور دور سے قلمیں منگوا کر ایک
اچھا خاصا باغ لگالیا تھا، مگر بہت ممکن تھا کہ وہ دنیا داری کی لغویات میں مبتلا ہوکر اپنے اصل
کمالات سے بیخبر رہتے، اگر خدا کی طرف سے اشارہ نہ ہوتا، اس کی صورت یہ ہوئی کہ مالیوں
کی بے پروائی سے کئی درختوں میں دیمک لگ گئی، باغ کو آیندہ بدنظمی کے نتائج سے بچانا اشد
ضروری تھا، اور محفوظ علیصاحب نے دفتر سے کچھ دنوں کی رخصت چاہی کہ گانوں جاکر باغ کی
نگرانی کے لئے مناسب انتظام کرسکیں، لیکن ان کے افسر نے جو ان سے بہت جلتا تھا چھٹی نہیں
دی، اور محفوظ علیصاحب کو یقین ہوگیا کہ اگر انسان کو اپنی عزت آبرو عزیز ہے تو وہ نوکری نہیں
کرسکتا، چنانچہ انھوں نے استعفا دیدیا، اور اس کے بعد جب کبھی ملازمت ترک کرنے کا ذکر آتا تو
تو وہ صاف صاف کہدیتے کہ اہل ذوق کے لئے نوکری کرنا بڑی غلطی ہے، اور انھوں نے یہی
محسوس کرکے اپنا دامن چھڑالیا۔

ملازمت سے استعفا دینا معمولی کام نہ تھا، محفوظ علیصاحب کی وہ رشتہ دار جنھوں نے انکو
پالا تھا یہ خبر سنکر کہ انہوں نے استعفا دیدیا ہے اور اب کہیں کسب معاش کی غرض سے نوکری چاکری
کرنیکا ارادہ بھی نہیں ہے، اسقدر خفا ہوئیں کہ انہیں اپنے گھر میں قدم رکھنے کی ممانعت کردی محفوظ علی

صاحب کی بیوی جو کبھی بھولے سے کسی خادمہ کو بھی نہیں گھڑکتی تھیں، اچانک بدمزاج ہوگئیں ہر گھڑی
محفوظ علیصاحب سے لڑنے جھگڑنے لگیں، اور کبھی تو گالیوں پر بھی اتر آتیں محفوظ علیصاحب کے تمام
دوست جو انھیں دنیا داری کے راستے پر چلانا چاہتے تھے ان کو جا وبیجا نصیحتیں کرنے لگے اور انکو
ایسا بیزار کر دیا کہ وہ تعلقات منقطع کرنے پر مجبور ہوگئے، سب سے زیادہ محفوظ علیصاحب پر یہ شاق گذرا
کہ وہ لوگ جو ایک زمانے میں ان کا ادب کرتے تھے، ان پر ہنستے اور انکو حقارت کی نظروں سے
دیکھنے لگے، لیکن محفوظ علیصاحب کی ہمت ایسی تھی کہ وہ یہ ساری جگ ہنسائی برداشت کر لے گئے
اور اپنے فن میں ایسے محو ہوئے کہ ان کو دنیا اور مافیہا کی مطلق خبر نہ رہی۔

ناظرین کا شک دور کرنے کے لئے مجھے پھر کہنا پڑتا ہے کہ ایک شغل کو جو بہت معمولی سمجھا
جاتا ہے اور جس کے لوازمات محض گرہ میں دام اور معدے میں گنجایش رکھنا فرض کیا گیا ہے محفوظ علی
صاحب کے کمال نے ایک بالکل نئی حیثیت دیدی تھی، اور اس کا درجہ مصوری، شاعری، انشاپردازی
اور خطابت سے کچھ کم نہیں، بلکہ فرداً فرداً مقابلہ کیا جائے تو ان سب سے بلند ہی ثابت کر دیا
تھا، شاعر صرف شعر کہتا ہے مصور صرف تصویریں بناتا ہے لیکن محفوظ علیصاحب نے اپنے فن کو ان
تمام فنون لطیفہ کا مجمعہ بنا دیا تھا، ایک اور خوبی ان کے فن میں یہ تھی کہ آرزوئیں اور خواہشیں پیدا
کرنے کے ساتھ وہ انھیں پوری بھی کرتا جاتا تھا محض تماشا نہیں بلکہ باعث تسکین و تسلی بھی تھا۔

عزیز اقارب کی خوشنودی اور دنیا دار دوستوں کے حسن ظن سے ہاتھ دھونا محفوظ علیصاحب
کی ایثار پسند طبیعت کے لئے کافی نہ تھا، انھوں نے اپنی ذات کے تمام جوہر بھی اپنے فن کے صدقے
کر دیئے۔ کالج میں انھوں نے عربی فارسی کی بہت اچھی تعلیم پائی تھی، طالب علمی کے زمانے میں
انھوں نے شعر بھی کہے تھے، چند رسالوں کے مدیر جو ان کی غزلیں اور تنقیدی مضامین شائع کر چکے تھے
نہایت خلوص سے ان کی نسبت طرح طرح کی ہمت افزا پیشین گوئیاں کرتے تھے، اور انہیں امید
تھی کہ آسمان ادب پر عنقریب ایک نیا ستارہ چمکنے والا ہے جس کے سامنے اوروں کی روشنی
بالکل ماند پڑ جائے گی، محفوظ علیصاحب نے ملازمت اختیار کرنے کے بعد بھی اپنی ادبی دلچسپیاں

ے گئی، مرحوم کے آخری سال بہت تنگی میں گذر رہے تھے، یہاں تک کہ انھیں اپنا باغ جو انہیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھا ٹکڑے ٹکڑے کرکے بیچ دینا پڑا تھا قصبہ کے لوگوں میں سے بہت ایسے تھے جنھیں مرحوم کا نام تک یاد نہ تھا، مگر خدا خدا کرکے کسی نے مجھے ان کی قبر کا مقام بتا دیا، اور میں بیتابی سے بھاگتا ہوا وہاں پہونچا، قبر کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ شخص جس کا وطن کے سب لوگ نام تک بھول گئے تھے کسقدر بلند رتبے کا ولی تھا اور مشیت ایزدی نے اس کی آرزوں کا کتنا پاس کیا تہا، ان کی قبر سے میں سمجھتا ہوں خاص اس مقام سے جہاں مرحوم کا دل ہوگا، ایک آم کا درخت نکلا تھا اور جس انداز سے وہ ہوا میں جھوم رہا تھا مجھے یقین ہے کہ اس نے بہت جلد ایک شاندار درخت کی صورت اختیار کرلی ہوگی کاش وہ لوگ جو مٹکے شاہ اور دیوانے شاہ کی فرضی قبروں پر ہجوم کرتے ہیں، محفوظ علیصاحب کی قبر کو اپنا مرجع بناتے، ان کا آخری معجزہ دیکھکر اپنا ایمان پختہ کرتے، اور بارگاہ تعالیٰ میں اپنی دعائیں ایسے کامل بزرگ کے ذریعہ سے پہونچاتے جنپر نظر التفات ہونے کا خدا تعالیٰ نے ایسا روشن ثبوت دیا تھا"

شذرات

خلد آشیاں بیگم صاحبہ بھوپال کا غم ہمارے دلوں میں ابھی تازہ ہی تھا کہ ایک دوسری اسلامی ریاست کے تاجدار، نواب حامدعلیخاں صاحب. سابق والی رام پور کے انتقال کی پرالم خبر موصول ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم ایک ذیعلم فرمانروا تھے، خاصکر علوم دینیہ میں نہایت ہی اعلیٰ استعداد رکھتے تھے۔ ہم مرحوم کے پسماندگان وباشندگان ریاست رام پور سے اظہار تعزیت کرتے ہیں اور بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین۔

اس مہینہ کا سب سے اہم واقعہ غالباً سائمن کمیشن کی رپورٹ کی اشاعت ہے جس کا انتظار سیاسی حلقوں میں بے چینی سے کیا جارہا تھا۔ اس رپورٹ کے مرتب کرنے والے انگلستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے قابل ترین اشخاص ہیں۔ انہوں نے واقعات سے پوری واقفیت حاصل کرنیکی کوشش بھی کی ہے جس کا اظہار رپورٹ کی پہلی پراز معلومات جلد سے ہوتا ہے۔ لیکن قوموں میں حاکم ومحکوم کا رشتہ اسقدر غیر فطری ہے کہ شاید اس تعلق کے بعد ایک قوم دوسری قوم کی ذہنیت کو سمجھنے سے بالکل قاصر ہوجاتی ہے۔ سائمن کمیشن کی سفارشوں کی تعریف میں برطانوی اخبارات تقریباً سب کے سب متفق اللفظ ہیں، برخلاف اس کے ہندوستانیوں کو ان میں اپنے قومی جذبات کی اہانت اور استحکام حکومت برطانیہ کے لئے نئی تدابیر نظر آتی ہیں۔ ان سفارشات سے خصوصاً وہ لوگ سخت مایوس ہوئے ہونگے جنہوں نے کمیشن کی فیاضی سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ ان سے اگر وہ کوئی فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو بس اس طرح کہ آئندہ سے اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرنے کا سبق لیں، اور آزادی بطور بخشش حاصل کرنے کا خیال خام چھوڑ دیں۔

یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ کمیشن نے حقیقی آزادی کے تمام مطالبات کو ناقابل عمل قرار دے دیا ہے، اس کی سفارشات سے ہمیں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ لیکن ایک اندیشہ ایسا ہے جس کے سبب سے ہمیں سفارشات کے بعض حصص کو بنظر اعتنا دیکھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اس امر واقعہ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انتہا پسند تعاون کریں یا نہ کریں حکومت اپنے مجوزہ پروگرام پر عمل کرکے رہے گی۔ اور جبتک انتہا پسند اتنے مضبوط نہ ہو جائیں کہ اپنے بنائے ہوئے دستور اساسی کو حکومت سے منوالیں ملک میں وہی دستور اساسی نافذ ہوگا جسے راونڈ ٹیبل کانفرنس کے انعقاد کے بعد برٹش پارلیمنٹ منظور کرلے۔ اور عرصہ تک ملک کی سیاسی و اجتماعی زندگی پر اثر ڈالتا رہیگا۔ سائمن کمیشن کی سفارشات اگر اس دستور اساسی کی بنیاد نہ بھی قرار دیجائیں تو بھی اسکی تشکیل میں انکا خاص اثر ہوگا۔ پس اس خیال سے نہیں کہ وہ ہمیں کیا دیتی ہیں، بلکہ اس خیال سے کہ وہ ہمیں کس طرف لیجانا چاہتی ہیں کمیشن کی چند اہم سفارشات پر غور کرنا ضروری ہے۔

پہلے ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان سفارشات پر عملدرآمد ہونے سے ہماری قومی زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔ اس واقعہ سے قطع نظر کیجئے کہ ڈومینین اسٹیٹس (درجہ نوآبادیات) کا ذکر تک رپورٹ میں کہیں نہیں آیا ہے، اس حقیقت سے بھی چشم پوشی اختیار کیجئے کہ اختیارات حکومت صوبوں میں وزرا تو درکنار گورنر اور وائسرائے تک کو نہیں حاصل ہیں اور آخری فیصلہ تمام تر برٹش پارلیمنٹ کے ہاتھ میں رکھا گیا ہے۔ اور ذرا کمیشن کے بنائے ہوئے دستور اساسی پر نظر ڈالئے کہ اس میں کوشش کیا کی گئی ہے۔ سب سے بڑی کوشش اس میں بمقابلہ مرکز، صوبوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیکر "وفاقی" طرز حکومت کے دھوکہ میں ہندوستان کی مرکزیت کو توڑ دینے کے لئے کی گئی ہے۔

مرکزی مجلس قانون ساز، جسے خیر سے "فیڈرل[1] اسمبلی" کا مرعوب کن نام دیا گیا ہے، مجوزہ

---

[1] Federal Assembly

دستور کے اندر ایک ایسی کمزور اور بے اثر جماعت ہوجائیگی کہ اس سے "قومیت کی تعمیر" میں بہت ہی کم مدد ملیگی۔ اسکی ہیئت ترکیبی اور اس کے اختیارات کی نوعیت دونوں اسی پر دال ہیں۔ ہندوستان جیسے وسیع اور مختلف مقامی مفاد رکھنے والے ملک میں اگر ایک طرف صوبوں کو بڑی حد تک خودمختاری دینا مصلحت ہے تاکہ وہ اپنے مقامی مسائل کو خود حل کرلیا کریں، تو دوسری طرف مرکزی اسمبلی کو ایسا ہونا چاہئے کہ وہ صحیح معنوں میں پوری قوم کی نمائندہ ہو، اور اس کی امداد پر بھروسہ کرسکے تاکہ ہمارے قومی مفاد کی بخوبی حفاظت ہو لیکن کمیشن کی مجوزہ فیڈرل اسمبلی کے لئے ارکین کا انتخاب بالواسطہ ہوگا، وہ بھی صوبوں کی مجالس قانون ساز کے ذریعہ۔ اس حالت میں یہ اسمبلی صوبوں کی "مخلوق" ہوگی، اور انہیں کی غلام۔ وہ بحیثیت مجموعی قوم کی نمائندہ نہیں ہیگی۔ اور اگر ایسے مواقع پیش آئے کہ صوبوں کے مقامی اور ساری قوم کے مفاد میں تصادم ہوا (اس قسم کے مواقع فیڈرل حکومتوں کی سیاسی زندگی میں کبھی کبھی پیش آجایا کرتے ہیں)، تو ممکن ہے کہ فیڈرل اسمبلی کو قوم کے مفاد پر صوبوں کے مفاد کو ترجیح دینا پڑے۔

اس بات کو ذہن میں رکھئے، اور ذرا آنیوالے واقعات پر چشم تصور سے نگاہ ڈالئے۔ ممکن ہے گول میز کانفرنس میں۔ ہندوستان اور برطانوی حکومت کے مابین کوئی سمجھوتہ ہوجائے جس کی رو سے صوبوں کو علیحدہ علیحدہ صحیح معنوں میں خوداختیاری مل جائے۔ اس کا فوری نتیجہ اغلباً یہ ہوگا کہ بمقابلہ مرکز صوبوں کو زیادہ با اختیار دیکھکر تمام سربرآوردہ لوگ جو مرکزی اسمبلی اور اس سے باہر کانگریس میں متفق ہو کر حکومت کی ماہیت بدلنے کی کوشش میں مصروف ہیں اپنے اپنے صوبوں کی مجالس تقننہ میں جاکر مقامی سیاسیات کے جھگڑوں میں گرفتار ہوجائینگے، اور قومی آزادی کی تحریک قوتوں کے منقسم ہوجانے سے کمزور پڑجائیگی۔ پھر کچھ دنوں بعد ایک دوسری صورت حال کے وقوع پذیر ہونے کا اندیشہ ہوسکتا ہے۔ مختلف المفاد صوبوں کے اغراض انگریزی حکومت کچھ اس طرح اپنی ذات سے وابستہ کرلے گی کہ صوبوں کے لئے انگریزی اقتدار کے خلاف متحد ہوکر سر اٹھانا اسی طرح مشکل ہوجائیگا جس طرح اس وقت دیسی

ریاستوں کے لئے مشکل ہو۔ چونکہ فیڈرل اسمبلی صوبوں کی مقامی مجلسوں کی نمائندہ ہوگی کمیشن نے انکا وزن بڑھانے کے لئے یہانتک گنجایش رکھدی ہے کہ صوبوں کی مجالس مقننہ کے اراکین ساتھ ہی ساتھ فیڈرل اسمبلی کے بھی ممبر ہوسکیں گے)۔ فیڈرل اسمبلی کے نمائندوں میں اسی قدر اختلاف رہیگا جس قدر صوبوں کے مقامی مفاد میں۔ پس اسکا بھی کسی متحدہ قومی پالیسی پر عمل کرنا مشکل ہوجائے گا۔

کمیشن فیڈرل اسمبلی کے اس طرز نمائندگی کے لئے جو دلیل پیش کرتا ہے وہ یہ کہ فاصلۂ رائے دینے والوں کی کثرت تعداد اور حلقہائے انتخاب کے وسیع ہونیکی وجہ سے نمائندے اپنے رائے دہندگان سے قریبی تعلقات نہیں رکھ سکتے، اور رائے دہندگان کا اپنے نمائندوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اسمبلی کے ممبروں کا انتخاب براہ راست نہ ہو بلکہ ایک ایسی درمیانی جماعت کے ذریعہ عمل میں آئے جو تعداد میں کم اور تعلیمیافتہ ہونیکے باعث ممبروں پر کافی اثر و اقتدار رکھ سکے۔ اول تو ایک ایسی اسمبلی میں جس کے پاس کچھ بھی اختیارات نہ ہوں، اسکی ضرورت ہی کہاں پیش آسکتی ہے کہ کسی معاملہ میں نمائندے اپنے اپنے رائے دہندگان سے استصواب رائے کریں (ضرورت تو جب ہوتی جب انکی رائے سے کچھ ہو بھی سکتا) دوسرے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ استصواب رائے کی ضرورت پیش آسکتی ہے، اور نمائندے اکثر اوقات اپنے دور دور رہنے والے کثیر التعداد رائے دہندگان کے پاس نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے انکی ہدایت کے موافق کام نہیں کرسکتے تو بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ بالواسطہ انتخاب سے یہ بُعد کم کیسے ہوجائے گا۔ اس سے تو رائے دینے والوں اور نمائندوں کے درمیان ایک اور دیوار حائل ہوجائیگی۔ بالواسطہ انتخاب ہونیکی حالت میں نمائندے ملک کے رائے دہندگان کا چنداں لحاظ نہ کرینگے بلکہ اس درمیانی جماعت کی پالیسی پر چلیں گے جو انہیں منتخب کرے گی خواہ وہ صوبوں کی مجالس قانون ساز ہوں یا کوئی دوسری جماعت۔ اور خواہ ان سے نمائندوں کو قابو میں رکھنے کا کام لیا جاسکے، یہ قوم کے مفاد کی نمائندگی کی اہل خود قوم سے بڑھ کر نہیں ہوسکتیں۔

ہماری دلیل پر یہ اعتراض عاید ہوسکتا ہے کہ اسے اس سوال کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا کہ

فیڈرل اسمبلی کے اراکین کیونکر اپنے ووٹروں سے قریب تر اور استصواب رائے پر مجبور کئے جا سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دور جدید کے وسائل آمد و رفت و خبر رسانی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے اور ووٹروں کی اچھی طرح سیاسی تعلیم ہو۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ فاصلہ کی دقت دور کرنے کے لئے قومی مفاد کو قربان کر دیا جائے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے فیڈرل اسمبلی کے لئے بلاواسطہ انتخاب کے مقابلہ میں بالواسطہ انتخاب کو ہی ترجیح دینا ضروری سمجھا جائے تو اس انتخاب کا کام صوبوں کی مجالس مقننہ سے لینا کسی طرح قرین مصلحت نہ تھا اس کے لئے کسی دوسری جماعت کے انتخاب کی (خواہ اسی طرح جس طرح صوبوں کی مجالس مقننہ کا انتخاب ہو) تجویز ہونی چاہئے تھی۔ کیونکہ صوبوں کی مجالس مقننہ کے سپرد مخصوص مقامی مفاد ہوتے ہیں۔ ایک ہی جماعت دو مفاد کی امین نہیں رہ سکتی۔ بالخصوص اس حالت میں کہ وہ دونوں مفاد کبھی کبھی متصادم بھی ہوتے رہیں۔ اور یہ انتظام بھی فقط عارضی طور سے ہوتا اور جس وقت جمہور کو اچھی طرح سیاسی تجربہ ہو چکتا، درمیانی جماعت کو ہٹا کر براہ راست انتخاب کے اصول پر عمل ہونے لگتا۔

فیڈرل اسمبلی کے اختیارات پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ اس اعتبار سے بھی وہ کمزور ہے۔ خود کمیشن اس کا مقر و سفارشی ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک جس وقت صوبوں کے اندر "اہم سیاسی تجربات" ہوتے رہیں، مرکزی حکومت کو مضبوط (یعنی انگریزوں) کے ہاتھوں میں ہونا چاہئیے لیکن یہاں اعتراض یہ نہیں کہ اسمبلی کو مرکزی معاملات میں مزید اختیار کیوں نہیں دیا گیا اور گورنر جنرل کے تمام اختیارات حاکمانہ بدستور کیوں رکھے گئے۔ خود صوبوں کی مجالس مقننہ بھی گورنروں کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتیں۔ اعتراض یہ ہے کہ فیڈرل اسمبلی اور صوبوں کی مجالس مقننہ میں جو باہمی تعلقات ہونگے ان میں مقامی مفاد کو کافی سے زیادہ وزن دیا گیا ہے۔

جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں یہ تمام ترکیبیں صوبوں کو اہمیت دینے اور مرکزیت کو کمزور کرنے کے

لئے معلوم ہوتی ہیں. تاکہ ملک جس طرح ایک طرف ہندو ہندوستان، مسلم ہندوستان وغیرہ میں منقسم ہو
اور دوسری طرف دیسی ہندوستان اور برطانوی ہندوستان میں، اسی طرح اس کے اندر بٹنے
والے صوبہ وارانہ اختلافات بھی پیدا ہو جائیں۔

اب ذرا اس پر نظر ڈالئے کہ صوبے جنہیں فیڈرل اسمبلی کے مقابلہ میں اس قدر اہمیت دی گئی
ہے خود ان کے اختیارات کیا ہیں اور ان سے کیا کام لیا جانے والا ہے۔ صوبوں پر اتنی عنایت
تو ضرور کی گئی ہے، کہ تمام شعبوں کو وزرا کے اختیار میں دیدیا گیا ہے۔ البتہ ان کو "مختار" اسی
طرح دکھایا گیا ہے جس طرح ہندوستان کے دستور اساسی کو "فیڈرل" (وفاقی) بنایا گیا ہے۔ کیونکہ
وزرا پر گورنر کا تسلط، گورنر پر ویسرائے کا تسلط اور ویسرائے پر برطانوی پارلیمنٹ کا تسلط ہندوستان
کے لئے وفاقی طرز حکومت اور صوبہ جاتی خود مختاری کے منافی سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن صوبوں کو ہر طرح سے گورنر کے اختیار میں دیدینے کے بعد کمیشن نے وزرا کی آزادی میں یوں اضافہ
کر دیا ہے کہ مجالس قانون ساز کا دباؤ ان پر کم کرنے کی سفارش کی ہے وزرا کی تنخواہوں پر جو اختیار مجالس قانون
ساز کو حاصل تھا اسے مقید کرنے اور وزرا کے لئے "مشترک ذمہ داری" کے اصول کی سفارش
انہیں اغراض کو پیش نظر رکھکر کی گئی ہے۔

ان باتوں سے مقصود سارا یہ ہے کہ گورنر کچھ ایسے بندگان ہوا وہوس کو جو اپنی خوش قسمتی
مگر قوم کی بدقسمتی سے تھوڑا بہت اثر رکھتے ہوں۔ ہندو مسلمانوں کو لڑا سکیں، قومی تحریکوں کو
دبا سکیں، یا خود قومی عقائد سے تائب ہو کر گورنمنٹ سے مل جائیں، ان عہدوں کے لئے نامزد
کرکے (وزرا گورنر کے نامزد کردہ ہونگے) ان سے حکومت برطانیہ کے مستحکم کرنے میں مدد لیتا ہے۔

اور یہ لوگ اس خدمت کے عوض میں عہدہ ہائے وزارت پر متمکن پہلے سے بھی زیادہ مصئون و مامون تین کی جگہ پانچ سال تک پبلک کے روپیہ سے گرانقدر تنخواہیں لیتے رہیں۔

اگر راونڈ ٹیبل کانفرنس میں صوبوں کی حقیقی خود مختاری کی بابت کوئی سمجھوتہ نہ ہوا، اور کمیشن کی موجودہ سفارشات پر ہی عمل کیا گیا تو بھی کمیشن نے ایسے انتظامات کر دئے ہیں جن سے "اصلاحات" جدیدہ کے نفاذ کے بعد ہی ملک کی توجہ اختلافی مسائل کی طرف منعطف ہو جائے اور قومی تحریک کو نقصان پہنچے۔ صوبوں کو از سر نو تقسیم کرنے کا مشورہ، مجالس مقننہ میں کچھ عرصہ بعد انتخاب اور رائے دہندگی کے مسائل چھیڑنے کی تجویز، اور رائے دہندگان کی تعداد میں اضافہ کی سفارش یہ تمام باتیں فرقہ دارانہ نزاعات کے واسطے حد درجہ اشتعال انگیز ثابت ہوں گی۔

رہے فرقہ وارانہ مسائل سو انکی بابت کمیشن نے جو سفارشات پیش کی ہیں وہ ذرا بھی ہماری دشواریوں کو ہلکا نہیں کرتیں۔ ان مسائل کے حل کی جو مختلف صورتیں خود ہندوستانیوں کے ذہن سے ابتک نکلی ہیں انہیں میں سے کچھ ادھر سے اور کچھ ادھر سے لیکر ایک مجموعہ تجاویز تیار کر دیا گیا ہے جسے شاید کوئی جماعت پسند نہیں کرے گی۔ اس معاملے میں کمیشن کی ناکامی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ فرقہ وارانہ اختلافات میں گورنمنٹ ہی کو حکم قرار دیا گیا ہے۔ گویا کمیشن نے یہ تسلیم کر لیا کہ وہ کوئی ایسا آئین پیش کرنے سے قاصر ہے جو تمام فرقوں کے حقوق کی از خود حفاظت کر سکے اور حکومت کی غیر آئینی مداخلت کی ضرورت نہ پڑے غنیمت تھا اگر قصہ یہیں تک ہوتا۔ لیکن ہمیں تو اندیشہ ہے کہ اس موقع پر بھی تجاویز حکومت ہی کے اغراض کو مد نظر رکھکر پیش کی گئی ہیں۔ کیونکہ ان پر عملدرآمد ہونے سے ہر جگہ کی قلیتیں اپنے

حقوق کی حفاظت میں دائمی طور سے حکومت کی محتاج رہیں گی۔ اور وہ انہیں اپنے استحکام کے لئے ہر طرح استعمال کرتی رہے گی۔

مسٹر ہارن کے انتقال سے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کو جو نقصان ہوا اس کا اندازہ مشکل ہے۔ آپ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے اور یونیورسٹی کے جدید دور اصلاح میں بہت مفید ثابت ہوئے تھے۔ اگرچہ عمر نے وفا نہ کی لیکن جو تھوڑا سا زمانہ کام کے لئے ملا اس میں بھی آپ نے اپنی حسن خدمات سے ارنلڈ اور بک کی یاد تازہ کر دی۔ ہمیں اس نقصان پر مسلم یونیورسٹی کے ساتھ بہت ہمدردی ہے

(ع۔ق)